امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حصہ دوئم

تحریر

حکیم عبدالرحمٰن خلیق بدوملہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امیرالمومنین

معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(حصہ دوم)

اس کتاب کی ترقیم میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی مشہور تصنیف خلافت و ملوکیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور مولانا موصوف نے اپنی اس تصنیف میں اپنے تاریخی مطالعہ کا حاصل جس ترتیب سے پیش کیا ہے کتاب ہذا میں ٹھیک اسی ترتیب کے ساتھ ہی حضرت معاویہؓ کے خلاف عائد کئے گئے الزامات و اعتراضات کا جواب عرض کیا گیا ہے۔

:تحریر:

حکیم عبدالرحمٰن خلیق

نام کتاب :۔۔۔۔ امیر المومنین معاویہؓ (حصہ دوم)

نام مصنف :۔۔۔۔ مولانا حکیم عبدالرحمٰن خلیق - بدوملہی

تعداد :۔۔۔۔ ۱۱۰۰

ناشر :۔۔۔۔ دارالکتب رحمانیہ بدوملہی ضلع سیالکوٹ

مطبع :۔۔۔۔

کتابت :۔۔۔۔ نذیر احمد خوشنویس، لاہور

تاریخ اشاعت :۔۔۔۔ سنہ ۱۴۰۹ھ سنہ ۱۹۸۹ء

قیمت :۔۔۔۔ ۹۰ روپے

فہرس

امیرالمومنین معاویہؓ حصہ دوم

باب اوّل

باب دوم

فصل اول ـــــ مولانا مودودی کی "خلافت و ملوکیت"

فصل دوم ــــــ سوئے منزل ۱۳۰

باب چہارم

بابِ پنجم ——— مغالطات ۶۵۵

عذر و تاسّف

اب جبکہ یہ کتاب قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے، افسوس ہے کہ اس کتاب کے بلاواسطہ مخاطب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔

میری بڑی خواہش تھی کہ میں اس کتاب کو جلد شائع کر کے اُن کی خدمت میں پیش کر سکوں مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ ہوا۔ یہ کتاب اُن کی زندگی میں ہی لکھی جا چکی تھی مگر ابھی یہ نظر ثانی کے مرحلہ میں تھی کہ مولانا کا انتقال ہوگیا۔

اس کی اشاعت میں عجلت کا یہ اہم سبب جب موجود نہ رہ سکا تو اس کی اشاعت میں تاخیر و تعویق بھی دل کا بوجھ نہ رہ سکی۔

اس کی اشاعت میں تعویق کا ایک بڑا سبب اس کے حصہ اوّل کی اشاعت کا اہتمام بھی تھا جو دراصل پیش نظر کتاب کا زینہ ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے لیے زینہ کی تعمیر پہلے ہی مناسب تھی۔

بہرحال جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا اس کی اشاعت کا مرحلہ بھی آگیا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اخص اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف مولانا کی پھیلائی ہوئی زہر کو دور کر سکے گی۔ انشاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ میری اس حقیر سعی کو شرف قبول سے نوازیں اور اس کو مفید خلائق بنا دیں۔ آمین۔

فقیر
عبدالرحمٰن خلیق

تمہیدی بات

کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کُشتنی ہے
الٰہی! اس کے شور ہائے ذَنْبٍ قُتِلْتِنی ہے
کہ آج کوچہ میں اس کے شور ہائے ذَنْبٍ قُتِلَتْ ہے

زیر نظر کتاب "امیر المؤمنین معاویہ رضؓ"، کا یہ حصّہ دوم دفاع صحابہ رضؓ کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور ہم نے اس کے ذریعہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر وارد کیے گئے اعتراضات اور ان پر لگائے گئے الزامات کی حقیقت واضح کرنے کی سعی کی ہے۔

حضرت معاویہ رضؓ کے کردار پر انگلی رکھنے والے لوگوں میں بہت سے بڑے لوگ بھی شامل ہیں اور جو بڑے نہیں ہیں اُن کا تو شمار ہی مشکل ہے۔ تاہم اگر ان پر وارد کیے گئے اعتراضات اور الزامات کے پس منظر کو سامنے رکھ لیا جائے تو ان ہجوم در ہجوم اعتراضات اور الزامات کا سبب سمجھ لینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

امیر المؤمنین معاویہ رضؓ کے خلاف اُن کے مخالفین اور معاندین نے جس پس منظر کو تخلیق دے کر اُن پر تنقید کی طرح ڈالی ہے۔ یقیناً وہ پس منظر بڑے بڑے اہل فکر و نظر کی ٹھوکر کا باعث بن سکتا ہے اور ان حالات میں اچھے اچھے اہل علم و خبر لوگ بھی راہ بھٹک سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اخص رفقاء، محبوب ساتھیوں، قریبی دوستوں اور آپؐ کے اصحاب کبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف جب بھی اور جس زمانہ میں بھی کوئی قلم بے قابو ہوا ہے تو قلم کی اس آوارہ روی کا سبب وہ کبھی نہیں ہوتا جسے بیان کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان

بزرگوں کے خلاف قلم کی زہر چکانی کا اصل سبب واقعات کی بجائے وہ جذبات ہوتے ہیں جو قلمکار کو دو طرح سے مؤثر ہوتے ہیں۔

۱۔ قلمکار کا گروہی تعصّب، اس کا جماعتی مفاد اور مصالح۔

۲۔ نسب کی بڑائی کا عقیدہ اور اس بنیاد پر اُس کی نفسیاتی مرعوبیت اور مغلوبیت کا متوارث رجحان۔

اور ان دونوں صورتوں میں ہی صاحبِ قلم کے افکار جذبات کے ہی تابع ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جذبات کو آنکھیں نہیں بخشی گئیں بلکہ وہ ہمیشہ اندھے ہوتے ہیں۔

ہماری تاریخ میں گروہی متعصب راویوں کی دراز دستیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے اصحاب و انصار اور بعض امہات المؤمنینؓ کے بارے میں جو گستاخانہ رویّہ روا رکھا ہے تو اس کی وجہ بھی وہی گروہی تعصّب اور جماعتی تشدّد و تصلّب ہی ہے جس نے نسلی تفاخر اور نسبی برتری کے جاہلی عقیدہ کے دُودھ پر پرورش پائی تھی۔

یہ پوری کہانی اپنے ہر رخ سے جذبات کی ہی پیداوار ہے اور از اوّل تا آخر جذبات کے گرد ہی گھومتی ہے، جہاں حقائق کا نہ گزر ہے اور نہ مقام نہ ایسا کوئی محل ہے نہ موقع، نہ طلب ہے نہ تمنّا، نہ ادھر کوئی توجہ ہے نہ تجسّس، نہ کسی ولالت کا موقع، نہ وکالت کا، نہ شہادت کا، نہ سماعت کا، نہ اس میں کوئی کشش ہے نہ جذب، نہ کسی کو اس کی ضرورت ہے نہ حاجت۔ یعنی جب جذبات کی بات ہو تو پھر وہاں کسی اور بات کا کوئی دخل نہیں ہوتا بس آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر جانب اور ہر سمت جذبات ہی ہوتے ہیں اور جذبات کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوتی۔ ہم اس کتاب کے حصہ اوّل کے پیش لفظ میں یہ عرض کر آئے ہیں کہ امیر المؤمنین معاویہ رضؓ

کی کمزوری دراصل یہ ہے کہ انہیں زندگی کی بساط پہ ایک ایسے مرحلہ سے گزرنا پڑا ہے جہاں انہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اختلاف کی مجبوری پیدا ہو گئی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو نازک رشتہ اور گہرا تعلق حاصل ہے، ظاہر ہے کہ اس کا ہر رخ جذبات سے ہی تعلق رکھتا ہے اور اس حال میں جس کسی کو بھی حضرت علی رضہ سے اختلاف ہوگا، خواہ وہ اختلاف کتنا بھی صحیح کیوں نہ ہو، کتنا بھی ضروری کیوں نہ ہو اور کتنا بھی حقیقی کیوں نہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن کے نازک رشتہ کی وجہ سے اُسے انصاف کے گز سے نہیں بلکہ جذبات کے گز سے ہی ناپا جائے گا اور جذبات کی ترازو ہی میں تولا جائے گا اور یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ واقعات اور جذبات کی جنگ میں غلبہ جذبات کو ہی ہوگا اور معاویہؓ اور علی رضہ کی لڑائی میں عام طور پہ حضرت علی رضہ کی بلا قصد و ارادہ حمایت کا اصل اور بڑا سبب یہی ہے، ورنہ حضرت معاویہؓ کا مقدمہ کمزور ہرگز نہیں تھا۔

اور واقعہ یہی ہے کہ امیر المؤمنین معاویہؓ کو خونِ عثمان رضہ کے قصاص کے سوال پہ اگر حضرت علی رضہ کے بجائے کسی دوسرے شخص سے معاملہ پڑتا تو تاریخ کا فیصلہ کچھ اور ہوتا۔

امام شعبیؒ کا کہنا ہے کہ ماکذب علی احد من ھٰذا الامۃ ما کذب علی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہؐ کہ جتنا زیادہ جھوٹ ہمارے ہاں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے بولا گیا ہے، اتنی بڑی مقدار میں جھوٹ اس امت میں کسی اور کے لیے نہیں بولا گیا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ امر حق ہی ہے کہ دامادِ رسولؐ سے اختلاف کے جرم میں گروہی

ؐ میزان الاعتدال حصہ اول صفحہ ۴۳۶

راویوں اور متعصب مورخین نے ایک سوچے سمجھے منصوبے سے ایک مہم کے بطور حسب تعداد اور حسب مقدار میں جھوٹ کہانیاں، غلط بیانیاں، دروغ بافیاں اور افترا پردازیاں تصنیف کر کے اور ترتیب دے کر حضرت معاویہؓ کے کھاتے میں ڈال دی ہیں، دنیا میں اتنی بڑی سازش کسی اور کے خلاف کہیں نہیں کی گئی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ سے خلفاء راشدینؓ کے بابرکت زمانہ تک جو تاریخی اہمیت حاصل تھی، متعصب مورخین اور گمراہی راویوں نے انہیں نہ صرف اس زمانہ میں حاصل شدہ ان کے تاریخی اور مسلمہ مقام سے محروم کر دیا ہے، بلکہ ان کی تاریخ کو خود ان کے اپنے زمانہ میں بھی اُن کے ہاتھ سے چھین لیا ہے۔ اُن کے تاریخی کارناموں کو یا تو حذف کر دیا گیا ہے اور اگر بیان کی مجبوری ہوئی تو انہیں اس طرح کم سے کمتر کر کے بیان کیا ہے کہ ان کی اہمیت ہی کھو ڈالی ہے۔

اس کتاب میں ہم نے امیر المومنین معاویہؓ پر لگائے گئے الزامات، اُن پر وار کیے گئے اعتراضات اور اُن کے خلاف تصنیف کردہ غلط کہانیاں کے جواب میں ناقدین کے حلقہ میں سے دورِ حاضر کے ایک عظیم قلمکار مصنف، مفسر اور مورخ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تصنیف "خلافت و ملوکیت"، کو سامنے رکھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے علم و نظر کی حد تک اصحابِ رسول ﷺ کے مخالفین کی وکالت اور حمایت میں اس کتاب کے گرامی قدر مصنف نے جس جوش و جذبہ، جس اخلاص اور جس محنت سے بطور ایک مہم کے اس کام کو انجام دیا ہے۔ اسلام کی گذشتہ پوری تاریخ میں کبھی اور کسی بھی مرحلہ پر کسی بھی شخص یا ادارہ کی طرف سے اس تن دہی، اس اہتمام، اس اعتماد اور اس عزم سے یہ

کام نہیں کیا گیا۔ مولانا کی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ اس عنوان سے ایک منفرد کتاب ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ دفاع صحابہؓ کی غرض سے کام کرنے والے لوگوں کو مولانا کا مشکور رہنا چاہیے کہ انہوں نے ایسے لوگوں کو صدہا کتب کے مطالعہ اور ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کی مشقت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کی موجودگی میں اصحاب دشمن مآخذ میں سے کسی دوسرے ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عبدالرحمن خلیق

مقدمہ

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روشن تاریخ اس کتاب کے حصّہ اوّل کی صورت میں ہمارے قارئین ملاحظہ کر چکے ہیں اور جیسا کہ ہم نے حصّہ اوّل کے پیش لفظ میں عرض کیا تھا، امیر المومنین معاویہ رض ایک عظیم مسلمان فاتح اور تاریخ اسلام کے عظیم محسن ہونے کی وجہ سے اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ہاں نہایت ہی بلند مرتبہ پہ فائز ہیں اور حق یہی ہے کہ ان کی قابلِ فخر تاریخ کی روشنی میں اُن کے بارے میں کوئی بھی سچا مسلمان بُرے خیالات نہیں رکھ سکتا۔

امیر المومنین معاویہ رض سے محبت ٹھیک ویسے ہی ایمان کا حصّہ ہے جس طرح کسی بھی صحابیٔ رسول ؐ کی محبت ایمان کا حصّہ ہو سکتی ہے اور حضرت معاویہ رض ٹھیک اسی سطح پر اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ کے شرف سے مشرف ہیں جس طرح دوسرے اصحابِ رسول ؐ کو یہ شرف حاصل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے بعض مشہور مورخین نے بھی بعض نسلی، طبقاتی اور جذباتی وجوہ سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بہت سا زور حضرت معاویہ رض اور اُن سے بعض اخص اصحاب کے خلاف صرف کر رکھا ہے۔ تاہم تاریخ کا گہرا اور غیر جانبدارانہ مطالعہ رکھنے والا ہر فہیم شخص بادنیٰ تامل ہی اس نتیجہ پہ پہنچ جاتا ہے کہ اس مخالفانہ جمع و ترتیب میں تاریخی واقعات کے بجائے بہت سے دوسرے داخلی اور خارجی عوامل جمع ہو گئے ہیں۔

ہم یقیناً حضرت معاویہ رض کو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے اور نہ ہم اس بات کے ہی قائل ہیں کہ اُن سے کسی سہو و خطا کا صدور ممکن نہیں ہے۔

یقیناً اُن سے وہ ساری ہی کوتاہیاں ممکن ہیں جو انسان ہونے کے ناتے سے کسی بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے انسان سے بھی واقع ہو سکتی ہیں۔ تاہم حضرت معاویہ رضؓ کے بارے میں بھی ہم متعصب راویوں کی شطحیات کو بالکل ویسے ہی درست نہیں سمجھتے جیسے ہم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں اُن کی ذات سے کسی ناہموار واہی روایت کو درست تسلیم نہیں کرتے۔

حضرت علی رضؓ کے متعلق تاریخ میں ایسی بے شمار لغو روایات بھری پڑی ہیں جن کا انتساب کوئی بھی شریف آدمی اپنی طرف پسند نہیں کرے گا چہ جائیکہ ہم انہیں علی رضؓ جیسے بزرگ صحابی اور پاکباز انسان کے بارے میں مدارِ یقین بنالیں۔ ہم حضرت علی رضؓ کی صرف اُنہی بشری کوتاہیوں تک ہی ایمان رکھتے ہیں جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں اور صرف ایسی تاریخی روایات کو معتبر مانتے ہیں جو صحیح احادیث کے مندرجات کے تابع ہوں اور ہم اصحابِ رسول ؐ کے بارے میں اس معیار کو کتاب و سنت سے منصوص ہونے کی وجہ سے حجت مانتے ہیں۔

اس معیار کی روشنی میں جب ہم حضرت معاویہ رضؓ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہ رضؓ سے سخت زیادتی ہوئی ہے اور وہ فی الواقع ہی تاریخ کی مظلوم ترین شخصیت ہیں اور ان کا استخفاف ایک منظم سازش اور سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت عمل میں آیا ہے۔

قلم اگر خباست پہ اُتر آئے تو اُس کے زہر کا کوئی توڑ نہیں ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس دَور میں قلم کی خباثت اپنے شباب کو چھو رہی ہے اور اُس نے جس بے دردی اور بے انصافی سے معاویہ رضؓ اور اصحابِ معاویہ رضؓ کو اپنی نشتر زنی اور زہر چکانی کا ہدف بنایا ہے، تاریخ میں اس کی مثال

مشکل سے ہی حل ہو سکے گی۔ اصحاب رسولؐ کا مسئلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلہ سے کچھ زیادہ متغایر نہیں تھا اور حضور علیہ السلام نے ما انا علیہ واصحابی کے ارشاد سے اس ذہن کی کھلی نشاندہی بھی فرمادی تھی، مگر مقام قلق ہے کہ اس دور میں ہماری تاریخ کے اکثر ہی راوی روایت کے مرحلہ پہ اپنے دامانِ فکر کی پاکیزگی، غیر جانبداری اور انصاف پسندی کو کذب و افترا کی پلیدی، جانبداری اور بے انصافی سے بچا نہیں سکے۔

اس دور میں بہت سے ایسے غیرے باتونی اور مسخرے لوگ راویوں کی شکل میں برساتی کیڑوں کی طرح باہر نکل آئے ہیں اور انہوں نے قلم کی عصمت کو رنڈی کا بالاخانہ بنا دیا ہے اور انہوں نے اپنی زندگی کے دوسرے بے شمار مسائل کی سطح پہ اس مسئلہ کے تقدس کو بھی بُری طرح پامال کیا ہے۔

قرآن کریم نے جس سختی سے فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى پر عمل پیرا ہو کر رہنے کی تاکید فرمائی تھی، اُنہوں نے اُتنی ہی شدت سے اس کے خلاف سوچا ہے اور خلاف ہی عمل کیا ہے۔ اُنہیں جس گناہ سے سختی کے ساتھ نفرت دلائی گئی تھی، اُنہوں نے اتنی ہی رغبت اور گرمجوشی سے اپنے فکر و عمل کی ساری دلچسپیاں اس گناہ کے ساتھ وابستہ کر دی ہیں۔

حیاتِ انسانی کے جبلّی مظاہر

اصل یہ ہے کہ آدمی کو ایک فطرت بخشی گئی ہے اور اس فطرت کے خالق نے اُسے آدمی کی بشریت سے ہموار رکھنے کے لیے اس کی خلقت کے اجزائے ترکیبی میں اچھائیاں اور برائیاں ساتھ ساتھ جمع کر دی ہیں تاکہ مخلوق اور خالق میں فرق قائم رہ سکے اور عبد اور معبود کے درمیان خطِ فاصل موجود رہے۔ مبادا یہ بندہ اپنی بندگی کی حدود کو پھاند کر خدائی کا شوق کرنے لگے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی فطرت اپنے جبلّی احوال و ظروف اور اعمال و اطوار کی روشنی میں سرتاسر اضداد کا اعجب العجائب مجموعہ ہے اور فطرت کے اجزائے ترکیبی کے تجزیہ اور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تخلیقی ترکیب میں بے شمار علوی اور سفلی یا ملکوتی و طاغوتی عوامل اور محرکات شریک ہیں جن کی بیک وقت مختلف الاثر تاثیرات کی وجہ سے اس کا جبلّی وجود طرح طرح کی ہلاکتوں اور خطرناکیوں میں ہمیشہ محصور رہتا ہے۔

فطرت بیک وقت نرمی و گرمی، مہر و قہر، لطافت و شقاوت، عفو و انتقام، ایثار و خود غرضی، استقامت و بے صبری، فراخدلی و کم ظرفی، عدل و ظلم، انصاف و بے انصافی، درندگی و رحمدلی، حوصلہ مندی و بے حوصلگی، سنجیدگی و جذباتیت، شرافت و سفاہت، محبت و نفرت، تقویٰ و فسق، انکسار و استکبار، جانبداری و غیر جانبداری، رواداری و عصبیت جاہلیہ، بے غرضی و مطلب پرستی، فیاضی و بخل، یقین و بے یقینی، ایمان و نفاق، امید و قنوطیت، حسنِ فکر و

جہالت، ایفائے عہد و بدعہدی، متانت و جارحیت، حق و ناحق اور صدق و کذب وغیرہم بے شمار متضاد و متخالف عوامل و محرکات سے مرکّب ہے، اور یہ سب کے سب اُسے بیک وقت ہی موثر بھی رہتے ہیں۔

انسانی سیرت فطرت کے انہی عوامل کے دخل و عمل سے ترکیب پانے والے نتائج کے مظاہر کا نام ہے۔ اگر فطرت مستقیم ہوئی اور ان عوامل سے متاثر ہوئی جو فطرت کے علوی یا ملکوتی رُخ سے عبارت ہیں تو آدمی کی سیرت میں بھی اُنہی کے نقوش اُبھرتے ہیں اور اگر فطرت مائل بہ کجی ہوئی اور اُس نے فطرت کے سفلی تاریک اور گھناؤنے رُخ کو اپنا لیا اور ان عوامل و محرکات سے متاثر ہوئی جن سے شر و فساد کے چشمے پھوٹتے ہیں تو سیرت بھی انہی مظاہر کی امین ہوتی ہے۔

فطرت کی تخلیقی ترکیب میں ان دونوں قسم کے عوامل کی کارفرمائی کے اثر سے انسانی سیرت کے یہ دونوں پہلو انسانی تاریخ میں بھی ہمیشہ ہی موجود رہے ہیں۔

زندگی کی بساط پر انسانی جدوجہد کا رنگ و رُخ فطرت کے انہی موثرات کے تابع ہے اور انسانی سیرت میں حُسن و خوبی یا خساست و رذالت کا وجود انہی کی کارفرمائی سے ترتیب پاتا ہے اور انسانی تاریخ کے سارے ہی محاسن و معائب کی پوری تاریخ انہی عوامل کی کوکھ سے اُچھلی ہے۔

پس اگر آدمی اپنے فکر و عمل اور جہد و سعی کو فطرت کے اس رخ کی رہنمائی میں دے دے جس کا تعلق فطرت کے ملکوتی خصائص سے ہے تو پھر اس کی فکر کا ہر دائرہ اور اس کے قلم کا ہر نقش اُس کے صفحۂ حیات پر

ع "غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے"

کے سانچے میں ڈھل کر نکلتا ہے۔

لیکن اگر اُس کی فکر اُن عوامل سے رہنمائی کی طالب ہوئی جو فطرت کی تاریک راہوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں تو پھر اس کی فکر کا ہر دائرہ بے انصافی اور اُس کے قلم کا ہر نقش دھاندلی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور پھر جب تھوڑا سا آگے چل کر یہ تاریک عناصر و عوامل آدمی کے شعور کو مغلوب کر لیتے ہیں تو خود بے انصافی اور ناحق اندیشی ہی اس کی فطرت بن جاتی ہے اور تب وہ انصاف اور حق کو انتہائی بے دردی اور سنگدلی سے ذبح کر ڈالنے کے باوجود بھی اپنی فطری تاریکی کے زیرِ اثر اپنی اس سفّاکی سے نہ صرف کوئی اثر نہیں لیتا بلکہ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

ہماری تاریخ میں مشاجراتِ صحابہؓ کا دَور ہمارے بہت سے متعصب راویوں کی گروہی، نسلی، قبائلی، طبقاتی، علاقائی اور جماعتی عصبیت کے زیرِ اثر فطرت کے اس آخرالذکر رُخ کا ہی شکار رہا ہے۔ جبکہ گروہی اور جانبدار راویوں نے اپنے سے اختلاف رکھنے والے لوگوں کو بدنام کرنے کے لیے جی بھر کر جھوٹ بولا ہے اور تاریخ کے نام سے دھاندلیوں کی ایک طویل داستان تصنیف کر دی ہے۔ جس کی وجہ سے تاریخ کا یہ قابلِ فخر و ناز اور تابناک دور سامانِ ندامت اور سراسر غیر تاریخی دَور بن کر رہ گیا ہے۔ جبکہ اسلامی تاریخ کا یہ دور اپنی اصلی شکل و صورت میں تاریخ کا حسن اور اسلام کی سربلندی اور رعنائی کا دور ہے۔

اس پر مزید بدنصیبی یہ ہے کہ جو لوگ تاریخ کے اس دَور کی تصحیح کا ادّعا لے کر سامنے آئے ہیں، انہوں نے بھی اس دَور کو اپنے جذبات کے ہی تابع رکھا ہے اور پھر اس کے مطابق کہانیاں تصنیف کر کے اسے اس دَور کی حقیقی تاریخ کا نام دے دیا ہے، بلکہ الٹا یہ احسان بھی رکھا ہے کہ ہم نے تاریخ کے طالب علم کی مایوسی کو دُور کرنے کے لیے یہ مشقت قبول کی ہے۔ کیونکہ تاریخ کا تسلسل یہاں پہنچ کر ٹوٹ جاتا ہے اور پھر تاریخ کے طالب علم کے لیے معلوم

کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس دَور کی حقیقی تاریخ کیا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ وہ اگر اس تاریخ کو مرتب نہ کر دیتے تو اس دَور کی صحیح تاریخ کو جاننے کے لیے تاریخ کے شائقین اور طالب علم ہمیشہ مایوسی کا شکار رہتے۔

حالانکہ اس اسلوبِ نگارش سے تاریخ کے طالب علم کے بجائے اصل فائدہ ایک خاص گروہ کو ہی پہنچتا ہے جسے ہمارے ان اصحابِ ادعا اہلِ علم نے اپنے تاریخ ساز بزرگوں کے خلاف اُسی گروہ کی تصنیف کردہ جھوٹی کہانیاں اپنی تصدیق کے ساتھ پورے قرینہ سے جمع کر کے دے دی ہیں۔

دَورِ مشاجراتِ صحابہؓ

بات کو سمجھنے کے لیے پہلے بات کے اصل سبب کا تجسّس مناسب ہوگا کہ تاریخ میں یہ ابتری کیوں پیدا ہوئی اور اس کی بنیاد کیا ہے۔

یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اس سلسلہ کا سرِ فہرست مسئلہ مشاجراتِ صحابہؓ ہے اور یہی وہ دَور ہے جب مسلمانوں کے اندر اختلاف و فساد کی بنیاد اٹھی ہے جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ مسلمان ایک دوسرے سے یوں کٹ گئے کہ پھر پہلے کی طرح مل نہ سکے بلکہ تاریخ کی کتاب بھی تاریخ کے بجائے راوی کے دل کی بات بن کر رہ گئی۔

دَورِ مشاجراتِ صحابہؓ سے مراد اصحابِ رسول علیہ السلام کے باہمی جدال و قتال اور حرب و ضرب کا دَور ہے اور تاریخ اسلام کا یہ دَور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۂ ثالث کے خلاف بغاوت اور اُن کے قتلِ ناحق کے نتیجہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے انعقاد کے متصل ہی شروع ہو جاتا ہے۔

اس دور کی ابتدا اس بات سے ہوئی کہ خلیفۂ رسولؐ کے قتل ناحق پر مقتول خلیفہ کے خون کا قصاص لینے کا سوال اٹھ کھڑا ہوا اور ظاہر ہے کہ یہ ایک طبعی امر ہی تھا، مگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے سلطنتی مصالح سے اس قصاص طلبی کو بے وقت کہا اور قصاص کے مطالبہ کو مسترد کر دیا۔ آپ کا موقف یہ تھا کہ اس وقت باغیوں یعنی عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلوں کے غلبہ کی وجہ سے یہ قصاص ممکن نہیں ہے اور یہ کام کسی دوسرے مناسب موقع پر کیا جائے گا۔ جبکہ دوسرے بہت سے بزرگ اس قتل ناحق کا فوری قصاص لینے پر بضد تھے۔ اس پر بات بڑھ گئی، فریقین اپنے اپنے موقف پر اڑے رہے اور نوبت جنگ و پیکار تک پہنچ گئی۔

مشاجرات صحابہؓ کا یہ دور ۳۵ھ ہجری سے شروع ہوا ہے اور چونکہ اس جدال و قتال کی ابتدا صحابۂ رسولؐ کے وقت میں انہی کے ہاتھوں ہوئی تھی اس لیے اس کو مشاجرات صحابہؓ کا دور ہی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ پھر یہ مشاجرات دور صحابہؓ سے خاص نہیں رہ سکے تھے اور مسلمانوں کا یہ باہمی قتل و خون صحابہؓ کا دور گزر جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ یہاں تک کہ بنو عباس نے بنو اُمیہ پر غلبہ حاصل کر کے نہ صرف ان کی سلطنت بلکہ اُن کی سالمیت کا بھی خاتمہ کر دیا۔

تاہم اس دور کو اس کے نام کی حد تک حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مصالحت، حضرت حسنؓ کی طرف سے خلافت سے دستبرداری اور حضرت معاویہؓ کی خلافت کے انعقاد پر ختم سمجھنا چاہیے۔ مشاجرات صحابہؓ کے زیرِ عنوان ہماری تاریخ میں جو کچھ درج ہوا ہے اسے صحیح تاریخ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کی یہ ترقیم تاریخ کے نام سے

بنو عباس کی مملکتی ضرورتوں سے اُن کے دورِ حکومت کی قلمی دھاندلیوں، بے انصافیوں اور اُن کے فکری رجحان کی عبرت انگیز اور کذب بدوش سیاسی دستاویز ہے جسے بڑی ہی جدوجہد اور ایک طے شدہ منصوبہ کے ماتحت تاریخ بنایا گیا ہے اور واقعات کی جمع و ترتیب کی اس غیر واقعاتی کہانی کو، جو الف لیلائی کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے اور جو نسل در نسل تاریخ کے بطور نقل ہوتے آنے کی وجہ سے اب تاریخ ہی سمجھی جانے لگی ہے، "تاریخ کی حیثیت سے پیش کر دیا گیا ہے۔ اس کہانی کا پس منظر یہ ہے کہ جب بنو عباس نے بنو اُمیہ کے اقتدار کی صف لپیٹ دی تو اب ان غلط بیانیوں، افترا پردازیوں اور دروغ بافیوں کو، جن کو وہ بنو اُمیہ کے خلاف خروج کے دوران میں اہل ملک کے روبرو اچھالتے رہے تھے اور عوام مسلمانوں کو، جن کے ساتھ بنو اُمیہ کے خلاف گمراہ کرتے رہے تھے، ان کا جھوٹ کھل جانے کے خوف سے اس سب کچھ کو قانونی اور تاریخی بنانے کی ضرورت محسوس کی تاکہ وہ جہاں اپنے جھوٹ پر پردہ ڈال سکیں وہاں اُن لوگوں کو مستقبل میں بھی عوام مسلمانوں کا معتوب بنائے رکھیں اور اس طرح اپنی سلطنت کی بنیادوں کے استحکام کا سامان بھی مستقل طور پہ مہیا کر لیں۔

چنانچہ انہوں نے اپنے خصوصی اہتمام میں ان افترا پردازیوں، اختراعی داستانوں اور جھوٹی کہانیوں کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نام سے بہت سی نئی کہانیاں بھی تصنیف کرائیں اور پھر اپنے حکومتی ڈنڈے کے زور سے اسے تاریخ کے نام سے اپنے اہلِ ملک کے سپرد کر دیا۔

ان لوگوں نے تاریخ کے نام سے جن واقعات کو قلم و قرطاس کے حوالے کیا تھا ان پر اب نہ کسی کو اعتراض کا موقع تھا نہ ہمت۔ اعتراض

کا موقع اس لیے نہیں تھا کہ عباسی حکومت نے جن داستانوں کو تاریخ بنا کر اہل ملک کے حوالے کیا اور جن مخترعات کو واقعات کے نام سے شائع کیا اس پر اب ایک صدی گزر چکی تھی، اب ان واقعات کا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں تھا جو ان کو جھٹلا سکتا اور پھر اب جبکہ بنو عباس کے اقتدار کا طوطی بول رہا تھا، حکومت اُن کے ہاتھ میں تھی، ڈنڈا اُن کے قبضہ میں تھا، قانون ان کی مرضی کا نام تھا، ضابطہ اُن کی خواہش کو کہتے تھے کسی آدمی کا اس تاریخ کو جھٹلانا جسے حکومت نے تاریخ قرار دے دیا تھا، اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہی تھا۔ ایسے میں لوگوں نے بامر مجبوری اُسی ابتری اور دھاندلی کو تاریخ کے بطور سننا اور پڑھنا گوارا کر لیا، جسے حکومت تاریخ کہتی تھی اور جو تاریخ کے بطور ہی اُن کو مرتب کر کے دی گئی تھی۔ بلاشبہ اس دور میں بھی کچھ اہل حق نے اس صورت حال کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور قلم و قرطاس کے ایسے نقوش آج بھی مہیا ہیں جو اس دور ظلمت کے اندر روشنی کی شعاع کے بطور نمایاں ہیں مگر حکومت کے نقار خانے میں اُن کی آواز طوطی کی آواز بن کر ہی رہ گئی۔

اب ایک صورت باقی تھی کہ عباسی حکومت کے خلاف کوئی انقلاب برپا ہو جو اُس کو چلتا کرے اور پھر اس انقلاب کو برپا کرنے والے لوگ اگر اپنے دل میں خدا کا خوف رکھنے والے ہوں تو وہ صحیح واقعات پر مشتمل تاریخ کی ترقیم و تسوید کا اہتمام کریں، مگر ایسا نہ ہو سکا اور پھر کم و بیش پانچ سو برس تک یہی سیاسی دستاویز تاریخ بنی رہی اور اب جبکہ تاریخ کا قافلہ مزید تیرہ سو برس کا طویل فاصلہ طے کر چکا ہے، اس دھاندلی کے خلاف کچھ کہنا اور اسے جھٹلانے کی کوشش کرنا، سوائے تعجب سے سننے اور حیرت سے دیکھنے کے کوئی اثر

پیدا نہیں کرتا۔

مگر یہاں ہمیں مشاجرات صحابہ رضؓ کے نام سے بیان کردہ تاریخی واقعات کو جرح و تعدیل کی چھلنی میں چھاننا اور اُن کے صدق و کذب پر بحث کرنا مطلوب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بحث اس کتاب میں اپنے موقع و محل پر جگہ بجگہ موجود ہے۔ یہاں ہمیں صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ اس دور کی تاریخ پر بطور ایک تاریخی حقیقت کے بھروسہ کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ تاریخ کے نام سے یہ غیر تاریخی اور اختراعی باتیں، گروہی، قبائلی اور نسلی عصبیتوں کی کوکھ سے اچھلی ہیں اور ان میں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ صرف ایک خاندان کی اپنے حریف خاندان کے خلاف معاندانہ جذبات کی عکاسی ہی ہے اور اس تاریخی داستان میں درج کردہ واقعات کا اکثر حصہ سطح ارض پر گزرنے والے واقعات پر مشتمل ہونے کے بجائے اندر سے اچھلنے والے جذباتِ معاندت کی زمین پر استوار ہوا ہے۔ ورنہ بنو اُمیہ کا دورِ حکومت اسلام اور مسلمانوں کے لیے برکات و حسنات کی اتنی کثیر مقدار اپنے اندر سموئے ہوئے ہے کہ اس پر فخر کیا جا سکے۔

مسلمانوں کی کشور کشائی اور شوکت اسلامی کے وہ اُجلے نقوش جو اس دورِ حکومت نے اپنی یادگار کے بطور چھوڑے ہیں۔ اس کی مثال اس دور کے بعد پھر کہیں نہیں پائی گئی اور کبھی نہیں پائی گئی۔ مگر بدنصیبی سے اس دور کی تاریخ لکھنے کا کام جن لوگوں کے سپرد ہوا وہ مورخ نہیں بلکہ اہلِ سیاست تھے۔ پھر اس سیاست کاری نے اس دور کی تاریخ سے کتنا کچھ انصاف روا رکھا ہوگا، اس کا اندازہ آپ بنو اُمیہ کے خلاف بنو عباس کے مزاج کی سطح اور ان کے جذباتِ عناد و خصومت کی مقدار کو معلوم کر کے باآسانی کر سکتے ہیں۔ ہم اس غرض سے اپنے

قارئین کو "خلافت وملوکیت" کے مصنف علامہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے مطالعہ تاریخ سے استفادہ کی دعوت دیتے ہیں۔ اسے ہم اس کتاب کے حصہ اوّل کے پیش لفظ میں نقل کر آئے ہیں مگر بحث کو قریب سے سمجھنے کے لیے اسے ایک بار پھر یہاں درج کرتے ہیں۔ مولانا موصوف رقمطراز ہیں:

"بنو اُمیہ کے دار السلطنت دمشق کو فتح کر کے عباسی فوجوں نے وہاں قتل عام کیا جس میں ۵۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ ۷۰ دن تک جامع بنی اُمیہ گھوڑوں کا اصطبل بنی رہی۔ حضرت معاویہؓ سمیت تمام بنی امیہ کی قبریں کھود ڈالی گئیں۔ ہشام بن عبدالملک کی لاش قبر میں صحیح سلامت مل گئی تو اس کو کوڑوں سے پیٹا گیا۔ چند روز تک اُسے منظر عام پر لٹکائے رکھا گیا اور پھر جلا کر اُس کی راکھ اُڑا دی گئی۔

بنی اُمیہ کا بچہ بچہ قتل کیا گیا اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر فرش بچھا کر کھانا کھایا گیا۔

بصرے میں بنی اُمیّہ کو قتل کر کے اُن کی لاشیں ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچی گئیں اور اُنہیں سڑکوں پر ڈال دیا گیا، جہاں کتّے اُنہیں بھنبوڑتے رہے۔ یہی کچھ مکّے اور مدینے میں بھی ان کے ساتھ کیا گیا۔ سفّاح کے خلاف موصل میں بغاوت ہوئی تو اس نے اپنے بھائی یحیٰ کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ یحیٰ نے اعلان کیا کہ جو شہر کی جامع مسجد میں داخل ہو جائے گا اس کے لیے امان ہے۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں وہاں جمع ہو گئے۔ پھر مسجد کے دروازوں پہ پہرہ لگا کر ان امان یافتہ پناہ گزینوں کا قتل عام کیا گیا اور گیارہ ہزار آدمی مار

ڈالے گئے۔
رات کو یحیٰ نے اُن عورتوں کی آہ و بکا کا شور سُنا جن کے مرد مارے گئے تھے۔ اُس نے حکم دیا کہ کل عورتوں اور بچوں کی باری ہے۔ اس طرح تین دن موصل میں قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ جس میں عورت، مرد، بچہ، بوڑھا کوئی معاف نہ کیا گیا۔
یحییٰ کی فوج میں چار ہزار زنگی تھے، وہ موصل کی عورتوں پر لوٹ پڑے اور زنا بالجبر کا طوفان برپا کر دیا۔"[1]
ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ اس دور کے مورخین جن کے سر پر ایک درندہ حکومت کے نسلی تفاخر اور قبائلی عصبیت کی تلوار لٹک رہی تھی، جس کی آستینوں سے ابھی تک انسانی خون کے قطرے ٹپک رہے تھے، وہ اس کی خون آشام تلوار اور اس کے سفاک حکام کے زیر سایہ اس حکومت کے حریف فریق سے کچھ بھی انصاف کر سکیں گے اور پھر جو تاریخ ایسے مجبور یا متعصب قلم سے لکھی جائے گی، وہ فی الواقع بھی تاریخ کا مرتبہ ہی رکھتی ہو گی اور اس تاریخ میں وہی واقعات ہی قلمبند کیے گئے ہوں گے جو فی الواقع خارج میں گذرے بھی ہوں گے یا ٹھیک اسی طرح گذرے ہوں گے جس طرح وہ قلمبند کیے گئے یا انہیں قلمبند کرنے کی اجازت دی گئی۔ آخر جو تاریخ کسی اقتدار اعلیٰ کی اجازت یا اس کی صوابدید یا اس کی منشا سے لکھی جائے گی، اسے کوئی کیونکر تاریخ کہے گا۔
بلاشبہ اس دور کے کچھ اہلِ حق اس صورتِ حال سے نالاں بھی

---

[1] خلافت وملوکیت، صفحہ ۱۹۲-۱۹۳

تھے اور اس پر وقف احتجاج بھی ہوئے تھے اور جیسا کہ ہم عرض کر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی ہمت کے مطابق کچھ کام بھی کیا مگر ماحول میں حد نگاہ تک پھیلی ہوئی بے بسی کے حصار میں اُن سے کچھ بن نہ پڑا، اُن کی ہمتیں لوٹ گئیں، ان کے عزائم فسخ ہو گئے۔ وہ بہت کچھ کہنے اور لکھنے کی خواہش کے باوجود اپنے عزم کے مطابق کام نہ کر سکے۔ زبان پہ پہرے تھے، قلم پہ قدغن تھی، زبانیں گنگ تھیں، قلم شکستہ تھے اور سلطنت عباسیہ کی ستم کاریوں اور ظالمانہ کارروائیوں کی موجودگی میں کسی کو دم مارنے کی ہمت نہیں تھی۔ اگر کسی زبان پہ کلمہ حق اچھل آیا تو زبان کاٹ دی گئی۔ قلم نے اگر قرطاس پہ کوئی نقش چھوڑا تو قلم توڑ دیا گیا اور قلمکار کے ہاتھ تیغ ستم کی نذر ہو گئے۔ اس ماحول میں تاریخ کیا اور تاریخ نویسی کیا؟۔

پس تاریخ کے بطور اب جو کچھ بھی ہے وہ بنو عباس کی وراثت ہی ہے اور اب اُس زمانہ کی یہی تاریخ ہے اور اگلی کہانی اسی تاریخ سے چلتی ہے اور اس کی بنیاد اسی پر رکھی گئی ہے۔ اب خواہ کوئی کچھ کہے امر واقعہ یہی ہے کہ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج

تا ثریا می رود دیوار کج

اس دَور کے اکثر راوی کتنے جھوٹے اور مفتری تھے اور پھر اپنے جھوٹ اور افترا کو نباہنے میں کتنے پھوہڑ اور بے شعور تھے۔ اس کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہم اپنے قارئین کو مدینہ منورہ سے متعلق واقعہ حرّہ کی مبینہ کہانی سے دکھاتے ہیں۔

اس واقعہ کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بھی اپنے ہاں نقل کیا ہے اور اس کو بڑی ہی اہمیت دی ہے اور اگرچہ مولانا نے

اس کی بہت سی تفصیلات کو جھوٹ اور افسانہ سمجھ کر ترک بھی کر دیا ہے مگر اُنہوں نے اس کی جس قدر بھی تفصیل دی ہے معلوم نہیں وہ اُسے بھی کس پیمانے سے صحیح سمجھتے ہوں گے۔ تاہم اس واقعہ کو جتنا اچھالا گیا اور اس کے ذریعہ سے دوسروں کو بدنام کرنے کی جو سعی کی گئی ہے، اس کی نامعقولیت اس واقعہ کی مبیّنہ تفصیل کو دیکھ کر ہر معقول قاری پر خود ہی واضح ہو جاتی ہے۔

ہم اس واقعہ کی تھوڑی سی تفصیل حضرت علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب "تاریخ الخلفاء" سے اپنے قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ علامہ موصوف رقمطراز ہیں:

جانتے ہو واقعہ حرّہ کیا ہے؟ اس کی کیفیت حسن بصریؒ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اہلِ مدینہ میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں رہا تھا جو اس (یزید کے بھیجے ہوئے) لشکر سے پناہ میں رہا ہو۔ ہزاروں صحابیؓ شہید ہوئے، مدینہ شریف لوٹ لیا گیا، ایک ہزار کنواری لڑکیوں سے کمبخت لشکریوں نے زنا کیا۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون ہ

واقدی نے عبداللہ بن حنظلہ الغسیلؓ سے روایت کی ہے کہ ہم نے جب تک یزید سے بغاوت نہیں کی ہمیں یقین نہیں ہوا کہ آسمان سے اب پتھر برس جائیں گے، سخت تعجب ہے کہ لوگ اپنی ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں سے نکاح کریں اور کھلم کھلا شراب پییں اور نمازیں چھوڑ دیں۔[1]

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

یزید کے حکم کے مطابق تین دن کے لیے فوج کو اجازت دیدی

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطیؒ، صفحہ ۲۳۱-۲۳۲

گئی کہ شہر میں جو کچھ چاہے کرے۔ ان تین دنوں میں شہر کے اندر ہر
طرف لوٹ مار کی گئی، شہر کے باشندوں کا قتل عام کیا گیا، جس میں امام
زہریؒ کی روایت کے مطابق سات سو معززین اور دس ہزار کے قریب
عوام مارے گئے اور غضب یہ ہے کہ وحشی فوجیوں نے گھروں
میں گھس گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی۔ حافظ ابن کثیر
کہتے ہیں کہ: حتی قیل انہ حبلت الف امرأة فی تلک الایام
من غیر زوج۔

کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہو گئیں۔[1]

اب فرمایئے جو روایت قِیْلَ (کہا جاتا ہے) کے مجہول صیغے سے
شروع ہو جس کے نہ بتانے والے کا پتہ ہو نہ دیکھنے والے کا علم،
اسے روایت کہہ کر نقل کرنا اپنے علم و خبر، فکر و نظر اور عقل و خرد
کی بے وقری کے ساتھ ساتھ فن تاریخ اور تاریخ دونوں سے ایک
ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے!

حضرت علامہ سیوطیؒ تو خیر روایات کو لینے اور نقل کرنے میں کبھی
محتاط نہیں رہے لیکن مولانا مودودی پر تعجب ہے کہ اُن جیسے چھان کر
پینے والے لوگ بھی اس روایت کو بنیاد گفتگو بنائیں جسے وہ خود
بھی بصیغۂ مجہول ہی ذکر کرتے ہیں اور یہ کتنی بڑی زیادتی ہے کہ وہ
ایک مجہول الاسم راوی کی روایت پر مسلمانوں کی باہمی جنگ کے ایک
فریق کو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور سارے جہانوں کی لعنت کا محل
قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ انہیں علم ہے کہ مدینہ پر حملہ آور لشکر نے مدینہ
کے آداب اور اس کے تقدس کی پامالی کے خوف سے ہی اہل مدینہ

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۸۲

کو بغاوت کی راہ ترک کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دی تھی اور جب باغیوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار ہی کر دیا تو ان پر حملہ کے بغیر چارہ نہ رہ سکا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا مولانا کو خود بھی اعتراف ہے۔[۱]

پھر ایک ہزار عورتوں کی گنتی، جن کی ردائے آبرو کو چاک کیا گیا بھی بڑی عجیب بات ہے۔ آخر یہ بات کیونکر معلوم ہو سکی کہ جن عورتوں کی عصمت دری ہوئی، اُن کی تعداد ٹھیک ایک ہزار ہی تھی نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔

اور پھر مولانا مودودی صاحب نے تو کسی تخصیص کے بغیر اس بات کو عورتوں کے الفاظ تک ہی محدود رکھا ہے مگر علامہ سیوطی نے اس عصمت دری کو کنواری لڑکیوں سے خاص قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک وحشی فوجی پہلے اس بدنصیب عورت کی یہ تشخیص کرتے تھے کہ یہ کنواری ہے یا بیاہی ہوئی ہے۔ پھر اگر وہ اسے کنواری پاتے تو اُن کی خباثت اگلا قدم اٹھاتی، ورنہ شاید اُسے چھوڑ دیتے ہوں گے۔ یا پھر شادی شدہ عورتوں کی بے حرمتی اس کے علاوہ ہو گی۔ پھر علامہ سیوطی رح کی روایت کے بموجب تو وحشی فوجیوں نے صرف ایک ہزار کنواری بچیوں سے زنا ہی کیا ہے مگر مولانا نے جس روایت کو قبول فرمایا ہے اس کے بموجب ایک ہزار عورتیں اس ظلم کے نتیجہ میں حاملہ ہوئی تھیں۔ گویا وہاں کوئی محکمہ کھولا گیا تھا جس نے بعد میں تحقیق کر کے ان ہزار کی ہزار ہی حرام کی مدخولہ عورتوں کو حاملہ پایا۔ پھر مولانا کے نزدیک تو تین روز تک کے لگاتار قتل عام کے نتیجہ میں بارہ ہزار حملہ آوروں کی

---

[۱] خلافت و ملوکیت، صفحہ ۱۸۱ سطر آخر و صفحہ ۱۸۲ سطر اول۔

گئے تھے، مگر علامہ سیوطی رح ہزار ہا صحابیوں رض کے قتل کی خبر لائے ہیں جبکہ مدینہ میں اصحاب رسول ص کی تعداد نہایت ہی محدود رہ گئی تھی اور صحابہ رض کا کوئی ہجوم وہاں سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔

علامہ ابن خلدون کی روایت ہے کہ

اس قتل عام میں قریش اور انصار کے تین سو چھ آدمی اور باقی سب شہری اور قبائلی ملا کر چھ سو بارہ کے قریب قتل ہوئے تھے[1] معلوم ہوتا ہے کہ عباسیہ کے تاریخ نویسوں نے اس قتل و خون کے ذکر سے موصل کے اس قتل و خون کے لیے گنجائش پیدا کی ہے جو سفاح کے دور حکومت میں اس کے بھائی یحیٰی کی زیر کمان موصل کی جامع مسجد کے اندر کیا گیا تھا اور ایک ہزار عورت کے ساتھ زنا کی روایت تخلیق کر کے تاریخ کے اس واقعہ کا جواب پیدا کیا ہے جو موصل کے اندر یحیٰی کے حبشی سپاہیوں کی درندگی کے نتیجہ میں سامنے آیا تھا۔ ورنہ جہاں تک زنا کاری کے اس طوفان کا تعلق ہے، محتاط تاریخ نویسوں کو ایسے کسی واقعہ کی خبر نہیں ملی۔ علامہ ابن خلدون نے ان واقعات کی پوری تفصیل قلمبند کی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ انہیں حملہ آور لشکر کا کوئی سپاہی اس حرامکاری میں مصروف نظر نہیں آیا۔

کہا گیا ہے کہ اس حملہ میں مدینہ کے کسی آدمی کو پناہ حاصل نہیں تھی حالانکہ اس کا جھوٹ اس امر سے ہی ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ کے اندر حضرت حسین رض کے فرزند زین العابدین رض بھی رہائش پذیر تھے۔ مگر انہیں ان کے اہل خانہ اور اعوان و انصار سمیت کسی بھی تکلیف کا سامنا نہیں

---

[1] تاریخ ابن خلدون حصہ دوم، صفحہ ۱۳۹

ہوا، وہ اس بغاوت میں شریک بھی نہیں ہوئے تھے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اس بغاوت کو ناجائز اور ناروا بھی کہتے تھے۔ انہیں اپنے ساتھ ملانے کے لیے باغیوں نے بہت کوشش کی مگر وہ ان سے ہموار نہ ہو سکے۔ ہمیں یہاں یزید کا دفاع مطلوب نہیں بلکہ بطور اظہار واقعہ کے ہی گزارش ہے کہ انہیں یزید کے خلاف آمادہ کرنے کے لیے پورا زور صرف کیا گیا، یزید کی برائی بیان کی گئی۔ اس کے بے نماز ہونے اور شرابی ہونے کے قصے سنائے گئے، مگر انہوں نے ان سب قصوں کو جھوٹ بتایا اور فرمایا کہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ یزید ایک نمازی، پرہیزگار اور متبع سنت آدمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے نزدیک اس کے خلاف خروج جائز نہیں ہے[1] اور مجھے آپ لوگ اس کے خلاف استعمال نہیں کر سکتے۔

چنانچہ وہ اس لڑائی میں یزید کے حامی رہے اور مدینہ کے حالات سے اسے مطلع بھی کرتے رہے[2]۔ اس صورت حال میں ان روایات کو یزید سے عناد یا بنوامیہ دشمنی کے بجز اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

تعجب ہے کہ اس جنگ کا یہ پہلو جس میں حملہ آوروں کی صفائی کا بڑا حصہ شامل ہے، مولانا کی نگاہ سے بھی اوجھل رہا اور حضرت سیوطی رح بھی اس سے پہلو بچا کر ہی نکل گئے ہیں۔

روایت میں جو ماؤں بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کا ذکر آیا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات وہاں موجود ہوتی تو یقیناً حضرت زین العابدین رض ابن حسین رض بن علی رض یزید کا ذکر کرتے ہوئے صلی اللہ امیر المومنین یزید کا جملہ ادا نہ فرماتے اور مسلمان یقیناً ایسے بے غیرت نہ تھے کہ ایسے امیر

---

[1] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۸ ص ۲۳۲ - [2] الامارۃ والسیاسۃ جلد ا صفحہ ۲۱۸ طبقات ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۲، بلاذری جلد ۴ صفحہ ۳۹

کو برداشت کرتے۔ ظاہر ہے کہ کذاب راویوں کے اس ٹھوہڑ ین
نے از خود ہی اپنی روایت کی صحت کو دریا بُرد کر دیا ہے۔ ان
روایتوں کے اصلی خالق کا نام اگرچہ مولانا مودودی صاحب نے
نہیں لیا مگر حضرت سیوطی کے قلم سے ان بزرگوار کا ذکر آگیا ہے۔
جب اُنہوں نے فرمایا کہ:

"واقدی نے عبداللہ بن حنظلہ سے روایت کی ہے ....
ذکر یزید کے عہد میں) لوگ ماؤں، بہنوں، بیٹیوں سے
نکاح کر لیتے تھے"

اور یہ واقدی وہ بزرگ ہیں جن کو اصحاب اسماء الرجال نے
کذّاب کہا ہے اور لکھا ہے کہ وہ روایات خود اختراع کرتے ہیں۔
اور یہاں جو ان واقدی کے متعلق ذکر ہوا ہے کہ انہوں نے عبداللہ
بن حنظلہ سے روایت کی ہے تو اس کا جھوٹ اس سے ہی ظاہر ہے
واقدی تو کیا ان کے دادا نے بھی ابن حنظلہ کو نہیں پایا۔

واقدی بنو عباس کے درباری وظیفہ خور اور تنخواہ دار مورخ
تھے اور جو کچھ لکھتے تھے اپنے آقایانِ ولی نعمت کی منظوری سے اور ان کی
خوشی کے لئے لکھتے تھے۔

یہ تو ایک واقعہ کے بارے میں افترا پردازی تھی۔ ہم آپ کو دو
روایات ایسی بھی پیش کرتے ہیں جو چوری اور سینہ زوری کی بدترین
مثال ہیں اور جن کو سُن کر کوئی بھی معقول آدمی ان کی تصدیق نہیں
کر سکتا۔

عمروؓ بن العاص ایک روز تنہائی میں حضرت معاویہؓ سے ملے اور
کہا بڑا تعجب ہے کہ میں تمہاری حمایت پر آمادہ ہوں اور تو مجھ سے مُنہ
پھیر رہا ہے۔ خدا کی قسم اگر ہم تمہارے ساتھ مل کر عثمانؓ کے خون کے

قصاص کا مطالبہ کریں تو ہمیں اُس شخص کے ساتھ جنگ کرنا ہوگی جس کی سبقت اسلام قرابت رسولؐ اور فضیلت سے خود تو بھی واقف ہے لیکن ہم نے دنیا کو اختیار کر لیا ہے۔ یہ سُن کر معاویہؓ نے ان سے صلح کر لی [۱]

اب کوئی غیر معقول آدمی ہی اس بات پر ایمان لائے گا کہ حضرت عمروؓ بن العاص نے یہ بات کہی ہوگی کہ ہم نے دنیا کو اختیار کر لیا ہے اور عاقبت کو فراموش کر دیا ہے اور راوی نے یہ بات اُن کے مُنہ سے اتنی سنجیدگی سے اور اعتماد سے بیان کی ہے جیسے اُس نے یہ بات اپنے کانوں سُنی ہو اور وہ اس مجلس میں موجود تھا جہاں یہ بات ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس بات کو ماننے کے لئے غیر معقول ہی نہیں بلکہ احمق بننا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ امر ہرگز قابل فہم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسا صحابی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخص اصحاب میں جگہ دے رکھی تھی اور جس پر وہ ہمیشہ خوش رہے اور خوش ہی رخصت ہوئے۔ وہ عاقبت کے مقابلہ میں دنیا کو یوں پورے ارادے سے اختیار کرے گا اور ایک امر کو ناحق جان کر بھی اس پر عمل پیرا ہوگا۔ مگر راوی کو ایک ہی بات مطلوب تھی کہ عمروؓ کو بدنام کیا جائے اور اُسے بے وقعت ثابت کیا جائے۔ اُسے اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس طرح عمروؓ تو بدنام کیا ہوگا خود اس کی اپنی عقل اور اس کے اپنے شعور کی لاش روایت کے کفن میں لپٹی صاف نظر آرہی ہے۔

مگر یہاں بڑے بڑے قیمتی جواہر پارے چھپے پڑے ہیں اس ایک پرہی

---

[۱] طبری جلد ۳ باب ۱۰۔

بس نہیں ہم آپ کو اس سے بھی بڑھ کر روایت گردی کی ایک احمقانہ مثال سناتے ہیں۔ ذرا پڑھیے اور کہنے والوں اور ماننے والوں کی حماقت کی داد دیجیے۔

یزید بن معاویہؓ کی وفات کے بعد اُن کے فرزند معاویہؓ بن یزید تخت نشین ہوئے اور تخت نشین ہو کر انہوں نے جو خطبہ دیا اس کا ایک حصہ ہمارے عقلِ کل راوی کی زبانی سنئے۔

اے لوگو! یہ خلافت اللہ کی مستحکم رسّی تھی، میرے دادا معاویہؓ نے اس سلسلہ میں خلافت کے اصل حقدار حضرت علیؓ بن ابی طالب سے جھگڑا کیا اور وہ افعال اختیار کیے جو آپ سب کو معلوم ہیں اور اب وہ اپنی قبر میں پہنچ چکے ہیں۔ پھر یہ منصب میرے والد یزید کو پہنچا اور وہ بھی اس کا مستحق نہیں تھا، اُس نے رسولؐ کے نواسے سے جنگ کی جس کا اثر یہ ہوا کہ اُس کی عمر ختم ہو گئی اور وہ اپنے گناہوں کا قیدی بن کر اپنی قبر میں پہنچ گیا (اس کے بعد وہ رونے لگا اور کہا) سب سے بڑی مصیبت ہمارے لئے اس امر کا احساس ہے کہ میرے والد کا انجام بُرا ہوا، اُس نے اولادِ رسولؐ کو شہید کیا اور شراب کو مباح کر دیا۔ اور کعبہ کو برباد کیا[1]

اب دیکھیے پوتے کی زبان سے اپنے اُس دادا کی توہین و تنقیص جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارتوں سے نوازا اور جس کے ہادی و مہدی ہونے کی دعائیں فرمائیں، جس کو مسلمانوں کی مصیبتوں میں اُن کا ملجا و ماویٰ کہا اور جس کی حکومت کو مسلمانوں کے لئے بابرکت قرار دیا۔ راوی کا کتنا پھوہڑپن ہے اور کتنے بڑے احمقانہ کردار کا ثبوت ہے۔

---

[1] صواعق محرقہ لابن حجر مکیؒ صفحہ ۱۳۴

باپ کتنا بھی بُرا ہو اُسے کوئی بُرا نہیں کہتا مگر راوی کتنا احمق ہے کہ وہ ابنِ یزید کی زبان سے اپنے باپ کو بد انجام اور دشمنِ حق کہلواتا ہے اور قبر میں اس کے بُرے انجام کی خبر دلواتا ہے جبکہ اللہ کے رسول علیہ السلام نے اپنی ذات کو بھی عقبیٰ کی بے خبری سے مستثنیٰ نہیں کیا اور فرمایا تھا کہ وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ [1] اور یہ فرزندِ رشید اپنے باپ کو دوزخ کے گڑھے پر کھڑا دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ اُن لوگوں میں داخل ہے جن کو صحیحین کی حدیث کے بموجب جنّت کی خوشخبری مل چکی ہے [2]

حسینؓ کے فرزندِ گرامی حضرت زین العابدینؒ تو یزید کی پرہیزگاری کی شہادت دیتے ہیں مگر احمق راوی یزید کے بیٹے سے اُسے فاسق و فاجر اور شراب کو مباح قرار دینے والا کہلوا رہا ہے۔

پھر اس روایت کا احمق راوی اُس کے منہ سے اللہ کی تقدیر پر بھی حرف زن ہے جب وہ کہتا ہے کہ یزید نے رسول اللہؐ کے نواسے سے جنگ کی جس کی وجہ سے اس کی عمر ختم کر دی گئی۔

مگر جن بزرگوار کے مُنہ سے وہ یہ الفاظ اُگلواتا ہے راوی کے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ وہ اپنی تمام تر حسینؓ دوستی کے باوجود خود اپنی عمر میں کوئی اضافہ نہ کروا سکا۔ اور یزید نے تو ۶۰ھ سے ۶۴ھ تک چار برس تک حکومت کی لذت اٹھائی تھی مگر ہمارے راوی کا یہ ممدوح حکومت پانے کے چالیس روز بعد ہی اپنے اللہ کو پیارا ہو گیا [3] اور اپنے باپ کو ظالم اور دادا کو غاصب کہنا اس کے کچھ بھی کام نہ آیا۔

---

[1] بخاری، مسلم [2] بخاری

[3] ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ ۔ تاریخ الخلفاء سیوطی

تو ایسے دھاندلی بھرے زمانے میں معاویہؓ، ان کی اولاد یا ان کے اجداد سے کسی اچھے سلوک کی کیونکر امید کی جا سکتی ہے۔ اس لئے اگر ورخ نے دنیا بھر کی اچھائیاں اُن کے دامن سے نکال کر اُن کی جگہ اپنے متعصب ذہن کی تخلیقات کو بھر دیا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

یقیناً اب اگر اس ناحق اور جھوٹ کی تردید کی جائے گی تو ناحق کا اثر زائل ہونا مشکل ہے البتہ تردید ایک اجنبی شے نظر آئے گی، صدہا برس کی مشق ستم سے طبائع اب اس ناحق اور جھوٹ سے مانوس ہو چکی ہیں کیونکہ آج تک یہ ناحق ہی حق کے بطور سامنے رہا ہے، اور اب اس بناوٹ کے مقابلہ میں حقیقت یقیناً ایک نئی بات ہی ہے اور آدمی اب حق کو حق سمجھتے یقیناً جھجک محسوس کرے گا۔

وہ ناحق کے اس سیلاب میں حق کہتا ہوا یوں محسوس کرتا ہے جیسے اُس سے کسی جرم کا ارتکاب ہوا ہے اور لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف حیرت اور تعجب کے ساتھ اُٹھ رہی ہیں اور وہ یوں سمجھتا ہے کہ جیسے وہ کسی خطرہ میں گھر گیا ہے کیونکہ اُس کے حق کو تو آج تک کسی نے حق کے بطور جانا ہی نہیں تھا اور پایا ہی نہیں تھا پھر اب کوئی اسے اچانک ہی کیونکر حق سمجھ لے گا۔

یہ سچ اب ایک امانت ہی ہے جو اگر تاریخ کے اوراق میں ہے تو نگاہوں سے اوجھل ہے اور اس پر امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں ہزاروں من مٹی کی تہہ جم چکی ہے اور اگر کسی نے تاریخ کے دبیز پردوں کے نیچے اسے جھانک بھی لیا ہے تو باہر نہیں اُچھلی بلکہ پہلے تاریخ کے اوراق میں دفن تھی۔ اب دیکھنے والے کے سینہ کا دفینہ ہے، اب یہ گاڑی پٹڑی سے اتر چکی ہے اس کو دوبارہ پٹڑی پر لانے کے لئے وقت اور محنت دونوں چیزیں وافر مقدار میں درکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ایسے باہمت اور اہل جرأت و دیانت اہلِ قلم پیدا کرے جو تاریخ کی

حقیقی ضرورت بنیں اور تاریخ کو تاریخ بنا کر اُس فریضہ کو ادا کریں جو گزشتہ تقریباً ساڑھے بارہ سو برس سے مسلمان اہلِ حق کے علم و بصیرت پر قرض چلا آرہا ہے۔

دفع دخل مقدّر

بات کو ختم کرنے سے پہلے ہم اس بات کو بھی صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے جو اس کتاب میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دفاع میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کردار سے استشہاد کیا ہے اور ضرورت کے ہر مرحلہ پر اور بات کے ہر رُخ سے ہم نے جو حضرت معاویہؓ کے حق نے حضرت علیؓ کی زندگی سے دلیل اختیار کی ہے تو اس سے صرف حضرت معاویہؓ کا دفاع ہی مقصود ہے اور ہم اس طرح حضرت معاویہؓ کے حق میں حضرت علیؓ کو ایک موثر اور معتبر گواہ صفائی کے طور پر ہی پیش کر رہے ہیں ورنہ معاذ اللہ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ جو کیڑے معاویہؓ دشمن لوگوں نے حضرت معاویہؓ کے کردار میں ڈالے ہیں وہی کیڑے حضرت علیؓ کی داستانِ زندگی میں بھی سمو دیئے جائیں۔

ہم حضرت علیؓ کی محبت کو اپنے ایمان کا جزو سمجھتے ہیں اور جہاں تک کسی مقابلہ کا تعلق ہے ہم اصحابِ رسولؐ کے معاملہ میں احتیاط روا رکھنے کے باوجود حضرت معاویہؓ کو کسی طرح بھی حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دے سکتے۔

ہم نے اس کتاب کے حصہ اوّل کے پیش لفظ میں اس بات کی کھلی تصریح کر دی تھی کہ اپنے ذاتی شرف کے اعتبار سے حضرت علیؓ بہرحال حضرت معاویہؓ پر فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ حضرت معاویہؓ کو نہ تو حضرت علیؓ کی

طرح قبولِ اسلام میں ہی اولیت کا شرف حاصل ہے اور نہ وہ اُن کے ساتھ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں داخل ہیں۔ اُنہیں نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ کا ہی وہ قرب حاصل ہے جو حضرت علیؓ کے دامن کی لازوال دولت ہے اور نہ وہ نسب کے اعتبار سے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت علیؓ کا سا تقرب رکھتے ہیں۔

حضرت علیؓ کا یہ شرف بھی سوائے علیؓ اور اہلِ بیتِ علیؓ کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک کی ازواج کو شرفِ تطہیر کے مژدہ سے نوازا اور اُنہیں اہل بیت نبوی کی حیثیت سے طاہرات و مطہرات کی سعادت عطا فرمائی اور وحی کی زبان سے اُن کو مخاطب کر کے فرمایا اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ کہ اے اہل بیت نبویؐ! اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ تمہیں ہر اعتبار سے ہی پاک و مطہر بنا دے تو حضور علیہ السلام نے اس سعادت میں حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور حسنین رضی اللہ عنہم کو بھی شامل کر لیا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ یہ آیۂ مبارکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے حق میں ہی نازل ہوئی تھی جیسا کہ خطاب کے انداز سے ہی ظاہر ہے کہ "نبی کے گھر والو!" اور ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ میں سوائے حضورؐ کی ازواج کے اور کوئی نہیں تھا۔ فاطمۃ الزہراؓ ہو سکتی تھیں مگر شادی ہو چکنے کی وجہ سے وہ اب اپنے علیحدہ گھر میں رہتی تھیں اس لئے وہ اس آیۂ مبارکہ کی مخاطب نہ رہ سکی تھیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت فاطمہؓ سے جو محبت تھی اس کی وجہ سے آپؐ نے چاہا کہ بیویوں کے ساتھ بیٹی بھی اہل بیت میں شامل ہو جائے۔ اور بیٹی کے رشتہ سے ہی آپؐ نے اپنے داماد حضرت علیؓ اور حضرت

فاطمہؓ کے دونوں بیٹوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سب کو بلا کر اپنی چادر کے اندر لے لیا اور اپنے اللہ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ان سب کو بھی اس سعادت میں شریک کرلے جو ازواجِ رسولؐ کے لئے خاص کی گئی تھی، اور ہم سب مسلمانوں کو یقین ہے کہ اللہ کے ہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس درخواست نے شرفِ قبولیت پایا اور پھر اُسی روز سے ہی پوری امت نے حضرت علیؓ کو بھی امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے ساتھ اہلِ بیت رسولؐ میں داخل مان لیا۔

ورنہ اس سے پہلے انہیں اہلِ بیت میں کہنے یا ماننے کی کوئی وجہ موجود نہیں تھی کیونکہ اہلِ بیت تو وہ ہوتے ہیں جو گھر میں رہتے ہوں مگر حضرت فاطمہؓ، اُن کے شوہرِ گرامی اور اُن کے بچے اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں نہیں رہتے بستے تھے اس لئے وہ اہلِ بیت نہیں تھے۔ اگر آیۂ تطہیر کے موقع پر حضرت فاطمہؓ کی شادی نہ ہو چکی ہوتی اور وہ اپنے باپ کے گھر کو چھوڑ کر اپنا گھر جُدا نہ بنا چکی ہوتیں تو ظاہر ہے کہ انہیں از خود ہی یہ شرف حاصل ہو جاتا۔ مگر ان کے اس موقع پر اہلِ بیتِ رسولؐ سے خارج ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے لئے جُدا اہتمام کرنا پڑا اور خود یہ جُدا اہتمام ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بھی فاطمہؓ یا اُن کے شوہر اور ان کی اولادآپؐ کے اہلِ بیت کا حصہ نہیں رہ سکے تھے ورنہ وہ اپنے خدا کے سامنے انہیں اہلِ بیت قرار دے کر کیوں پیش کرتے۔ اور یہ امر بالکل واضح ہے کہ حضرت معاویہؓ کو ایسا کوئی شرف حاصل نہیں تھا۔

اور حضرت علیؓ تو خیر بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی تنقیص کے

بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کی توہین و تنقیص یا اُن کے حق میں کوئی بھی کلمۂ ناسزا خداوند تعالیٰ کو ناراض کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر صحابی قرآنِ پاک اور حدیثِ رسول علیہ السلام کی نص سے جنتی ہے، مغفور ہے، عادل ہے اور مقبول درگاہِ ربانی ہے۔ اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی بُغض یا عناد خداوند تعالیٰ کی ناراضگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو اذیت دینے کا موجب ہے، اور جس طرح حضرت علیؓ کی توہین یا اُن سے بُغض اور اُن کے حق میں کلمۂ ناسزا خداوند تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتا ہے بالکل ایسے ہی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، حضرت مروانؓ اور دوسرے صحابہ و صحابیاتِ رسولؐ اور امہات المومنینؓ کے حق میں کلمۂ ناسزا اور توہین و تنقیص اور اُن سے بُغض و عناد کا اظہار خداوند تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتا ہے اور ایسا کرنے یا کہنے والے کو جنت سے دُور اور دوزخ کے قریب کرتا ہے۔ ہماری تاریخ میں مشاجراتِ صحابہؓ کے دَور میں متعصب گروہی راویوں نے اپنے ممدوح کے فریقِ مخالف کے حق میں جھوٹی کہانیاں تخلیق دے کر اُن کو بدنام کرنے کی جو ناروا مہم چلائی ہے وہ نہ صرف ہر شریف آدمی کے لئے موجبِ قلق ہی ہے بلکہ وہ گمراہی کی بنیاد بھی ہے۔ اور اچھے اچھے لوگ ان وضعی روایات اور جھوٹی کہانیوں کے زہر سے متاثر ہوئے ہیں اور اُنہوں نے ان غلط روایات کی بنیاد پر بعض اصحابِ رسولؐ کے بارے میں بُری رائے قائم کرکے اپنی اُخروی زندگی کو خطرہ میں ڈال لیا ہے۔ گروہی متعصب راویوں نے ان روایات کو بہانہ بنا کر اصحابِ رسولؐ کے

خلاف اپنے دل کا زہر اُگلا ہے اور اصحابِ رسولؐ کی عدالت کو اپنے ذاتی، گروہی اور سیاسی مفاد کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

انہوں نے اپنے ممدوح کے مخالفین کے خلاف اتنی بدگمانیاں پھیلا دی ہیں اور ان کے لئے اتنی گالیاں تصنیف کی ہیں کہ اس دَور کی تاریخ کے قاری کو بجز ایمان کی رہنمائی کے اپنی عاقبت کو محفوظ رکھنا سخت مشکل ہو گیا ہے۔

مشاجرات صحابہؓ کے بارے میں اہلِ سنّت کے متفقہ عقیدہ سے ہٹ کر ہمارے بہت سے متاخرین اہلِ قلم نے بھی جو صورتِ حال قبول کر لی ہے وہ اپنی جگہ انتہائی افسوس ناک بھی ہے اور دردناک بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرب عزیز تر ہونے کی وجہ سے حضرت علیؓ کے ساتھ چونکہ اُمّت کو نفسیاتی اور جذباتی رابطہ دوسرے اصحابؓ کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہے اس لئے جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اپنے سیاسی اور گروہی مفاد سے جب کچھ طالع آزما سیاست بازوں نے حضرت علیؓ سے اختلاف کے جرم میں حضرت معاویہؓ کو بے نقط گالیاں دیں تو نبی علیہ السلام سے علیؓ کے اس نازک رشتہ کی وجہ سے وہ سہہ لی گئیں۔

حضرت معاویہؓ کے خلاف طرح طرح کے جذباتی نعرے لگائے گئے مگر فریقِ معاویہ کی طرف سے اس پر بھی خاموشی اختیار کی گئی کیونکہ گالی کا جواب گالی ہی ہو سکتی ہے اور نعروں کا جواب تو نعرے ہی ہوتے ہیں، مگر یہاں دونوں محاذوں پر علیؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نازک رشتہ اونچے سانس لینے میں بھی مانع تھا۔ گالی اور نعرے تو دُور کی باتیں ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سبّاب و شتّام اور نعرہ باز لوگوں نے جو جھوٹ بھی کہا اُسے سچ سمجھ لیا گیا۔

اب اگر معاویہؓ اور علیؓ کے مقدمہ میں انصاف کی تلاش میں انہی معاویہؓ دشمن اہل علم و قلم کی مصنفہ اور مصدقہ تواریخ کے بموجب بات یہ ظاہر ہو کہ مخالفینِ معاویہؓ نے جن امور کو انتہائی خیانت کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی دھاندلی، اُن کی خود غرضی، اُن کی نفس پرستی، ان کی اسلام دشمنی اور ناحق پرستی کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ یہ سب کچھ انہی ذرائع سے حضرت علیؓ کے ہاں حضرت معاویہؓ سے کہیں بڑھ کر پایا جاتا ہے۔ تو بات سیدھی ہو جاتی ہے اور حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ایک ہی حکم میں آ جاتے ہیں۔ لیکن اگر حضرت علیؓ کو اُن کمزوریوں، اُن نقائص اور اُن خرابیوں سے۔ جو تاریخ میں ان کے نام سے درج ہیں اس لئے پاک سمجھا جائے کہ علیؓ اللہ کے رسولؐ کے صحابی تھے ان کا ایسے معائب میں ملوث ہونا ممکن نہیں تو یہی فارمولا حضرت معاویہؓ کے لئے بھی اختیار کیا جائے گا کیونکہ وہ بھی اللہ کے رسولؐ کے صحابی تھے ان کے حق میں بھی اللہ کے رسول کی پیشگوئیاں، خوش خبریاں اور دعائیں احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ اگر تواریخ کی خساست حضرت علیؓ کے ساتھ ہموار نہ ہونے کی وجہ سے خساست کا درجہ ہی رکھتی ہے تو اُسے معاویہؓ سے بھی ناہموار ہونے کی وجہ سے خسیس ہی سمجھا جائے گا۔ اسی بنا پر ہم نے حضرت علیؓ کو حضرت معاویہؓ کا معیار مقرر کیا ہے اور معاویہؓ کی زندگی کے ہر رُخ کو حضرت علیؓ کی ترازو میں اتارا ہے۔ اس طرح حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ کے حق میں صفائی کے اتنے عظیم گواہ ہیں جن کی گواہی کو مسترد کر دینا ممکن نہیں ہے۔ اور ہم نے اپنے تاریخی مطالعہ کی حد تک فی الواقع ہی حضرت علیؓ کو حضرت معاویہؓ کے لئے ایک مضبوط حصار کی حیثیت میں ہی موجود پایا ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ کو جہاں اور جس مرحلہ پر بھی کوئی خطرہ لاحق ہوا حضرت علیؓ دوڑ کر پہنچے ہیں اور حضرت معاویہؓ اور اُن کے

دشمنوں کے درمیان سنگین دیوار بن کر حائل ہو گئے ہیں اور اپنے عمل کے ذریعہ معاویہؓ کا دفاع پیش کیا ہے۔

بنا بریں ہم نے جو اس تحریر میں حضرت علیؓ کو اپنے مضمون کے سرنامہ کے طور اختیار کیا ہے تو اس سے ہمارے پیش نظر اُن کے ہاتھوں حضرت معاویہؓ کے سر سے بوجھ کا اتارنا ہی ہے، ورنہ اس سے مقصود حضرت علیؓ کی ذاتِ گرامی کو زیرِ بحث لانا نہیں ہے۔

صحابی ہونے کے رشتہ سے حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشد خلیفہ ہیں اور ہم اُن کی محبت کو جزوِ ایمان مانتے ہیں۔ ہم اُن کی تنقیص کیوں چاہیں گے، لیکن مولانا مودودی صاحب کی پیدا کردہ مجبوری سے اصحابِؓ رسولؐ کے دفاع کی بحث میں اگر مولانا مودودی صاحب ہی کی بیان کردہ معتبر کتابوں کی معتبر روایات حضرت علیؓ کے حق میں کسی ناگفتنی پر منتج ہوں تو اس کا ثواب دنیا و آخرت میں مودودی صاحب کا ہی حصہ ہے۔ جن کی سیاسی ضرورتوں نے ایک ایسی بحث ناگزیر بنا دی جسے کوئی بھی اصحابؓ، دوست شخص پسند نہیں کرے گا۔

باب اوّل

حضرت معاویہؓ کے خلاف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی مرتب کردہ

فردِ قرار دادِ جُرم

ہم اپنی اس کتاب کے شروع میں "تمہیدی بات" کے زیرِ عنوان یہ عرض کر آئے ہیں کہ ہم نے اس کتاب میں امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر وارد کردہ اعتراضات اور عائد کردہ الزامات کے جواب میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس کی بنیاد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے وہ ارشادات ہیں جو انہوں نے اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت" میں حضرت معاویہؓ کے خلاف تاریخ کے نام سے جمع کر کے ان کی مخالف اسلام زندگی کے ثبوت میں پیش کئے ہیں اور جن کی وجہ سے مولانا کے نزدیک اسلام کی نظامی حکومت یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ اسلام کے اندر ملوکیت نے دخل و عمل پایا۔

آگے چلنے سے قبل ہم یہاں مولانا کے اُن ارشادات کا خلاصہ خود مولانا کے ہی الفاظ میں پیش کر دینا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے قارئین حضرت معاویہؓ کے بارے میں مولانا کے خیالات کا یکجا طور پر ایک نظر میں جائزہ لے سکیں۔

یہ تحریر دراصل حضرت معاویہؓ کے خلاف مولانا کی مرتب کردہ

قرار دادہ جرم ہے۔ ہم نے مولانا کے ارشادات کے ضمن میں بعض ناگزیر مواقع پر حواشی کے اندر ساتھ ہی ساتھ اصل صورتِ حال بھی ضروری اختصار سے پیش کر دی ہے اور کہیں بحث کے تفصیلی ذکر کی طرف اشارہ کر دیا ہے تاکہ قارئین اصل اور غیر اصل میں ساتھ ہی ساتھ فرق معلوم کرتے جائیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح اُن کے قلب و ذہن کے صدمہ کا بوجھ بھی ہلکا ہوتا رہے گا۔

معاویہؓ ٹھیٹھ جاہلیت قدیمہ کے طریقہ پر

مولانا کا ارشاد ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ جو خلافتِ راشدہ کے نظام کو قائم نہیں رکھ سکے تھے تو اس کے تین سبب تھے:

اوّل: حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے میں اُن لوگوں کی شرکت جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کرنے کے لئے باہر سے آئے ہوئے تھے۔ اُن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے بالفعل جرم قتل کا ارتکاب کیا تھا اور وہ بھی جو قتل کے محرک اور اُس میں اعانت کے مرتکب ہوئے تھے۔[۱]

دوم: بعض اکابر صحابہؓ کا حضرت علیؓ کی بیعت سے الگ رہنا . . . . وہ بہرحال اُمت کے نہایت بااثر لوگ تھے۔ ان میں سے ہر ایک ایسا تھا جس پر ہزاروں مسلمانوں کو اعتماد تھا۔ ان کی علیحدگی نے دلوں میں شک ڈال دیئے۔[۲]

---

[۱] خلافت و ملوکیت صـ۱۲۳ سطر ۷ تا ۹ [۲] صفحہ ۱۲۳ سطر ۱۸ - ۲۱ تا ۲۲

سوم: حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ جسے لے کر دو طرف سے دو فریق اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ [1] ....

پہلے فریق نے بجائے اس کے کہ وہ مدینے جاکر اپنا مطالبہ پیش کرتا جہاں خلیفہ اور مجرمین اور مقتول کے ورثاء سب موجود تھے اور عدالتی کارروائی کی جا سکتی تھی، بصرے کا رُخ کیا اور فوج جمع کر کے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی کوشش کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ ایک خون کے بجائے دس ہزار مزید خون ہوں اور مملکت کا نظام اتھل پتھل (درہم برہم) ہو جائے۔ شریعتِ الٰہی تو درکنار دنیا کے کسی آئین و قانون کی رُو سے بھی اسے ایک جائز کارروائی نہیں مانا جا سکتا [2]

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۲۴ سطر ۳-۴

[2] ایضاً صفحہ ۱۲۴ سطر ۱۹ تا ۲۳ و صفحہ ۱۲۵ سطر اوّل

اگر اس فریقِ اوّل یعنی حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کی فوجی کارروائی اس لئے خلافِ شرع و آئین ہے کہ انہوں نے عدالتی کارروائی کی طرف رجوع نہیں کیا اور مدینہ منورہ جانے کے بجائے بصرے کی طرف چل دیئے تو کہنا پڑے گا کہ مولانا نے ان بزرگ اصحابِ رسولؐ کے ساتھ سخت زیادتی کی ہے کیونکہ یہ بات تو مولانا کو خود بھی تسلیم ہے کہ طلحہؓ و زبیرؓ یہ آئینی مرحلے طے کر چکے تھے جیسے فرمایا:

حضرت طلحہؓ و زبیرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہما چند دوسرے اصحاب کے ساتھ اُن (یعنی حضرت علیؓ) سے ملے اور کہا ہم نے اقامتِ حدود کی شرط پر آپ سے بیعت کی ہے۔ اب آپ اُن لوگوں سے قصاص لیجیے جو حضرت عثمانؓ کے قتل میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا فرماتے ہیں کہ:

اس سے بدرجہا زیادہ غیر آئینی طرزِ عمل دوسرے فریق یعنی حضرت معاویہؓ کا تھا۔ جو معاویہؓ بن ابی سفیان کی حیثیت سے نہیں بلکہ شام کے گورنر کی حیثیت نے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لئے اُٹھے۔ مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کیا، گورنری کی طاقت اپنے اس مقصد کے لئے استعمال کی اور مطالبہ بھی یہ نہیں کیا کہ حضرت علیؓ قاتلین عثمانؓ پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دیں بلکہ یہ کیا کہ وہ قاتلینِ عثمانؓ کو اُن کے حوالے کردیں تاکہ وہ خود انہیں قتل کریں۔

یہ سب کچھ دورِ اسلام کی نظامی حکومت کے بجائے زمانہ قبل از اسلام کی قبائلی بدنظمی سے اشبہ ہے۔ خونِ عثمانؓ کے مطالبے کا حق اوّل تو حضرت

شریک تھے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ بھائیو! جو کچھ آپ جانتے ہیں اس سے میں بھی ناواقف نہیں ہوں، مگر میں اُن لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم اُن پر (خلافت وملوکیت ص۱۲۷ سطر ۱۶ تا ۲۰)

اور مولانا اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ اس کے بعد حضرات طلحہؓ و زبیرؓ نے لگاتار چار ماہ تک انتظار کیا مگر حضرت علیؓ کی مجبوری دُور نہ ہوسکی اور نہ اُس کے دُور ہوسکنے کے کوئی آثار ہی پیدا تھے۔ اس لئے یہ لوگ مایوس ہوکر مدینہ سے نکل آئے اور مظلوم خلیفہ کے قتل کا قصاص لینے کے لئے مسلمان عوام کی طرف رجوع کیا۔ اس میں آخر خلافِ شرع وآئین کیا بات تھی۔ جب عدالتی کارروائی ممکن ہی نہ تھی، اور حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ ایسی کسی بھی کارروائی سے معذرت کررہے تھے تو آپ ہی فرمایئے کہ جو کچھ اُن بزرگوں نے کیا اس کے سوا اور چارہ کار ہی کیا تھا۔

معاویہؓ کے بجائے حضرت عثمانؓ کے شرعی وارثوں کو پہنچتا تھا۔ تاہم اگر رشتہ داری کی بناء پر حضرت معاویہؓ اس مطالبہ کے مجاز بھی ہو سکتے تھے تو اپنی ذاتی حیثیت میں نہ کہ شام کے گورنر کی حیثیت میں۔

حضرت عثمانؓ کا رشتہ جو کچھ بھی تھا معاویہ بن ابی سفیان سے تھا، شام کی گورنری اُن کی رشتہ دار نہ تھی۔ اپنی ذاتی حیثیت میں وہ خلیفہ کے پاس مستغیث بن کر جا سکتے تھے اور مجرمین کو گرفتار کرنے اور اُن پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر سکتے تھے [۱]

(خلافت وملوکیت ص۱۲۵ سطر ۲ تا ۱۳)

مولانا کا مزید ارشاد ہے کہ:

گورنر کی حیثیت سے اُنہیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی جس کی خلافت کو اُن کے زیرِ انتظام صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی اُس کی اطاعت سے انکار کر دیتے اور اپنے زیرِ انتظام علاقے کی فوجی طاقت کو مرکزی حکومت کے مقابلہ میں استعمال کرتے [۲]

---

[۱] مولانا کا یہ مشورہ صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ ایک آزاد حاکم ہوتے اور اپنی صوابدید کے مطابق عدالتی کاروائی کے تقاضے پورے کر سکتے۔ مگر جب وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھ پر باغیوں کا قبضہ اور غلبہ ہے تو ایسی صورت میں معاویہؓ اگر اُن کے ہاں جاتے بھی تو اُنہیں بھی وہی جواب ملتا جو حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو مل چکا تھا اس لئے اس مرحلہ پر مولانا کا یہ مشورہ نہ صرف غیر صحیح ہے بلکہ حضرت علیؓ کے حالات کے بھی غیر مطابق ہے۔

[۲] حضرت معاویہؓ پر مولانا کا غصہ بجا مگر غصہ کی بہتات میں (باقی اگلے صفحہ پر)

اور ٹھیٹھ جاہلیت کے طریقہ پر یہ مطالبہ کرتے کہ قتل کے ملزموں کو عدالتی کارروائی کے بجائے مدعی قصاص کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ خود ان سے بدلہ لے لے۔ ؎

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۲۵ سطر ۱۳ تا ۱۵ و صفحہ ۱۲۶ سطر ۱ تا ۴)

انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ کے زیرِ انتظام صوبے کے سوا پوری مملکت اسلامی حضرت علیؓ کے زیرِ علَم آ چکی تھی کیونکہ حضرت معاویہؓ کے صوبہ شام کے علاوہ بھی سلطنت اسلامی کا بہت سا حصہ حضرت علیؓ کی حکومت سے باہر تھا۔ مورخین کے قول کے مطابق خود حجاز کی بیشتر آبادی بھی جہاں حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا گیا تھا غیر جانبدار تھی۔ شام سرے سے ہی علیؓ کے ساتھ نہیں تھا۔ کوفہ میں حضرت ابو موسےٰؓ گورنر کوفہ کے زیرِ اثر غیر جانبداری قائم تھی۔ مصر میں دس ہزار آدمیوں کی جمعیت ایسی موجود تھی جو حضرت علیؓ سے باقاعدہ برسرِ جنگ تھی جن کا مقابلہ کرنے کے لئے حضرت علیؓ نے قیسؓ بن سعد کو معزول کر کے محمد بن ابی بکرؓ کو بھیجا تھا۔ جنگِ جمل کے دنوں بصرہ کے میدان میں تیس ہزار آدمی حضرت علیؓ کے مقابلہ پر جمع تھے اس حالت میں یہ کہنا خلافِ واقعہ ہی ہے کہ معاویہؓ کے صوبہ شام کے سوا ساری مملکتِ اسلامیہ علیؓ کے ساتھ تھی۔

؎ حضرت معاویہؓ کے حق میں ٹھیٹھ جاہلیت کے طریقہ پر چلنے کے ریمارکس سخت تکلیف دہ، نہایت سنگین اور انتہائی افسوسناک ہیں کیونکہ اگر مقتول کے وارثوں کا یہ مطالبہ جاہلیت ہے کہ قاتل کو ان کے حوالے کیا جائے تو اس جاہلیت کو تو حضرت علیؓ کے ہمراہیوں کے سوا دوسرے تمام صحابہؓ اور اسلام کے پیروکاروں نے اختیار کر رکھا تھا۔ اُم المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور ان کے تمام ساتھی (معاذاللہ) اسی جاہلیت کے طریقہ پر چل رہے تھے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت معاویہؓ کے جھوٹ اور جعلسازیاں

مولانا فرماتے ہیں کہ:
حضرت عثمانؓ کی شہادت (۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ) کے بعد حضرت نعمان بن بشیر اُن کا خون سے بھرا ہوا قمیص اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق لے گئے۔ اور انہوں نے یہ چیزیں منظرِ عام پر لٹکا دیں تاکہ اہلِ شام کے جذبات بھڑک اٹھیں۔ یہ اس بات کی کھلی علامت تھی کہ حضرت معاویہؓ خونِ عثمانؓ کا بدلہ قانون کے راستہ سے نہیں بلکہ غیر قانونی طریقہ سے لینا چاہتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ شہادتِ عثمانؓ کی خبر ہی لوگوں میں غم و غصہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھی اس قمیص اور ان انگلیوں کا مظاہرہ کر کے عوام میں اشتعال پیدا کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ (خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۳۲ سطر ۷ تا ۱۳)

اور خلفائے راشدین کے ہاں اس ٹھیٹھ جاہلیت کے مطابق فیصلے کرنے کا معمول رہا ہے۔ مولانا حضرت معاویہؓ کے خلاف بے قابو غصہ رکھنے کی وجہ سے اپنے قلم کو بھی بے قابو ہونے سے روک نہیں سکے ورنہ ہم انہیں ایسا بے خبر نہیں سمجھتے کہ انہیں یہ علم نہ ہو کہ فاروقِ اعظمؓ نے قبیلہ بکر بن وائل کے ایک قاتل فرد کو مقتول کے عیسائی ورثاء کے سپرد کر دیا تھا۔ اور حضرت عثمانؓ نے ہرمزان کے قتل کے عوض حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے عبید اللہ بن عمرؓ کو ہرمزان کے بیٹے قاذان کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ مفصل بحث اس کتاب میں اپنی جگہ پر موجود ہے۔

مولانا کا بیان ہے کہ:

حضرت علیؓ نے منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد جو کام سب سے پہلے کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ محرم ۳۶ھ میں حضرت معاویہؓ کو شام سے معزول کر کے حضرت سہل بن حُنیف کو اُن کی جگہ مقرر کر دیا مگر ابھی یہ نئے گورنر تبوک تک ہی پہنچے تھے کہ شام کے سواروں کا ایک دستہ اُن سے آکر ملا اور اُس نے کہا، اگر آپ حضرت عثمانؓ کی طرف سے آئے ہیں تو اہلاً و سہلاً اور اگر کسی اور کی طرف سے آئے ہیں تو واپس تشریف لے جائیے۔

یہ اس بات کا صاف نوٹس تھا کہ شام کا صوبہ نئے خلیفہ کی اطاعت کے لئے تیار نہیں ہے۔ (خلافت وملوکیت صہ۱۳۲ سطر۱۴ تا ۱۹)

حضرت معاویہؓ کا قاصد حضرت علیؓ کے پاس آیا اور اُن سے کہا کہ ساٹھ ہزار شامی آپ سے حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ چاہتے ہیں۔

اس واقعہ کو تحریر کرنے کے بعد مولانا رقمطراز ہیں کہ:

اس کے صاف معنی یہ تھے کہ شام کا گورنر (معاویہؓ) صرف اطاعت ہی سے منحرف نہیں ہے بلکہ اپنے صوبہ کی پوری فوجی طاقت مرکزی حکومت سے لڑنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے اور اس کے پیشِ نظر قاتلین عثمانؓ سے نہیں بلکہ خلیفۂ وقت سے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینا ہے [1]

---

[1] یہ صرف قلم کی کاوش اور استدلال کا ہی کمال ہے۔ ورنہ معاویہؓ نہ علیؓ سے لڑنا چاہتے تھے نہ علیؓ کی ذات سے کسی بدلہ کا ہی خیال کرتے تھے، نہ انہیں علیؓ کے مقابلہ میں خلافت کا ادعا تھا۔ حضرت علیؓ سے ان کا مقابلہ محض حضرت علیؓ کی اس روش سے ہی ہو گیا تھا کہ وہ نہ قاتلینِ عثمانؓ کو خود ماخوذ کرتے تھے، نہ اُن سے جدا ہوتے تھے، نہ خود قصاص لیتے تھے نہ کسی کو لینے دیتے تھے بلکہ قصاص تو رہا درکنار اُنھوں نے قاتلینِ عثمانؓ کو پناہ دے رکھی تھی۔

یہ سب کچھ اس چیز کا نتیجہ تھا کہ حضرت معاویہؓ مسلسل ۱۶ - ۱۷ سال تک ایک ہی صوبے اور وہ بھی جنگی نقطۂ نظر سے انتہائی اہم صوبے کی گورنری پر رکھے گئے۔ اسی وجہ سے شام خلافتِ اسلامیہ کے ایک صوبے کی بہ نسبت اُن کی ریاست زیادہ بن گیا تھا [1]

(خلافت وملوکیت صـ۱۳۳ سطر ۱۱ تا ۱۴)

کوئی سیاسی بصیرت رکھنے والا آدمی یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت علیؓ اگر حضرت معاویہؓ کی معزولی کا حکم صادر کرنے میں تاخیر کرتے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوتی۔ ان کے اس اقدام سے ابتداء ہی میں یہ بات کھل گئی کہ حضرت معاویہؓ کس مقام پر کھڑے ہیں۔ زیادہ دیر تک ان کے موقف پر پردہ پڑا رہتا تو یہ دھوکے کا پردہ ہوتا جو زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ (ایضاً صـ۱۳۳ سطر ۱۹ تا ۲۱، صـ۱۳۴ سطر ۱)

---

[1] مولانا کے یہ ریمارکس دراصل بالواسطہ طور پر حضرت فاروقِ اعظمؓ اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی مذمت ہے۔ کیونکہ حضرت معاویہؓ کو شام کے صوبہ کی گورنری پر طویل عرصے تک قائم رکھنا اگر کوئی بے تدبیری تھی تو اس کا تعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ دوم اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ سوم سے تھا۔

فاروقِ اعظمؓ نے انہیں حاکم مقرر کیا تو اپنی پوری زندگی اُن کو تبدیل نہ کیا۔ پھر ان کے بعد عثمانؓ آئے تو انہوں نے بھی انہیں قائم رکھا۔

مولانا کی ناراضگی کا تو ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔ البتہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کا شام سے تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے الہامِ ربانی کی بنیاد پر ہے اور معاویہؓ کو شام کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص کر رکھا تھا۔ انہیں زمین کا کوئی فیصلہ شام سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت علیؓ نے انہیں ہٹانا چاہا تھا مگر اس کے نتیجہ میں خود انہی کو ہٹ جانا پڑا۔

مولانا مزید رقمطراز ہیں :

جنگِ جمل (جمادی الاُخریٰ ۳۶ھ) سے فارغ ہو کر حضرت علیؓ نے پھر شام کے معاملے کی طرف توجہ کی اور حضرت جریر بن عبداللہ البجلی کو حضرت معاویہؓ کے پاس ایک خط دے کر بھیجا جس میں اُن کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اُمت جس خلافت پر جمع ہو چکی ہے اس کی اطاعت قبول کر لیں اور جماعت سے الگ ہو کر تفرقہ نہ ڈالیں۔ مگر حضرت معاویہؓ نے ایک مدت تک حضرت جریرؓ کو ہاں یا ناں کا کوئی جواب نہ دیا، اور انہیں برابر ٹالتے رہے۔

پھر حضرت عمروؓ بن العاص کے مشورے سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت علیؓ کو خونِ عثمانؓ کا ذمہ دار قرار دے کر اُن سے جنگ کی جائے۔ دونوں حضرات کو یقین تھا کہ جنگِ جمل کے بعد اب حضرت علیؓ کی فوج پوری طرح متحد ہو کر اُن کے جھنڈے تلے نہ لڑ سکے گی نہ عراق اُس دلجمعی کے ساتھ اُن کی حمایت کر سکے گا جو اہلِ شام میں حضرت معاویہؓ کے لئے پائی جاتی ہے۔ اس دوران میں جبکہ حضرت معاویہؓ ٹال مٹول کر رہے تھے حضرت جریرؓ بن عبداللہ نے دمشق میں شام کے بااثر لوگوں سے ملاقاتیں کر کے ان کو یقین دلایا کہ خونِ عثمانؓ کی ذمہ داری سے حضرت علیؓ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت معاویہؓ کو اس سے تشویش لاحق ہوئی اور اُنہوں نے ایک صاحب کو اس کام پر مامور کیا کہ کچھ گواہ ایسے تیار کریں جو اہلِ شام کے سامنے یہ شہادت دے دیں کہ حضرت علیؓ ہی حضرت عثمانؓ کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ وہ صاحب پانچ گواہ تیار کر کے لے آئے اور اُنہوں نے لوگوں کے سامنے یہ شہادت دی کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا ہے۔ لہ

لہ (خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۳۴ سطر ۱۲ تا ۲۱ و صفحہ ۱۳۵ سطر ۱ تا ۷)

(حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

مزید ارشاد ہے کہ:

اس کے بعد حضرت علیؓ عراق سے اور حضرت معاویہؓ شام سے

دیکھیے صفحہ کا حاشیہ) لہ یہ روایت جسے مولانا نے قبول فرما کر بڑے اعتماد سے حضرت معاویہؓ کو نہایت درجہ سنگین اور سفاکانہ حملوں کا ہدف بنایا ہے۔ تاریخ کی ان سرفہرست جھوٹی روایتوں میں سے ایک ہے جس پر عبداللہ بن سبا کی اولاد کو بجا طور پر ناز ہے مگر مولانا نے معاویہؓ کے لئے اس کوچہ میں جاتے بھی جھجک محسوس نہیں کی۔ اس روایت کے جھوٹ ہونے کی وجوہ مختصراً یہ ہیں:

(ا) حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص کا کوئی ایسا خفیہ مشورہ تاریخ کی کسی معقول کتاب سے ثابت نہیں جو انہوں نے ابن جریر کی مہم کے ذیل میں کیا ہو کیونکہ معاویہؓ کا موقف شروع سے آخر تک ایک ہی رہا ہے اور انہوں نے ہمیشہ کھلی بات کی ہے، انہوں نے ہمیشہ علیؓ سے صرف قاتل ہی طلب کئے ہیں علیؓ کو بطور قاتل کے کبھی طلب نہیں کیا۔

(ب) حضرت علیؓ کے اس اعلان پر کہ میں نے عثمانؓ کو قتل نہیں کیا اور نہ کرایا حضرت معاویہؓ نے ہمیشہ صرف یہی کہا ہے کہ ایسی صورت میں علیؓ پھر عثمان کے قاتلوں سے علیحدگی کیوں نہیں اختیار کر لیتے ہم ان سے خود نپٹ لیں گے یعنی علیؓ کو الزام نہیں دیا بلکہ اظہارِ قلق ہی کیا ہے۔

(ج) عمروؓ بن العاص اور معاویہؓ حضرت علیؓ کی جن فوجی اور سیاسی کمزوریوں کو دور بیٹھے جانتے تھے حضرت علیؓ اپنے لشکر کے اندر بیٹھ کر اپنے لشکر کی اس حالت کو کیوں جان نہ سکے۔

(د) معاویہؓ کے ٹال مٹول کی بات ایک مفروضہ ہے اور انتہائی غلط ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر کے دمشق پہنچنے پر حضرت معاویہؓ نے خود دمشق کے اہل الرائے کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب کیا تھا اور بقول ابن کثیر تمام

(باقی اگلے صفحہ پر)

جنگ کی تیاریاں کر کے ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور صفین کے مقام پر
جو فرات کے مغربی جانب الرّقّۃ کے قریب واقع تھا۔ فریقین کا آمنا سامنا

مدوئین اور متدین نے بیک زبان حضرت علیؓ کے مطالبہ کو مسترد کر دیا تھا
اور فیصلہ کن انداز میں کہا کہ علیؓ کو خلیفہ ماننے کی ایک ہی شرط ہے کہ وہ
قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لیں یا قاتلین کو ہمارے حوالے کر دیں۔
(البدایہ والنہایہ جلد ۷ صـ۲۵۳)

(ط) ابن جریر کا دمشق میں بیٹھ کر معاویہؓ کے خلاف اور علیؓ کے حق میں
لوگوں کو ہموار کرنے کی بات ماننے کے لئے آدمی کا احمق بننا بھی ضروری ہے
بھلا ابن جریر کو یہ ہمت کیونکر ہو سکتی تھی کہ معاویہؓ کے گھر میں اس کے خلاف
کوئی سرگرمی روا رکھ سکے۔ معاویہؓ کوئی مجبور اور بے بس حاکم نہیں تھے اگر ابن
جریر ایسا کرتے تو وہ فوراً اُسے اپنے ملک سے نکال دیتے۔

(و) مولانا کا یہ کہنا بڑی جسارت ہے کہ معاویہؓ نے ایک صاحب کو جھوٹے گواہ
پیدا کرنے کے لئے کہا پھر وہ پانچ گواہ بنا لائے جنہوں نے معاویہؓ کی مرضی کے مطابق
اہلِ شام کے سامنے جھوٹی گواہی دی۔

ہم اس بات کو مولانا کی سادگی نہیں سمجھتے کہ وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ معاویہؓ
کے شامی ایسی موم کی ناک نہیں تھے کہ جس کا جی چاہے انہیں اپنی مرضی کے مطابق
موڑ لے۔ معلوم نہیں مولانا معاویہؓ کے خلاف اس جسارت کا اپنے اللہ کے ہاں کیا
جواب دیں گے اور اپنے قارئین کو ایک جھوٹ کے ساتھ ہموار کرنے پر اُخروی
جوابدہی سے کیونکر بچیں گے۔

بھلا جب معاویہؓ خود بھی علیؓ کو قاتل نہیں کہتے تھے تو وہ اہلِ شام کے لئے
جھوٹے گواہ کیوں پیدا کرتے۔ کیا اہلِ شام حضرت معاویہؓ کی رائے اور ان کے موقف
سے آگاہ نہیں تھے جو معاویہؓ کو اس تکلف کے ساتھ انہیں ہموار کرنا پڑتا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہوا۔ حضرت معاویہؓ کا لشکر فرات کے پانی پر پہلے قابض ہو چکا تھا۔ اُنہوں نے لشکرِ مخالف کو اس سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت نہ دی۔

اور مولانا کی اپنی جرأت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی بات بھی پوری نہ کر سکے اور یہ نہ بتا سکے کہ وہ ایک صاحب کون تھے اور پانچ جھوٹے گواہ کون تھے۔ جبکہ "الاستیعاب" میں جہاں سے انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے ان ایک صاحب اور ان پانچ گواہوں کے نام بھی دیئے گئے ہیں۔

ہمیں مولانا کی اس کمزوری کی علت معلوم ہے کہ وہ محض ایک صاحب اور پانچ گواہ کہہ کر کیوں نکل گئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایک صاحب بھی رسول اللہؐ کے صحابی ہیں اور ان پانچ میں بھی چار صحابی ہیں اور گو راوی تو اصحابِ رسولؐ کے نام جھوٹ لگانے نہیں شرمایا تھا مگر مولانا اتنی جرأت نہیں فرما سکے کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ اصحابِ رسولؐ کے نام سے اس جھوٹ کو شائع کرنے سے کچھ لوگ بدک جائیں گے اور سنتے ہی کہہ دیں گے کہ یہ جھوٹ ہے، اصحابِ رسولؐ اس طرح جھوٹ پر جمع نہیں ہو سکتے لہٰذا اُنہوں نے اصحابِ رسولؐ کے نام حذف کر دیئے اور اپنی بات سیدھی کر لی کہ معاویہؓ نے فی الواقعہ ہی یہ فریب رچایا تھا اور یہ فراڈ کیا تھا اور اگر معاویہؓ اہلِ شام کو یوں دھوکا نہ دیتے تو شامی حضرت علیؓ کے حامی بن جاتے والے تھے جناب ابن عبد البرؒ مصنف الاستیعاب مولانا سے زیادہ جری نکلے کہ اصحابِ رسولؐ کے نام سے ایک کھلی جھوٹی روایت نقل کی اور اس کی کوئی سند بھی ذکر نہیں کی کہ اُنہیں یہ روایت کہاں سے ملی اور کس ذریعہ سے ان تک پہنچی اور اس روایت کے راوی کون لوگ ہیں۔ تاہم مولانا نے جن بزرگوار کو ایک صاحب کہہ کر بات چلائی ہے الاستیعاب نے ان کا نام شرحبیلؓ بن سمط لکھا ہے۔ یہ ایک مشہور بزرگ صحابی ہیں جن کے نام سے اس فریب بھری کہانی کو تصنیف کیا گیا ہے اور جن کو پولیس کے ایک ذلیل ٹاؤٹ کا مقام دے کر جھوٹے گواہوں کی تلاش میں نکالا

(باقی اگلے صفحہ پر)

پھر حضرت علیؓ کی فوج نے لڑ کر اُن کو وہاں سے بے دخل کر دیا اور حضرت علیؓ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اپنی ضرورت بھر پانی لیتے رہو اور باقی سے لشکرِ مخالف کو فائدہ اٹھانے دو۔[1]

گیا ہے۔ پانچ گواہوں میں سے چار حضرت یزیدؓ بن اسد، حضرت حابسؓ بن سعد، حضرت ابوالاعورؓ السلمی اور حضرت بسرؓ بن ابی ارطاۃ ہیں جن کو بعض خاص وجوہ سے اس بدنامی کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔

اب اگر اصحابِ رسولؐ بھی اس درجہ دروغ باف ہو سکتے ہیں تو کذاب راویوں کی تو بات ہی کیا ہے۔

پھر اس واقعہ کا یہ پہلو بڑا ہی عبرتناک ہے کہ یہی ابن جریر عبد اللہؓ بن البجلی جو معاویہؓ کے دیس میں حضرت علیؓ کے حق میں یوں سرگرم دکھائے گئے ہیں واپس جا کر علیؓ کے حق میں زیادہ متشدد ہونے کے بجائے علیؓ سے ہی کٹ گئے اور پہلے تو غیر جانبدار رہ گئے اور پھر واپس معاویہؓ سے جا ملے۔

[1] فرات کے پانی پر حضرت معاویہؓ کا قبضہ اور حضرت علیؓ کا اس قبضہ کو بزورِ شمشیر توڑنا اور دشمن و دوست سب پر پانی کا کھول دینا حضرت علیؓ کے حق میں ایک نہایت ہی خوبصورت کہانی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بے بنیاد ہے۔ اور اس کی اصل کوئی نہیں ہے۔ اس روایت کے بموجب فُرات کے پانی پر قبضہ کرنے کا مشورہ حضرت معاویہؓ کو دینے والے دو بزرگ بیان کئے گئے ہیں حضرت عبد اللہؓ بن سعد بن ابی سرح اور حضرت ولیدؓ بن عُقبہ۔ مگر قارئین کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ دونوں بزرگ جنگِ صفین میں سرے سے شامل ہی نہیں تھے۔ (ابن اثیر جلد ۳ صہ ۸۵)

ذی الحجہ کے آغاز میں باقاعدہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے پاس اتمامِ حجت کے لئے ایک وفد بھیجا مگر ان کا جواب یہ تھا کہ "میرے پاس سے چلے جاؤ، میرے اور تمہارے درمیان تلوار کے سوا کچھ نہیں ہے"۔ لے

لے مولانا نے حضرت معاویہؓ کی زبان سے جو جملہ یہاں نقل کیا ہے اس میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ سخت زیادتی کی گئی ہے اور اگرچہ نقل روایت کا یہ طریق خلافت و ملوکیت میں نقل کردہ اکثر روایات کی "تکنیک" کے خلاف تو نہیں مگر مولانا نے اس جملہ کو نقل کر کے حضرت معاویہؓ کی اخلاقی حالت کے بارے میں جو تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ حقیقت کے ضرور خلاف ہے۔ مولانا کے قلم سے حضرت معاویہؓ کے حق میں بے انصافی کی حقیقت کو جاننے کے لئے ہم یہ روایت جس سے یہ ایک جملہ سیاق و سباق سے جدا کر کے انتخاب کیا گیا ہے یہاں درج کرتے ہیں جس سے حضرت علیؓ کے اتمامِ حجت کا حال وفدِ علیؓ کی معقولیت اور مولانا کے بیان کی حقیقت بڑی اچھی طرح واضح ہو سکے گی۔

"حضرت علیؓ نے بشیر بن عمرو بن محصن انصاری، سعید بن قیس الہمدانی اور شبیث بن ربعی کو حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجا کہ جاؤ اُسے حق پر چلنے، امیر کی اطاعت اور جماعت کے اتحاد کی دعوت دو۔ ارکانِ وفد میں سے شبیث نے حضرت علیؓ سے کہا کہ معاویہؓ کو طمع دیجئے کہ اگر وہ علیؓ کی بیعت کرلے تو شام کی امارت اُس کا حق قرار دیدی جائے گی۔ علیؓ نے جواب دیا کہ تم جاؤ تو سہی، دیکھو وہ کیا چاہتا ہے۔ یہ وفد معاویہؓ کے پاس (ذی الحجہ ۳۶ھ ہجری میں) پہنچا اور بشیر بن عمرو نے بات اٹھائی۔

"اے معاویہؓ! یہ دنیا ایک نہ ایک دن تم سے جاتی رہے گی، تم خدا کے روبرو پیش ہوگے جہاں تمہارے اعمال کا حساب ہوگا، جماعت میں تفریق پیدا نہ کرو

(باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا کا مزید ارشاد ہے کہ:

معاویہؓ کی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی اس وقت حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اُٹھائے اور کہے کہ هٰذَا حَكَمٌ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (یہ ہمارے

اور مسلمانوں کا خون بہانے سے رُک جاؤ۔

معاویہؓ نے بات کاٹ کر کہا کہ تم جس بات کی مجھے نصیحت کرتے ہو تم نے کبھی اپنے امیر کو بھی ایسی نصیحت کی ہے؟ بشیر نے کہا ہمارا امیر تمہارے جیسا نہیں ہے۔ وہ تمام مخلوق میں دوسروں کو نصیحت کرنے کا سب سے بڑھ کر حقدار ہے، وہ صاحبِ دین بھی ہے اُسے فضیلت بھی حاصل ہے، اسلام میں سبقت بھی حاصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی بھی ہے۔ معاویہؓ نے کہا کہ آخر تمہارے امیر مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ بشیر نے کہا وہ تمہیں تقویٰ اختیار کرنے، اللہ عزّ وجل سے ڈرنے اور امرِ حق میں اپنی اطاعت کا حکم دیتے ہیں۔ اس میں تمہاری دینی واُخروی بھلائی ہے۔

معاویہؓ نے کہا تو پھر کیا عثمانؓ کا خون رائیگاں جانے دوں۔ خدا کی قسم ایسا تو نہیں ہوگا۔ اس کے جواب میں (بشیر کو پیچھے ہٹا کر) شبث بن ربعی آگے بڑھا اور بولا، معاویہؓ! میں تمہاری بات کو خوب سمجھتا ہوں خدا کی قسم تمہارے مقاصد اور تمہارے عزائم ہم پر مخفی نہیں ہیں۔ تم نے لوگوں کو بہکانے کے لئے خلیفہ کی مظلومیت اور مظلومانہ شہادت کا ڈھونگ کھڑا کر رکھا ہے، تم لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو کہ تمہارے امام مظلوم شہید کر دیئے گئے ہیں۔ اس پر کچھ بے وقوف اور اوباش تمہارے ساتھ لگ گئے ہیں حالانکہ تم نے عثمانؓ کی امداد میں تاخیر ہی اس لئے کی تھی کہ وہ قتل ہو جائیں اور تم اُن کے خون کے قصاص کے مطالبے کے بہانے یہ مقام حاصل کر سکو۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اور تمہارے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے) اس کی مصلحت حضرت عمروؓ نے خود یہ بتائی کہ اس سے علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ کچھ کہیں گے کہ

تم جس چیز کی آرزو کر رہے ہو اگر وہ غلط ہے تو اس وقت تم تمام عرب سے بدترین شخص ہو گے اور اگر تمہارا مقصد صحیح ہے تو تم اسے حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم اپنے آپ کو دوزخ کا مستحق نہ بنا لو۔"

اب ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کے بھیجے گئے وفد میں سے ہر کسی کی بات ہی نہایت غیر سنجیدہ، اشتعال انگیز اور معاملہ فہمی یا افہام و تفہیم کے ہر پہلو منافی تھی۔ حضرت علیؓ کا مقصد جب حالات پر قابو حاصل کرنا ہی تھا تو انہیں اس غرض سے شائستہ اخلاق بردبار اور معاملہ فہم لوگوں کا انتخاب کرنا چاہیئے تھا۔ یہ لوگ جو نہ مجلسی اخلاق کے حامل ہیں نہ انہیں گفتگو کا شعور حاصل ہے، نہ موقع و محل کو سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ تو لڑائی کرانے والے تھے لڑائی کو ہٹانے والے کہاں ہیں۔ حضرت معاویہ نے ارکانِ وفد کی ان اشتعال انگیز، ناشائستہ اور غیر مہذب گفتگو کو سن کر شبیث بن ربعی کے حسب حال جواب دیا اور کہا۔

"تمہاری تقریر سے جو پہلی بات معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم انتہائی بیوقوف اور بے عقل شخص ہو، تم نے اپنی قوم کے سردار (بشیر) کی گفتگو بھی قطع کر دی اور پھر تم نے باتیں بھی ایسی کیں جن کا تمہیں کوئی علم نہیں تھا اس طرح تم نے جھوٹ سے بھی کام لیا۔ اے جاہل آدمی تم اس جھوٹ پر ہی مرو گے۔"

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۸۸ - ۲۸۹)

اب کوئی بھی انصاف پسند اور غیر جانبدار شخص حضرت علیؓ کے وفد کی باتوں کا علم حاصل کر کے **حضرت معاویہؓ کے جواب کو بے محل، غلط، غیر صحیح اور غیر معقول** نہیں کہہ سکتا سوائے اس کے کہ مولانا کے طریق پر بات کا سیاق و سباق

یہ بات مان لی جائے اور کچھ کہیں گے کہ نہ مانی جائے، ہم مجتمع رہیں گے اور ان کے ہاں تفرقہ برپا ہو جائے گا - اگر وہ مان گئے تو ہمیں مہلت مل جائے گی ۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ ایک جنگی چال تھی، قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود ہی نہ تھا - اس مشورے کے مطابق لشکرِ معاویہؓ میں قرآن نیزوں پر اٹھایا گیا اور اس کا وہی نتیجہ ہوا جس کی حضرت عمروؓ بن العاص کو امید تھی۔ حضرت علیؓ نے عراق کے لوگوں کو لاکھ سمجھایا کہ اس چال میں نہ آؤ اور جنگ کو آخری فیصلے تک پہنچ جانے دو۔ مگر ان میں پھوٹ پڑ کر رہی - آخر کار حضرت علیؓ مجبور ہو گئے کہ جنگ بند کر کے حضرت معاویہؓ سے تحکیم کا معاہدہ کر لیں لہ

(خلافت و ملوکیت صـ ۱۲۹ سطر ۶ تا ۱۵ و صـ ۱۴۲ سطر اوّل)

بات سے جدا کر دیا جائے اور اپنے مطلب کا ایک جملہ انتخاب کر کے حضرت معاویہؓ کے سر پر ایک مزید بوجھ کا اضافہ کرنے کا پروگرام ہو۔ قارئین کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس وفد کے کسی رکن کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ اپنے سفر کو حلال بنانے کے لیئے ہی صلح صفائی کی بات کا بھی کوئی تجربہ کر لینا - اور جہاں تک معاویہؓ کا تعلق ہے اُن کا یہ جملہ محض جواب آں غزل ہی ہے اور بالکل وقتی سی بات ہے کیونکہ وہ اس کے بعد بھی ہمیشہ صلح پر آمادہ رہے ہیں بلکہ ہمیشہ صلح کے محرک بھی رہے ہیں۔

لہ اس روایت کا راوی ابومخنف ہے اور وہ باتفاق کذاب بھی ہے۔ اور شیعہ بھی ہے۔ تاہم مولانا نے اوّل تو اس روایت کو بہت اچھالا ہے اور اس سے حضرت معاویہؓ کے خلاف دلیل پیدا کی ہے جیسے معاویہؓ نے اس مسلم کشی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر کے کوئی سخت گناہ کیا ہے حالانکہ

مولانا فرماتے ہیں:

عراق کے لوگ ہمت ہار چکے تھے اور خوارج کے فتنے نے حضرت علیؓ کے لیے مزید ایک دردِ سر پیدا کر دیا تھا۔ پھر حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ کی تدبیروں سے مصر اور شمالی افریقہ کے علاقے بھی اُن کے ہاتھ سے نکل گئے اور دنیائے اسلام عملاً دو متحارب حکومتوں میں بٹ گئی۔ آخر کار حضرت علیؓ کی شہادت (رمضان ۴۰ھ ہجری) اور پھر حضرت حسنؓ کی مصالحت (۴۱ھ ہجری) نے میدان حضرت معاویہؓ

روایت کے زہر بھرے اسلوب سے قطع نظر خود روایت کے بموجب بھی معاویہؓ کی یہ مہم بڑی ہی مقدس مہم ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر صلح کی بنیاد پڑی۔ مولانا معاویہؓ کے اس فعل پر انہیں الزام دیتے ہیں حالانکہ یہ ایک عظیم احسان ہے جو حضرت معاویہؓ کی یادگار ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل و خون رُک گیا۔ بالفرض اگر یہ کوئی جنگی چال بھی تھی تو بھی مسلمانوں کے لئے برکات و حسنات سے بھرپور ہے اس کو خیانت کہنا تو خود بیانِ حقیقت سے خیانت ہے۔ مسلمانوں کو باہمی جنگ سے باز رکھنے کے لئے یہی فعل حضرت علیؓ نے جنگِ جمل میں سرانجام دیا تھا اور وہ لڑنے والوں کی صفوں میں قرآن: قرآن پکارتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ اگر مسلمانوں کو قرآن کا واسطہ دے کر لڑائی سے روکنا جنگِ جمل کے اندر بدنیتی سے نہیں تھا تو صفین میں اس کو کیوں بدنیتی کہا جائے گا۔ آخر حضرت معاویہؓ سے عناد کی کوئی حدود بھی ہیں یا نہیں۔ سوال کسی کی فتح یا شکست کا نہیں سوال مسلمانوں کی سلامتی کا ہے خواہ وہ کسی کے ذریعہ بھی میسر آئے اللہ کی نعمت ہی ہے۔ مزید تفصیل بحث کے اصل موقع پر ملاحظہ ہو۔

کے لئے پوری طرح خالی کر دیا [1] (خلافت و ملوکیت ص۱۴۵ سطر ۲ تا ۱۱)

حضرت معاویہؓ ایک سازشی حکمران!

ارشاد ہے :

حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں اختیارات کا آنا خلافت سے ملوکیت کی طرف اسلامی ریاست کے انتقال کا عبوری مرحلہ تھا۔ بصیرت رکھنے والے لوگ اس مرحلہ پر ہی سمجھ گئے تھے کہ اب ہمیں بادشاہی سے سابقہ درپیش ہے۔ (خلافت و ملوکیت ص۱۴۷ سطر ۱۱ تا ۱۲)

اب خلافت علی منہاج النبوۃ کے بحال ہونے کی آخری صورت صرف یہ رہ گئی تھی کہ حضرت معاویہؓ یا تو اپنے بعد اس منصب پر کسی شخص کے تقرر کا معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورے پر چھوڑ دیتے یا اگر قطع نزاع کے لئے اپنی زندگی میں ہی جانشینی کا معاملہ طے کر جانا ضروری سمجھتے تو مسلمانوں کے اہلِ علم و اہلِ خیر کو جمع کر کے انہیں آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے دیتے کہ ولی عہدی کے لئے اُمت میں موزوں تر

---

[1] مولانا نے حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص کی تدبیروں کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی ناکامی اور فکری بے بسی کا ذکر فرما کر حضرت علیؓ کے فہم و تدبر کو کوئی اچھا خراجِ عقیدت پیش نہیں کیا۔

تعجب ہے کہ مولانا نے جس بلاواسطہ انداز فکر پر حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو بُری طرح رگید ڈالا تھا (خلافت و ملوکیت ص۱۳۳ سطر ۱۵) یہاں پہنچ کر وہی بات خود بھی بالواسطہ طور پر حضرت علیؓ کے لئے بیان کر دی۔

آدمی کون ہے۔ لیکن اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لئے خوف ولالچ کے ذرائع سے بیعت لے کر انہوں نے اس امکان کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اس تجویز کی ابتدا حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی طرف سے ہوئی حضرت معاویہؓ انہیں کوفے کی گورنری سے معزول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے انہیں اس کی خبر مل گئی فوراً کوفہ سے دمشق پہنچے اور یزید سے مل کر کہا کہ "صحابہؓ کے اکابر اور قریش کے بڑے لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیرالمومنین تمہارے لئے بیعت لے لینے میں کیوں تامل کر رہے ہیں"۔ یزید نے اس بات کا ذکر اپنے والد ماجد سے کیا۔ انہوں نے حضرت مغیرہؓ کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا بات ہے جو تم نے یزید سے کہی۔ حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا "امیرالمومنین! آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتل عثمانؓ کے بعد کیسے کیسے اختلافات اور خون خرابے ہوئے۔ اب بہتر یہ ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی میں ہی ولی عہد مقرر کر کے بیعت لے لیں۔ تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف برپا نہ ہو"۔

حضرت معاویہؓ نے پوچھا اس کام کو پورا کرا دینے کی ذمہ داری کون لے گا؟ انہوں نے کہا اہلِ کوفہ کو میں سمجھا لوں گا اور اہلِ بصرہ کو زیاد، اس کے بعد پھر اور کوئی مخالفت کرنے والا نہیں ہے۔

یہ بات کر کے حضرت مغیرہؓ کوفہ آئے اور دس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دے کر اس بات پر راضی کیا کہ ایک وفد کی صورت میں حضرت معاویہؓ کے پاس جائیں اور یزید کی ولی عہدی کے لئے ان سے کہیں۔ یہ وفد حضرت مغیرہؓ کے بیٹے موسیٰ بن مغیرہؓ کی سرکردگی میں دمشق گیا اور اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔

بعد میں حضرت معاویہؓ نے موسیٰ کو الگ بلا کر پوچھا تمہارے باپ نے

ان لوگوں سے کتنے میں ان کا دین خریدا ہے؟
اُنہوں نے کہا تیس ہزار درہم میں۔ حضرت معاویہؓ نے کہا تب تو ان کا دین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے لہ
(خلافت وملوکیت از صفحہ ۱۴۸ سطر ۶ ـــ ص ۱۴۹ سطر ۱۱)

لہ اللہ اکبر مولانا اپنی دلیری کی جزا کے لئے اپنے اللہ کے ہاں حاضری تک آزاد ہی ہیں۔ اُن کے قلم کو کون روک سکتا ہے۔ کتنی زیادتی ہے کہ جن اصحابؓ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے اصحابؓ ستاروں کی مانند ہیں تم جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت ہی پاؤ گے اور مولانا ہیں کہ اُن میں اصحاب کبارؓ تک کو اپنی سیاسی اغراض سے جعلساز، مفتری، دھوکا باز، جھوٹے اور بکاؤ مال ثابت کرنے میں اپنے علم و فضل کا پورا زور صرف کر رہے ہیں۔ سبحان اللہ اگر اصحاب کبارؓ کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ذاتی غرض سے ایمان فروشی پر اُتر آتے ہیں اور اپنا ایمان داؤ پر لگا دیتے ہیں اور دوسروں کا ایمان خریدنے نکل آتے ہیں تو پھر وائے گردش امروز بود فردا ئے
افسوس ہے کہ مولانا نے تاریخی روایت میں بھی تصرف کیا ہے اور اس کے حوالہ میں بھی ایک مورخ یا مصنف کے آداب سے تجاوز کیا ہے۔ مولانا نے یہ روایت ابن اثیر سے لی ہے اور اس کے مندرجات کی تائید میں البدایہ کا نام محض حوالہ کو بوجھل بنانے کے لئے ٹانک دیا ہے۔ ابن اثیر نے بڑی وضاحت سے تحریر کیا ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے بڑھاپے کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا اور حضرت معاویہؓ نے ان کی جگہ سعید بن العاص کو مقرر کر دیا تھا مگر مولانا اس پورے ذکر کو گول کر گئے اور ایک صاف بدیہی بات کو سازش بنا کر پیش کر دیا۔ مگر چونکہ یزید کی ولیعہدی کی بات مغیرہؓ نے اٹھائی تھی اسلئے
(باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا مزید فرماتے ہیں:

اس رُوداد سے دو باتیں بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ یزید کی ولیعہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس طرح اُمتِ محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں لے

دوسرے یہ کہ یزید بجائے خود اس مرتبے کا آدمی نہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے قطع نظر کرتے ہوئے کوئی شخص یہ رائے قائم کرتا کہ حضرت معاویہؓ کے بعد اُمت کی سربراہی کے لئے وہ موزوں ترین آدمی ہے۔

(خلافت وملوکیت صفہ ۱۵۱ سطر ۲ تا ۸)

حضرت معاویہؓ راشی تھے

مولانا کی اطلاع کے مطابق:

زیاد کی وفات (۵۳ھ) کے بعد حضرت معاویہؓ نے یزید کو ولی عہد بنانے کا فیصلہ کر لیا اور بااثر لوگوں کی رائے ہموار کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کو ایک لاکھ

حضرت معاویہؓ نے ان پر زور دیا کہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں اور اپنی تجویز کے سلسلہ میں خود ہی اہل الرائے سے رجوع کریں اور عوام سے استصواب کریں۔

لے مولانا کے اس اسلوب گفتگو پر، بجز اس کے کیا کہا جائے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

درہم بھیجے اور یزید کی بیعت کے لیئے راضی کرنا چاہا۔
(خلافت وملوکیت صفحہ ۱۵۱ سطر ۹ تا ۱۱)

حضرت معاویہؓ کی دھونس اور دھاندلی

مولانا کا ارشاد ہے کہ:

عراق، شام اور دوسرے علاقوں سے بیعت لینے کے بعد حضرت معاویہؓ خود حجاز تشریف لے گئے۔ کیونکہ وہاں کا معاملہ سب سے اہم تھا اور دنیائے اسلام کی وہ بااثر شخصیتیں جن سے مزاحمت کا اندیشہ تھا وہیں رہتی تھیں۔ مدینے کے باہر حضرت حسینؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ ان سے ملے۔ حضرت معاویہؓ نے اُن سے ایسا درشت برتاؤ کیا کہ وہ شہر چھوڑ کر مکّے چلے گئے۔ اس طرح مدینے کا معاملہ آسان ہوگیا۔ پھر اُنہوں نے مکّے کا رُخ کیا اور ان چاروں اصحابؓ کو خود شہر کے باہر بُلا کر ان سے ملے۔ اس مرتبہ اُن کا برتاؤ اُس کے برعکس تھا جو مدینے کے باہر اُن سے کیا تھا۔ ان پر بڑی مہربانیاں کیں، انہیں اپنے ساتھ لیئے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ پھر تخلیہ میں بُلا کر انہیں یزید کی بیعت پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جواب میں کہا آپ تین کاموں میں سے ایک کام کیجئے۔ یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کسی کو جانشین نہ بنایئے لوگ خود اُسی طرح کسی کو اپنا خلیفہ بنالیں گے جس طرح اُنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو بنایا تھا۔ یا پھر وہ طریقہ اختیار کیجئے جو حضرت ابوبکرؓ نے کیا کہ اپنی جانشینی کے لئے حضرت عمرؓ جیسے شخص کو مقرر کیا۔ جن سے اُن کا کوئی

دُور پرے کا رشتہ بھی نہ تھا۔ یا پھر وہ طریقہ اختیار کیجئے جو حضرت عمرؓ نے کیا کہ چھ آدمیوں کی شوریٰ تجویز کی اور اس میں ان کی اولاد میں سے کوئی شخص شامل نہ تھا۔

حضرت معاویہؓ نے باقی حضرات سے پوچھا۔ آپ لوگ کیا کہتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا ہم بھی وہی کہتے ہیں، جو ابن زبیرؓ نے کہا ہے۔ اس پر حضرت معاویہؓ نے کہا۔ اب تک میں تم لوگوں سے درگزر کرتا رہا ہوں، اب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم میں سے کسی نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی کہا تو دوسری بات اُس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی تلوار اُس کے سر پر پہلے پڑ چکی ہوگی۔ پھر اپنے باڈی گارڈ کے افسر کو بُلا کر حکم دیا کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک ایک آدمی مقرر کر دو اور اُسے تاکید کر دو کہ ان میں سے جو بھی میری بات کی تائید یا تردید میں زبان کھولے اُس کا سر قلم کر دے۔

اس کے بعد وہ اُنہیں لیے ہوئے مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ "یہ مسلمانوں کے سردار اور بہترین لوگ ہیں جن کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا۔ یزید کی ولی عہدی پر راضی ہیں۔ اور اُنہوں نے بیعت کر لی ہے لہٰذا تم لوگ بھی بیعت کر لو۔ اب لوگوں کی طرف سے انکار کا سوال ہی باقی نہ تھا، اہلِ مکّہ نے بھی بیعت کر لی لے (خلافت و ملوکیت صـ۱۵۲ سطر ۸ تا آخر اور صفحہ ۱۵۳ سطر ۱ تا ۱۱)

لے حضرت معاویہؓ کا فریب تو خیر ایک عام بات تھی اور مولانا کے بقول ایسی باتیں اُن کا معمول ہی تھا اور مولانا نے اُسے بیان کر کے لذّت حاصل کر لی مگر اُن چاروں بزرگوں کا کیا باقی چھوڑا جن میں سے ہر ایک کے ہزاروں پیرو کار مولانا نے خود ہی شمار کر کے بتائے تھے اور جن سے مزاحمت کا سخت خطرہ تھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

مزید فرماتے ہیں:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت اس نوبت کی خلافت نہ تھی کہ

کہاں مولانا کا وہ زعم اور کہاں خود مولانا کا ہی یہ اظہار کہ وہ لوگ تلوار کی دھمکی سے ہی دم بخود ہو گئے۔ پہلے مدینہ سے بھاگ کر مکہ پہنچے اور جب مکہ میں بھی معاویہؓ نے اُن کو ہموار نہ پایا تو سخت دھمکی دی کہ خبردار جو زبان کو حرکت بھی دی۔ اور دھمکی بھی یہ کہ اگر تم نے میری تردید میں خواہ تائید میں بھی زبان ہلائی تو اُسی لمحے گردن کٹ کر زمین پر گر چکی ہوگی۔ اور اتنے سے ہی ان کی سانس سینے میں بند ہو کر رہ گئی۔ معاویہؓ نے صریحاً جھوٹ کہا تھا کہ یہ لوگ یزید کی بیعت کر چکے ہیں مگر کیا مجال جو اُن کی حق گوئی کے کان پر جوں بھی رینگی ہو۔ ایک طرف مولانا حضرت حسینؓ کو اس مقام پر دکھاتے ہیں کہ جب انہوں نے حق کو مغلوب ہوتے دیکھا اور باپ کے بعد بیٹے کی حکومت کے بدعی کارنامے کو سامنے پایا تو اصل اسلام کو قائم کرنے کے لئے میدان میں کُود گئے۔ اس وقت صحابہؓ کی بھی بڑی تعداد موجود تھی اور اگرچہ اُن سے بھی کسی نے اُن کا ساتھ نہ دیا مگر وہ اکیلے ہی ایک جابر سلطنت سے ٹکرا گئے اور اپنی جان دے کر دین کی آبرو بچا لی۔ مگر دوسری طرف یہ عالم ہے کہ معاویہؓ کی ایک گھُرکی سے ہی وہ دم بخود ہو گئے۔ اور باپ کے بعد بیٹے کی بدعت کے جواز کو پوری خاموشی سے قبول کر لیا آہ ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اور جس عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو مولانا پہلے مدینے سے بھگا کر مکہ لے گئے ہیں جہاں معاویہؓ کی تلوار اُن کے سر پر لٹکتی دکھائی ہے وہ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق مکہ گئے ہی نہیں تھے بلکہ وہ مدینہ میں ہی رہے اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کے ارشاد کے مطابق وہیں بیعت کر لی تھی (بخاری جلد ۲) مگر مولانا کو بخاری کے مقابلہ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں - اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے ، وہ بہر حال خلیفہ ہونا چاہتے تھے. انہوں نے لڑکر خلافت حاصل کی - مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا - لوگوں نے اُن کو خلیفہ نہیں بنایا تھا وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے [1] اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں کے لئے بیعت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا - اس وقت اگر ان سے بیعت نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے بلکہ اس کے معنی خونریزی اور بدامنی کے تھے.

ابنِ کثیر کی روایت پر زیادہ اعتماد ہے ، کیونکہ وہ مولانا کی خواہش کے مطابق ہے -

[1] کیا مولانا کے نزدیک حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ مسلمان نہیں تھے ؟ کیونکہ حضرت معاویہؓ کو انہی بزرگوں نے خلیفہ بنایا تھا اور ان کے بنانے سے ہی وہ خلیفہ بنے تھے - ان کی خلافت پر سب سے پہلی بیعت حضرت حسنؓ نے کی تھی - اور اسی ایک پہلی بیعت سے ہی حضرت معاویہؓ کی خلافت کی کہانی چلتی ہے - ورنہ اس سے پہلے پورے بیس برس کی حکومت میں حضرت معاویہؓ کی زبان پر خلافت کا تذکرہ کبھی نہیں آیا ، نہ کسی نے سُنا نہ انہیں ایسا کوئی ادعا تھا - اور کیا بیعت کرتے وقت حضرت حسنؓ کے سر پر کوئی تلوار لٹک رہی تھی یا کیا انہیں گرفتار یا محصور کرکے ان سے جبراً بیعت لی گئی تھی ؟ پھر معاویہؓ اپنے زور سے خلیفہ کیوں کر بنے ؟

جسے امن اور نظم پر ترجیح نہیں دی جا سکتی تھی ۱؎ اسی لئے امام حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری (ربیع الاوّل ۴۱ھ) کے بعد تمام صحابہؓ و تابعین اور صلحائے اُمت نے ان کی بیعت پر اتفاق کیا اور اس کو عام الجماعۃ اسی بنا پر قرار دیا کہ کم از کم باہمی خانہ جنگی تو ختم ہوئی ۲؎

(خلافت و ملوکیت ص۱۵۸ سطر ۱۴ تا آخر صفحہ)

۱؎ کیا صحیح فرمایا ہے مولانا نے کہ اب اگر معاویہؓ کی بیعت نہ کر لی جاتی تو بہت خونریزی کا خطرہ تھا حالانکہ اب تک اس خونریزی سے بچنے پر ہی توجہ رہی تھی اور پورا ملک امن وامان سے ہی بستا آ رہا تھا۔ کسی مسلمان کی نکسیر تک نہ پھوٹی تھی۔ اب معاویہؓ کی ضد کی وجہ سے ہی ایسا خطرہ تھا۔ مولانا! یہ خونریزی نہ پہلے معاویہؓ کی وجہ سے ہوئی تھی نہ اب ہی ان سے کوئی ایسا خطرہ متوقع تھا۔ اس خونریزی سے بچنے کے لئے ہی تو وہ سفید کاغذ اپنے دستخطوں سے اپنے فریقِ ثانی کے ہر قابلِ ذکر آدمی کو بھیج دیتے تھے کہ اس کاغذ پر صلح کی شرطیں تم خود اپنی مرضی کے مطابق لکھ لو ورنہ اُن کے ہاں کمزوری کہاں تھی۔ اور پہلی بار جب خونریزی رُکی تو وہ بھی معاویہؓ کی حکمتِ عملی سے ہی رُکی تھی۔ مگر آپ نے اسے بھی معاویہؓ کی جعلسازی اور جنگی چال کہا۔

۲؎ دیکھئے پوری اُمت نے اس صلح کو ایک بابرکت کارنامہ کہا اور آپ اس کو بھی مجبوری قرار دیتے ہیں سبحان اللہ ع

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیب ست

ابن کثیر لکھتے ہیں: پوری اسلامی سلطنت میں ہر طرف حضرت معاویہؓ کی خلافت پر اتفاق ہو گیا۔ سلطنت کے تمام مشرقی، مغربی اور دور و نزدیک کے تمام صوبوں نے ان کی خلافت کی توثیق کر دی (باقی اگلے صفحہ پر)

معاویہؓ کا اعترافِ جُرم

مولانا کا کہنا ہے کہ :

حضرت معاویہؓ خود بھی اس پوزیشن کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اپنے زمانۂ خلافت کے آغاز میں اُنہوں نے مدینہ طیبہ میں تقریر کرتے ہوئے خود فرمایا :

"بخدا میں تمہاری حکومت کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ تم میرے برسرِاقتدار آنے سے خوش نہیں ہو اور اسے پسند نہیں کرتے ۔ اس معاملہ میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے میں خوب جانتا ہوں مگر میں نے اپنی اس تلوار کے زور سے تم کو مغلوب کرکے اسے لیا ہے" لہ

(خلافت و ملوکیت صہ ۱۵۹ سطر ۱-۲- ۷ تا ۱۰)

اور اس سال کا نام عام الجماعۃ رکھا کیونکہ تفرقے کے بعد ایک خلیفہ پر دوبارہ تمام مسلمان جمع ہو گئے تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۹ صہ ۱۹-۲۰)

اور اگر مولانا کے نزدیک عالم اسلام کی یہ یک جہتی اور مثالی اتحاد کم از کم خانہ جنگی تو ختم ہوئی ہی ہے ۔ تو اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہے؟

لہ یہ ایک بے سند روایت ہے اور مولانا نے اپنے لئے مفید مطلب سمجھ کر ہی نقل کر دی ہے ورنہ اس کی اصل کوئی نہیں ۔ مولانا نے جس البدایہ کے صفحہ ۱۳۲ سے اس کو لیا ہے اُسی البدایہ کے مصنف نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں صہ ۱۹ پر بڑے اعتماد سے یہ خبر دی ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

جبرو استبداد

- جبری بیعت اور خاندانوں کی بادشاہت کا ایک مستقل طریقہ چل پڑا۔[1] (خلافت و ملوکیت صہ ۱۵۹ سطر ۱۴ تا ۱۷)
- خلفاء کے طرزِ زندگی میں تبدیلی آگئی اور بادشاہ قسم کے خلفاء نے قیصر و کسریٰ کا سا طرزِ زندگی اختیار کر لیا (صفحہ ۱۶۱ سطر ۱۴-۱۵)

امانت میں خیانت

- بیت المال کی حیثیت میں تبدیلی آگئی۔ بیت المال کا اسلامی تصور یہ تھا کہ وہ خلیفہ اور اس کی حکومت کے پاس خدا اور خلق کی امانت ہے۔ دورِ ملوکیت میں بیت المال کا یہ تصور اس تصور سے بدل گیا کہ

معاویہؓ ایک جید السیرۃ یعنی عمدہ سیرت کے مالک حسن التجاوز، انتہائی درگزر کرنے والے، جمیل العفو، عفو و درگزر کو پسند کرنے والے اور کثیر الستر یعنی دوسروں کی پردہ پوشی کرنے والے انسان تھے۔ (البدایہ جلد ۸ صہ ۱۱۹)
اور ظاہر ہے کہ یہ ساری خوبیاں مولانا کے بیان کردہ جبر و تشدد کے منافی ہیں۔

[1] اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کی بیعت کے بارے میں کیا ارشاد ہے! معاویہؓ پر تو الزام ہی ہے مگر اس امر واقعہ کے متعلق آپ کیا صفائی پیش کریں گے!

خزانہ بادشاہوں اور شاہی خاندان کی ملک ہے اور رعیت بادشاہوں کی باجگذار ہے۔ (خلافت وملوکیت صہ ۱۶۱ سطر ۱۰-۱۱-۱۸-۱۹)

حلال وحرام سے بے نیازی

- بیت المال کی آمدنی کو دیکھئے تو نظر آتا ہے کہ اس کے بارے میں بھی حلال وحرام کی تمیز اُن کے ہاں اُٹھتی چلی گئی۔¹ (صہ ۱۶۲ سطر ۶-۷)

دستورِ زبان بندی

- اظہارِ رائے کی آزادی کا خاتمہ ہوگیا (صہ ۱۶۳)

خوشامد پسندی

- ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور زبانیں بند کردی گئیں اور اب قاعدہ یہ ہوگیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو ورنہ چُپ

---

¹ حضرت معاویہؓ کے عہد میں تو بیت المال کی حیثیت خلافتِ راشدہ کے دور سے ہرگز مختلف نہ تھی ورنہ مولانا کوئی ایک آدھ ہی واقعہ نقل فرما دیتے جس سے معاویہؓ کی شاہ خرچی اور اُن کی ذات سے بیت المال کا استحصال ثابت ہوسکتا اور جہاں تک دورِ معاویہؓ اور یزید میں بیت المال کی آمدنی میں حرام وحلال کی تمیز اُٹھ جانے کا تعلق ہے اس کی گواہی مولانا سے نہیں لی جائے گی بلکہ اس غرض سے خاندانِ نبوت کے ایک ایک فرد کی گواہی طلب کرنا مناسب ہے جو اس حرام کی کمائی کو دیکھتے بھی رہے اور وظیفوں کی صورت میں لاکھوں روپے حاصل کرتے رہے اور کھاتے پیتے پہنتے رہے۔ اس کی گواہی اُمّہات المومنینؓ دیں گی۔ حسنؓ حسینؓ اور اُن کی اولاد دے گی۔ مولانا کی گواہی صحیح نہیں ہے۔

رہو۔ اگر تمہارا ضمیر اتنا ہی زور دار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لئے تیار ہو جاؤ [۱]
(خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۶۳ سطر ۱۸ تا ۲۰)

- لوگوں کی آواز کو جبر و ستم سے دبانے کا سلسلہ بڑھتا گیا (صفحہ ۱۶۶ سطر ۵)
- خوشامد اور ضمیر فروشی کی قیمت مارکیٹ میں چڑھتی اور حق پرستی اور راست بازی کی قیمت گرتی گئی۔ (صفحہ ۱۶۷ سطر ۵-۶)

عدالت ختم شوریٰ کالعدم

- عدلیہ کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا [۲] (صفحہ ۱۶۷)
- شورائی حکومت کا خاتمہ ہو گیا (صفحہ ۱۶۸)

---

[۱] سبحان اللہ حضرت معاویہؓ کے ہاں تو منافقین تک گستاخیاں کرتے تھے اور جھڑکی تک نہیں پاتے تھے۔ دورِ معاویہؓ میں تو زبانوں پر قفل والی بات صریحاً جھوٹ ہے۔ ایک مرتبہ اہلِ دربار نے معاویہؓ سے شکایت کی آپ انتہائی بدتمیز اور گستاخ لوگوں سے بھی عفو سے ہی کام لیتے ہیں۔ تو فرمایا مجھے اس بات سے شرم محسوس ہوتی ہے کہ لوگوں کا جرم میرے حلم پر غالب آجائے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۵)

[۲] حضرت معاویہؓ کی کوئی بے عدلی تاریخ کے حوالے نہیں ہوئی اور جن کا ذکر کیا گیا ہے ان میں بھی کسی کو بے عدلی کہنا تعصب کی وجہ سے ہی ہے ورنہ حضرت معاویہؓ تو کسی گورنر کے خلاف شکایت صحیح ثابت ہونے پر گورنر تک کو بھی معزول کر دیتے تھے۔
(طبری جلد ۴ واقعات ۵۵ھ)

اسلامی ریاست کے بنیادی قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ تھا کہ حکومت مشورے سے کی جائے مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو یہ قاعدہ بھی بدل گیا اور شوریٰ کی جگہ شخصی استبداد نے لے لی، حق شناس اور حق گو اہلِ علم سے بادشاہ اور بادشاہوں سے یہ لوگ دور بھاگنے لگے[۱]

(خلافت و ملوکیت صد ۱۶۸ آخری دو سطور)

پھر وہی جاہلیت

- نسلی اور قومی عصبیتوں کا ظہور ہونے لگا (خلافت ملوکیت صد ۱۶۹)
- قوم، نسل، وطن اور قبیلہ کی وہ تمام جاہلی عصبیتیں پھر سے اُبھر آئیں جنہیں اسلام نے ختم کرکے خدا کا دین قبول کرنے والے تمام انسانوں کو یکساں حقوق کے ساتھ ایک امت بنایا تھا[۲]

(خلافت و ملوکیت صد ۱۶۹ سطر آخر صد ۱۷۰ ا سطر ا)

---

[۱] حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد شوریٰ کا نظام صرف معاویہؓ کے ہاں ہی تو تھا۔ آپ معاویہؓ کے مقابلہ میں کسی دوسری جگہ شورائیت کا نشان دے سکتے ہیں؟

[۲] قوم و نسل اور قبیلہ کی عصبیت کا معاملہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں تو مولانا نے حضرت معاویہؓ سے محبت کی بنا پر ہی اُن کے کھاتے میں ڈال دیا ہے ورنہ مولانا سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ نسل و نسب کا فتنہ کسی اور دور کی یادگار ہے۔ مولانا نے نہ جانے کیوں، پچاس برس قبل کی تاریخ سے غض بصر روا رکھنا مناسب سمجھا ہے۔ ورنہ انہیں علم ہے کہ یہ فتنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی جبکہ ابھی آپ سپردِ خاک بھی نہ ہوسکے تھے اُٹھ آیا تھا اور پھر خلافت کی ہر تبدیلی پر ہر بار ہی اُٹھتا رہا ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

بے آئینی اور قانون شکنی

- اسلام جس بنیاد پر دنیا میں اپنی ریاست قائم کرتا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت سب پر بالا ہے۔ حکومت اور حکمران، راعی اور رعیت، بڑے اور چھوٹے، عوام اور خواص سب اس کے تابع ہیں کوئی اس سے آزاد یا مستثنیٰ نہیں ہے۔

(خلافت و ملوکیت ص۱۷۲ سطر ۱۴ تا ۱۶)

بادشاہوں نے اپنے مفاد اور اپنی سیاسی اغراض اور خصوصاً اپنی حکومت کے قیام و بقا کے معاملہ میں شریعت کی عائد کی ہوئی کسی پابندی کو توڑ ڈالنے اور اس کی باندھی ہوئی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کیا[1] (خلافت و ملوکیت ص۱۷۳ سطر ۳ تا ۵) یہ پالیسی حضرت معاویہؓ کے عہد سے ہی شروع ہو گئی تھی (ص۱۷۳ سطر ۱۴)

اور پھر حضرت عثمانؓ کی شہادت تک جو کچھ بھی ہوا اسی فتنہ کی کرشمہ کاری ہی تھی مولانا کو اتنی دور آگے نکل کر اسے حضرت معاویہؓ کی جھولی میں ڈالنے کا تکلف کوئی سیاسی مسئلہ ہی ہو سکتا ہے ورنہ اس کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

[1] قانون کی برتری کو ختم کرنے اور اپنی حکومت کے قیام و بقا کے لئے شریعت کی سرحدیں توڑنے کا الزام حضرت معاویہؓ پر کسی طرح بھی عاید نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ معاویہؓ کو اپنی پوری زندگی اپنی حکومت کے قیام و بقا کا جھنجھٹ ہی کبھی پیش نہیں آیا نہ ان کی حکومت کبھی خطرہ میں پڑی، نہ ان کو اس کے بچانے کی کبھی فکر ہوئی۔

ایسے امور کو اجاگر کرنے کی تو ان لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت معاویہؓ کی اسلام سوز حرکتیں

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدینؓ کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے نہ مسلمان کافر کا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانہ حکومت میں مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا۔ اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا۔ (خلافت وملوکیت صہ ۱۷۳ سطر ۱۵ تا ۱۸) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آکر اس بدعت کو موقوف کیا [1]

جن کے پاس حکومت نہ ہو اور وہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہر سوچ سوچیں اور ہر قدم اٹھائیں معاویہؓ کو تو ایسی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کی حکومت حضرت فاروقِ اعظمؓ کے وقت سے قائم تھی، عثمانؓ کے عہد میں قائم رہی اور جوان ہوئی۔ پھر ان کی پوری زندگی وہ جوان ہی رہی۔ پھر انہیں اس کے قیام وبقا کی فکر کیونکر ہوتی۔ یہ مرحلہ حضرت علیؓ کو ضرور پیش آیا تھا جنہیں حکومت حاصل کرنے، اسے بچانے اور اس کی بقا کے لئے مدینہ سے جمل تک اور جمل سے صفین تک بھرپور سفر کرنے پڑے۔

[1] زہری کی جس روایت کے بل بوتے پر مولانا نے یہ بات اٹھائی ہے انتہائی غیر واضح روایت ہے اگر مولانا ہی بات کھول دیتے۔ تو ان کی بات کچھ وزن حاصل کرلیتی مگر انہوں نے بھی حضرت معاویہؓ کی روش کو بدعت کہہ کر جی ٹھنڈا کرلیا حالانکہ اُنہوں نے جن بزرگوں یعنی زہری اور ابن کثیر کے نام سے بات کی ہے وہ اس کو بدعت نہیں کہتے روایت دوسروں سے لی گئی ہے اور بدعت کے الفاظ اُس میں مولانا کے قلم کا تبرک ہے یعنی نام اُن کا ہے اور کام اِن کا ہے۔

• دیت کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا۔ سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمانوں کے برابر ہوگی مگر حضرت معاویہؓ نے اس کو نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی۔[1] (صہ ۱۷۳ سطر ۲۰-۲۱ صہ ۱۷۴ سطر ۱)

حضرت علیؓ کو گالیاں

مولانا فرماتے ہیں:

---

[1] دیت کے بارے میں بھی مولانا کا یہ ارشاد صحیح نہیں ہے کہ سنت کچھ اور تھی اور حضرت معاویہؓ کا فعل دوسرا ہے کیونکہ معاہد کی دیت کا معاملہ دورِ نبویؐ سے معاویہؓ کے عہد تک مختلف فیہ ہی رہا ہے اور آج بھی مختلف ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی حسبِ حالات و ضرورت کمی بیشی ہوتی رہی ہے اور بعد میں بھی یہی صورت قائم تھی۔ محدثین بھی اس بارے میں مختلف ہیں اور آئمہ کے ہاں بھی کسی ایک بات پر اتفاق نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ پوری دیت کے قائل ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہودی اور نصرانی کی دیت ایک تہائی تھی، امام مالکؒ نصف کے قائل ہیں اور یہی مسلک عمر بن عبدالعزیزؒ کا تھا اس کی بنیاد اجتہاد پر ہے اور مجتہدین باہم مختلف الرائے ہو سکتے ہیں۔ حضرت معاویہؓ پوری دیت وصول کرتے تھے جس میں سے نصف مقتول کے وارثوں کو ادا کی جاتی تھی اور باقی نصف بیت المال میں داخل ہوتی تھی۔ چنانچہ "بدایۃ المجتہد" میں ہے فجعل فی بیت المال نصفھا و اعطیٰ اہل المقتول نصفھا اور مولانا کا یہ ارشاد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ پر تہمت اور بہتان ہے کہ وہ نصف خود لے لیتے تھے۔

- ایک نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور اُن کے حکم سے اُن کے تمام گورنر خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے حتیٰ کہ مسجد نبویؐ میں منبرِ رسولؐ پر عین روضۂ نبویؐ کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ (خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۷۴ سطر ۲ تا ۸)

لہ حضرت معاویہؓ پر حضرت علیؓ کو گالیاں نکالنے اور نکلوانے کا الزام محض حضرت معاویہؓ کو گالیاں دینے کا بہانہ پیدا کرنے کے لئے ہے اور اسی بہانے مولانا نے اپنی اس تحریر میں انہیں ساب و شاتم مخالف شرع انسانی اخلاق سے گیا گزرا، گندے کام کرنے والا گھناؤنے کردار کا مالک کہہ کر اپنی آتشِ غضب بجھائی ہے ورنہ معاویہؓ کے بارے میں یہ الزام سفید جھوٹ ہے۔ بات صرف یہ تھی کہ معاویہؓ کے ساتھی اکثر ہی اُن لوگوں پر لعنت بھیجتے جنہوں نے خلیفۂ رسولؐ کو بے دردی سے ذبح کیا تھا اور اسی کو مولانا اور اُن کے ساتھی حضرت علیؓ کو گالیاں کہتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی نادان دوستی سے بالواسطہ طور پر حضرت علیؓ کو قاتل بنا دیتے ہیں جبکہ اس افسانے کا ایک رُخ یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ اور اُن کے ساتھیوں پر اُن کا نام لے کر لعنت کرتے تھے پھر جب حضرت معاویہؓ اور اُن کے ساتھیوں کو حضرت علیؓ کے اس فعل کی خبر ملی تو وہ بھی جواباً علیؓ اور اُن کے ساتھیوں پر لعنت کہنے لگے (طبری) (باقی اگلے صفحہ پر)

مالِ غنیمت میں تصرف

مولانا کی تحقیق یہ ہے کہ :

- مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہؐ کی خلاف ورزی کی۔ کتاب وسنّت کی رُو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیئے اور باقی چار حصّے اُس فوج میں تقسیم کئے جانے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا اُن (یعنی معاویہؓ) کے لئے الگ نکال لیا جائے اور پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

(خلافت وملوکیت صد ۱۷۴ سطر ۱۳ تا ۱۷)

معاویہؓ کا اخلاقی تسفّل

مولانا فرماتے ہیں :

مگر ہم صحابہؓ کو ایسا نہیں سمجھتے کہ وہ ایک دوسرے کو گالیوں کی زبان سے مخاطب کرتے تھے کیونکہ یہ امر اخلاقِ نبویؐ کے خلاف ہے اور یہ لوگ اخلاق نبویؐ کا آئینہ تھے۔ یہ صرف مولانا کی مجبوری ہے کہ ایک مکروہ بدعت معاویہؓ کے نام لگا کر ایک مکروہ جرم کو سرانجام دینے میں لذت پاتے ہیں ورنہ اس کی اصل کوئی نہیں ہے تفصیلی بحث اپنی جگہ دیکھئے۔

لے یہ ایک سریحا جھوٹی کہانی ہے جو روافض کے دماغوں کی پیداوار ہے اس ذیل کی تفصیلی بحث اپنے مقام پہ آگے چل کر آپ ملاحظہ کریں گے۔

• زیاد بن سمیہ کا استلحاق (زیاد کو اپنا بھائی قرار دینا) بھی حضرت معاویہؓ کے اُن افعال میں سے ہے جن میں اُنہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّمہ قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ زیاد طائف کی ایک لونڈی سمیہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں حضرت معاویہؓ کے والد ابوسفیانؓ نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ اور اسی سے وہ حاملہ ہوئی حضرت ابوسفیانؓ نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد اُنہی کے نطفہ سے ہے۔ جوان ہو کر یہ شخص اعلےٰ درجے کا مدبر، منتظم، فوجی لیڈر اور غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ثابت ہوا۔

حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا اور اُسنے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں۔ اُن کے بعد حضرت معاویہؓ نے اُس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد اُنہی کا ولد الحرام ہے۔ پھر اسی بنیاد پر اُسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا[1]

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۷۵ سطر ۱ تا ۱۲)

---

[1] حضرت معاویہؓ کا یہ فعل مکروہ تھا یا نہیں اور اس کی قانونی حیثیت کیا تھی یہ بحث تو آگے چل کر اپنے اصل مقام پر آئے گی مگر یہاں قابلِ غور بات حضرت مولانا کا اسلوبِ بیان ہے جس پر کوئی صحابہؓ دوست مسلمان فخر نہیں کر سکتا۔ مولانا کتنی بیباکی سے حضرت معاویہؓ کا منصبی ادب (باقی اگلے صفحہ پر)

گورنروں کو کھلی چھٹی

- حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا، اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کاروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُن کا گورنر عبداللہؓ بن عمرو ایک مرتبہ بصرے میں منبر پہ خطبہ دے رہا تھا۔ ایک شخص نے دورانِ خطبہ میں اس کو کنکر مار دیا۔ اس پر عبداللہؓ نے اس شخص کو گرفتار کرایا اور اُس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رُو سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا، تو اُنہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کر دوں گا مگر میرے عمّال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں [1]

(خلافت و ملوکیت ص۱۷۵ آخری ۵ سطور ص۱۷۶ پہلی دو سطور)

نظر انداز کر کے اُن کے بارے میں طنز بھری اور تحریف کے زہر میں بسی ہوئی گفتگو فرما رہے ہیں۔ اُن کا اپنی سیاسی اغراض سے شریعت کے احکام کی خلاف ورزی اُن کے مکروہ افعال اور پھر قلم کی شوخی کا یہ حال ہے کہ " والد ماجد کی زناکاری" ان کے " والد ماجد کا ولد الحرام" کا صوتیانہ اسلوب ایک صحابی اور صحابی کے صحابی بیٹے کے بارے میں حضرت مولانا کی ہی ہمت ہے۔

[1] مولانا نے اس واقعہ کو صحیح طور پر نقل نہیں فرمایا۔ گورنر کا فعل اپنی جگہ جدا محلِ بحث ہے کہ اس نے اصل سے تجاوز کیوں کیا۔ مگر مولانا کی سادگی کتنی معصوم ہے کہ ملک کے گورنر کو جمعہ کے خطبہ میں کچھ لوگ روڑے کنکر مارنے لگتے ہیں اور مولانا فرماتے ہیں بھلا یہ بھی کوئی ایسا جرم ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

- زیاد کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کے ساتھ کوفہ کا بھی گورنر مقرر کیا اور وہ پہلی مرتبہ خطبہ دینے کے لئے کوفے کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہوا تو کچھ لوگوں نے اس پر کنکر پھینکے۔ اُس نے فوراً مسجد کے دروازے بند کروا دیئے اور کنکر پھینکنے والے تمام لوگوں کو (جن کی تعداد ۳۰ سے ۸۰ بیان کی جاتی ہے) گرفتار کرا کے اُسی وقت اُن کے ہاتھ کٹوا دیئے۔ کوئی مقدمہ اُن پر نہ چلایا گیا نہ کسی عدالت میں ان کو پیش کیا گیا۔ کوئی باقاعدہ قانونی شہادت ان کے خلاف پیش نہ ہوئی۔ گورنر نے محض اپنے انتظامی حکم سے اتنے لوگوں کو قطع ید کی سزا دے ڈالی جس کے لئے قطعاً کوئی شرعی جواز نہ تھا۔ مگر دربارِ خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا ۵

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۷۶ سطر ۲ تا ۹)

جس پر ملک کا سب سے بڑا حاکم مغلوب الغضب ہو جائے لیکن یہ تو جب معلوم ہوا گر مولانا بھی گورنر بن جاتے اور کوئی اُن پر روڑے پھینکتا اور پھر مولانا یا مولانا کے پیروکار حوصلہ کرتے۔ مولانا کو ضرور یاد ہوگا کہ حضرت علیؓ نے اپنے قاتل کا مُثلہ نہ کرنے کی وصیت فرمائی تھی مگر اُن کے پیروکاروں نے غصہ کی بہتات سے اس کا بُری طرح مُثلہ کیا حالانکہ حضرت حسنؓ موجود تھے اور جانتے تھے کہ یہ فعل حرام ہے تاہم اس معاملہ میں حضرت معاویہؓ کے پاس اس مقطوع الید شخص کے ورثاء نے حاضر ہو کر کہا تھا کہ گورنر نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ میں کاٹا ہے۔ اس پر معاویہؓ نے اس شخص کے ورثاء کو دیت پر راضی کر لیا اور گورنر کو معزول کر دیا۔ مگر مولانا یہ ساری کہانی گول کر گئے ہیں۔

۵ مولانا کس معصومیت سے فرماتے ہیں کہ زیاد گورنر خطبہ کے لئے اُٹھا تھا کہ کچھ لوگ ان پر روڑے کنکر پھینکنے لگے یعنی مولانا کے نزدیک (باقی اگلے صفحہ پر)

- اس سے بڑھ کر ظالمانہ افعال بُسر بن ابی ارطاۃ نے کئے ...... اس شخص نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبداللہؓ بن عباس کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو قتل کر دیا۔ ان بچوں کی ماں اس صدمہ سے دیوانی ہو گئی [1] (خلافت و ملوکیت صہ ۱۷۶ سطر ۱۱-۱۲)

- اسی ظالم شخص (بُسر بن ابی ارطاۃؓ) کو حضرت معاویہؓ نے ہمدان پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا جو اُس وقت حضرت علیؓ کے قبضہ میں تھا۔ وہاں اُس نے دوسری زیادتیوں کے ساتھ ایک عظیم کام یہ کیا کہ جنگ میں جو مسلمان عورتیں پکڑی گئیں اُنہیں لونڈیاں بنا لیا۔ یہ ساری کاروائیاں اس بات کا اعلان تھیں کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے اور سیاسی معاملات میں شریعت کی کسی حد کے وہ پابند نہیں ہیں [2] (خلافت و ملوکیت صہ ۱۷۶ آخری دو سطور صہ ۱۷۷ پہلی چار سطور)

حضرت معاویہؓ کے مخالفین کا حضرت معاویہؓ کے گورنروں کو یوں کھلی مجلس میں مسجد کے اندر خطبہ کی حالت میں درّے مارنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلاشبہ گورنر کی یہ مبینہ کاروائی ظالمانہ ہی کہی جائے گی۔ ہمیں کسی کے ظلم کی حمایت مطلوب نہیں مگر یہ واقعہ ہی خلافِ حقیقت ہے۔ تاہم اگر کسی کو اس کی صحت پر اصرار ہو تو تاریخ کی کسی کتاب سے یہ ثابت نہیں ہے کہ یہ معاملہ حضرت معاویہؓ کے نوٹس میں لایا گیا تھا اور معاویہؓ کے نوٹس نہ لینے کا سوال مولانا کا پیدا کردہ ہے، ورنہ نوٹس لینے یا نہ لینے کا وہاں کوئی موقع ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔

[1] یہ واقعہ بھی صحیح نہیں۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ صرف مشہور بات ہی ہے مگر اس کی اصلیت کوئی نہیں ہے (البدایہ جلد ۸ صہ ۳۲۲)

[2] حضرت بُسر بن ابی ارطاۃؓ ایک صحابی ہیں مگر چونکہ حضرت علیؓ کے خلاف اور حضرت معاویہؓ کے حق میں سرگرم عمل تھے اس لیے مولانا کو دیا تی اگلے صفحہ پر)

وحشیانہ کاروائیاں

- سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا اسی دور (معاویہؓ) میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا لے (صفحہ ۱۷۷ سطر ۵ تا ۷) حضرت معاویہؓ کے دور کے علاوہ اُن کے بعد کی مبینہ ظالمانہ کاروائیوں کو مولانا نے اُنہی کے کھاتے میں شامل کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ پر جاتے جاتے یوں غصہ جھاڑا ہے۔
- حضرت معاویہؓ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے اور سیاسی اغراض

جتنی جھوٹ موٹ کی روایات بھی اُن کے بارے میں میسر آسکی ہیں اُنہوں نے لکھ دی ہیں ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی سے تو اس اخلاق کی ویسے ہی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پھر یہ روایات تو اپنی تاریخی حیثیت سے بھی خلافِ واقعہ ہیں اور روافض کے پروپاگنڈا کا حصہ ہیں۔ تفصیل آگے آئے گی۔

لے سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا نہ جاہلیت کی رسم تھی نہ بعد میں موقوف ہوئی۔ مولانا نے اس ضمن میں جتنے واقعات درج کئے ہیں ان کی حقیقت جاننے کے لئے تفصیلی بحث آگے چل کر اس کی اپنی جگہ ملاحظہ کریں۔ وہیں آپ محمد بن ابی بکرؓ کو جلا ڈالنے اور عمرو بن الحمق وغیرہ کے بارے میں بھی بحث ملاحظہ کر سکیں گے جس کا ذکر مولانا نے اپنی اس تحریر کے آخر میں حضرت معاویہؓ کی ظالمانہ کاروائیوں کے ضمن میں کیا ہے۔

کے لئے شریعت کی حدیں توڑ ڈالنے کی جو ابتداء ہو گئی تھی اُن کے اپنے نامزد کردہ یزید کے عہد میں وہ بدترین نتائج تک پہنچ گئی۔

(خلافت و ملوکیت صـ۱۷۹ سطر ۷ تا ۹)

اور اس سے دو سطر قبل آپ نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہ سوال کیا ہے کہ:

قطع نظر اس کے کہ جن لوگوں کے مرنے کے بعد یہ سلوک اُن کی لاشوں کے ساتھ کیا گیا ہے وہ کس پائے کے لوگ تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام نے کسی کافر کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کرنا جائز رکھا ہے؟ (جو حضرت معاویہؓ کے اپنے دور میں اور اُن کے بوئے گئے بیج کے نتیجہ میں اُن کے جانشینوں کے دَور میں ہوا۔ ناقل) صـ۱۷۹ سطر ۲ تا ۴) یہاں تک کہ پھر آپ نے عباسیہ دور کی ظالمانہ کاروائیوں کو بھی حضرت معاویہؓ کے کھاتے میں ڈال دیا ہے کیونکہ یہ دین پر دنیا کو بالا رکھنے کی بنیاد معاویہؓ نے ہی ڈالی تھی۔ ان سب باتوں کا جواب قارئین اگلی بحث میں مطالعہ کریں گے۔

باب دوم

فصلِ اوّل

خلافت وملوکیّت کی تصنیف

اس کتاب کی تصنیف کے اسباب و وجوہ اور مقاصد

مولانا مودودی صاحب کی یہ کتاب اُن کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو کتاب کی صورت اختیار کرنے سے پہلے کتنے ہی مہینوں تک اُن کے اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں شائع ہوتے رہے۔ اور اگرچہ ان مضامین کی زہرناکی سے اہلسنّت کے بہت سے حلقوں میں اُن دنوں بھی سخت اذیّت محسوس کی گئی تھی اور اس کا جوابی ردِّعمل بھی وقوع میں آیا تھا تاہم ماہنامہ کے بہت کم لوگوں تک رسا ہونے کی وجہ یہ ردِّعمل زیادہ عام نہیں ہو سکا تھا۔

لیکن پھر جب یہ مضامین کتابی صورت میں عوامی حلقوں تک پہنچے تو ملک بھر کے اصحاب دوست لوگوں میں غم و غصہ اور حُزن و ملال کی لہر دوڑ گئی۔

مولانا کی اس کتاب کے بارے میں یہ امر بہرحال ہی دریافت طلب ہے کہ اُنہیں آخر ایسی کونسی افتاد در پیش آئی کہ اُنہوں نے بیٹھے بٹھائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں ایک ایسی زہریلی کتاب لکھ دی جسے اصحابِ رسولؐ کے دامانِ آبرو سے کھیلنے کے سوا کچھ نہ کہا جا سکے۔ جس میں اُنہوں نے اصحابؓ کے خلاف اصحاب دشمن لوگوں کی شطحیات واہی تخلیقات اور خود ساختہ جھوٹ کہانیوں کا

جواب دینے کے بجائے اپنی ساری صلاحیتیں کذب وافترا کے ان پلندوں کی تائید وتصدیق میں صرف کر دیں۔

جس کے مندرجات کے مطالعہ سے اصحابؓ دشمن حلقے ہمیشہ لذت حاصل کریں اور اسے اپنی شطحیات کے حق میں بطور سند پیش کریں جبکہ دوسری طرف وہ اصحاب دوست لوگوں کے لئے ہمیشہ کرب واذیت کا موجب ہی بنی رہے۔ یہ صورتِ حال خود مولانا کے لئے بھی نشانِ استفہام تھی چنانچہ وہ اپنی اس کتاب کی وجۂ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جو لوگ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اُن کے سامنے واقعات کا یہ نقشہ آتا ہے کہ سنہ ۳۴-۳۳ تک خلافتِ راشدہ اسلامی حکومت کی بہترین خصوصیات کے ساتھ چل رہی ہے۔ پھر اس پر زوال آنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ سنہ ۶۰ تک پہنچتے پہنچتے وہ ساری خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی جگہ دنیوی حکومت کی امتیازی خصوصیات نمایاں ہو جاتی ہیں۔

جبری بیعت موروثی بادشاہت، قیصر وکسریٰ کا سا طورِ زندگی، راعیوں کا رعایا سے احتجاب، بیت المال کے معاملے میں احساسِ ذمہ داری کا فقدان، سیاست کا شریعت کی پابندی سے آزاد ہو جانا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی سے مسلمانوں کی محرومی، شوریٰ کے طریقے کا خاتمہ۔

غرض وہ تمام چیزیں جو ایک دنیوی حکومت کو ایک دینی حکومت سے ممیز کرتی ہیں وہ سنہ ۶۰ کے بعد سے ایک مستقل بیماری کی طرح مسلمانوں کی حکومت کو لگی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اب اس عظیم تغیر اور نہایت نمایاں تغیر کے متعلق ہم کیا کہیں۔ کیا یہ کہیں کہ یہ اچانک کسی سبب کے بغیر رونما ہو گیا ہے! یا یہ کہیں کہ اس دور کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ یا یہ کہیں کہ اس دور کی

تاریخ تو موجود ہے مگر اس کا ہر وہ واقعہ جو اس تغیر کے اسباب کی نشاندہی کرتا ہے ناقابلِ اعتماد ہے۔ اگرچہ انہی مورخین کی روایات اس سے پہلے اور اس کے بعد کے ادوار کے متعلق قابلِ اعتماد ہیں۔

یا یہ کہیں کہ اس دَور کی تاریخ کی طرف سے آنکھیں بند کر لینی چاہئیں اور ان سوالات پر غور، بحث، کلام کچھ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس ۲۶-۲۷ سال کے زمانے میں جو حالات ان نتائج کے موجب ہوئے ہیں ان کی ذمہ داری بعض صحابہؓ پر عائد ہو جانے کا خطرہ ہے ان میں سے کونسی بات آخر ہم صحت و معقولیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں جو تاریخ پڑھنے والے کسی عام شخص کو مطمئن کر دے لہ

اس باب میں مولانا کی پریشانی کا اندازہ فرمایئے جب آپ نے فرمایا۔ اب ہم نہ اسے چھپا سکتے ہیں نہ لوگوں کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم تاریخ اسلام کے اس دَور کا مطالعہ نہ کرو اور نہ خلقِ خدا کو اس پر کلام کرنے سے روک سکتے ہیں۔

اگر ہم صحت نقل اور معقول و مدلل اور متوازن طریقے سے اس تاریخ کو خود بیان نہ کریں گے اور اس سے صحیح نتائج نکال کر مرتب طریقے سے دنیا کے سامنے پیش نہ کریں گے تو مغربی مستشرقین اور غیر معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مسلمان مصنفین جو اسے نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں اور مسلمانوں کی نئی نسل کے دماغ میں اسلامی تاریخ کا ہی نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظامِ زندگی کا بھی غلط تصور بٹھا دیں گے۔ ۔ ۔ ۔

ابھی کچھ مدت پہلے پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے سیاسیات کے امتحان میں یہ سوالات آئے تھے کہ:

لہ خلافت و ملوکیت صہ ۳۰۱ سطر ۷ا سے صہ ۳۰۲ سطر ۱۲ تک

- قرآن نے ریاست کے متعلق کیا اصول بیان کئے ہیں؟
- عہدِ رسالت میں ان اصولوں کو کس طرح عملی جامہ پہنایا گیا؟
- خلافت کیا چیز تھی اور یہ ادارہ بادشاہی میں کیسے اور کیوں تبدیل ہوا؟

اب کیا معترض حضرات چاہتے ہیں کہ مسلمان طلبہ ان سوالات کے وہ جواب دیں جو مغربی مصنفین نے دیئے ہیں! یا ناکافی مطالعہ کے ساتھ خود اُلٹی سیدھی رائیں قائم کریں، یا ان لوگوں سے دھوکا کھائیں جو تاریخ ہی کو نہیں اسلام کے تصورِ خلافت تک کو مسخ کر رہے ہیں؟

آخر کیوں نہ ہم جرأت کے ساتھ اپنی تاریخ کے ان واقعات کا سامنا کریں اور کیوں نہ بے لاگ طریقہ سے ان کا جائزہ لے کر ٹھیک ٹھیک یہ تعین کر دیں کہ خلافت اصل میں کیا چیز ہے؟ اس کے امتیازی اوصاف کیا ہیں؟ اس میں اور بادشاہی میں اصولاً کیا فرق ہے۔ اس سے بادشاہی کی طرف انتقال ہمارے ہاں کیوں اور کیسے ہوا؟....

آج جو لوگ بھی علم سیاست کے سلسلے میں اسلامی نظریۂ سیاست کا مطالعہ کرتے ہیں ان کے سامنے ایک طرف تو وہ نظامِ حکومت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں قائم تھا اور دوسری طرف وہ بادشاہی نظام آتا ہے جو بعد کے ادوار میں ہمارے ہاں چلتا رہا۔ دونوں کے درمیان احوال و مقاصد، طریقِ کار، اور رُوح و مزاج کا نمایاں فرق وہ محسوس کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے دونوں کی یکساں اطاعت کی ہے......

اس سے لازماً سیاست کے ہر طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصل اسلامی نظریۂ سیاست کیا ہے؟

کیا یہ دونوں بیک وقت اور یکساں اسلامی نظام ہیں یا اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے درمیان کوئی فرق ہے۔ اور اگر فرق ہے تو دونوں کے تحت

مسلمانوں نے جو بظاہر ایک ساطرزِ عمل اختیار کیا اس کی کیا توجیہ ہے؟ جب نہیں سمجھا کہ دماغوں کو ان سوالات پر سوچنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے اور ان کا جواب آخر کیوں نہ دیا جائے؟ [1]

مولانا کا عزم بڑا محبوب ہے، ان کا ارادہ بڑا نیک ہے اور اگر تاریخ میں کوئی ایسے گھپلے موجود ہیں جن سے تاریخ کی اصلیت متاثر ہوئی ہے تو ان کو دُور کرنا بے حد ضروری ہے اور ایسی ہر کوشش کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔

اور اگر اس کتاب کی تصنیف سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا دراصل مقصود یہی ہے جس کا انہوں نے اپنی تحریر میں ذکر کیا ہے تو فی الواقع ہی یہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔

مگر حالات کی جو تصویر اور واقعات کی جو کڑیاں ہمارے سامنے آئی ہیں ان کے مطالعہ سے ہر ذی فہم شخص اس نتیجہ پر ہی پہنچتا ہے کہ مولانا کی یہ ساری جمع و ترتیب زرا تکلف ہے اور اس میں حقیقت کا کوئی شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔

مولانا نے اپنی یہ کتاب "تاریخ کے گھپلوں کے ازالہ کے لئے لکھی ہے لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے ہر سمجھ دار آدمی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ کتاب خود اس صدی کا سب سے بڑا گھپلا ہے اور ظاہر ہے کہ ؎

آنکس کہ خود گم ست کرا رہبری کند

ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا نے تاریخی گھپلوں کے ضمن میں جتنے بھی سوالات اٹھائے ہیں محض مفروضے ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

تاریخ بڑی سیدھی ہے، بڑی صاف ہے اور ہماری تاریخ میں

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۳۰۰ - ۳۰۱

کبھی کوئی مرحلہ ایسا نہیں آیا جہاں وہ ناقابلِ فہم ہوگئی ہو۔
واقعات اپنے منطقی نتائج کے ساتھ ہر کسی کے سامنے ہیں اور
سوال کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ مولانا کہنا کچھ اور
چاہتے ہیں مگر بہانہ کوئی دوسرا رکھ رہے ہیں یعنی ؎

خوشتر آں باشد کہ سِرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

پُرانی یاد ـــــ دارالاسلام پٹھانکوٹ

بات کو سمجھنے کے لئے ہم اپنے قارئین کو چند برس پیچھے کی طرف اپنے ہمراہ چلنے کی تکلیف دیں گے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مولانا نے جماعت اسلامی کے نام سے اپنی ایک جماعت قائم کی جس کے ماتحت آپ نے ملک کے اندر تحریک اقامتِ دین کا اجرا کیا۔ جماعت اسلامی کا مرکز بھارتی پنجاب کے ضلع گورداسپور میں ضلع کا مشہور قصبہ پٹھانکوٹ تھا اور یہ قصبہ تحصیل کا درجہ بھی رکھتا تھا۔ مولانا کی زندگی کا یہ دَور اُن کا حاصلِ حیات اور ایک ملکوتی دَور ہے اور بلا شبہ ان دنوں مولانا کی دعوت پر لبیک، ایمان کا مطالبہ اور دین حق کا تقاضا تھا۔ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا اس جماعت کے امیر اور میاں طفیل محمد صاحب قیم منتخب کئے گئے۔

جماعت اور اس کے پلان کے اعلان کے ساتھ ہی پورا ملک مولانا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اور اس امر کو مولانا کے اخلاصِ عمل کی برکت ہی کہنا چاہیئے کہ مولانا کی دعوت پر ملک کے دُور دراز علاقوں اور دوسرے

صوبوں تک سے نیک دلی اور نیک اندیشی مولانا کی طرف لپک آئی اور پورے ملک کے منتخب اہلِ دل اور اہلِ تقویٰ وطہارت پٹھانکوٹ کی طرف اُٹھ دوڑے اور پھر پٹھانکوٹ کے اندر پٹھانکوٹ سے الگ قدوسیوں کی ایک نئی بستی بس گئی۔ جس کے دن پر سورج کی روشنی کو اور جس کی رات پر چاند کی نورانیت کو رشک تھا۔ یہی مختصر سی بستی تھی جس کا نام دارالاسلام تھا اور کہنا چاہیئے کہ یہ نام اسم بامسمیٰ ہی تھا۔ اس بستی کا دن تو دن ہی تھا مگر اس کی رات دن پر بھی فائق تھی۔ جہاں دن کو قرآن و سُنت کی ان چلتی پھرتی تصویروں کے حلقہ میں اقامتِ دین کی تجویزوں پر بحث و نظر کے لئے مجالس جمتیں اور جو وقت بچتا وہ ذکر و فکر میں صرف ہوتا اور جہاں رات کی تاریکی سطحِ ارض پر بسنے والے ان خاک نژاد فرشتگان کی نور بھری شب خیزیوں سے منور اور سحرگاہی کی نکہتوں سے معطر رہتی تھی۔

مولانا اس ریاست کے رئیس تھے، اس بستی کے سربراہ تھے، اس جماعت کے امیر تھے۔ اور ملک کے اس دُور افتادہ مگر رشکِ فلک خطۂ ارض کے سورج تھے اور چاند تھے۔

چند برس کی خاموش کارکردگی کے بعد مولانا نے اپنی تحریک اقامتِ دین کے سلسلہ میں ایک کُل ہند اجتماع ۱۹-۲۰-۲۱ اپریل ۱۹۴۵ء کو پٹھانکوٹ میں بلایا اور وہ حیرتناک طور سے اتنا کامیاب ہوا کہ پورے ملک میں دارالاسلام کے اس اجتماع کی کامیابی کی دھوم مچ گئی۔ مولانا نے اس اجتماع میں خوب کُھل کر اپنے سامعین اور اپنے رفقاء سے باتیں کیں۔ تین روز تک شب و روز کے اس اجتماع کی پوری کارروائی مولانا نے اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی تین اشاعتوں کو یکجا کر کے شائع کی۔ ترجمان القرآن کا یہ خاص شمارہ ایک ایسی اہم دستاویز ہے جس میں تحریک اقامتِ دین پر

ہر پہلو سے ہی مکمل بحث درج ہے اور اس کو اس تحریک کا دستور ہی کہنا چاہیئے۔ مولانا نے فرمایا:

ہمارا نصب العین اور واحد مقصدِ زندگی اس دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی سعی اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے.....
یوں سمجھیے کہ ہم وہی دعوت لے کر آئے ہیں جو آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام لے کر دنیا میں تشریف لائے [1]

اجتماع کی کامیابی پر اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے فرمایا:

جو تحریک لے کر ہم اُٹھے تھے ..... اور اس کے لئے ہم نے جو طریقِ کار اختیار کیا اُس کے اندر ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہ تھی جو آجکل دنیا کی دعوتوں کو پھیلانے اور خلقِ خدا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

نہ جلسے، نہ جلوس، نہ نعرے نہ جھنڈے، نہ مظاہرے، نہ نمائش، نہ تقریریں، نہ وعظ۔ مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بندگانِ خدا روز بروز زیادہ کثرت کے ساتھ ہماری اس دعوت کی طرف کھنچ رہے ہیں اور ہمارے بے لطف اجتماعات میں شرکت کے لئے دُور دُور سے بغیر کسی طلب کے آ رہے ہیں [2]

آپ نے اپنے اصحاب کو تلقین فرمائی کہ:

اپنی اس تمام سعی و جہد میں زیادہ نمود و نمائش سے بچیں، اپنے کارناموں کو گنانے اور فخر کے ساتھ اُن کا مظاہرہ اور لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف

---

[1] ترجمان القرآن خاص نمبر ص۱۵ [2] خاص نمبر ص۳۲
[3] خاص نمبر ص۳۳

کھینچنے کی ذرہ برابر کوشش نہ کریں بلکہ جو کچھ کریں اس نیت اور اس یقین و اطمینان کے ساتھ کریں کہ ان کا سارا عمل خدا کے لئے ہے اور خدا بہرحال ان کی خدمات سے واقف ہے [۱]

مزید فرمایا:

ہمارے نزدیک یہ بات بہروپیے پن سے کم نہیں کہ ہم ایک طرف تو خدا اور آخرت اور وحی و نبوت اور شریعت کو ماننے کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف دنیا کی طلب میں بھٹکے ہوئے اُن درس گاہوں کی طرف خود دوڑیں۔ انسان کو ان کا شوق دلائیں اور خود اپنے اہتمام میں ایسی درس گاہیں چلائیں جن میں انسان کو خدا سے دُور کرنے والی، آخرت کو بھلا دینے والی مادہ پرستی میں غرق کر دینے والی تعلیم دی جاتی ہو۔

ایک طرف ہم خدا کی شریعت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف ان عدالتوں کے وکیل اور جج بنیں اور ایسی عدالتوں کے فیصلوں پر حق اور غیر حق کے فیصلے کا دارمدار رکھیں، جو شریعت الٰہی کو ایوانِ عدالت سے بے دخل کر کے شریعت غیر الٰہی کی بنیاد پر قائم کی گئی ہوں [۲]

مولانا نے فرمایا:

ہمارے طریق کار کا ایک بڑا جزو یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو نظام باطل کی قانونی اور عدالتی حفاظت سے خود بخود محروم کر لیا ہے اور علی الاعلان دنیا کو بتا دیا ہے کہ ہم اپنے انسانی حقوق، اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کسی چیز کی عصمت بھی قائم رکھنے کے لئے اس نظام کی مدد

---

[۱] ترجمان القرآن خاص نمبر صفحہ ۲۴ [۲] خاص نمبر صفحہ ۲۶

مس کرنا نہیں چاہتے جس کو ہم باطل سمجھتے ہیں ۔[1]

ی اجتماع میں قیم جماعت میاں طفیل محمد صاحب نے فرمایا :

ہماری دعوت اور طریق کار کا یہ فطری تقاضا ہے کہ اس میں دکھاوے یا نمائش یا مبالغے کی کوئی جھلک نہ پائی جائے ۔

میاں صاحب نے فرمایا :

ہمارے پیش نظر کوئی بھیڑ جمع کر کے دوسروں کو مرعوب کرنا یا کسی کونسل یا کارپوریشن میں اپنی نشستوں میں اضافہ کروانا نہیں ہے[2]

میاں صاحب نے فرمایا :

جن ذرائع اور طریقوں سے عام طور پہ دوسرے لوگ اور ادارے سرمایہ فراہم کرتے ہیں ۔ اُن طریقوں اور ذرائع سے روپیہ فراہم کرنا تو درکنار ہم تو عام پبلک اپیل اور ضرورت کے عام اشتہار کو بھی اپنے مسلک اور طریق کار کے منافی سمجھتے ہیں ۔

حد یہ ہے کہ اپنے ارکانِ جماعت تک پر بھی کوئی باقاعدہ چندہ عائد کرنا اس کام (یعنی دین کو قائم کرنے) کی صحیح شکل نہیں سمجھتے (خاص نمبر صفحہ[3]) اس زمانہ میں مولانا دوسری جماعتوں کی طرح اپنی جماعت کے لئے نہ رکن سازی کرتے تھے نہ کوئی ایسی بھیڑ جمع کرنے کے حق میں تھے بلکہ وہ صرف معیاری آدمی چاہتے تھے اگرچہ ان کی تعداد کتنی بھی کم ہو چنانچہ ایک مرحلہ پر جب اُن کی جماعت کے ارکین کی تعداد ساڑھے سات سو تک پہنچ گئی، تو آپ نے ایک جائزہ کے نتیجہ میں تقریباً سوا تین سو ارکین کی رکنیت ختم کردی کہ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے تحریک اقامت دین کے مزاج سے ہموار نہیں تھے[3]

---

[1] ترجمان القرآن خاص نمبر صفحہ ۱۴۴ [2] خاص نمبر صفحہ ۱۰۱ [3] خاص نمبر صفحہ ۱۷۱

مولانا کی تحریک کا یہ ملکوتی دور اور ان کے رشک ملائک احباب کا یہ پاکیزہ اسلوب حیات ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک اپنی انتہائی فکری و عملی پاکیزگی سے پورے ملک کے لیے وجہِ جذب و کشش بنا رہا۔ سبحان اللہ ست

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

مولانا مودودی اور شیعہ

ماحول کی ان قرآن بدوش ساعتوں اور تحریکِ اقامتِ دین کے اس رشکِ شباب مرحلہ پر جب مولانا قرآن و سُنت سے باہر سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ جب اُنہیں نہ کوئی دنیا کی لالچ تھا۔ نہ مصلحت جب ان کی نگاہ میں نہ مال و دولت کی کوئی قدر تھی، نہ وکالت اور جج کی، نہ انہیں کارپوریشن کی نشستوں کا لالچ تھا نہ اسمبلی کی سیٹوں کی ہی انہیں کوئی کشش موجود تھی جب مولانا زمین پر رہتے تھے۔ مگر آسمان کی باتیں کرتے تھے۔ ان سے کسی نے پوچھا۔

شیعہ (رقم کے) فرقوں کو حکومت الٰہیہ کے زیر سایہ عملاً کیا حیثیت دی جائے گی؟

(سائل کا مطلب یہ تھا کہ آیا انہیں بھی اہل کتاب اور ذمیوں میں شمار کیا جائے گا؟)

مولانا نے پوری سادگی سے اس سوال کو قبل از وقت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

یہ سوال دراصل (موجودہ) وقت کا ہے ہی نہیں۔ یہ سوال جب عملاً پیش آئے گا تو اس کا حل بھی انشاء اللہ ہو ہی جائے گا۔

قبل از وقت آخر ایک فرقہ سے اس کی حیثیت کے متعلق بحث کے دروازے کھول کر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔ [1]

مولانا کا یہ جواب یقیناً شیعہ کے لئے لمحۂ فکریہ ہی تھا اور وہ بآسانی یہ سوچ سکتے تھے کہ مولانا جو حکومتِ الٰہیہ قائم کریں گے۔ اس کے اندر شیعہ کے لئے گنجائش بھی ہوگی یا نہیں بالخصوص جبکہ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ مولانا کو ملک کے اندر گہرا اثر و نفوذ حاصل ہو چکا ہے، اور لوگ ان کی بات پر کان دھرنے لگے ہیں۔ شیعہ یقیناً مولانا کے اس جواب کو اپنے لئے ایک انتباہ سمجھ سکتے تھے۔

مگر بات اس سے بھی آگے بڑھ گئی اور باتوں ہی باتوں میں شیعیت کی بنیاد کا رعقیدہ عصمت امام بھی زیر بحث آگیا۔ شیعہ اپنے آئمہ کو معصوم سمجھتے ہیں اور اس عقیدہ کا ان کے مسلک سے جان و تن کا تعلق ہے۔ مولانا کی مجلس میں جب اس کا ذکر آیا تو مولانا نے فرمایا:

امام معصوم کا عقیدہ جو شیعوں میں رواج پا گیا ہے اور جس پر درحقیقت مسلکِ تشیع کی بنیاد قائم ہے اپنی اصل کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ بے اصل ہے بلکہ شیطان کا ایک بڑا دھوکا ہے جس سے اس نے مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کو دین اور اس کے مطالبات اور اس کے مہمات کو عملاً معطل کر دیا ہے۔ اس نے (یعنی شیطان نے) امامت کے لئے معصومیت کی شرط لگائی ہے جس کا متحقق ہونا اور دائماً و مستقلاً متحقق ہوتے رہنا غیر ممکن تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرونِ ماضیہ میں جبکہ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق آئمہ معصومین ظاہر ہوتے رہے۔ ہر امام کی وفات کے بعد اختلاف واقع ہوا کہ

---

[1] ترجمان القرآن خاص نمبر ص۱۸۱

اس کی جگہ کون سا امام معصوم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اگر اس پر بھی شیعہ حضرات متنبہ نہیں ہوتے اور شیطانی دھوکے میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ صبر کریں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں [1]

شیعہ جماعت اسلامی کا رکن نہیں بن سکتا

مولانا سے مزید دریافت کیا گیا۔ کیا کوئی شیعہ جماعت اسلامی کا رکن بن سکتا ہے؟ مولانا نے جواب دیا:

دستور جماعت اسلامی کے پورے مطالبات کو تسلیم کر لینے اور ان پر عمل پیرا ہو جانے کے بعد کوئی شخص شیعہ رہ ہی کہاں سکتا ہے۔

پھر تو وہ ویسا ہی خالص مسلمان ہوگا جیسے اس دستور کو تسلیم کرنے والے دوسرے اراکین ہیں [2]

اور پھر مولانا کے ان بیانات کے بعد شیعہ اور مولانا کے درمیان ایک ایسی دیوار حائل ہو گئی جس کا گرانا ہرگز آسان نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد مولانا کے حق میں اہل تشیع کا رویہ بھی زیادہ سخت ہو گیا۔

مُلک کی تقسیم

تحریکِ اقامتِ دین کا یہ قافلہ اپنی غیر معمولی شان اور غیر معمولی

---

[1] ترجمان القرآن خاص نمبر ص ۱۸۱ - ۱۸۲ [2] خاص نمبر ص ۱۸۲

رفتار سے ہی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا کہ مسلم لیگ کی تحریک کے نتیجہ میں ملک کی تقسیم عمل میں آگئی اور ہندوستان، پاکستان اور بھارت کی دو آزاد سلطنتوں کی صورت میں تقسیم ہوگیا جس کے نتیجہ میں دوسرے بہت سے مسلمانوں کی طرح مولانا مودودی صاحب کو بھی دارالاسلام پٹھانکوٹ کو ترک کرکے پاکستان کا رُخ کرنا پڑا۔

مولانا مودودی لاہور میں

اس بات کو تحریک اقامتِ دین اور اس کے وابستگان کی بدقسمتی ہی کہنا چاہیئے کہ پٹھانکوٹ سے نقل مکانی کے بعد مولانا نے لاہور میں قیام کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ جن وجوہ سے مولانا نے لاہور کو ترک کرکے پٹھانکوٹ کو تحریک کے مرکز کے بطور انتخاب کیا تھا ٹھیک اُنہی وجوہ سے پٹھانکوٹ کو ترک کرنے کے بعد مولانا کو پاکستان میں آکر بھی پھر کسی پٹھانکوٹ کو ہی تلاش کرنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ اُنہی لیل و نہار کو اپنے لئے مہیا رکھ سکیں جو اُن کو پٹھانکوٹ میں مہیا تھے۔

لاہور پاکستان میں شیطان کی سب سے بڑی کارگاہ تھی جہاں ہر جانب شیطانی مکائد کے جال بچھے تھے اور شیطان کے خلاف جنگ کرنے کے لئے شیطان کی کارگاہ میں قیام کرنا نہ عقلمندی ہی تھی اور نہ یہ کسی خوش نصیبی کی ہی تمہید تھی۔ مولانا الیاس رحؒ صاحب کی تبلیغی جماعت کو بھی ہندوستان سے پاکستان منتقل ہوتے یہی مرحلہ درپیش تھا۔ کراچی اور لاہور ان کے سامنے بھی تھے مگر انہوں نے غور وفکر کے بعد اپنے مرکز کے لئے رائیونڈ کو تجویز کیا اور پاکستان میں یقیناً بہت سے پٹھانکوٹ اور رائیونڈ موجود تھے مولانا کو بھی انہی پٹھانکوٹوں اور رائیونڈوں میں سے کسی ایک پٹھانکوٹ یا رائے ونڈ کو منتخب کرنا چاہئے تھا۔

لاہور ایشیا میں مسائل کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں سلجھاؤ کے بجائے اُلجھاؤ کے امکانات زیادہ تھے، اور افسوس ہے کہ یہاں مولانا کی ذہانت نے سخت ٹھوکر کھائی اور انہوں نے لاہور میں قیام کا فیصلہ کر کے اپنی زندگی کا سب سے بڑا غلط فیصلہ کیا۔

مولانا کو ابھی وہ اسلحہ مہیا نہیں ہو سکا تھا جس کے بھروسے وہ شیطان کے گھر میں بیٹھ کر شیطان کو چیلنج کر سکتے۔ اُن کے ساتھی ابھی بہت کمزور تھے۔ ناتجربہ کار تھے، جنگ کے آداب سے ناآشنا تھے۔ ابھی انہیں یا تو چند برس تک اُس پہلے پٹھانکوٹ میں ہی رہنے کی ضرورت تھی یا اگر وہ چھن گیا تھا تو انہیں یہاں بھی کوئی ویسی ہی شیطان کے ہتھکنڈوں سے محفوظ تربیت گاہ درکار تھی اور خود مولانا بھی اس صورتِ حال سے واقف تھے۔ انہیں اپنے ساتھیوں کی سپاہیانہ صلاحیتوں کے بارے میں ابھی تک کوئی اطمینان حاصل نہیں تھا۔ وہ انہیں بالکل اناڑی سمجھتے تھے چنانچہ وہ خود فرماتے تھے :

آپ سے امیر کی اطاعت، ضابطے کی پابندی اور رضاکارانہ خدمت کی ادائیگی میں جتنی کمزوری ظاہر ہوئی ہے اُتنا ہی میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسی بندوقوں سے کام لے رہا ہوں جو لبلبی دبانے پر بھی فائر نہیں کرتیں اور ظاہر ہے کہ ایسے ہتھیاروں کو لے کر کون ایسا نادان ہو گا جو کسی بڑے کام کا ارادہ کر بیٹھے [1]

مزید فرمایا : آپ کے مالی ایثار، آپ کے وقت اور محنت کے ایثار اور اپنے مقصد کے ساتھ آپ کی محبت اور اُس کے لئے آپ کی قربانی کا جو حال اس وقت ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو آپ یہ حق بھی نہیں رکھتے کہ

---

[1] ترجمان القرآن خاص نمبر ص۱۳

اپنے دل میں اس تمنا کو پرورش کریں کہ آپ کے ہاتھوں یہ جھنڈا کبھی بلند ہو۔[۱]

مولانا نے مزید کہا:

آپ نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح سمجھا ہی نہیں کہ دین حقیقت میں کس چیز کا نام ہے اور اس کے واقعی مطالبات اپنے پیرؤں سے کیا ہیں؟[۲]

پھر فرمایا:

ایک اور خامی جو ہمارے بعض رفقاء میں پائی جاتی ہے اور جو اکثر ہی ہمارے لئے پریشانی کا سبب بنتی رہتی ہے یہ ہے کہ یہ حضرات... طریقِ کار کو اچھی طرح نہیں سمجھتے۔[۳]

مزید ارشاد ہوا:

ہمارے حلقہ میں ایک اچھا خاصا گروہ ایسا پایا جاتا ہے جس نے تبلیغ و اصلاح کے کام میں تشدّد اور سخت گیری کا رنگ اختیار کر لیا ہے ..... ان کے اندر بگڑے ہوئے لوگوں کو سنوارنے کی بیتابی اتنی زیادہ نہیں جتنی انہیں اپنے سے کاٹ پھینکنے کی بیتابی ہے۔ دینی حرارت نے ان میں ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ اتنا نہیں اُبھارا جتنا نفرت اور غصے کا جذبہ اُبھار دیا ہے۔[۴]

قیم جماعت میاں طفیل محمد صاحب نے فرمایا:

ہماری سب سے بڑی مشکل اور رکاوٹ مردانِ کار اور صحیح قسم کے کارکنوں کی کمی ہے .... ہمارے ارکان اور بیشتر کارکن تقریباً ہر لحاظ سے ہی ابھی ابتدائی حالت میں ہیں۔[۵]

---

[۱] ترجمان القرآن خاص نمبر ص۴۳ [۲] حوالہ مذکور [۳] خاص نمبر ص۴۹ [۴] ایضاً
[۵] خاص نمبر ص۴۲

مزید فرمایا:

ہمارے بعض رفقاء میں یکسوئی کی کمی ہے جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ابھی تک ہماری دعوت اور اُس کے طریقِ کار کو اچھی طرح نہیں سمجھا اس وجہ سے وہ باوجود جماعت میں منسلک ہو جانے کے بار بار دوسرے قافلوں کی طرف دیکھتے ہیں [1]

فرماتے ہیں:

ابھی دراصل ان میں اپنے نصب العین اور مقصد زندگی سے حقیقتاً وہ لگاؤ بھی پیدا نہیں ہوا ہے جو اس کے لئے انہیں سرقربانی کر جانے پر بیتاب کر دے [2]

مولانا امین احسن اصلاحی (مولانا کے نائب اور رفیقِ خاص) نے فرمایا:

ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ لوگ اپنی ذمہ داری کی نسبت بھی یہی خواہش رکھتے ہیں کہ مرکز ہی اُن کو بھی پورا کرے ..... پھر ہاتھ پاؤں بن کر اُن کے ذمہ کے عمل کو بھی پورا کر دے [3]

اور پھر اس ناکارہ سلاح جنگ اور اس اناڑی ناتجربہ کار فوج کے ساتھ مولانا لاہور میں شیطانی مکائد کے خلاف جنگ کرنے کے لئے میدان میں اُترے اور ظاہر ہے کہ اس بے تدبیری اور غیر مآل اندیشی کے نتیجہ کے بارے میں کسی بھی سمجھدار آدمی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں مولانا کے لئے کوئی بھلائی مقدر ہوتی تو وہ ضرور انہیں پاکستان میں کسی پٹھانکوٹ کا پتہ دیتے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مولانا کی آزمائش منظور ہوئی اور افسوس ہے کہ مولانا اس آزمائش میں پورے نہ اُتر سکے۔

---

[1] ترجمان القرآن خاص نمبر ص۲۴ [2] ص۳۰ [3] ص۸۷

لاہور اور پٹھانکوٹ کا فرق

یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ مولانا کو سب کچھ جانتے بوجھتے اس بات کا کیوں علم نہ ہو سکا کہ ملک کے مرکزی اور بڑے بڑے شہر ان کی تحریک کے اس مرحلہ پر ان کے لئے مناسب حال نہیں ہیں اور وہ کیوں نہ جان سکے۔ آدابِ جنگ سے پوری واقفیت نہ رکھنے والے، حربی نشیب وفراز سے ناآگاہ، رنگروٹوں کو لے کر کھاگ اور فن کار حربی دشمنوں کے خلاف میدان میں اترنا اپنی شکست کو آواز دینے کے مترادف ہے۔ مولانا کے ساتھیوں کو ابھی کئی برس تک شہری ہنگاموں، سیاسی دھماچوکڑیوں اور تہذیبی دھماکوں سے الگ رہ کر سیکھنے کی ضرورت تھی۔ مولانا جب پٹھانکوٹ میں تھے تو وہاں قابلِ ذکر صرف وہی تھے یا اُن کے کارکن۔ وہاں ان کا کوئی حریف نہیں تھا، کوئی مدِمقابل نہیں تھا، ان کو کوئی روکنے والا نہیں تھا، اُن سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہاں اُنہیں آگے بڑھنے کی پوری آزادی تھی۔ ان کا میدان ان کے عزائم کو بروئے کار لانے کے لئے کفایت کرتا تھا۔ وہ اگرچہ حاکم نہیں تھے مگر وہاں اُنہی کی حکومت تھی، وہاں کے روز و شب کا نظام ان کی مرضی کے سانچے میں ڈھلا تھا، وہاں اُنہی کا پلان تھا، اُنہی کا پروگرام تھا، اور وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے، کر سکتے تھے اور کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔

وہاں کے لوگ اُن سے محبت کرتے تھے اُن سے لڑتے نہیں تھے، لوگ انہیں چاہتے تھے اُن سے اعراض نہیں کرتے تھے، ان کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اُن سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ وہ اُن کی پیروی کرتے تھے، اُنہیں اپنا قائد مانتے تھے، ان کی پیشوائی پر راضی تھے، ان کی

امامت پر خوش تھے۔
وہ انہیں دیکھ کر جیتے تھے اور اپنے دیدہ و دل اُن کے لئے فرشِ راہ رکھتے تھے۔
مولانا کے کمزور ساتھی وہاں قوی تھے۔ ان کے ناقص اور نا تربیت یافتہ کارکن وہاں کامل تھے، اُن کے اناڑی وہاں کے ماہر تھے۔ الغرض پٹھانکوٹ کی سرزمین پر سب کچھ وہی تھے اور وہی سرزمین دراصل بھی اُن کے لئے دارالاسلام بھی تھی اور دارالسلام بھی۔ اور یہ ماحول پٹھانکوٹ کے بعد اُنہیں صرف پٹھانکوٹ ایسے مقام پر ہی مہیا ہو سکتا تھا، لاہور اور کراچی جیسے شہر اُن کے اور اُن کے ساتھیوں کے ہرگز متحمل نہیں تھے۔
یہ شاید کوئی اوپر کا ہی فیصلہ تھا کہ مولانا نے اپنی تحریک اور اپنے اہلِ تحریک کے سارے ہی مصالح کو نظر انداز کر کے لاہور میں رہنے کا فیصلہ کیا ورنہ مولانا کی ذہانت سے ان کی خفتگی کی حالت میں بھی ایسے غلط اور غیر مآل اندیشانہ فیصلے کی توقع نہیں تھی۔

اگلی صُورتِ حال

لاہور کو اپنی قیام گاہ بنا چکنے کے بعد مولانا کو جلد ہی یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہاں بطور قائد تحریک اقامتِ دین ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے کیونکہ مولانا اپنے پہلے ماحول میں بلا شبہ ایک منفرد مقام کے حامل اور ایک عظیم شخصیت کی حیثیت ہی رکھتے تھے۔ مگر یہاں لاہور میں انسانی عظمت کا معیار پٹھانکوٹ والے معیار سے یکسر الگ اور بالکل دوسرا تھا۔
پٹھانکوٹ کے ماحول میں یقیناً وہی بڑا تھا جسے قرآن نے بڑا قرار دیا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ مگر یہاں لاہور میں سب

بڑا وہ تھا جس کے پاس سب سے زیادہ ووٹ ہوں جبکہ مولانا کی حالت لاہور میں ورُود کے مرحلہ پر یہ تھی کہ پورے پاکستان میں اُن سے وابستگان کی تعداد صرف ۳۸۵ تھی لہ

ایسے میں اگر مولانا چاہتے تو ان کے سنبھل سکنے کا موقع گزر نہیں چکا تھا، وہ اپنا فیصلہ بدل سکتے تھے آخر اُنہی کے سے حالات رکھنے والے کچھ دوسرے لوگ بھی یہاں کے حالات کو نامساعد پا کر دوسرے مقامات پر چلے ہی گئے تھے ۔ مگر مولانا نے اس رُخ سے سوچنا پسند نہ کیا۔ تاہم اگر مولانا کی صوابدید یہی تھی کہ اُنہیں لاہور میں رہ کر ہی کام کرنا ہے تو اس کی دو صورتیں تھیں :

اوّل: مولانا کے ساتھی جیسے کیسے بھی تھے اور وہ باطل کے خلاف جنگ کے لئے جتنی کچھ بھی تربیت حاصل کر چکے تھے وہ انہیں بتوکل علی اللہ میدان میں جھونک دیتے اور ان کی سپاہیانہ صلاحیتوں اور آداب جنگ سے ناواقفی کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں اسی فراہم آمدہ قوتِ ایمانی اور بے یقینی آشنا یقین کے بھروسے آگے بڑھا دیتے، کہ مردِ حق سلاحِ جنگ کی کمی اور عددی قلّت کے باوجود بارہا تاریخ کی پیشانی پر اپنی فتوحات کے نقوش کندہ کر چکا ہے ۔ وہ لوگ اللہ کی نصرت کے بھروسے پر آگے بڑھتے اور باطل کے کاسہ سر پر بے قاعدہ یا باقاعدہ ضربیں دیتے آگے نکل جاتے۔ وہ اپنے ہاتھ ہلاتے رہتے ضربیں لگانے میں کوئی آنکھوں سے پنہاں قوت ہمراہ شامل ہو جاتی کہ ہم نے ایسے ہی مراحل پر نگاہوں سے اوجھل کسی سپاہ کے نام آسمان کی رفعتوں سے یہ احکام گونجتے بارہا سُنے ہیں۔

لہ ترجمان القرآن مارچ - اپریل - مئی ۵۱ء حاشیہ ص۲

اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ط سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ کُلَّ بَنَانٍ ط

(میرے فرشتو!) میں تمہارے ساتھ ہوں آگے بڑھو اور مومنوں کی ثابت قدمی کا ذریعہ بن جاؤ۔ میں کافروں کے دلوں میں اپنے بندوں کی ہیبت ڈال دوں گا، تم بڑھو کافروں کی گردنوں پر ضربیں لگاؤ اور ان کا جوڑ جوڑ توڑ ڈالو۔

مولانا اگر ایسا کرتے تو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی ضرور مدد کرتے اور انہیں حق کے دشمنوں کے خلاف فتحیاب کرتے۔

ایمان کا تقاضا یہی تھا کہ مولانا اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ میدان میں کود جاتے پھر خواہ جتنا بھی نقصان ہوتا، جتنی بھی قربانی دینا پڑتی حق کے مطالبہ کو پوری حوصلہ مندی سے پورا کرتے یہاں تک کہ باطل ہمت ہار دیتا ورنہ یہ لوگ حق کی طلب میں خود کٹ کر آنے والے اہلِ حق کے لئے راستہ ہموار کر جاتے۔

اہلِ ایمان کے اس طریقِ جنگ سے مولانا کے ساتھی بھی ناواقف نہیں تھے کیونکہ انہیں یہ سارے مراحل پٹھانکوٹ میں ہی تلقین کر دیئے گئے تھے، جب اُن سے کہا گیا

یہ سوال بحث سے خارج ہے کہ یہ جدوجہد کس نتیجہ تک منتہی ہوگی ہوسکتا ہے کہ ہم آروں سے چیر ڈالے جائیں، گلیوں میں گھسیٹے جائیں، انگاروں پر لٹائے جائیں اور ہمارے جسموں کو چیلیں اور کوّے نوچیں اور ان ساری باتوں کے بعد بھی ہمیں یہ سعادت حاصل نہ ہو سکے کہ موجودہ نظامِ باطل کو ایک نظامِ حق سے بدل دیں لیکن نہ تو یہ ناکامی ناکامی ہے، اور نہ اس کا اندیشہ بلکہ اس کا یقین بھی ہم کو اس مطالبہ سے سبکدوش

نہیں کر سکتا جو خدا نے اقامت دین کے لئے ہم سے کیا ہے۔

وہ ایک قطعی اور اٹل فرض ہے جو ہر قیمت پر اور ہر حال میں ہمیں ادا کرنا ہے [1]

پھر مزید تاکید فرمائی کہ:

رات دن اس جدو جہد میں لگے رہیئے کہ خدا کے بندوں پر خدا کا قانون حاکم ہو اور دوسرے مدعیانِ حکومت یا تو مٹ جائیں یا ان کو بدلنے اور نہ بدلنے کی صورت میں اُن کو مٹانے میں ہم مٹ جائیں [2]

دوم: دوسری صورت یہ تھی کہ مولانا اپنے نئے مرکز کے غیر دینی احوال و ظروف اور تحریک اقامتِ دین کے بالکل مخالف سمت رواں دواں زندگی کو بدلنے کے بجائے اپنی اور اپنی جماعت کے لئے یہاں گنجائش کی راہیں پیدا کریں اور اس غرض سے خود کو اُن احوال و ظروف کے تابع کر دیں اور اس ماحول سے ہموار ہو جائیں جن سے لاہور کی لاہوریت عبارت تھی اور زندگی کے ان اطوار سے صلح کر لیں جو وہاں کا دستور تھے۔

اس طرح وہ وہی زندگی جینے لگیں جو یہاں بھرپور زندگی کی علامت تھی۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں پہلی صورت اگرچہ غیرتِ ملی کا ہی تقاضا تھی مگر ایک کٹھن راہ اور مشکل ترمنزل تھی اور یقیناً یہ راہ ایک مومن کے ایمان و ایقان کے لئے ایک آزمائش کا ہی مرحلہ تھی۔ دوسری صورت نہایت آسان تھی اگرچہ انتہائی مہلک تھی انسانی شرف و مجد کی توہین تھی۔ اور تحریکِ اقامتِ دین کی راہ سے بالکل دوسری راہ تھی۔

اور اس امر کو اس تحریک اور اہل تحریک کی بد نصیبی ہی کہئے کہ لاہور میں

---

[1] ص۹۲ خاص نمبر [2] خاص نمبر ص۵۵

بس جانے کے بعد مولانا کو اس دوسری زندگی سے اپنے آپ کو ہموار کر لینے کی مجبوری پیدا ہو گئی - انا للہ وانا الیہ راجعون -

پھر جب مولانا نے لاہوریت قبول کرلی

بلاشبہ مولانا نے لاہور میں کچھ عرصہ تک لاہوریت کا مقابلہ کیا اور اسے قبول کرنے سے انکار کرتے رہے مگر ساتھیوں کی کمزوریوں سے وہ اپنے عزم کی حفاظت نہ کر سکے اور لاہور میں اپنے لئے مقام بنانے کے لئے اُنہوں نے اُنہی ہتھیاروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا جن کے بغیر ان کے لئے لاہور میں اپنا تشخص قائم کرنا ممکن نہ تھا -

۱۹۵۱ء کے عام انتخابات کا اعلان ہوا تو مولانا نے بھی دوسرے اہلِ لاہور کی طرح اسمبلیوں اور کارپوریشنوں کے ذریعہ اوپر آنے کا فیصلہ کیا اور آپ نے اچانک ہی وہ سارے اطوار اپنا لئے جو پٹھانکوٹ میں کفر کا درجہ رکھتے تھے اور پھر آپ نے وہ سارے ہی مراحل طے کئے جو لاہور میں بڑائی حاصل کرنے کے لئے کسی بھی شخص کے لئے ضروری ہیں یعنی وہی جلسے، وہی جلوس وہی پوسٹر بازی وہی بینر، اخبارات کے ساتھ سودے بازی، ایڈیٹروں اور اخبارات کے مالکان سے معاملے، اخبارات کے اشتہارات، اپنی خدمات شماری -

تاہم آپ کامیاب نہ ہو سکے اور پورے ملک نے کچھ عرصہ پہلے جس محبت سے آپ کو قبول کیا تھا - اسی سطح کی بے توجہی سے انہیں مسترد کر دیا -

سوچ کی نئی راہیں

انتخابات میں سخت ناکامی کے بعد مولانا کے لئے ان اسباب کا تجسس

ناگزیر ہوا جو ان کی ناکامی کا سبب بنے تھے اور ان وسائل کی تلاش ہوئی
جو آئندہ ان کی کامیابی کی ضمانت بن سکیں۔

اور ظاہر ہے کہ ناکامی کے اسباب کا ازالہ بھی اگلے عام انتخابات سے
پہلے ہی ہو جانا چاہیئے تھا۔

مولانا کے لئے اب سوچنے کی ایک ہی بات تھی کہ آخر اتنا عرصہ تک
ملک اور قوم کے لیے کام کرتے رہنے اور اچھی شہرت رکھنے کے باوجود
لوگوں نے انہیں کیوں مسترد کر دیا ہے، لوگ اُن کے لئے ہمیشہ چشم براہ
تھے مگر انہوں نے اپنے ووٹ اُنہیں کیوں نہیں دیئے اور لوگوں کے
ووٹ حاصل کرنے کے لئے اب انہیں کیا کرنا چاہیئے۔

اور پھر اس کے بعد اگلے چند برس کا عرصہ مولانا نے اسی جدوجہد
کے لئے وقف کر دیا اور وہ دن اور رات قوم سے ووٹ حاصل کرنے
کی تدابیر اور تحصیل رائے دہی کے وسائل جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔

یہ سب کچھ پٹھانکوٹ والی زندگی کے منافی تھا مگر اب جب مولانا نے
لاہوریت کو قبول کر لیا تھا تو انہوں نے اپنے ماضی کو فراموش کر کے
اپنا تمام تر تعلق اپنے حال کو سنبھالنے اور مستقبل کو سنوارنے کے سوال
سے وابستہ کر لیا اور بلا شبہ لاہور میں رہ کر اب ان کا سرفہرست مسئلہ یہی
تھا اور اگر انہیں لاہور میں ہی رہنا تھا تو کامیاب زندگی کا یہی ایک
طریقہ تھا۔

یہاں مولانا کو ایک اور حادثہ سے بھی دوچار ہونا پڑا کہ لاہور کی
زندگی میں مولانا کے لیل و نہار کے مطالعہ سے ان کے بہت سے ساتھی
جو پٹھانکوٹ میں ان کی تحریک کی جان اور روح رواں تھے، ایک ایک
کر کے ان سے الگ ہو گئے یہاں تک کہ آگے چل کر اُن کے ایک رفیق راہ اور
گہرے عقیدتمند اور مداح مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے آنسوؤں

کے دریا میں ڈوب کر لکھا:

جو مولانا مودودی رحلت فرما گئے ہیں وہ دین کے ممتاز عالم تھے مفسر قرآن تھے، متکلم تھے، اقامت دین و حکومتِ الٰہیہ کے علمبردار تھے ایک مستقل اور سراپا دینی شخصیت تھے .... اور جو مولانا مودودی صاحب ماشاءاللہ زندہ موجود اور سرگرم عمل ہیں۔ وہ ایک سیاسی لیڈر ہیں جس طرح کے اور پارٹیوں کے لیڈر موجود ہیں اور ہر ملک میں نرم گرم اور رطب و یابس قسم کے لیڈر ہوا ہی کرتے ہیں لہ

تاہم مولانا بہر حال اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہی رہے۔ اگرچہ

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

مولانا کو غور و فکر کے بعد یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ عام مسلمانوں نے انہیں اس لئے ووٹ نہیں دیئے کہ وہ مولانا سے سخت ناخوش تھے کہ وہ جسے حرام کہتے تھے اسے حلال کیوں کہنے لگے۔ اور وہ سمجھنے لگے تھے کہ مولانا کا حال بھی دوسرے دنیا طلب زعما کا ہی ہے جو اللہ اور رسولؐ کے نام سے ہمیشہ مسلمانوں کو دھوکا دے کر اپنا کام نکالنے کے عادی ہیں۔

مسلمان سمجھتے تھے کہ جس طرح دوسرے اہلِ غرض خدا اور رسولؐ کی شریعت کی تنفیذ کے وعدوں سے اُن سے ووٹ طلب کرتے ہیں۔ مولانا کا حکومتِ الٰہیہ اور اقامتِ دین کا نعرہ بھی بالکل اُسی طرح کا ہے انہیں بھی اقامتِ دین مقصود نہیں بلکہ اپنا اقتدار مطلوب ہے۔ پس وہ اُن سے الگ رہے۔

لہ "المنبر" لائلپور جنوری ۱۹۶۵ء بحوالہ صدق جدید۔

مگر مولانا ان لوگوں سے زیادہ پریشان نہیں تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے وہ امتدادِ زمانہ سے سب کچھ بھول جایا کرتے ہیں۔ یہ لوگ آج نہیں تو کل بہرحال ان کی آواز سننے لگیں گے اور وہ چند برس میں یہ امر فراموش کر دیں گے کہ مولانا کے ماضی اور حال میں بہت فرق ہے۔

البتہ اہلِ تشیع کا معاملہ بہت ٹیڑھا تھا اور مولانا جانتے تھے کہ ان کی ناراضگی بہت گہری ہے اور انہیں راضی کر لینا اب آسان نہیں رہ سکا ہے۔

مگر چونکہ شیعہ کو راضی کئے بغیر مولانا کا مستقبل مولانا کی حسب پسند استوار نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے مولانا نے ہر قیمت پر شیعہ کو راضی کر لینے کا فیصلہ کیا۔ دیہات کی آبادیوں میں تو خیر شیعہ کا بطور شیعہ کے کوئی وزن موجود نہیں تھا مگر ملک کے بڑے بڑے شہروں میں شیعہ کے مراکز مولانا کے لئے ایک طاقتور مزاحمت کی حیثیت سے صاف دکھائی دیتے تھے اور لاہور میں تو بالخصوص شیعہ فرقہ کا گڑھ موجود تھا اور اس کے ساتھ شیعہ کی بہت سی دلچسپیاں ایک حقیقت تھیں۔ مولانا یہ بھی دیکھتے تھے کہ شہری آبادی کی حد تک صدر مملکت اور بعض اہم وزراء سے لے کر حکومت کی بہت سی کلیدی آسامیوں پر بھی شیعہ قابض ہیں، انتظامیہ میں بھی شیعہ کا بہت دخل و عمل ہے۔ حکومت کے بعض دوسرے اہم شعبوں میں بھی یہ لوگ بعض وجوہ سے دخل و عمل حاصل کر چکے ہیں اور لاہور کے اندر بالخصوص سٹوڈ بوز سے لے کر "اکسی بازار" تک محلے، بازار اور گلیاں شیعہ ووٹوں سے بھری ہیں ایسے میں وہ شیعہ کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

مگر مشکل یہ تھی کہ وہ شیعہ کے بنیادی عقائد تک کو شیطانی چکر قرار دے چکے تھے۔ ان کے ذمی یا مسلم ہونے کے بارے میں بھی ان کے سامنے سوالات اُٹھا چکے تھے، وہ شیعہ پر جماعت اسلامی کے دروازے بھی بند

کر چکے تھے ایسے میں اُن کو منانے کی کیا صورت ہو سکتی تھی ۔

عظیم انقلاب

پھر مولانا نے ایک فیصلہ کیا اور وہ بے دھڑک اپنے فیصلہ پر عمل کرنے لگے ۔ شیعہ کو ہموار کرنے کے لئے وہ مختلف راہوں سے شیعہ تک پہنچنے لگے ۔ ان کی مجالس بھی اب ان کے لئے شجرِ ممنوعہ نہ رہ سکی تھیں ۔ شیعہ کے حسب پسند مضامین لکھنا بھی ان کی تازہ سوچ کا حصہ تھا اور اپنی مجالس اور اپنی محافل میں بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مدح و توصیف کو بھی وہ بالخصوص دوسرے مسائل حیات پر فوقیت دینے لگے ۔

پٹھانکوٹ میں ایک دفعہ ان کے احباب نے نعرۂ تکبیر بلند کیا تو آپ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد کیا (خبردار رہو) ایک مرتبہ جہاد میں صحابہ کرامؓ نے صورتِ حال سے متاثر ہو کر اللہ اکبر کے نعرے بلند کئے تو حضورؐ نے فرمایا جس کو تم پکار رہے ہو وہ بہرہ نہیں ہے ۔ یہی باوقار رویہ تھا جسکی .... تقلید ہمیں بھی کرنی چاہیئے [1]

لیکن یہاں اب ہم نے اپنے کانوں سے مولانا کے اجتماعات میں نعرہ حیدری ! یا علی کی گونجیں سنیں مگر حضرت کی پیشانی پر اکراہ کا کوئی ایک خط بھی نمودار نہیں ہوتا تھا ۔ تاہم شیعہ ان کے ساتھ ہموار رہنے کے لئے آمادہ نہ ہو سکے ۔ پھر مولانا نے ایک قدم اور بڑھایا اور شیعہ کی مشہور خوش فعلی متعہ کے جواز کی گنجائش قرآن پاک کی آیات سے نکال ڈالی ۔

---

[1] ترجمان القرآن خاص نمبر ص۱۴۱

مُتعہ کا جواز

ہمارے قارئین شاید اس خبر پر بدکیں گے اوران کا جی نہیں چاہے گا کہ یہ خبر سچ ہو، مگر واقعات کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلتی۔ مولانا نے فی الواقع ہی یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ آیئے آپ بھی اپنے کانوں سُن لیجئے اور اپنی آنکھوں دیکھ لیجئے۔

زیرِ آیت :- فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ

ارشاد ہوا :

فرض کیجئے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد و عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے ایک ایسے سنسان جزیرے میں جا پہنچتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں اور شرعی شرائط کے مطابق اُن کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں ان کے لیے اس کے سوائے چارہ نہیں کہ باہم خود ہی ایجاب و قبول کر کے اُس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کر لیں جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی اُن تک نہ پہنچ جائے کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں (اور) مُتعہ ایسی اضطراری حالتوں کے لئے ہی ہے [1]

خلافت وملوکیت

اس زمانہ میں مولانا کے دل و دماغ سخت بحران سے دو چار تھے۔

---

[1] ماہنامہ ترجمان القرآن ماہ اگست ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۷۹ (مزید حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور ان کی تصنیف خلافت و ملوکیت بھی اسی دور کی پیداوار، اسی ذہنی بحران کا نقش اور ان کی شیعہ دوستی کے لئے بیتابی کی مہم کا حصہ ہے۔

مولانا نے اپنی اس کتاب میں جیسا کہ ہمارے قارئین جانتے ہیں ہر اس صحابی اور تابعی کی توہین کی ہے جن کی توہین سے اُن کے ناراض دوست خوش ہو سکتے تھے اور ہر اُس بزرگ کی ٹانگ کھینچی ہے جسے اہلِ تشیع بُرا سمجھتے تھے۔

شیعہ حلقوں میں اس کتاب کا خوب ہی خیر مقدم کیا گیا، شیعہ پریس نے اس پر تبصرے لکھے۔ ہفت روزہ "رضاکار" نے اس کتاب کی تصنیف پر مسلمانوں پر طعن توڑا اور تعریف کی۔

جناب رئیس احمد جعفری نے اپنی ترجمہ کردہ اور اپنے ہی اہتمام میں شائع کردہ کتاب نہج البلاغہ میں مولانا کی حسین یاد کو محفوظ کیا اور اس کو اپنے شیعی معتقدات کی سُنی حلقہ کی طرف سے تصدیق قرار دیا۔

تاہم مولانا کی اس تسخل پذیری کے باوجود مولانا کے بارے میں

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

کچھ عرصہ قبل میں نے کسی دینی ہفت روزہ میں مولانا کے اس اجتہاد کا ذکر کیا تو مولانا کے بعض عقیدت مندوں نے مجھے لکھا کہ مولانا نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔ دلیل یہ ہے کہ مولانا نے اپنے ماہنامہ سے اس تفسیر کو بصورت کتاب جمع کرتے یہ عبارت ترک کر دی تھی، جواباً گزارش ہے کہ اس ترک کی یہ مصلحت ہو سکتی ہے کہ محفوظ رہے اور بوقتِ ضرورت پھر بھی کام دے سکے۔ مگر تفسیر چونکہ آپ کے لئے تھی اس لیئے مولانا نے آپ کو ناراض کرنا پسند نہ کیا ورنہ انہیں لفظاً رجوع میں کیا مانع تھا جبکہ مولانا کے اجتہاد پر ملک کے سارے ہی دینی حلقے چیخ اٹھے تھے اور مولانا کا یہ اجتہاد عرصہ تک ملک کے دینی رسائل میں زیرِ بحث بھی رہا تھا مگر وہ بالکل خاموش رہے۔

شیعہ کے عام طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آرہی تھی جس کی بنیاد پر مولانا یہ قیاس کر سکیں کہ شیعہ اُن سے اپنی ناراضگی ترک کر کے ان کے نزدیک آ گئے ہیں۔

لیکن مولانا نے کسی دل شکستگی کے بغیر اُنہیں منانے کی کوششیں جاری رکھیں، حالات کے ہر اُس مطالبہ کو پورا کیا جسے پورا کرنا شیعیت کے سرکش گھوڑے کو رام کرنے کے لئے ضروری تھا اور ہر وہ منتر پڑھتے چلے گئے جو اُن کی ساحری کی تحویل میں تھا۔

مولانا کا بیانِ صفائی

مولانا کی اس تازہ روش اور اپنے بعض معتقدات سے دستبرداری کو بعض حلقوں کی طرف سے انتخابی چال کا نام دیا گیا تو اس پر مولانا نے ایک بیان جاری کیا۔

ان پر (یعنی مولانا پر) یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ شیعہ کی مخالفت کرتے رہے ہیں اور اب محض انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اہلِ تشیع کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا:

میری شائع کردہ کتابوں میں سے کوئی شخص یہ نہیں دکھا سکتا کہ میں نے کبھی شیعہ حضرات پر حملہ کیا ہو یا اُن کے عقائد کے خلاف کبھی کوئی دل آزار بات کہی ہو[1]

---

[1] روزنامہ مشرق ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء

مولانا کو شیعہ کا تعاون حاصل ہو گیا

مولانا کا یہ بیان اب محض ایک تکلف ہی تھا ورنہ مولانا کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجہ میں شیعہ اب بظاہر مولانا کے قریب آنے لگے تھے، چنانچہ مولانا نے جب ۳۱ رمئی ۱۹۷۰ء کو کاروانِ شوکتِ اسلام" کے نام سے ایک ملک گیر انتخابی جلوس نکالنے کا اعلان کیا تو شیعہ کی طرف سے اس جلوس میں خصوصی شرکت کا خاص اعلان کیا گیا تھا۔ ۳۱ رمئی یعنی جلوس کی تاریخ کی صبح کو نکلنے والے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو چکی تھی کہ۔

شوکتِ اسلام کے اس جلوس میں پانچ ہزار شیعہ انجمنیں شرکت کریں گی [۱]

اور ظاہر ہے کہ اس خبر سے شیعہ عوام کو یہی تاثر دینا مقصود تھا کہ شیعہ اب نہ صرف مولانا کے قریب آچکے ہیں بلکہ وہ ان کی انتخابی مہم میں بھی اُن کا بھرپور ساتھ دے رہے ہیں۔

اگلی صبح کے اخبارات میں جلوس کے سلسلہ میں یہ خبر چھپی:

مولانا ظفر الحسن کی قیادت میں شیعہ کا جلوس جب دفتر تحفظ حقوقِ شیعہ نسبت روڈ پہنچا تو وہاں سُنی اور شیعہ علماء کی طرف سے جلوس کے شرکاء کو ہار پہنائے گئے [۲]

اور اس طرح ایک بار پھر بھرپور طریقے سے مولانا اور شیعہ کے تازہ تعلقات کا ذکر اخبارات میں آگیا۔

---

[۱] روزنامہ مشرق ۳۱ رمئی ۷۰ء

[۲] روزنامہ مشرق یکم جون ۱۹۷۰ء

تازہ فتویٰ۔ شیعہ جماعت اسلامی کے رکن بن سکتے ہیں

ایک دن اچانک ہی مولانا نے شیعہ پر اپنی ایک حرمت اور حلال کردی اور اعلان کر دیا کہ شیعہ کیلئے جماعت اسلامی کی رکنیت پر اب کوئی پابندی نہیں ہے۔ ارشاد ہوا:

یہ بات بالکل غلط ہے کہ جماعت اسلامی شیعہ حضرات کی مخالف ہے اور یہ تاثر بھی غلط ہے کہ اہلِ تشیع جماعت اسلامی کے رُکن نہیں بن سکتے

مولانا نے مزید فرمایا: یہ غلط فہمیاں چند خود غرض افراد کی پیدا کردہ ہیں اصل یہ ہے کہ شیعہ حضرات جماعت اسلامی کے ساتھ پورا تعاون کر رہے ہیں (روزنامہ مشرق ۱۶ جون ۱۹۷۰ء)

سب کچھ منظور

ارشاد ہوا: ہمارے نزدیک تو صدرِ مملکت کا صرف مسلمان ہونا ہی کافی ہے خواہ وہ کسی بھی مسلمہ مسلمان فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔

مزید فرمایا:

قائدِ اعظم کو سب نے اپنا نمائندہ مان لیا تھا اور کسی نے یہ سوچا تک نہیں تھا کہ وہ سُنی ہے یا شیعہ۔

سکندر مرزا ایک مدت تک صدرِ مملکت رہے ہیں .... کسی نے اُن پر اس بنا پر اعتراض نہیں کیا تھا کہ وہ شیعہ ہیں۔

موجودہ صدرِ مملکت (یحییٰ خان) بھی شیعہ ہی ہیں اور اُن پر بھی

اُن کے مسلک کی بنا پر کسی نے اعتراض نہیں کیا [1]

ڈراپ سین

اس کہانی کا ڈراپ سین اس بات پر ہوتا ہے کہ جب مولانا کی ان فکری، نظری اور عملی گمراہیوں پر خود جماعت اسلامی کے ہی بعض اچھے لوگوں نے جماعت کی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں گرفت کی کہ آپ نے جماعت اسلامی کے بنیادی اصولوں سے کیوں انحراف کیا ہے جبکہ آپ کی زندگی کا ہر رُخ آج ان بنیادوں کے مخالف سمت واقع ہوا ہے جن پر جماعت اسلامی کو تشکیل دیا گیا تھا تو مولانا نے اس کے جواب میں بڑے اعتماد اور بڑے اطمینان سے فرمایا:

میں نے اگر جماعت اسلامی کے اصولوں سے انحراف کیا ہے تو کیا ہوا یہ جو کچھ بھی کیا گیا ہے اسلام ہی کی خاطر اور دینی مصلحت کی وجہ سے ہی کیا گیا ہے۔ دین میں جہاں اصولوں کی اہمیت ہے وہاں حکمتِ عملی کو بھی برابر کی اہمیت حاصل ہے [2]

اور ظاہر ہے کہ مولانا کی اس منطق کا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے بعد جو اہلِ علم دینِ حق کو غالب کرنے کے لئے مولانا کے گرد جمع ہوئے تھے وہ دل برداشتہ ہو کر جماعت چھوڑ گئے اور جو لوگ مولانا کے گرد مولانا کے لئے جمع تھے وہ بدستور جمع ہے کہ ؏

---

[1] روزنامہ نوائے وقت ۲۱ اگست ۱۹۷۰ء

[2] ہفت روزہ "المنبر" لائل پور جنوری ۱۹۵۷ء بحوالہ ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۶ء۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

یہ تھے وہ حالات جن کے زیرِ اثر مولانا کو خلافت و ملوکیت لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ تھی مولانا کی ضرورت جس نے انہیں ایک حق پسند، حق گو اور حق کے علمبردار قائد کے بجائے ایک دنیا طلب سیاسی لیڈر بنا دیا۔

اب اگلی سطور میں ہم حضرت معاویہؓ کے ذمے مولانا کا قرض ادا کرنے کی سعی کریں گے۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْق ۔

فصلِ دوم

سوئے منزل

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

کیا حضرت معاویہؓ باغی تھے؟

تاریخ کے بعض گروہی راویوں کی جمع و ترتیب کے نتیجہ میں حضرت علیؓ کے خلاف لڑنے کی وجہ سے امیر المومنین حضرت معاویہؓ پر بغاوت کا سنگین الزام رکھا گیا ہے چنانچہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب رقمطراز ہیں:

(فریقِ طلحہؓ اور زبیرؓ) سے بھی بدرجہا زیادہ غیر آئینی طرزِ عمل دوسرے فریق معاویہؓ کا تھا جو معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کی حیثیت سے نہیں بلکہ شام کے گورنر کی حیثیت سے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لئے اُٹھے۔ مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کیا، گورنری کی طاقت اپنے اس مقصد کے لئے استعمال کی اور مطالبہ بھی یہ نہیں کیا کہ حضرت علیؓ قاتلینِ عثمانؓ پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دیں بلکہ یہ کیا کہ وہ قاتلینِ عثمانؓ کو اُن کے حوالہ کر دیں "تاکہ وہ خود انہیں قتل کریں۔ یہ سب کچھ دورِ اسلام کی نظامی حکومت کے بجائے زمانۂ قبل اسلام کی قبائلی بدنظمی سے اشبہ ہے۔

خونِ عثمانؓ کے مطالبے کا حق اوّل تو حضرت معاویہؓ کے بجائے حضرت عثمانؓ کے شرعی وارثوں کو پہنچتا تھا۔ تاہم اگر رشتہ داری کی بنا پر حضرت معاویہؓ اس مطالبہ کے مجاز بھی ہو سکتے تھے تو اپنی ذاتی حیثیت سے نہ کہ شام کے گورنر کی حیثیت میں۔

حضرت عثمانؓ کا رشتہ جو کچھ بھی تھا معاویہؓ بن ابی سفیانؓ سے تھا شام کی گورنری اُن کی رشتہ دار نہ تھی۔ اپنی ذاتی حیثیت میں وہ خلیفہ کے پاس مستغیث بن کر جا سکتے تھے اور مجرمین کو گرفتار کرنے اور اُن پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر سکتے تھے، گورنر کی حیثیت سے اُنہیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی، جس کی خلافت کو ان کے زیرِ انتظام صوبے (شام) کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی اس کی اطاعت سے انکار کر دیتے اور اپنے زیرِ انتظام علاقے کی فوجی طاقت کو مرکزی حکومت کے مقابلے میں استعمال کرتے اور ٹھیٹھ جاہلیتِ قدیمہ کے طریقے پر یہ مطالبہ کرتے کہ قتل کے ملزموں کو عدالتی کارروائی کے بجائے مدعیٔ قصاص کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ خود اُن سے بدلہ لے لے[1]

(خلافت و ملوکیت ص۱۲۵ - ۱۲۶)

حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

اسلامی سلطنت کا ہر صوبہ حضرت علیؓ کی بیعت پر قائم تھا اور صرف شام حضرت معاویہؓ کے زیرِ اثر ہونے کی بنا پر اُن کی اطاعت سے

---

[1] افسوس ہے مولانا کے نزدیک امام کے حکم سے بھی قاتل کو مقتول کے اقرباء کے سپرد کرنا جاہلیت کی روایت ہے جبکہ یہ کام خود رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا اور حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کرنے کا دستور رہا ہے۔

منحرف تھا۔ اس لئے صحیح آئینی پوزیشن یہ نہ تھی کہ دنیائے اسلام میں کوئی طوائف الملوکی برپا تھی جس میں کوئی کسی کی اطاعت کا پابند نہ تھا بلکہ یہ تھی کہ مملکت میں ایک جائز قانونی مرکزی حکومت موجود تھی جس کی اطاعت تمام دوسرے صوبے کر رہے تھے اور صرف ایک صوبہ (معاویہؓ کا شام ہی) باغی تھا۔[1]

پھر مسئلہ کی شرعی حیثیت قاضی ابوبکر ابن العربی کی کتاب "احکام القرآن" سے بیان کرتے ہیں کہ:

حضرت علیؓ نے ان حالات میں اسی آیت (فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ) کے مطابق عمل کیا تھا۔ انہوں نے اُن باغیوں (یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، اور امیر معاویہؓ) کے خلاف جنگ کی جو امام (یعنی حضرت علیؓ) پر اپنی رائے مسلط کرانا چاہتے تھے اور ایسا مطالبہ کر رہے تھے جس کا انہیں حق نہ تھا۔ اُن کے لئے صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ حضرت علیؓ کی بات مان لیتے اور اپنا مطالبۂ قصاص عدالت میں پیش کر کے قاتلین پر مقدمہ ثابت کرتے۔ اگر ان لوگوں نے یہ طریق کار اختیار کیا ہوتا اور پھر حضرت علیؓ مجرموں سے بدلہ نہ لیتے تو انہیں کشمکش کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ عامۂ مسلمین خود ہی حضرت علیؓ کو معزول کر دیتے۔[2]

افسوس ہے کہ خلافت و ملوکیت کے فاضل مصنف بہ آئینی اور شرعی

---

[1] خلافت و ملوکیت ص۱۲۵ حاشیہ

[2] خلافت و ملوکیت ص۱۲۷ سطر ۷ تا ۱۲

پوزیشن بیان کرتے وقت یہ امر فراموش کر گئے کہ جو صورت فیصلہ خود انہوں نے بیان کی ہے یا جو قاضی ابوبکر سے مستعار لی ہے۔ اگر فی الواقع حق یہی ہے تو اس حق کے سارے آداب پورے ہو چکے تھے اور اس آئینی اور شرعی پوزیشن کو اختیار کیا جا چکا تھا اور مولانا جو کچھ آج چاہتے ہیں۔ حضرت علیؓ سے اختلاف کرنے والے سارے ہی بزرگوں نے اُس وقت بھی یہی کچھ کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ اپنے اس موقف پر بلند تھے کہ وہ قصاص لے سکنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اور وہ اپنی اس کمزوری کا اظہار باربار کر چکے تھے اور ہمیشہ کرتے تھے اس لئے مولانا کی بیان کردہ آئینی پوزیشن اُس وقت کے حالات میں ہرگز صحیح نہیں تھی۔ یعنی بات یہ نہیں تھی کہ مولانا کا بیان کردہ طریق اختیار نہیں کیا گیا بلکہ بات یہ تھی کہ حضرت علیؓ اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اس آئینی اور شرعی پوزیشن کو قبول کر سکیں اور اس امر واقعہ کو خود مولانا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

حضرت طلحہؓ و زبیرؓ چند دوسرے اصحاب کے ساتھ اُن (یعنی حضرت علیؓ) سے ملے اور کہا کہ ہم نے اقامتِ حدود کی شرط پر آپ سے بیعت کی ہے۔ اب آپ اُن لوگوں سے قصاص لیجئے جو حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک تھے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا بھائیو! جو کچھ آپ جانتے ہیں اس سے میں بھی ناواقف نہیں ہوں۔ مگر میں اُن لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم اُن پر۔ کیا آپ حضرات اس کام کی گنجائش کہیں دیکھ رہے ہیں جسے آپ کرنا چاہتے ہیں؟ سب نے کہا نہیں[1]۔

---

[1] سازش کے لئے بڑی عقل درکار ہے مگر جب کام عقل کے بغیر بھی چل

(باقی اگلے صفحہ پر)

یعنی یہ بات سب کے نزدیک مسلمہ تھی کہ حضرت علیؓ قصاص لینے کی ہمت نہیں رکھتے اور اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ اس سلسلہ میں

جاتا ہو تو کسی کو اپنی عقل گھسانے کی کیا ضرورت ہے۔ مولانا کے راوی نے حضرت علیؓ کی صفائی میں ایک ایسی بات بنائی ہے جو حضرت علیؓ کی صفائی کے بجائے راوی کی بے عقلی اور اس کے شعور کی رسوائی کا ہی سامان ہے۔

دیکھئے مولانا کا راوی حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور اُن کے حامیوں کو جمع کر کے سخت جوش کی حالت میں حضرت علیؓ کے پاس لاتا ہے اور وہ آتے ہی حضرت علیؓ کے گلوگیر ہوتے ہیں کہ تم نے جو ہم سے وعدہ کیا تھا اُسے پورا کرو اور ہم آج وہ وعدہ پورا کرانے کے لئے ہی آئے ہیں۔

جواب میں حضرت علیؓ اُنہی بھرے بپھرے لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ کے نزدیک میں اس پوزیشن میں ہوں کہ آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر سکوں؟ سب نے کہا نہیں! لاحول ولا قوۃ۔

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

اب کوئی اس عقل کے اندھے اور پاگل خانہ سے بھاگے ہوئے راوی سے پوچھے کہ عقلِ کُل! اگر حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ یہ بات جانتے تھے کہ علیؓ یہ کام نہیں کر سکتے تو وہ اُن کے پاس ہی کیا لینے آئے تھے۔ اگر اُنہوں نے علیؓ کی ہاں میں ہاں ملا کر ٹھنڈے ٹھنڈے لوٹ جانا تھا تو گھر سے ہی کیوں نکلے تھے؟ اور اگر وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہی آئے تھے تو ظاہر ہے اُن کی نیت خراب تھی اور وہ حضرت علیؓ کو رسوا کرنے کے ارادہ سے نکلے تھے۔ اور اگر ایسا ہی تھا تو وہ لاجواب ہو کر نہ رہ جاتے بلکہ اپنے طے کردہ پروگرام کے تحت کوئی بات اُٹھاتے۔ یہ محض "ست بچن مہاراج" کہنے کے لئے آنا تو بالکل بے معنی تھا۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "غرض مند دیوانہ" تو یہ بات

(باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت علیؓ کی طرف رجوع اب قطعی بیکار ہے۔ اور اگر قصاص لینا ہے تو اس غرض سے کوئی دوسرا طریقہ ہی اختیار کرنا ہوگا۔

اب اس بات کا جواب تو خود مولانا مودودی صاحب ہی جانتے ہوں گے کہ جب حضرت علیؓ کی عدالت ہی اُن کی اپنی عدالت نہیں تھی، حضرت علیؓ کی حکومت ہی اُن کی اپنی حکومت نہیں تھی۔ اُن کی عدالت پر بھی دوسروں کا قبضہ تھا اور ان کی حکومت بھی دوسروں بلکہ مفسدوں کے رحم وکرم پر تھی تو اس حال میں مولانا کی بیان کردہ وہ آئینی پوزیشن نرا تکلف ہی نہیں تو اور کیا ہے! پھر اگر حضرت معاویہؓ حضرت مولانا مودودی صاحب کے مشورہ کے مطابق مدینہ منورہ پہنچتے بھی تو نتیجہ کیا ہوتا، یہی نا کہ معاویہؓ بھی حضرت عثمانؓ کی طرح قتل کر دیئے جاتے اور یقیناً یہی کچھ ہوتا اس کے سوائے اور کوئی بات متصور ہی نہیں ہے۔ لیکن چلیئے آپ فرض کر لیجئے کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ کے ہاں استغاثہ پیش کرتے ہیں تو کیا اس صورت میں بھی حضرت علیؓ کا جواب وہی ہوتا جو وہ قبل ازیں حضرت طلحہؓ وحضرت زبیرؓ کو دے چکے تھے۔ مولانا نے حضرت معاویہؓ کے لئے جو راہ تجویز فرمائی ہے حضرت علیؓ کی مجبور زندگی کی روشنی میں کیا وہ قابل عمل بھی تھی؟ اور کیا حضرت معاویہؓ اس راہ کو اختیار کر کے انصاف حاصل کر سکتے تھے؟

حضرت علیؓ کی زبان سے نکلی ہوئی یہ باتیں حضرت معاویہؓ کو پہنچ چکی تھیں کہ میرے پاس معاویہؓ کے لئے تلوار کے سوا کوئی جواب نہیں ہے تو کیا مولانا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ بہ نفسِ نفیس اس جواب کو سننے کے لئے حضرت علیؓ کے

بہت صحیح ہے۔ راوی نے اپنی غرض سے ایک بات بنائی اور مولانا نے اپنی غرض سے اُسے قبول کر لیا۔ اس ساری کاروائی میں عقل کی ضرورت کہاں پڑتی ہے۔

حضور پیش ہوتے؟

علیؓ اور اصحابِ رسولؐ

باہمی تصادم کے دو قریبی سبب

حضرت علیؓ سے اختلاف اور تصادم کی کہانی اصحابِ رسولؐ میں سے صرف حضرت معاویہؓ اور ان کے اصحاب سے ہی خاص نہیں رہ سکی بلکہ کچھ ایسے اسباب موجود تھے کہ حضرت علیؓ سے بہت سے کبار اصحابؓ نے اختلاف کیا اور پھر باہمی تصادم تک نوبت پہنچی۔ حضرت علیؓ سے حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کا اختلاف اور تصادم اسی ذیل میں آتا ہے۔

ہمارے مولانا مودودی صاحب تو جبراً اپنے لئے ایک مقام متحقق کر چکے ہیں اور وہ حضرت علیؓ سے اختلاف کرنے والے ہر صحابی کو ہی باغی کہتے ہیں مگر صورتِ حال دراصل یہ نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کا انتخاب بھی اگر خلفاء کے پہلے انتخابی دستور کے مطابق ہی عمل میں آتا اور انہیں بھی پہلے تینوں خلفاء کی طرح امت کے ارباب حل و عقد اور حضورؐ کے اخص اصحاب ہی منتخب کرتے جو پوری امت میں اتھارٹی سمجھے جاتے تھے تو ان کے انتخاب پر بھی اختلاف کی کوئی وجہ موجود نہ ہوتی۔ مگر اس امر کو امت کی بدنصیبی ہی کہیئے کہ حضرت علیؓ کی خلافت ان لوگوں کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی جنہوں نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے اپنی ضرورت سے لوگوں کو تلوار کے ذریعہ حضرت علیؓ کی بیعت کے لئے مجبور کیا اور لوگوں نے تلوار کے خوف سے ہی حضرت علیؓ کی بیعت کی، جس کی وجہ سے بہت سے اکابر صحابہؓ مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر کے نکل گئے۔

اور کچھ لوگ علیؓ کی بیعت کر کے مدینہ میں اپنے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لئے مجبور ہوئے۔

اصحابِ رسولؐ اور علیؓ کے درمیان یہی مسئلہ کچھ کم دُوری اور بُعد کا موجب نہیں تھا کہ اچانک ایک ایسا مسئلہ بھی اُبھر آیا جس نے مسلمانوں کے اتحادِ باہمی کی بنیاد ہمیشہ کے لئے ہلا کر رکھ دی اور پھر مسلمان ایک دوسرے سے یوں جدا ہوئے کہ اب اسرافیل کے نفخۂ اولیٰ سے اِدھر اُن کے مل بیٹھنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

ایک دوسرے سے باہمی سخت بُعد کا دوسرا سبب یہ پیدا ہوا کہ اگرچہ اسلامی حدود کا نفاذ اسلامی سلطنت کے سربراہ کی اپنی ہی ذمہ داری ہے مگر کچھ کبار صحابہؓ نے کسی اندیشہ سے علیؓ کی بیعت ہی اس شرط پر کی تھی کہ علیؓ زمامِ خلافت کو سنبھالتے ہی پہلا کام جو کریں گے وہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص ہوگا، اور حضرت علیؓ نے اُن کی یہ شرط تسلیم کر لی تھی مگر حضرت علیؓ نے خلافت حاصل کر چکنے کے اگلے ہی روز اس عذر سے حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لینے سے انکار کر دیا کہ وہ باغیوں اور بلوائیوں کے ہاتھ میں بے بس ہیں اور وہ فی الحال قصاص نہیں لے سکتے۔ اور جیسا کہ گزشتہ صفحات میں مولانا مودودی صاحب کی کتاب کے حوالے سے ہی ہم حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کر چکے ہیں کہ:

"میں اُن کو کیونکر پکڑ سکتا ہوں جبکہ وہ ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم اُن پر"۔ (خلافت وملوکیت ص۱۲۷)

ہو سکتا ہے کہ نامساعد حالات کی عملداری میں حضرت علیؓ کا یہ عذر صحیح ہو مگر اصحابِ رسولؐ کا خیال یہی تھا کہ علیؓ دراصل قاتلوں سے قصاص لینا ہی نہیں چاہتے اور ان کا یہ عذر اُن کے ٹال مٹول کا ایک حصہ ہے۔

بہت سے اصحابِ رسول یہ بات برملا کہتے تھے کہ جن لوگوں کی ہمت سے

علیؓ خلافت حاصل کر سکے ہیں وہ عثمانؓ کی جان کے لئے اُن کو کیوں
ناراض کریں گے۔ تاہم اُن حالات میں حضرت علیؓ کے عذر میں کچھ نہ
کچھ وزن ضرور تھا کہ علیؓ کے آگے پیچھے دائیں بائیں باغی اور بلوائی ہی
بھرے پڑے تھے۔ اور بقول مشہور مورخ اکبر شاہ خاں:
مدینہ پر باغیوں کے سردار غافقی بن حرب کی ہی حکومت تھی،
وہی ہر قسم کے احکام جاری کرتا تھا اور نمازوں کی امامت بھی (امیرالمومنین
علیؓ کے بجائے) وہی کراتا تھا (تاریخ اسلام حصہ اوّل)
لیکن بعد میں اصحابِ رسولؐ کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا کہ علیؓ
دراصل قصاص نہیں لینا چاہتے کیونکہ علیؓ کی وہ مجبوری چند روزہ ہی تھی،
لیکن جب علیؓ کے زیرِ علم ایک لاکھ سے بھی اوپر فوجی جانباز جمع تھے
اور اُن کا عذر دُور ہو چکا تھا تو حضرت علیؓ نے جب بھی قاتلین سے اُن
قصاص نہیں لیا، بلکہ اُن کو حکومت کے مناصب اور انعامات سے نوازا۔
حضرت معاویہؓ علیؓ کی خلافت کے اعلان کے بعد اُنہی کی طرف
راغب تھے اور قاتلینِ عثمانؓ سے خود قصاص لینے کے بجائے یہ کام حضرت علیؓ
کی ذمہ داری سمجھ کر اُنہی سے قصاص کے لئے درخواست کرتے تھے۔ مگر حضرت
علیؓ نے معاویہؓ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اگر وہ خود یا اپنے مشیرانِ خاص اور محبانِ
قدیم کے مشورہ کے مطابق معاویہؓ سے نرمی روا رکھتے اور ان کی صلح طلبی کے
جواب میں اُنہیں ٹھینگہ نہ دکھاتے تو قاتلین عثمانؓ سے قصاص کا مسئلہ کوئی
مسئلہ ہی نہیں تھا مگر حضرت علیؓ معاویہؓ کو کسی قیمت پر بھی پسند نہیں کرتے
تھے۔ وہ عثمانؓ کے مقرر کئے ہوئے کسی عامل اور حاکم تک کو اس کی جگہ قائم
رکھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ چنانچہ بقول مورخین: علیؓ نے اپنی حکومت
میں پہلا کام یہی کیا کہ نہ صرف معاویہؓ بلکہ عثمانؓ کے مقرر کردہ تمام عمالِ
حکومت کو اُن کے عہدوں سے ہٹا دیا۔ تاہم معاویہؓ اپنی طاقت کی وجہ سے

بچ گئے جبکہ دوسرے سب اپنی اپنی جگہ سے رخصت کر دیئے گئے ورنہ عثمانؓ کے قاتل کچھ اس درجہ طاقتور نہیں تھے کہ علیؓ کی پوری زندگی وہ ان کے قابو میں نہ آسکیں۔ اُن کی ساری جمعیت صرف دو ہزار افراد پر مشتمل تھی جن میں ہزار بارہ سو جنگِ جمل میں کیفرِ کردار کو پہنچ گئے تھے باقی سات آٹھ سو بلوائی علیؓ کی ایک لاکھ فوج پر بھاری نہیں تھے اور اگر وہ عثمانؓ کا قصاص لینا چاہتے تو انہیں کوئی مانع نہیں تھا۔ مولانا مودودی صاحب کو شکایت ہے کہ معاویہؓ نے علیؓ کے خلاف گورنری کی طاقت سے کام لیا حالانکہ مولانا کو علم ہے کہ گورنری کی یہ طاقت اس وقت بطور دفاع استعمال کی گئی تھی جب حضرت علیؓ نے معاویہؓ پر حملہ کر دیا۔ ورنہ اس طاقت کو عثمانؓ کی قصاص طلبی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حضرت معاویہؓ نے یہ پیشکش کی تھی کہ اگر حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے عثمانؓ کے خون کا قصاص لیں تو ہم ان کی بیعت کر لیں گے [1]

مگر حضرت علیؓ نے معاویہؓ کی اس پیشکش کے جواب میں اُن پہ فوج کشی کر دی اور پہلا کام خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کے بجائے معاویہؓ کی برطرفی کا کیا۔ خود مولانا مودودی صاحب رقمطراز ہیں کہ:

حضرت علیؓ نے منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد جو کام سب سے پہلے کئے اُن میں ایک یہ تھا کہ محرم ۳۶ھ میں (یعنی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے دس بارہ روز بعد جبکہ ابھی حضرت معاویہؓ کو حضرت عثمانؓ کے شہید ہو جانے کی بھی خبر نہیں پہنچ سکی تھی۔ ناقل) حضرت معاویہؓ کو شام سے معزول کر کے حضرت سہیل بن حنیف کو ان کی جگہ مقرر کر دیا۔

(خلافت و ملوکیت صہ ۱۳۲)

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۲۶

اصحابِ رسولؐ کا اصحاب الجنۃ ہونا قرآنی نص سے ثابت ہے اور خود حضرت علیؓ بھی اپنے فریقِ ثانی کو جنتی ہی سمجھتے تھے مگر دنیاوی زندگی کی حد تک اگر حضرت علیؓ تھوڑے سے تامل و تحمل سے کام لیتے تو تاریخ کی ترتیب کسی دوسری نہج پر ترتیب پاتی۔

اصحابِ رسولؐ کا موقف اور مولانا مودودی

مولانا مودودی صاحب کو اصرار ہے کہ حضرت علیؓ کے خلاف خروج امام کے خلاف بغاوت ہے۔ اور جن لوگوں نے بھی حضرت علیؓ سے ان کی خلافت منعقد ہو جانے کے بعد پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے ان کے خلاف خروج کی راہ اختیار کی وہ خواہ کوئی بھی ہوں بہرحال باغی ہیں [۱] جبکہ وہ اصحابِ رسولؐ جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کے رچائے ہوئے ڈرامہ کو از اوّل تا آخر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جو اس کھیل کے جو مدینہ کی گلیوں میں انتخاب خلافت کے نام سے کھیلا گیا عینی شاہد تھے۔ مولانا سے کسی مرحلہ پر بھی اتفاق نہیں کرتے۔

اصحابِ رسولؐ کا موقف یہ تھا کہ چونکہ علیؓ کی خلافت ان اصولوں کے مطابق منعقد نہیں ہوئی جن اصولوں پر پہلے خلفائے راشدین کا انتخاب ہو چکا تھا اور حضرت علیؓ کا انتخاب اُن لوگوں نے نہیں کیا جو اُمت کے ہاں اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہوں بلکہ اس انتخاب کا اہتمام مجہول المقام غیر معتبر اور خلیفۂ رسولؐ کے خلاف بغاوت کرنے والوں اور اُن کو قتل

---

[۱] خلافت و ملوکیت ص ۱۲۵ ۔ ۱۲۶ کا ملخص

کرنے والوں نے کیا تھا۔ اس لئے یہ انتخاب کوئی حقیقی انتخاب نہیں اور اس انتخاب کے نتیجہ میں منتخب ہونے والے خلیفہ کے خلاف خروج امام کے خلاف خروج نہیں اور نہ ہی اس خروج پر وہ حکم ہی لگ سکتا ہے جو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے خلاف خروج پر عاید ہوتا ہے۔ تاہم مولانا مودودی صاحب اپنے اختیار کردہ موقف کی صحت پر بضد ہیں اور بڑے اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

حضرت علیؓ کی حکومت قطعی طور پر ٹھیک ٹھیک انہی اصولوں کے مطابق منعقد ہوئی تھی جن پر خلافت راشدہ کا انعقاد ہو سکتا تھا۔ وہ زبردستی اقتدار پر قابض نہیں ہو گئے تھے۔ ... لوگوں نے خود آزادانہ مشاورت سے ان کو خلیفہ منتخب کیا [1]

مولانا نے اپنے موقف کے ایوان کی عمارت چار ستونوں پر استوار کی ہے:

۱۔ یہ انتخاب خلافت راشدہ کے اصولوں کے مطابق ہوا تھا۔
۲۔ انتخاب جیتنے کے لئے زور و جبر کی راہ اختیار نہیں کی گئی۔
۳۔ لوگوں نے آزاد ماحول میں اپنی رائے کو استعمال کیا۔
۴۔ علیؓ کی خلافت لوگوں کی باہمی مشاورت کا حاصل ہے۔

اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مولانا کا بیان اگر صحیح ہے تو حضرت علیؓ کے خلاف خروج یقیناً امام کے خلاف خروج ہے۔ اور خروج کرنے والے لوگ بھی یقیناً باغی ہیں۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولانا کا بیان کردہ موقف تاریخی موقف نہیں بلکہ یہ ان کی اپنی چاہت ہے اور چاہت کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور واقعات کسی درجہ میں بھی مولانا

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۱۲۲

کی چاہت سے ہموار نہیں ہیں۔

خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کیا ہے؟

یہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کیا شے ہے؟ جس کو مولانا کے نزدیک سند کا درجہ حاصل ہے۔ آیئے ہم یہ بات خود مولانا ہی سے دریافت کرتے ہیں۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے (جو درحقیقت اس وقت پورے ملک میں عملاً نمائندہ حیثیت رکھتے تھے) کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی[1]

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمرؓ کے حق میں وصیّت لکھوائی، پھر مسجد نبویؐ میں لوگوں کو جمع کر کے کہا کیا تم اس شخص پر راضی ہو جسے میں اپنا جانشین بنا رہا ہوں۔ خدا کی قسم میں نے رائے قائم کرنے کے لئے اپنے ذہن پر زور ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے اور اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں بلکہ عمرؓ بن الخطاب کو جانشین مقرر کیا ہے۔ لہٰذا تم ان کی سنو اور اطاعت کرو۔

اس پر لوگوں نے کہا ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے[2]

حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت خلافت کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک انتخابی مجلس مقرر کی ..... یہ انتخابی مجلس ان چھ اشخاص پر مشتمل تھی جو حضرت عمرؓ کے نزدیک قوم میں سب سے زیادہ بااثر اور مقبول تھے۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۸۳ [2] ایضاً صد ۸۴

اس مجلس نے آخر کار اپنے ایک رکن عبدالرحمٰن بن عوف کو خلیفہ مقرر کرنے کا اختیار دے دیا۔ اُنہوں نے عام لوگوں میں چل پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ عوام کا رجحان زیادہ تر کس شخص کی طرف ہے۔

حج سے واپس گزرنے والے قافلوں سے بھی دریافت کیا اور اس استصواب عام سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اکثر لوگ حضرت عثمانؓ کے حق میں ہیں۔ اسی بنیاد پر حضرت عثمانؓ خلافت کے لئے منتخب کئے گئے اور مجمع عام میں ان کی بیعت ہوئی [1]

حضرت علیؓ کی خلافت

حضرت علیؓ کے پیش رو تینوں خلفاء کا انتخاب جس طریقہ سے ہوا ہے مولانا کے نزدیک اس طریقہ پر ہونے والا انتخاب علیٰ منہاج النبوۃ ہے اور جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ مولانا کے نزدیک حضرت علیؓ کا انتخاب بھی ٹھیک ٹھیک اور قطعی طور پر اسی طریقہ اور انہی اصولوں کے عین مطابق تھا۔ مولانا کے الفاظ ایک بار پھر پڑھ لیجئے:

حضرت علیؓ کی حکومت قطعی طور پر ٹھیک ٹھیک اُنہی اصولوں کے مطابق منعقد ہوئی تھی جن پر خلافتِ راشدہ کا انعقاد ہو سکتا تھا۔ وہ زبردستی اقتدار پر قابض نہیں ہو گئے تھے ۔۔۔۔ لوگوں نے خود آزادانہ مشاورت سے ان کو خلیفہ منتخب کیا [2]

ظاہر ہے کہ مولانا کے ان بیان کردہ اصولوں کے مطابق ہونے والا انتخاب علیٰ منہاج النبوۃ ہی ہے۔ اور اسی وجہ سے مولانا کا ادعا یہ ہے کہ خلیفہ

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۸۵ [2] ایضاً صد ۱۲۲

(علیؓ) کے ہاتھ پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی [1]

مزید ارشاد ہے:

مملکت میں (علیؓ کی) ایک جائز قانونی مرکزی حکومت موجود تھی [2]

پس آیئے دیکھیں اس باب میں مولانا کا بیان واقعات سے کہاں تک تطابق رکھتا ہے جس کی بنا پر مولانا حضرت علیؓ سے لڑائی کرنے والے ہر صحابیِ رسولؐ کو باغی قرار دیتے ہیں اور یہ بات سب کو ہی معلوم ہے کہ باغی واجب القتل ہے۔

حضرت علیؓ کی آئینی حکومت کی بنیاد

(باغیوں اور بلوائیوں کے سردار) اشتر نے بڑھ کر علیؓ کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھمکی دی کہ اگر تم نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو تم اپنے حق میں بہت ہی کوتاہ نظر ثابت ہو گے (یعنی ہمارے کہنے سے خلیفہ نہ بنے تو تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا) چنانچہ پہلے اشتر نے بیعت کی پھر دوسرے لوگ بیعت کرنے لگے [3]

رائے کی آزادی

علیؓ کی (یہ آئینی) بیعت ہو چکی تو (باغیوں اور بلوائیوں کا سردار) اشتر طلحہؓ کے پاس گیا اور سختی سے کہا کہ چلو علیؓ کی بیعت کرو۔ اُنہوں نے کہا۔ ذرا مجھے دیکھنے دو کہ اہلِ مدینہ کیا کرتے ہیں مگر اشتر نے اُنہیں

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۲۵ [2] حوالہ مذکور [3] طبری جلد ۳ باب اوّل۔

ذرا مہلت نہ دی اور گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا علی رضؓ کے سامنے لایا اور تلوار نکال کر کہا کہ بیعت کرو ورنہ تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے بیعت کی۔

حکیم بن جبلہ زبیر رضؓ کے پاس گیا اور وہ اُن کو گھسیٹ لایا اور ان کے ساتھ بھی طلحہ رضؓ کا سا معاملہ ہوا اور انہوں نے بھی حضرت علی رضؓ کی بیعت کر لی [1]

مثالی مشاورت

حضرت عثمان رضؓ غنی کے شہید ہونے کے بعد مدینہ میں قریباً ایک ہفتہ تک غافقی بن حرب بلوائیوں کے سردار کی حکومت رہی۔ وہی ہر حکم جاری کرتا تھا اور وہی نمازوں کی امامت کراتا تھا۔

باغیوں نے اعلان کیا کہ ہم اہلِ مدینہ کو آگاہ کرتے ہیں کہ تم کو صرف دو دن کی مہلت ہے اس دوران میں کوئی خلیفہ منتخب کر لو ورنہ دو دن کے بعد علی رضؓ، طلحہ رضؓ اور زبیر رضؓ تینوں کو قتل کر دیا جائے گا [2]

قاتلینِ عثمان رضؓ نے اہلِ مدینہ کو ڈرا دھمکا کر انتخابِ خلیفہ کے کام پر آمادہ کیا [3]

جب علی رضؓ آئینی خلیفہ بن چکے

بیعتِ خلافت کے بعد علی رضؓ نے پہلا خطبہ دیا جس میں امر بالمعروف

---

[1] طبری جلد ۳ باب اوّل [2] تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں صفحہ ۴۶۸-۴۶۹
[3] تاریخ اسلام صفحہ ۴۷۶

اور نہی عن المنکر موت اور یوم الحساب کا ذکر تھا - ابھی آپ منبر پر ہی تھے کہ مصریوں (یعنی مصری باغیوں) نے کہا ابو الحسن! ہم جو کام شروع کرتے ہیں اُسے انجام تک پہنچائے بغیر نہیں رہتے اس لئے خوب یاد رکھو کہ تم نے ہم سے یہ وعدہ کر رکھا ہے (یعنی یہ امر بالمعروف کا وعظ چھوڑ دو ہماری قرارداد کے مطابق کام کرو) علیؓ نے جواب دیا۔

میں (آپ کے سامنے) اتنا عاجز ہوں کہ عذر بھی نہیں کر سکتا[۱]

علیؓ نے عثمانؓ کے خون کا قصاص طلب کرنے والوں سے کہا۔

ہم اُس قوم سے کیسے قصاص لے سکتے ہیں جو ہماری مالک بنی ہوئی ہے[۲]

خود مولانا مودودی صاحب کو بھی تسلیم ہے کہ جب حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور اُن کے ساتھیوں نے حضرت علیؓ کو اُن کا وعدہ یاد دلایا کہ آپ نے ہم سے بیعت لیتے وقت اقرار کیا تھا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص پہلے لیں گے تو آپ اپنا وعدہ پورا کیجئے۔ تو حضرت علیؓ نے فرمایا۔

میں ان (قاتلوں) کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم ان پر[۳]

خلیفۂ رسولؐ علیؓ کی خلافت میں

حضرت علیؓ کو باغیوں نے اپنی ضرورت سے خلیفہ تو بنا لیا مگر خلافت ان کو نہیں دی تھی۔ خلافت پر باغیوں کا ہی قبضہ تھا۔ خلیفۂ رسولؐ

---

[۱] طبری جلد ۳ باب بعنوان انعقاد خلافت [۲] طبری جلد ۳ [۳] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۲۷

علیؓ نہ کوئی حکم جاری کر سکتے تھے نہ کسی حکم پر عمل کروا سکتے تھے نہ اس بارے میں انہیں کوئی اختیار ہی حاصل تھا۔ یہ اُن کی حوصلہ مندی ہی تھی کہ وہ خلیفہ کہلاتے تھے۔ ورنہ یہ صورتِ حال ان کی ذات سے ہموار نہیں تھی اور ان کی گزشتہ تاریخ میں بھی ایسی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

"تاریخ اسلام کا یہ المیہ بے حد تکلیف دہ ہے کہ خلیفہ علیؓ تھے مگر خلافت ان کی نہیں تھی، حاکم علیؓ تھے مگر حکومت ان کی نہیں تھی، نام علیؓ کا تھا مگر کام دشمنانِ ملّت کا تھا۔

وہ اوّل تا آخر باغیوں، بلوائیوں اور عثمانؓ کے قاتلوں کے قبضہ میں تھے اور ان کی رضا مندی حاصل کئے بغیر نہ کچھ کہہ سکتے تھے نہ کر سکتے تھے۔ چند واقعات پیشِ خدمت ہیں:

- حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد اگلے ہی روز حضرت علیؓ کو خلیفہ بنا دیا گیا تھا[1] مگر وہ عثمانؓ کا لاشہ تین روز تک حرمِ مدینہ سے نہ اٹھوا سکے اور ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہی تھی کہ عثمانؓ کے قاتل یہی کچھ چاہتے تھے۔
- عثمانؓ خلیفۂ رسولؐ تھے، حضرت علیؓ کے پیش رو تھے، ان کی تکفین و تدفین علیؓ کا فریضہ تھا۔ مگر وہ مقتول کے جنازہ میں بھی شامل نہ ہوئے کیونکہ عثمانؓ کے قاتلوں نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی تھی۔
- علیؓ خلیفہ تھے مگر عثمانؓ کو مسلمانوں کے قبرستان جنّت البقیع میں دفن نہ کیا جا سکا کیونکہ عثمانؓ کے قاتل یہی چاہتے تھے۔

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی

- باغیوں کی اجازت سے علیؓ نے عثمانؓ کی لاش کو دفن کے لئے حریم مدینہ سے اٹھانے کی اجازت دی مگر ساتھ ہی حکم تھا کہ انہیں یہودیوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ حکم عثمانؓ کے قاتلوں کے حکم سے ہی جاری ہوا تھا۔
- حضرت عثمانؓ کے ہمراہ قتل ہونے والے غلاموں میں سے دو مقتولین کے پاؤں میں رسیاں باندھ کر انہیں گھسیٹا گیا اور پھر گھسیٹ کر ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا۔ جہاں اُن دونوں کو کتے کھا گئے مگر علیؓ خلیفہ ہونے کے باوجود اس بے رحمی میں رکاوٹ نہ بن سکے کیونکہ وہ عثمانؓ کے قاتلوں کی مرضی کے بغیر کچھ نہ کر سکتے تھے۔

حالات کی اس صورت میں بھی اگر مولانا کو یہی ضد ہو کہ علیؓ کی حکومت ایک آئینی حکومت تھی اور وہ حضرت معاویہؓ کو یہی مشورہ دیں کہ انہیں اپنی ذاتی حیثیت سے عثمانؓ کے خون کا استغاثہ لے کر علیؓ کے دربار میں حاضر ہونا چاہیئے تھا تو اب مولانا سے کوئی کیا کہے۔

البتہ اُن سے اُنہی کے الفاظ میں یہ ضرور پوچھا جا سکتا ہے کہ عثمانؓ کے لاشہ سے جو سلوک بھی ہوا کیا اسلام نے کسی کافر کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کرنا جائز رکھا ہے؟[1]

اگر علیؓ با اختیار خلیفہ تھے تو کہنا چاہیئے کہ یہ سب کچھ اُنہی کے حکم سے ہوا اگر اُن کے حکم سے نہیں ہوا اور وہ با اختیار نہیں تھے تو بے اختیار خلافت کو آپ علیٰ منہاج النبوۃ کیونکر کہتے ہیں اور لوگوں کو اُن کے پاس شکایات لے جانے کی تلقین کس اصول سے کرتے ہیں۔

---

[1] خلافت و ملوکیت ص۱۲۹

حضرت علیؓ کی بااختیار خلافت کا

ایک اور رُخ

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی کمان میں اپنی جانیں نچھاور کرنے والے لوگ جب تک یہ سمجھتے رہے کہ وہ علیؓ کے حکم سے لڑ رہے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علیؓ کے رشتہ کے اجلال و احترام میں وہ اُن کے حکم پہ کٹ کٹ کر گرتے رہے۔ مگر جونہی انہیں پتہ چلا کہ جدال و قتال کی یہ پالیسی علیؓ کی نہیں بلکہ عثمانؓ کے قاتلوں کی ہے، اور وہ مسلمانوں میں باہمی کشت و خون کو جاری رکھ کر اپنی حفاظت کا سامان کر رہے ہیں تو وہ پریشان ہو گئے، اور یہ مرحلہ علیؓ کی عزتِ نفس کے لئے بھی سخت تر ابتلاء کا موجب بن گیا۔ جب وہ علیؓ کے حکم کو غیر علیؓ کا حکم سمجھ کر اکڑ گئے اور انہوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا پھر ایک مرحلہ آیا کہ علیؓ فرماتے تھے۔

لوگو! میں چیخ چیخ کر تمہیں پکارتا ہوں اور ایک مدد طلب کرنے والے کی طرح گھبرا کر تمہیں اپنی مدد کے لئے آواز دیتا ہوں لیکن تم میری کوئی بات نہیں سنتے، نہ میرے حکم کی اطاعت کرتے ہو۔
(طبری جلد ۴ باب ۱۸)

مسلمانو! میں پچاس راتوں سے تمہیں پکار رہا ہوں لیکن تم اونٹ کی طرح مُنہ کھول کر زمین پر پھیل جاتے ہو۔ (طبری جلد ۴ باب ۱۸)

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ:

علیؓ اہلِ مدینہ کی اطاعت سے خوش نہیں تھے کیونکہ وہ لوگ مسلمانوں کی

لڑائی مسلمانوں کے خلاف جاری رکھنے پر تیار نہیں تھے ۔ حضرت علیؓ نے اہل مدینہ کو جمع کر کے خطبہ دیا اور انہیں اپنے مخالفوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ہمراہ چلنے کی تحریک کی مگر پورے شہر میں سے صرف دو آدمی ابوالہیثم اور خزیمہ ہی آپ کی بات قبول کرنے پر تیار ہو سکے۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت علیؓ نے اگلی صبح لوگوں کو مدینہ کے باہر پہنچنے کے لئے تاکید کی اور انہیں بتایا کہ میں وہاں اُن کا انتظار کروں گا۔ چنانچہ علیؓ وہاں ظہر تک بیٹھے لوگوں کے منتظر رہے مگر سوائے ابوالہیثم اور خزیمہ کے وہاں کوئی نہ پہنچا اور بالآخر علیؓ بھی واپس لَوٹ آئے [1]

اب ہمارے کہنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مولانا مودودی صاحب کا ادعا اور واقعات دونوں چیزیں قارئین کے سامنے ہیں اور فیصلہ بھی اُنہی کے سپرد ہے۔

اگرچہ حضرت علیؓ کے مقدمہ کو مضبوط رکھنے کے لیے ہماری معروضات کے خلاف بہت سی روایات لوگوں نے بنا رکھی ہیں مگر کوئی بتائے کہ ہماری پیش کردہ روایات کی کیا تاویل کی جا سکتی ہے۔

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۳

فصل سوم — تہہ منظر

علیؓ معاویہؓ تصادم کا اصل سبب

بیشتر پس منظر سے زیادہ تہہ منظر میں پوشیدہ ہے

مشاجراتِ صحابہؓ ہماری تاریخ کا ایک ایسا عظیم المیہ ہے جسے اسلام اور مسلمانوں کی بدقسمتی ہی کہا جائے گا۔

اسلام کے بہترین دور میں اہل اسلام کے یہ بدترین جھگڑے تھے جس کی وجہ سے اسلامی تاریخ کا رُخ ہی تبدیل ہو گیا۔

ان مشاجرات کا پہلا بُرا نتیجہ جمل کی جنگ میں سامنے آیا جب عام روایات کے مطابق دس ہزار اور بقول علامہ سیوطیؒ تیرہ ہزار مسلمان مسلمانوں کی تلواروں سے ہی موت کے گھاٹ اتر گئے۔

ان مشاجرات کا دوسرا ہولناک خونیں منظر اُس وقت دیکھنے میں آیا جب صفین کے میدان میں نوّے ہزار مسلمانوں کی نعشیں بکھری پڑی تھیں، جبکہ یہ مقتولین بھی مسلمان تھے اور اُن کے قاتل بھی مسلمان ہی تھے۔ مسلمانوں کے یہ باہمی جھگڑے اُس وقت شروع ہوئے جب خلافتِ عثمانی کے باغی بلوائیوں نے حضرت عثمانؓ خلیفۂ رسول کو قتل کر دیا اور ان کی جگہ حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کیا گیا۔ مگر چونکہ یہ انتخاب اُمت کے اربابِ حل و عقد اور کبار صحابہؓ کے بجائے حضرت عثمانؓ کے قاتلین اور بلوائیوں کے اہتمام میں ہوا تھا اس لئے بہت سے اصحابِ رسولؐ

کو اس انتخاب پر اعتراض ہوا۔

یہ اختلاف ابھی جاری ہی تھا کہ حضرت علیؓ نے بعض مصالح سے حضرت عثمانؓ کے خونِ ناحق کا قصاص فی الوقت لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر اختلاف نے احتجاج کی صورت اختیار کر لی اور یہ احتجاج پھر ایک دوسرے کے خلاف خروج پر منتج ہوا، خروج نے تصادم کی راہ لی اور اس تصادم کا نتیجہ پھر وہی تھا جس کا اوپر ذکر ہوا۔

حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ کا تصادم اسی پس منظر میں ہوا ہے مگر جس قیامت نے صفین کے میدان میں وجود پایا وہ صرف اسی پس منظر کی ہی تخلیق نہیں تھی بلکہ اس کے اسباب کچھ دوسرے بھی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے قتلِ ناحق کے نتیجہ میں واقع ہونے والے حالات اگر رُو پذیر نہ بھی ہوتے، حضرت علیؓ کے انتخاب میں بھی کوئی بات قابلِ اعتراض نہ ہوتی، علیؓ کی خلافت فساق کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے کے بجائے اُمت کے صلحاء، اکابر صحابہؓ اور اربابِ حل وعقد کے ذریعہ ہی منعقد ہوتی، حضرت علیؓ خونِ عثمانؓ کا قصاص بھی لے لیتے، علیؓ معاویہؓ تصادم پھر بھی ہوتا، ضرور ہوتا اور ہوئے بغیر ہرگز نہ رہتا کیونکہ علیؓ معاویہؓ تصادم کی بات نہ تو محض حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اس پر حضرت علیؓ کے طرزِ عمل سے ہی چلتی ہے اور نہ یہ کہانی اس پس منظر تک پہنچ کر ہی رُکتی ہے بلکہ علیؓ معاویہؓ تصادم کا ایک گہرا تہہ منظر ہے اور یہ تہہ منظر ہی دراصل اس سارے فساد کی بنیاد ہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد گزرنے والے واقعات جن کے نتیجہ میں جنگِ جمل برپا ہوئی تو اس کا علیؓ معاویہؓ تصادم سے بس اتنا ہی

تعلق ہے کہ دونوں جگہ قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ موجود تھا ورنہ جنگِ جمل ایک جدا حقیقت ہے اور علیؓ معاویہؓ تصادم ایک الگ امر ہے کیونکہ علیؓ معاویہؓ تصادم اصل میں علیؓ اور معاویہؓ کا تصادم نہیں تھا بلکہ بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کے درمیان تھا اور اس میں رکاوٹ اب تک صرف یہی تھی کہ بنو ہاشم صاحبِ اقتدار نہیں تھے۔ یہ اقتدار جونہی اُن کی طرف لوٹا پھر اس تصادم کے لئے کسی سبب یا بہانہ کی احتیاج نہیں تھی۔

بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی آویزش

واقعہ یہ ہے کہ بنو ہاشم اور بنو اُمیہ دراصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں، اور یہ دونوں خاندان ایک دوسرے سے نہایت ہی قریب پڑتے ہیں۔ عقد الفرید کی روایت کے مطابق بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کے درمیان آویزش کی بنیاد اُس وقت پڑی جب حضرت علیؓ کے دادا عبد المطلب اور حضرت معاویہؓ کے دادا حرب بن اُمیہ میں خاندانی چودھراہٹ کو اپنے لئے خاص کر لینے کے سوال پر نزاع چلی [1]

بنو ہاشم عددی اعتبار سے زیادہ طاقتور تھے اور بنو اُمیہ کو اپنی سیاسی اور فکری صلاحیتوں کا زعم تھا۔ پس بنو ہاشم اپنی افرادی قوت کی وجہ سے بنو عبد مناف کے قومی اعزاز پر اپنا حق فائق سمجھتے تھے اور بنو اُمیہ اپنی صلاحیتوں کی دلیل سے اس ریاست کو اپنا حق قرار دیتے تھے۔ اس پر دونوں خاندانوں میں کشمکش چل نکلی جو بالآخر معاندت کی حدود میں داخل ہو گئی اور دونوں ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور ذلیل بنا کر رکھنے

---

[1] الفاروق علامہ شبلی نعمانی

کے لئے آمادۂ کار رہنے لگے۔

حالات زیادہ نازک ہو گئے تو فریقین نے بنو عدی کے ایک بزرگ کو اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کیا اور اس بزرگوار نے فیصلہ بنو ہاشم کے حق میں دیا۔ یہاں تک تو خیر ہی تھی کہ ثالث نے جس بات کو صحیح سمجھا اُس کا اعلان کر دیا مگر ثالث نے اپنے فیصلہ کا اعلان کرتے وقت حرب بن اُمیہؔ کو مخاطب کر کے جو کلمات کہے وہ نہ صرف غیر ضروری ہی تھے اور ثالثی کے منصب اور انصاف کی حدود سے تجاوز کے ضمن میں آتے تھے بلکہ وہ حرب بن اُمیہؔ اور ان کے پورے خاندان کے لئے سخت توہین انگیز اور وجۂ اشتعال بھی تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنو اُمیہؔ نے اس فیصلہ کو جانبدارانہ قرار دے کر ماننے سے انکار کیا اور دو خاندانوں کے جس مناقشہ کو دُور کرنے کے لئے اس انصاف طلبی کا اہتمام کیا گیا تھا وہ فتنہ کو مزید بڑھانے کا سبب بن گئی۔

اب یہ بتانا تو مشکل ہے کہ ثالث نے یہ غیر ضروری بحث کیوں چھیڑ دی اور ثالثی کو جارحیّت سے کیوں ملوّث کیا۔ تاہم قیاس یہ ہے کہ ثالث بزرگ جو بنو عدی سے تعلق رکھتے تھے ثالثی کے وقت اُس تلخی کو فراموش نہیں کر سکے جو اُن کے خاندان کو گزشتہ کچھ زمانہ سے بنو عبد الشمس کے ہاتھوں پہنچتی رہی تھی۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

قبیلہ عدی اور بنو عبد الشمس میں بہت مدّت سے عداوت چلی آ رہی تھی اور چونکہ بنو عبد الشمس کا خاندان بڑا تھا اس لئے غلبہ اُنہی کو رہتا تھا (اس کشمکش کے ایک مرحلہ پر) عدی کے خاندان نے جن میں خطاب (حضرت عمرؓ کے والد) بھی شامل تھے، مجبور ہو کر بنو سہم کے دامن میں پناہ لی۔

بنو عدی کا تمام خاندان مکہ معظمہ میں مقام صفا میں رہتا تھا۔

جب اُنہوں نے بنو سہم سے تعلق پیدا کیا تو اپنے مکانات بھی اُنہی کے ہاتھ بیچ دیئے [1]

واضح رہے کہ عبد الشمس بنو اُمیہ کے جدِ اعلیٰ تھے۔ جناب عبدِ مناف کے دو بیٹے تھے ہاشم اور عبد الشمس۔ ہاشم کی اولاد بنو ہاشم کہلاتے تھے اور عبد الشمس کی اولاد بنو عبد الشمس کے نام سے مشہور تھی۔

عبد الشمس کے بیٹے اُمیہ زیادہ نامور نکلے تو یہ خاندان بنو عبد الشمس کے بجائے بنو اُمیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اس تصریح سے ظاہر ہے کہ بنو عدی اور بنو عبد الشمس کی لڑائی دراصل بنو عدی اور بنو اُمیہ کی ہی لڑائی تھی۔

اب اس باب میں بنو عدی کے ایک شخص کی معاندانہ چالوں کے مقابلہ میں بنو اُمیہ کی حوصلہ مندی، صاف دلی اور صلح پسندی کا جذبہ ہی لائقِ تحسین ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بنو عدی سے کشیدگی کی موجودگی میں اُن سے انصاف چاہنے میں خطرہ ہے۔ اُنہوں نے محض اپنی امن پسندی اور اور صاف دلی کی وجہ سے ہی اُن کے ایک فرد کو اپنے مقدمہ میں ثالث مان لیا۔

ہم اس کتاب کے حصہ اوّل میں حضرت معاویہؓ کی نیک اندیشی، امن خواہی اور صلح جوئی کے سلسلہ میں بعض ایثار بدوش واقعات پیش کر آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو اُمیہ فطرتاً ہی صلح جُو اور امن پسند تھے۔ اور عین دورانِ جنگ بھی کسی ادنیٰ سی تحریک سے صلح قبول کرنے اور ہتھیار رکھ دینے پر آمادہ رہتے تھے۔ بہر حال اس فیصلہ کے نتیجہ میں مناقشت کی آگ بجھنے یا کم ہونے کے بجائے مزید بھڑک گئی اور معاملہ

---

[1] الفاروق صہ۴۹ بحوالہ تاریخِ مکہ المازرقی

پہلے سے بھی زیادہ سنگین ہو گیا۔

آفتابِ رسالتؐ کا طلوع

حالات کے اس مرحلہ پر جبکہ بنو ہاشم اور بنو اُمیّہ کی باہمی عداوت شباب پر تھی اور اُن کے آپس میں مل بیٹھنے کی کوئی صورت موجود نہیں تھی۔ عرشِ معلّیٰ کی سمت سے ایک انقلاب اُچھلا جس کی کارفرمائی نے ارض و سماء کی تقدیر کے سارے ہی خطوط یکسر تبدیل کر دیئے۔

رحمتِ الٰہی کے بحرِ بیکراں میں ایک موج لہرائی اور ملاءِ اعلیٰ کی رفعتوں سے لے کر زمین کی پستیوں تک ہر شئے کی نگاہیں مستقبل پر جم گئیں۔ رحمت کی بارش سے ایمان کی کھیتیاں ہر جانب لہلہانے لگ گئیں اور دلوں کی شور زمیوں میں ایقان کے پھول اُگ آئے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم یتیمی کی گود میں کھیلے، غربت کے دُودھ پر پلے اور سیّد المرسلینؐ بن کر اُبھرے۔

آفتابِ رسالتؐ کی ضیاء پاشیوں نے کفر کی بھیانک تاریکیوں کے پردے چاک کر دیئے، شیطان کا غرور ٹوٹ گیا اور شرک کے خرابوں میں توحید کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے اپنے عہدِ طفولیت سے ہی اہلِ مکّہ کے دلوں میں گھر کر چکے تھے، اور مکّہ کے سارے ہی اچھے لوگ بلا امتیاز شعب و قبیلہ اُن سے محبت کرتے تھے اور اُن کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ اہلِ مکّہ میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو بنو ہاشم سے عداوت رکھتے تھے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے رغبت اور محبت کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعویٰ نبوت سے قبل امینِ مکّہ کا

حلف دینے والوں میں بنو ہاشم کے حلیف اور حبیف سارے ہی شامل تھے۔

اگرچہ بنو امیہ سے بنو ہاشم کی چپقلش جاری تھی مگر بہت سے دوسرے اچھے لوگوں کی طرح بنو امیہ کے اچھے لوگ بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بے پناہ احترام کرتے تھے اور ان سے پوری پوری ہمدردی رکھتے تھے۔ حضورؐ کی بعثت کے مرحلہ پر بنو امیہ کے سربراہ ابوسفیان تھے۔ انہیں حضور علیہ السلام سے جس درجہ شغف اور ہمدردی تھی وہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اشرار کی بات تو جدا ہے مگر مکہ کے اخیار کے ہاں حضورؐ کا احترام آپ کے دعوئے نبوت سے بھی متاثر نہیں ہوا تھا اور وہ اس حال میں بھی آپ سے وہی محبت اور شغف روا رکھتے تھے۔ جو دعویٔ نبوت سے قبل ان کا معمول تھا۔ ابوسفیان آپ کی نبوت کے منکر تھے مگر آپ کی ذات سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ اور ان کی ہمدردیاں بہرحال آپ کے ساتھ تھیں۔

حضورؐ کے دعویٔ نبوت کے بعد آپ کے اپنے خاندان یعنی بنو ہاشم کے لوگ آپ کی تکلیف میں آپ کا ساتھ نہیں دے رہے تھے بلکہ ان میں بعض ایسے بھی تھے جو آپ پر سنگباری بھی کرنے لگتے تھے مگر ابوسفیان اس مرحلہ پر بھی حسب ضرورت حضورؐ کی امداد کو پہنچ جاتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اشرار مکہ کی طرف سے نشانہ ستم بنایا جاتا تھا تو بنو ہاشم کے بجائے حضور علیہ السلام کی پناہ گاہ ابوسفیان کا گھر بنتا تھا[۱]

ایک دفعہ فرعون مکہ ابوجہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب تر اور کمسن بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا کے چہرۂ مبارک پر ایسا طمانچہ مارا کہ انگلیوں کے نشان آپ کے رخساروں پر نظر آتے تھے۔ رسول اللہ

---

[۱] اصابہ فی تمیز الصحابہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منظر سے بڑی تکلیف پہنچی۔ آپؐ نے فاطمہؓ سے کہا جاؤ ابو سفیان کو جا کر اپنا حال سناؤ۔ وہ ابو سفیان کے پاس گئیں اور اپنی دردبھری کہانی سنائی۔ ابو سفیان کو سخت رقت ہوئی۔ فوراً اٹھا اور فاطمہ کو ہمراہ لے کر ابو جہل کے ڈیرہ پر پہنچا۔ ابو جہل اپنے ساتھیوں میں بیٹھا بڑے فخر و ناز سے باتیں کر رہا تھا۔ ابو سفیان نے فاطمہؓ سے کہا لو بیٹی، آگے بڑھو اور جس طرح اس نے تمہیں طمانچہ مارا تھا تم بھی اس کے منہ پر ایسے ہی زور سے طمانچہ مارو۔ اس پر فاطمہؓ آگے بڑھیں اور ابو جہل کے منہ پر اس زور سے طمانچہ رسید کیا کہ پوری محفل مبہوت ہو کر رہ گئی۔

بنو ہاشم نے آگے چل کر حضورؐ کی نبوت کو اپنے خاندان کی برتری کی دلیل بنا لیا تھا مگر مکہ میں وہ اس نبوت سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے جبکہ بنو امیہ کا کردار اس مرحلہ پر بھی ہمدردانہ ہی تھا۔ حضرت عثمانؓ بنو امیہ میں سے ہی تھے۔ مکہ کے دورِ ابتلاء میں ہی ایمان لائے تھے۔ اور اپنے اخلاص کی وجہ سے حضور کے بہت قریب پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ حضورؐ نے ان کو اپنی دامادی کے شرف سے نوازا۔ اور جب حضورؐ کی ایک بیٹی فوت ہو گئی تو آپ نے اپنی دوسری بیٹی بھی اُن کے نکاح میں دے دی۔ حضورؐ کی بڑی بیٹی حضرت زینبؓ حضرت ابو العاصؓ کے نکاح میں تھی، یہ بھی اموی ہی تھے۔ بنی امیہ جب ایمان لائے تو حضور علیہ السلام کے فتراکِ اطاعت سے یوں بندھ گئے کہ بس پھر حضورؐ کے ہو کر ہی رہ گئے اور اُنہوں نے کبھی مُڑ کر بھی نہ دیکھا کہ وہ پہلے کون تھے، کہاں تھے اور بنو ہاشم سے ان کے تعلقات کی کیا نوعیت تھی؟ انہوں نے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کی تفسیر اپنے حسنِ عمل سے اس طرح کی کہ وہ ایک تاریخی حقیقت بن گئی۔ وہ جب آئے تو بنو ہاشم سے یوں گھل مل گئے کہ جیسے وہ

اُنہی میں سے ہوں۔ اُنہوں نے بنی ہاشم کی طرف سے اپنا دل یوں صاف کر لیا کہ جیسے وہاں کبھی کسی غبار نے دخل ہی نہیں پایا تھا۔ دربارِ رسالتؐ میں چھوٹے بڑے کے سارے امتیاز ختم ہو گئے۔ اور سب ہی ایک دوسرے سے اخوت کے رشتہ میں بندھ گئے۔ نہ وہاں کوئی نسل کا امتیاز رہ گیا نہ قبیلہ کا۔ سب ہی مسلمان تھے اور صرف مسلمان تھے اور منظر کچھ ایسا ہی تھا کہ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اور بنو ہاشم؟

افسوس ہے کہ بنو ہاشم کی سوچ بالکل دوسری تھی اور وہ اس بات کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے کہ کسی کو بنو ہاشم سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب نصیب ہو۔ ان کا مزاج سب سے جُدا تھا اور سب سے الگ تھا۔ وہ لوگ اب سب کا مرجع بن گئے تھے۔ مگر اسلام قبول کر لینے کے باوجود اُنہوں نے اپنے قدیم مزاج میں کوئی تبدیلی قبول نہ کی۔

بلاشبہ بنو ہاشم کا یہ شرف بڑا عظیم شرف تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خاندان کا حصہ تھے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اسلام کی برادری سے اپنے آپ کو الگ اور ممتاز سمجھیں اور دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے پر اصرار کریں۔ اُن کا یہ شرف صرف اسلام کی وجہ سے تھا اور اسلام نے یہ شرف دوسرے لوگوں کو بھی عطا کر دیا تھا جب وہ قبولِ اسلام

کے شرف سے مشرف ہو چکے۔

اسلام کالے گورے کا فرق مٹا چکا تھا۔ وہ اعلان کر چکا تھا کہ جاہلیت کے سارے دستور ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اب کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے تھے۔ فضیلت صرف اسی کو حاصل ہے جس کے اعمال سب سے بہتر ہوں اور جو اللہ سے سب سے بڑھ کر ڈرنے والا ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہ بات بنو ہاشم کی عقل میں نہیں آ رہی تھی۔ دراصل بنو ہاشم کی کمزوری یہ تھی کہ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی تعلق کے سوا دوسری کوئی کوالیفکیشن موجود نہیں تھی اور وہ اپنی اسی کوالیفکیشن کی طاقت سے ہی پیش منظر پر رہ سکتے تھے۔

خود بنو ہاشم کو بھی اپنی اس کمزوری کا علم تھا یہی وجہ ہے کہ کسی دوسرے خاندان کا کوئی شخص حضور علیہ السلام سے جس قدر قریب ہو جاتا وہ اسی سطح پر بنو ہاشم کا محسود ہوتا تھا۔ اور اس باب میں بنو ہاشم حضرت ابوبکرؓ صدیق اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے اخص رفقائے رسول علیہ السلام کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

بنو ہاشم ہمیشہ استعجاب کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ ان کے ہوتے تیمی (ابوبکرؓ) اور عدوی (عمرؓ) خلافت پر کیونکر قبضہ کر بیٹھے اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں تو علانیہ نقضِ خلافت کے مشورے ہوتے رہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ ازالۃ الخفا میں لکھتے ہیں:

زبیرؓ و جمعے از بنو ہاشم در خانہ حضرت فاطمہؓ جمع شدہ درباب نقض خلافت مشورہ ہا بکاری بردند [1]

کہ حضرت زبیرؓ اور دوسرے بنو ہاشم حضرت فاطمہؓ کے گھر میں جمع ہوتے تھے اور ابوبکرؓ کی خلافت کو توڑنے کی تدبیریں سوچتے تھے۔

---

[1] الفاروق اشاعت ثانی شائع کردہ کتاب منزل لاہور صـ ۲۰۴

یہ محض کوئی تاریخی روایت ہی نہیں بلکہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ البخاری میں بھی حضرت عمر فاروق رضی کی زبان سے ایک روایت وارد ہوئی ہے کہ:

حضرت رسول علیہ السلام کی وفات کے بعد ابوبکر رضی صدیق ہم سب سے افضل تھے مگر حین توفی اللہ نبیہ ان الانصار خالفونا واجتمعوا باسرھم فی سقیفۃ بنی ساعدۃ وخالف عنا علی رضی و زبیر رض ومن معھما [1]

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو وفات دی تو انصار نے ہماری مخالفت کی اور (خلافت کو اپنے لئے خاص کر لینے کے لئے) سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے۔

اور (ٹھیک ایسے ہی خلافت کو اپنے لئے خاص کر لینے کے لئے) علی رضی، زبیر رض اور ان کے ساتھیوں (بنو ہاشم) نے بھی مخالفانہ محاذ قائم کر لیا۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ ابن حجر نے اپنی مشہور عالم تصنیف فتح الباری میں حضرت امام مالکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ:

وان علیاً والزبیر رض ومن کان معھما تخلفوا فی بیت فاطمۃ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کہ علی رضی، زبیر رض اور ان کے ہمراہی (بنو ہاشم) فاطمۃ الزہرا رض بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں الگ محاذ بنائے بیٹھے تھے۔

اس مرحلہ پر حضرت زبیر رض اس درجہ مشتعل تھے کہ تلوار لہرا لہرا کر فرما رہے تھے کہ جب تک علی رضی کی بیعت نہیں کی جائے گی یہ تلوار میان میں واپس نہیں جائے گی [2]

---

[1] بخاری شریف پارہ ۲۸ جلد ۳ باب المحاربین [2] طبری

نہج البلاغہ میں حضرت علیؓ کا ایک مکتوب اہلِ بصرہ کے نام نقل ہوا ہے۔ جس میں فرماتے ہیں:

خدا کی قسم مجھے یہ کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت آپ کے اہلِ بیت سے (کسی غیر کی طرف) منتقل کر دیں گے یا حضورؐ کے بعد خلافت کو مجھ سے مُڑ لے جائیں گے[۱]

مصری مصنف عمر ابوالنصر حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کا ایک مکالمہ نقل کرتے ہیں جس میں حضرت حسنؓ کے ایک سوال کے جواب میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

حضورؐ فوت ہوئے تو میں اپنے سوا کسی کو خلافت کا مستحق نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن لوگوں نے مجھے چھوڑ کر ابو بکرؓ کی بیعت کر لی۔ ابو بکرؓ کے بعد مجھے پختہ امید تھی کہ لوگ اب میرے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بنا سکیں گے۔ مگر لوگوں نے عمرؓ کی بیعت کر لی۔ پھر عمرؓ نے مجھے اپنا جانشین مقرر کرنے کے بجائے چھ آدمی نامزد کر دیئے میں ان چھ آدمیوں میں شامل تھا۔ مگر لوگوں نے پھر مجھے ترک کر کے عثمانؓ کی بیعت کر لی[۲]

مصری مصنف مزید لکھتے ہیں کہ:

حضرت علیؓ کو خلافت کی خواہش تو ضرور تھی مگر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں وہ اپنے جذبات کا برملا اظہار نہ کر سکے۔ پھر جب حضرت عمرؓ شہید کر دیئے گئے ..... اور خلافت حضرت عثمانؓ کی طرف منتقل کر دی گئی تو حضرت علیؓ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور جو کچھ دل میں تھا باہر آنا شروع ہو گیا[۳]

---

[۱] نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۶۲ [۲] علیؓ اور عائشہؓ ملخص صفحہ ۱۴۳ تا ۱۴۶
[۳] علیؓ اور عائشہؓ صفحہ ۲۰۷

اور یہی مرحلہ تھا جب حضرت علیؓ نے فرمایا:

"لوگو! میری بات یاد رکھو، اب تم جلد دیکھو گے کہ خلافت حاصل کرنے کے لئے تلواریں نکال لی جائیں گی اور تُخَانُ فِیْہِ الْعُھُوْدُ یعنی پھر سب عہد و پیمان توڑ دیئے جائیں گے [1]

ان حالات میں جب زمامِ اختیار حضرت علیؓ کے ہاتھ میں آ جائے یعنی اقتدار بنو ہاشم کی طرف منتقل ہو جائے تو کون باور کر سکتا ہے کہ حضرت علیؓ وہ سب کچھ نہیں کریں گے جس کے لئے وہ حسبِ روایات حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے عہد سے اب تک ساعی تھے۔ اور وہ اُن لوگوں سے چُن چُن کر انتقام نہیں لیں گے جن کو وہ اپنے اقتدار کی راہ کا پتھر سمجھتے تھے۔

معاویہؓ کے لئے وہ ہمیشہ اپنے پاس تلوار کا پیغام ہی رکھتے تھے بنو امیہ سے وہ اپنا رنج دور کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ پھر اگر انہوں نے اقتدار میں آتے ہی حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ ایک ایک عامل کو چھٹی دیدی اور اُن کے مقرر کردہ افسروں کو رخصت کر دیا، اُن سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو نوٹس مل گئے تو اس میں تعجب والی کوئی بات نہیں ہے، اُنہیں یہی کچھ کرنا تھا، یہ سب کچھ ان کے پروگرام کا حصہ تھا اور وہ جو کچھ کر رہے تھے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہی کر رہے تھے۔

اب بنو اُمیہ ہزار اخلاص دکھائیں، امن سے رہنا چاہیں، لڑائی کو ناپسند کریں، اطاعت کے نذرانے پیش کریں، تعلقات کو نیک بنیادوں پر استوار رکھنا چاہیں، ان کی کسی خواہش کا کوئی احترام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ بنو ہاشم تو پہلے روز سے ہی بنو اُمیہ کا قلع قمع

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳۹

کرنے کے لئے اس روز کے منتظر تھے جب اقتدار ان کی طرف منتقل ہو تو اب جب اُنہیں یہ دولت مل گئی وہ اپنے پروگرام کو ترک کیوں کریں وہ اپنے اس پروگرام کی تکمیل میں کوتاہی کیوں روا رکھیں۔ حضرت علیؓ کا پروگرام بالکل واضح تھا اور وہ بڑے اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنے اس عزم کا اظہار کرتے تھے کہ:

خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو بنو اُمیہ کو اس طرح جھاڑ پھٹک کر ڈال دوں گا جس طرح قصاب مٹی سے آلودہ گوشت کے ٹکڑے سے مٹی کو جھاڑ دیتا ہے [1]

بنو ہاشم کے دل بنو اُمیہ کے خلاف انتقام کے لئے جس درجہ بے قابو ہو رہے تھے اس کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت حسینؓ کا وہ قول کفایت کرتا ہے جو آپ نے یزید کی حکومت کے خلاف خروج کرتے وقت ارشاد کیا تھا کہ:

بادشاہی برائے بنو اُمیہ گوارہ نمی شود تا مرا نکشند [2]

کہ مجھے اپنے جیتے جی بنو اُمیہ کی حکومت کسی طرح بھی برداشت نہیں ہے۔ اور یہ ارشاد اُن دنوں کا ہے جب بادشاہی بنو اُمیہ کے ہی قبضہ میں تھی اس لئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب بادشاہی بنو ہاشم کے قبضہ میں ہو تو وہ ان روایات کی روشنی میں کیا کچھ نہیں کریں گے۔

بنو ہاشم کا امتحان

بنو ہاشم جو اپنے سوا کسی کو نگاہ میں نہیں لاتے تھے، ہر کسی کو

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۷۷ [2] جلاء العیون مطبوعہ ایران ص ۳۷۹

سمجھتے تھے اور اس بات پر بضد تھے کہ سب لوگ ہی اُن کی برتری پر ایمان رکھیں تو پھر ایک مرحلہ ایسا آہی گیا جب قدرت نے انہیں اپنی برتری کا ثبوت مہیا کرنے کا موقع فراہم کر دیا مگر وہ اپنے زعم کا ثبوت مہیا کرنے میں اس درجہ ناکام رہے کہ یہ واقعہ خود تاریخ کی ایک عبرت ہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب اقتدار بنو ہاشم کی طرف منتقل ہوا اور حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے جانشین کی حیثیت سے تختِ خلافت کو رونق بخشی تو آپ نے بنو ہاشم کی پرانی تمناؤں کے خاکہ میں بھرپور رنگ بھرا۔ اور جہاں جہاں بھی ممکن ہوا اپنے گھر کے سارے ہی قابلِ ذکر افراد مملکت کے مناصب اعلیٰ پر متعین کر دیئے۔

خود کوفہ کو دارالسلطنت قرار دے کر مملکت کے مرکز کی نگرانی اپنے قبضہ میں رکھی۔ یمن پر اپنے چچازاد بھائی عبیداللہ بن عباس کو حاکم مقرر کیا۔ مکہ کی حکومت اپنے دوسرے عم زاد معبد بن عباس کے سپرد کی۔ مدینہ منورہ کی حکومت اپنے تیسرے چچازاد بھائی قثم بن عباس کے حوالے کی۔ عراق کی حکومت اپنے چوتھے چچازاد بھائی عبداللہ بن عباس کو عطا فرمائی۔ خراسان پر اپنے بھانجے اور داماد جعدہ بن ہبیرہ کو حاکم مقرر کیا۔ مصر اپنے سوتیلے بیٹے (جو بنو ہاشم کا ہی ایک فرد بن چکا تھا) محمد بن ابی بکر کے سپرد کیا۔

اپنے حقیقی بیٹے محمد بن حنفیہ کو افواج اسلامی کے کمانڈر اعلیٰ کے عہدہ سے نوازا۔ حضرت علیؓ نے اپنے اہل خاندان کو اتنی فراخدلی سے نوازا کہ ان کے اس فعل کو خود اُن کے اپنے قریبی حلقوں میں بھی بری طرح محسوس کیا گیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی افواج کا مشہور کمانڈر، حضرت عثمانؓ کا قاتل اور حضرت علیؓ کو بزورِ شمشیر خلافت کا تاج پہنانے والا اشتر

حضرت کی اس کارروائی سے اس قدر مشتعل ہوا کہ بقول علامہ طبری اشترؒ کو جب معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ نے عبداللہؓ بن عباس کو بصرہ کا عامل مقرر کیا ہے تو وہ وفورِ غضب سے چلایا کہ کیا ہم نے اسی لئے اُس بوڑھے (عثمانؓ) کو قتل کیا تھا کہ یمن عبیداللہ بن عباس کو دے دیا جائے، حجاز قثم بن عباس کے سپرد کر دیا جائے، بصرہ عبداللہؓ بن عباس کو بخش دیا جائے اور کوفہ پر خود علیؓ حکومت کریں۔

یہ کہہ کر اشتر نے اپنی سواری منگوائی اور لشکرِ علیؓ کو چھوڑ کر نکل گیا۔ حضرت علیؓ کو یہ خبر ملی تو اُنہوں نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ اور بھاگم بھاگ اشتر کو جا لیا اور بلطائف الحیل اُسے منایا۔ لہ

اب یہ بات تاریخ کے ہر قاری کے لئے حیرت کا موجب ہی ہو گی کہ حضرت علیؓ کے مقرر کردہ ان عمالِ حکومت میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ نکلا جس نے تاریخ سازی میں کوئی ادنیٰ سا کردار بھی شامل کیا ہو۔

نہج البلاغہ حضرت علیؓ کے خطبات اور مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ ان میں سے کسی سے بھی خوش نہیں تھے اور وہ اپنے بہت سے مکتوبات میں ان لوگوں کی خیانتوں، بددیانتیوں، سرکشیوں اور نافرمانیوں کا بار بار ذکر فرماتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کے عظیم فرزند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کے عمال ملکی فرائض کی سرانجام دہی خلافت کے احکام کی تعمیل و تسلیم، ایفائے عہد اور وفاداری میں مثالی مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی عملداری میں عمدہ خدمات سرانجام دیں۔ خمس اور غنائم کو پوری

لہ طبری جلد سوم حصہ دوم

دیانتداری سے دار الخلافہ میں بھیجتے تھے ..... لیکن حضرت علیؓ کے عمال نہ ملک کے وفادار تھے، نہ علیؓ کے فرمانبردار تھے، اُن کے کاموں میں ابتری غالب تھی، وہ جدھر نکلے شکست کھا کر لوٹے اور جدھر بڑھے ذلیل ہوئے۔ اُنہوں نے خیانت کاریوں اور ظلم کے سبب دونوں جہانوں میں رُوسیاہی کا سامان کیا۔ اور یہی حال حضرت علیؓ کے ان عمال کا تھا جو حضرت کے چچا زاد بھائی تھے۔[1]

اپنے سوتیلے بیٹے محمد بن ابی بکر کی ناکام زندگی اور بدحالی کی موت کے بعد حضرت علیؓ اسے مصر کا عامل بنانے کی غلطی پر ہمیشہ متاسف رہے۔[2] حضرت عبداللہؓ بن عباس کی نسبت حضرت علیؓ کو اطلاع ملی کہ وہ بیت المال اور ملکی اموال میں خیانت کرتے ہیں اس پر حضرت علیؓ نے اُنہیں لکھا کہ مجھے تمہاری خیانت کاریوں کی اطلاع پہنچی ہے مجھے ملکی آمد و خرچ کی تفصیل لکھ کر بھیجو۔

حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ آپ کو غلط اطلاع پہنچی ہے۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ حضرت علیؓ نے دوسرا خط لکھا کہ بہرحال مجھے خزانہ میں آنے والی اور خرچ کی جانے والی رقوم کا حساب تحریر کرو۔

حضرت علیؓ کے اس خط کے جواب میں حضرت ابن عباسؓ نے اپنا استعفیٰ بھیج دیا اور لکھا کہ آپ جس کو چاہیں یہ حکومت سپرد کر دیں میں یہ حکومت چھوڑتا ہوں۔

اس کے بعد آپ نے اپنے ماموؤں (بنو بلال بن عامر) کو بلایا۔ چنانچہ ضحاک بن عبداللہ ہلالی اور عبد بن رزین ابن ابی عمرو ہلالی اُن کے پاس آئے اور ابن عباس نے ان کی مدد سے تمام خزانہ اٹھوا لیا۔ خزانہ

---

[1] تحفہ اثنا عشریہ طبع کراچی باب ۱۰ صفحہ ۴۸۹ کالم ۲ [2] طبری جلد سوم باب ۱۵

میں بڑی مقدار میں مال جمع تھا۔ ابن عباس نے پورا خزانہ، سارا مالِ غنیمت اور خمس کی حاصل کردہ رقوم پر قبضہ کیا اور ساتھیوں کی مدد سے سارا مال ہمراہ لے کر چل دیئے [1]

گویا مطلب یہ تھا ے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

یہ تو خیر خیانت کی باتیں ہیں، بنو ہاشم کی مالی محبت کے بعض لطیفے بھی حدیثِ پاک میں وارد ہوئے ہیں۔

حضرت عباسؓ نے ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مال کا تقاضا کیا تو آپؐ نے فرمایا کوئی مال آئے گا تو تجھے ضرور دوں گا۔ اتفاق سے بحرین سے بہت سی دولت آئی تو عباسؓ پھر حاضر ہوئے اور حضورؐ کو اُن کے وعدہ کی یاد دہانی کرائی۔ آپؐ نے فرمایا چچا! جتنا مال آپ اُٹھا سکتے ہیں اُٹھا لیں۔ اُنہوں نے چادر بچھائی اور اتنی دولت اس میں بھر لی کہ پھر اُٹھا نہ سکے۔ حضورؐ سے عرض کرنے لگے کسی آدمی کی مدد سے یہ بوجھ اُٹھوا دیں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں چچا، یہ بوجھ آپ خود ہی اُٹھائیں۔ نہ اُٹھا سکے تو بامرِ مجبوری کچھ دولت چادر سے نکالی مگر پھر بھی بوجھ ان کی ہمت سے زیادہ تھا، امداد کی درخواست کی مگر حضورؐ نے وہی پہلا سا جواب دیا۔ بالآخر کچھ مزید رقم چادر میں سے نکالی۔ بوجھ اب بھی بہت تھا مگر جیسے کیسے بھی اُٹھا لیا۔ جا رہے تھے مگر بوجھ سے کمر خمیدہ تھی۔ حضورؐ اُنہیں جاتے ہوئے دیکھتے تھے اور مسکراتے تھے کہ چچا کی دنیوی حرص کتنی زیادہ ہے [2]۔

حمص کا عامل فوت ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے (شائد کسی تحریک سے)

---

[1] طبری جلد دوم باب ۲۴ [2] بخاری شریف پ ۱۳ حدیث نمبر ۲۰۴ کتاب الجہاد

اُس کی جگہ حضرت عبد اللہؓ بن عباس کو وہاں کا عامل مقرر کرنا چاہا مگر ان کی طرف سے حضرت عمرؓ کو اطمینان نہیں تھا اس لئے انہیں بلا کر فرمایا کہ تمہیں حمص کا عامل تو بنا دوں مگر مجھے تمہاری طرف سے خدشہ ہے۔ اُنہوں نے پوچھا کیا خدشہ ہے۔ عمرؓ فرمانے لگے مجھے خدشہ یہ ہے کہ تم ملکی محاصل میں تصرف کرو گے۔ اس پر علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

"یہ صرف سُوءِ ظن نہ تھا بلکہ وقوع میں بھی آیا۔ حضرت علیؓ نے جب اپنے عہدِ خلافت میں حضرت عبد اللہؓ بن عباس کو عامل مقرر کیا تو اُنہوں نے بیت المال سے بہت سی رقم نکال لی۔ حضرت علیؓ نے باز پُرس کی تو لکھ بھیجا کہ میں نے تو ابھی اپنا حق بھی نہیں لیا" [1]

کچھ ایسے ہی وجوہ ہوں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بنو ہاشم کے بجائے دوسروں کو زیادہ لائقِ اعتماد سمجھا ورنہ بنو ہاشم سے حضورؐ کی محبت بہت بڑی تاریخی حقیقت ہے۔

اور بنو اُمیّہ!

اب اس حقیقت سے انکار کون کرے گا کہ اپنی مملکت کے اعلیٰ مناصب کے لئے بنو اُمیہ کے لوگوں کا انتخاب اُس نگاہِ رسا سے وابستہ ہے جو مومن کی فراست کی عینک سے انسانی پیشانی پر خطِ تقدیر کو پڑھتی تھی اور مومن کی یہ فراست اس کے کمالِ ایمانی کا وہ رُخ ہے جس کا علم وہ اپنے رب سے حاصل کرتا ہے۔

پھر یہ نگاہ بھی کسی عام مومن کی نگاہ نہیں تھی جس کے بھٹک سکنے کا احتمال

---

[1] الفاروق ص ۲۲۴

بہر حال موجود ہے بلکہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ تھی جو نہ کبھی زمین پر ہی بھٹکی تھی اور نہ آسمان کی رفعتیں ہی اس کو متاثر کر سکیں۔ وہ جس طرح زمین پر قائم اور مستحکم تھی اس کا یہ استحکام ماورائے افلاک بھی بدستور رہی تھا۔

حضرت موسےٰؑ نے طور کی ادنیٰ سی بلندی پر انوار کی جھلک پائی تو بے ہوش ہو کر گر گئے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تجربہ ساتوں آسمانوں کے اس پار جا کر سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر ہوا۔ قرآن کا کہنا ہے کہ:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى

کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگاہ نے غلطی نہیں کھائی بلکہ وہی کچھ دیکھا جو حقیقت میں تھا۔

ارشاد ہے:

اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ (نجم)

کہ سدرہ پر چھایا ہوا تھا جو بھی چھایا ہوا تھا۔ نگاہ نے اسے عین ٹھیک دیکھا یعنی نہ کوتاہی واقع ہوئی نہ تجاوز ہوا۔

اور اس نگاہ کے مالک کو اپنے ایوانِ مملکت کے استحکام کے لیے جب مضبوط اساتین کی ضرورت پڑی تو:

- مدینہ کے مرکز کو خود سنبھالا۔
- مکہ عتاب بن اسید اموی کے سپرد کیا۔
- نجران کا حاکم ابو سفیان بن حرب اموی کو بنایا۔
- طائف کی حکومت عثمان بن ابو العاص اموی کے حوالے کی۔
- یمن کا حاکم خالد بن سعید اموی کو بنایا۔
- خیبر عثمان بن سعید اموی کے سپرد کیا۔

- بحرین پر ابان بن سعید اموی کو حاکم مقرر کیا۔
- تیما کی حکومت یزید بن ابوسفیان اموی کے سپرد کی۔

اور پھر دنیا نے دیکھا کہ یہ سب لوگ ہی تاریخ ساز تھے جنہوں نے کفر کے خلاف بھرپور جنگیں لڑیں، ملکوں کو فتح کیا اور اسلام کی شوکت میں اضافہ کیا۔ ان میں سے کوئی خائن نہیں تھا، کوئی بددیانت نہیں تھا، کسی کے حساب میں خرابی نہیں تھی اور کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی کاروائی کرنا پڑی ہو یا کسی کو معزول یا برطرف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو یا کوئی بیت المال اور خزانۂ سرکار کی دولت سمیٹ کر بھاگ گیا ہو۔

جبکہ حضرت علیؓ کے مقرر کردہ عمّال بالخصوص ہاشمی عمّال کی سوائے اس کے کوئی تاریخ نہیں کہ وہ بنو ہاشم سے ہیں کوئی حضرت علیؓ کا بیٹا ہے، کوئی داماد ہے اور حضرت عباسؓ کے چار بیٹوں کی تاریخ صرف یہی ہے کہ وہ حضرت عباسؓ کے فرزندانِ گرامی ہیں اور حضرت علیؓ خلیفۂ رسولؐ کے عم زاد ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صلاحیتوں کی تقسیم اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں ہی رکھی ہے اور امرِ واقعہ یہی ہے کہ سیاسی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے حاکمیت اور فرمانروائی کی صلاحیتیں بنو ہاشم کے مقابلہ میں بنو اُمیہ کے ہاں زیادہ تھیں اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں بھی اُنہیں اپنی ان صلاحیتوں کی وجہ سے ہی مناصبِ حکومت میں سب سے زیادہ حصہ حاصل تھا اس لئے وہ لوگ بجا طور پر بنو ہاشم کے محسود تھے اور بنو ہاشم کے لئے ہر لمحہ اُن کا وجود ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا مگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلافِ منشا کچھ نہیں کر سکتے تھے تاہم وہ بنو اُمیہ کے خلاف سب کچھ کرنے کے عزم کو فراموش کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور اس غرض سے اُنہیں

صرف کسی مناسب وقت کا ہی انتظار تھا۔ اور اب جب حضرت عثمانؓ کے بعد اقتدار حضرت علیؓ کے ذریعہ بنو ہاشم کی طرف منتقل ہوا تو بنو امیہ کے خلاف کارروائی کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے زمامِ اختیار سنبھالتے ہی بنو امیہ کے خلاف کارروائی جاری کر دی اور ہم یہ عرض کر آئے ہیں کہ حالات کے اس مرحلہ پہ بنو ہاشم کو اپنی کسی کارروائی کے لئے بنو امیہ کی طرف سے کسی وجہِ اشتعال کے صدور کی حاجت نہیں تھی کیونکہ ان کے لئے بنو امیہ کا وجود اور اُن کا فروغ ہی ایک بڑی وجہِ اشتعال تھی۔

مولانا مودودی صاحب کی توجیہ

بنو ہاشم کو مناصبِ حکومت سے دُور رکھنے کے باب میں مولانا مودودی صاحب نے یہ توجیہ فرمائی ہے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقرباء اور قبیلے کو مناصبِ حکومت سے نواز کر اُمت کے اندر اقربا نوازی کی بنیاد نہیں ڈالنا چاہتے تھے [۱]

مگر مولانا کی یہ توجیہ کسی شرعی قاعدہ پر مبنی نہیں ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سُنت قرار دیا جا سکے۔

اصل میں مولانا اپنی اس توجیہ کے ذریعے حضرت عثمانؓ کے اُس حسنِ سلوک کے خلاف اپنا غصہ نکال رہے ہیں جسے اُنہوں نے خلیفۂ رسولؐ حضرت عثمانؓ کا گناہ بنا کر اپنی کتاب میں پیش کیا ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کا بہت خیال رکھتے تھے ورنہ اپنے باصلاحیت اقرباء کو ان کے جائز حق سے محروم رکھنا اور

---

[۱] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۰۶

ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے سے بجبر روک دینا شریعت کا کوئی تقاضا نہیں ہے کیونکہ باصلاحیت لوگوں کا سربراہِ سلطنت سے رشتہ ان کا کوئی گناہ نہیں ہے جس کی سزا انہیں برداشت کرنا پڑے اور اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو اپنی حکومت کے اندر ایک نہایت اہم منصب پر کبھی مامور نہ کرتے۔ وہ اپنے خاندان کے بھلے لوگوں کو کبھی بھلا نہ کہتے، وہ علیؓ کو باب علم نہ فرماتے، وہ اپنی بیٹی فاطمۃ الزہراؓ کو خاتونِ جنّت کا خطاب نہ دیتے، اُنہیں جنّت کی عورتوں کی سردار نہ کہتے۔ وہ اپنے نواسوں کو سیّد شباب اہل الجنّۃ نہ فرماتے، انہیں جنّت کے نوجوانوں کی سیادت کی ایمان افروز خبر سے نہ نوازتے، وہ اُمت کی عورتوں کو خدیجہ طاہرہؓ کی پیروی کی تلقین نہ فرماتے۔ وہ حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہؓ کی نفضیلت دوسری سب عورتوں کے مقابلہ میں کھانوں میں ثرید کی فضیلت سے تشبیہ نہ دیتے۔ اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیرؓ کو اپنا حواری ہونے کا اعزاز نہ بخشتے۔

اگر اپنے لوگوں کو، اپنے اقرباء کو اپنے عزیزوں کو پیچھے ڈال دینا کوئی ثواب کی بات ہوتی تو آپ نے حسبِ حالات یہ کیوں فرمایا کہ الائمۃ من قریش کہ (فی الحال) حکومت قریش کے ہاتھ میں ہی رہنی چاہیئے اور تاریخ کی بھرپور گواہی موجود ہے کہ صرف اس حدیثِ نبویؐ کو سُن کر ہی سب لوگوں نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں، نہ کوئی دعویدار رہا نہ طلبگار، سب نے اپنے دعوے واپس لے لئے اور حکومت قریش کے سپرد کر دی اور ظاہر ہے کہ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو ملک کے خاص سیاسی حالات کے ماتحت ہی دوسرے سب لوگوں پر فوقیت دی تھی اور حسب حالات آپ نے یہ ارشاد فرمائے اس بات کی کوئی پروا نہیں کی کہ دوسرے اس کو

خویش پروری اور اقربا نوازی قرار دیں گے۔ خود مولانا مودودی صاحب بھی مانتے ہیں کہ:

اُس وقت مسلمانوں کو مجتمع رکھنے کے لئے خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری تھا۔ اور اس وقت عرب صرف قریش کی خلافت پر ہی اتفاق کر سکتے تھے۔ ورنہ اگر اس مرحلہ پر یہ منصب کسی غیر قریشی کو دے دیا جاتا تو خود نظام خلافت ہی تہس نہس ہو کر رہ جاتا[1]

اور یقیناً یہ سب کچھ صلاحیتِ کار کی وجہ سے ہی تھا ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر قریشی مسلمانوں کو حکومت سے محروم رکھنے کی تمہید نہیں باندھ رہے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعد میں غیر قریشی با صلاحیت لوگ ہمیشہ قریش پر حاکم بنتے رہے ہیں اور اس پر کسی کو کبھی اعتراض نہیں ہوا۔

بنو امیہ بھی چونکہ قریش میں زیادہ با صلاحیت لوگ تھے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی صلاحیتوں سے پورا پورا استفادہ کیا۔ اور پھر بنو اُمیہ نے بھی آخر تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی اور اپنے آپ کو ہمیشہ حضور علیہ السلام کی توقع کے مطابق ہی ثابت کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حضورؐ کو بنو ہاشم بھول گئے تھے مگر اس کا کیا علاج تھا کہ ؏ ہر کسے را بہر کارے ساختند

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو اُمیہ پر جو گہرا اعتماد تھا ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے ہی حضورؐ کے مزاج میں ان کا دخل زیادہ بڑھ گیا تھا اور یہ کوئی غیر منطقی صورتِ حال نہیں تھی۔

حضورؐ اگر ان لوگوں سے زیادہ شفقت روا رکھتے تھے تو وہ یقیناً اس کے مستحق ہی تھے۔ بنو اُمیہ کی سیرت کے بہت سے رُخ حضورؐ کو دوسروں کے

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۵۵

مقابلہ میں زیادہ پسند تھے اسی لئے آپ نے بھی اپنی زندگی کے بہت سے رُخ ان کے لئے خاص کر رکھے تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ بنو اُمیہ سیاست اور سیادت سے آگے بڑھ کر حضور علیہ السلام کے حرم سرا تک پہنچ گئے تھے اور پھر نہ صرف وہ اُمہات المومنینؓ کے گروہ میں ہی اپنا حصہ شامل کر پائے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کو چھوڑ کر دوسری تمام بیٹیوں کے رشتے اموی لوگوں سے ہی استوار کئے۔ یہ بات ناقابلِ فہم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنو اُمیہ سے یہ قریبی تعلقات بنو ہاشم کے لئے وجۂ کرب بن سکتے تھے اور اُن کے لئے یہ امر قابلِ برداشت نہیں تھا کہ کوئی غیر ہاشمی حضورؐ کے مزاج میں دخل حاصل کرے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ غیر ہاشمیوں کے لئے حضورؐ کی گرم جوشی کو بنو ہاشم اپنی حق تلفی ہی سمجھتے تھے جس کے بہت سے مظاہر آپ کی زندگی میں بھی اُچھلتے اُبھرتے رہے تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نبوت کی ذمہ داریوں کو اپنے اہلِ خاندان سے زیادہ سمجھتے تھے اور اپنی مملکتی مصلحتوں کا بھی اپنے اہلِ خاندان سے زیادہ شعور رکھتے تھے۔ بنو ہاشم کے لئے یہ بات ہمیشہ ناقابلِ فہم ہی رہی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے وابستگی کے شرف سے بڑھ کر بزرگی کا کوئی اور معیار بھی ہو سکتا ہے اس لئے وہ ہر غیر ہاشمی مقتدر یا صاحبِ امر کو ہمیشہ اپنی راہ کا روڑا ہی سمجھتے رہے اور اپنے اس عزم پر جمے ہی رہے کہ ہمارے ہوتے کسی دوسرے کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہے۔

مزاجوں کا فرق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ خاندان میں مزاجوں کا فرق

ایک نہایت ہی نازک مگر اہم موڑ ہے اور اس فرق کو مستقبل کی تاریخ کے بنانے اور بگاڑنے میں بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔

سرورِ کائنات کے اہلِ خاندان کے تاریخی حالات کے مطالعہ سے یہ بات بڑی ہی آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے کہ:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
۲۔ آپ کی محبوب ترین بیٹی خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ۔
۳۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے فرزند اکبر حضرت حسنؓ۔

ان تینوں کا مزاج ایک قسم کا تھا، اور

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرامی قدر چچا حضرت عباسؓ۔
۲۔ حضورؐ کے عم زاد اور داماد حضرت علیؓ بن ابی طالب۔
۳۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے فرزند اصغر حضرت حسینؓ۔

ان تینوں کا مزاج دوسری قسم کا تھا اور اس اختلاف امزجہ کے مظاہر دونوں قسم کے بزرگوں کی زندگیوں میں بڑے نمایاں ہیں۔ عربی مصنف عمر ابوالنصر لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ہوشربا صدمہ کے بعد جب اہلِ مدینہ کے حواس بجا ہوئے تو انہیں میدان میں تین گروہوں کی موجودگی کا علم ہوا:

۱۔ ایک گروہ نے رسول اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چند روز قبل ہی آنے والے واقعات کا اندازہ لگا کر حصولِ اقتدار کے متعلق سوچ بچار کرنا اور اس سلسلہ میں صلاح ومشورہ شروع کر دیا تھا۔ یہ گروہ ہاشمیوں کا تھا جو اسلامی سیاست کے افق پر سب سے پہلے نمودار ہوا۔

جو تاریخی مواد ہمارے سامنے ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرورِ کائنات کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے حضورؐ کے مرض الموت کے دوران میں

حضرت علیؓ بن ابی طالب سے کہا تھا کہ وہ حضور علیہ السلام سے خلافت میں بنو ہاشم کے حصہ کے متعلق پوچھ لیں تاکہ بعد میں کوئی شخص اس بارے میں اُن سے جھگڑا نہ کر سکے۔

لیکن حضرت علیؓ نے یہ کہہ کر پوچھنے سے معذوری ظاہر کر دی کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ہاشم کو خلافت میں حصّہ دینے سے انکار کر دیا تو قیامت تک کے لئے یہ منصب ان کے ہاتھ سے چھن جائے گا اور مسلمان کبھی ان میں سے کسی کو خلیفہ نہیں بنائیں گے [۱]

اس پر مصنفِ کتاب لکھتا ہے:

بادی النظر میں یہ روایت صحیح ہو یا غلط تاہم کوئی ایسا سبب موجود نہیں تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل بنو ہاشم کو خلافت کے بارے میں غور و فکر سے منع کر سکتا۔

وہ حضور علیہ السلام کے قریبی عزیز اور اہل خاندان تھے اور طبعًا ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گی کہ دنیوی بادشاہوں کی طرح حضور علیہ السلام کی جانشینی کا شرف اُنہی کے حصہ میں آئے [۲]

مصنف کتاب مزید رقمطراز ہے:

کسی ہاشمی نے اپنے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے اپنے سیاسی حالات اور اپنی خواہشات کا ذکر نہ کیا اور یہ باتیں بنو ہاشم کے بعض افراد تک ہی محدود رہیں اور وہ خاموشی کے ساتھ آنے والے حالات کے منتظر رہے۔

وہ مزید لکھتا ہے:

بنو ہاشم کو یہ خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے سوال پر مسلمانوں میں سے کوئی شخص اُن کے مقابلہ پر آسکتا ہے۔۔

---

[۱] علیؓ و عائشہؓ صہ ۱۰-۱۱ [۲] علیؓ و عائشہؓ صہ ۵

یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؓ نے اس بارے میں (اپنے چچا عباسؓ کی تحریک کے باوجود) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوچھنے سے معذوری ظاہر کردی تھی۔

مصنّف اس پر بطور محاکمہ رقمطراز ہے:

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے نہ پوچھنے کی وجہ بھی وہی تھی جسے ہم عرض کر آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مناصب حکومت کی تقسیم نسب یا گروہ کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ صلاحیت شرط تھی چنانچہ خود علیؓ بھی حضورؐ سے اسی لئے نہیں پوچھتے تھے کیونکہ انہیں بھی اپنے موقف کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موقف کا علم تھا [1]

ابوالنصر مزید تحریر کرتے ہیں:

علیؓ کو معلوم تھا کہ سرورِ کائنات اپنے خاندان والوں کو مناصب حکومت اور دنیوی وجاہت سے الگ تھلگ رکھنا چاہتے ہیں اور بہت ممکن ہے ان کے دریافت کرنے پر حضورؐ انہیں خلافت سے محروم کردیں۔ گویا اقتدار کے سوال پر بنو ہاشم دوگونہ تشویش میں مبتلا تھے۔ایک خدشہ بنو اُمیہ کی طرف سے تھا کہ حکومت کے دروبست پہ اُنہیں پہلے سے ہی اختیار حاصل ہے۔

اور دوسرا خدشہ آئندہ خلافت کے نہ مل سکنے کا تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان بھی اپنے خاندان کی طرف نہیں تھا [2]

مصری مصنف ابوالنصر کا یہ تبصرہ تو اگرچہ محلِ بحث ہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان کے افراد کو مناصبِ حکومت سے الگ تھلگ کیوں رکھنا چاہتے تھے جبکہ حکومت خدا تعالیٰ کا انعام ہے اور قرآن پاک نے

---

[1] علیؓ وعائشہؓ صـ۱۲

[2] علیؓ اور عائشہؓ صـ۱۲

حکومت کے انعام خداوندی ہونے کی بار بار تصریح کی ہے۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی حاکم تھے ایسے میں قیاس چاہتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو بنو ہاشم کی صلاحیتوں اور سیاسی سوجھ بوجھ کے متعلق یقین حاصل نہیں تھا۔ ورنہ آپ یہ ارادہ نہ رکھتے۔ تاہم عربی مصنف کے تجزیہ سے یہ بات بہرحال واضح ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کی سوچ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوچ سے بالکل مختلف تھی۔

بنو ہاشم کو جیسا کہ عمر ابوالنصر نے تحریر کیا ہے سب سے بڑا خطرہ بنو امیہ کے سیاسی استعلاء سے ہی تھا اور وہ بہرحال اس خطرہ سے نمٹنے کے لئے فکرمند تھے۔

واقعات کے اس پس منظر میں جب ہم حضرت حسینؓ ابن علیؓ کا وہ بیان سامنے رکھتے ہیں جو شیعہ کی روایت کے مطابق حضرت حسینؓ نے یزید کے خلاف خروج کرتے وقت عراق کی راہ میں ایک مرحلہ پر دیا تھا تو بات بالکل کھُل کر سامنے آجاتی ہے۔ حضرت نے فرمایا:

بادشاہی برائے بنو امیہ گوارہ نمی شود تا مرا نکشند [1]

کہ مجھے جیتے جی بنو امیہ کی حکومت بہرحال گوارہ نہیں ہے۔

مگر بنو ہاشم کی اس سوچ کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد اصحابِ رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ کو آپ کی خلافت سونپ دی اور ان کے بعد پھر فاروقِ اعظم عمرؓ بن الخطاب خلیفہ بنائے گئے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ادوارِ خلافت میں تو بنو ہاشم کی آتشِ حرص دبی ہی رہی مگر حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں جو بنو امیہ میں سے تھے ہاشمی

---

[1] جلاء العیون مطبوعہ ایران صہ ۳۷۹ سطر اوّل

بزرگوں کی سانس میں اس آگ کا اثر محسوس ہونے لگا اور بعض مواقع ایسے بھی آئے کہ خود حضرت علیؓ نے بھی حضرت عثمانؓ سے اختلاف کیا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے خلاف بلوہ و بغاوت کے فرو کرنے میں بھی حضرت علیؓ کا حصہ کچھ ایسا مؤثر نہ تھا جس کی توقع خود حضرت عثمانؓ نے بھی حضرت علیؓ کی ذات سے باندھ رکھی تھی۔ مصنف عائشہؓ و علیؓ جناب عمر ابوالنصر لکھتے ہیں:

اگرچہ حضرت علیؓ کو خلافت کی خواہش ضرور تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہ اپنے جذبات کا برملا اظہار نہ کر سکے...... پھر جب حضرت عمرؓ شہید کر دیئے گئے...... اور خلافت حضرت عثمانؓ کی طرف منتقل ہو گئی تو حضرت علیؓ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور جو کچھ ان کے دل میں تھا باہر آنا شروع ہو گیا [1]

یہ ساری باتیں بنو اُمیہ کے خلاف بنو ہاشم کے دل کے غبار کا پتہ دیتی تھیں مگر پھر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد تو زیرِ زمین کھولنے والا یہ لاوا بالکل پھوٹ کر سامنے آگیا اور پورے ملک میں اچانک ہی سخت قسم کی آگ بھڑک اٹھی۔

حضرت علیؓ نے مسندِ خلافت پر قدم رکھتے ہی پہلا حکم حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ عمّال کی برطرفی کا ہی جاری کیا اور اس مہم میں آپ نے بنو اُمیہ سے تعلق رکھنے والے حکّام اور عمّال کو چن چن کر حکومت کے مناصب سے الگ کر دیا اور ان سب کی جگہ اپنی مرضی کے آدمی مقرر کر دیئے۔ حضرت علیؓ کے اس اقدام سے ہی دراصل بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کے تصادم نے عملی شکل اختیار کی اور وہ آگ جو اب تک اندر ہی اندر سلگ رہی تھی اس اقدام سے امداد پا کر بھڑک اٹھی اور پورا عالمِ اسلام اس کے شعلوں کی لپیٹ

---

[1] علیؓ اور عائشہؓ صہ ۷۲-۷۳

میں آگیا۔ حضرت علیؓ کا یہ اقدام اگرچہ بنو ہاشم کے عزائم کا عکاس اور ان کی قدیم سوچ کے مطابق ہی تھا اور ان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد کوئی ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر ایک متوقع اقدام ہی تھا مگر چونکہ اس میں اتمامِ حجت کے ظاہری طریقے بھی پورے نہیں کئے گئے تھے اور مستقبل کے مورخ کے لئے کوئی ایک دلیل بھی اپنے حق میں مہیا نہیں کی گئی تھی اس کے لئے ظاہر بین نگاہوں میں یہ ایک عجیب اقدام ہی تھا مگر دراصل اس میں تعجب والی کوئی بات نہیں تھی، تعجب اس بات پر ہوتا اگر بنو ہاشم اقتدار حاصل کر چکنے کے بعد حوصلہ سے کام لیتے مگر حضرت علیؓ نے آتے ہی بیک قلم اُن سب عمّال کی برطرفی کے احکام جاری کر دیئے جن کو حضرت عثمان نے مقرر کیا تھا یا جو بنو اُمیہ سے تعلق رکھتے تھے اور یہ بے احتیاطی اس پر مستزاد تھی جب وہ کھلے بندوں کہتے تھے کہ میں عثمانؓ کا مقرر کردہ کوئی بھی عامل اور حاکم اپنے عہدہ پر قائم نہیں رہنے دوں گا۔

اور مورخین کے بقول پھر آپ نے اپنے اس عزم اور اعلان کے خاکے میں پورا پورا رنگ بھرا اور فی الواقع ہی آپ نے عثمانؓ کا مقرر کردہ کوئی عامل اور حاکم اپنے عہدہ پر باقی نہ رہنے دیا۔

علامہ طبری کی جمع و ترتیب

حضرت علیؓ نے جب شام کے حاکم حضرت معاویہؓ کی برطرفی کا پروانہ جاری کیا تو حضرت ابنِ عباسؓ نے انہیں بمنت عرض کیا کہ معاویہؓ کی برطرفی کو ذرا مؤخر کر دیں اور جب سلطنت استحکام پالے اور پورا ملک آپ کی خلافت پر جمع ہو جائے تو معاویہؓ کو الگ کرنا مشکل نہیں ہوگا لیکن اب اس مرحلہ پہ جبکہ ابھی آپ کی خلافت نے استحکام نہیں پکڑا معاویہؓ کو الگ کرنے کا

حکم مشکلات کا باعث بنے گا۔ مگر علیؓ بضد ہوئے کہ میں اپنا فیصلہ واپس نہیں لوں گا۔

اُن سے مکرر درخواست کی گئی کہ آپ ان کو بیعت کے لئے کہیں۔ اگر وہ لوگ اس پر آمادہ ہوں تو بات یہیں ختم ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ بیعت سے انکار کریں تو ان کے خلاف کاروائی مناسب اور ضابطہ کے مطابق ہو گی۔ مگر آپ نے ابن عباسؓ کو جھڑک دیا اور کہا کہ معاویہؓ کے لئے میرے پاس تلوار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تم صرف میرے حکم کی تعمیل کرو اور بس۔ اب ہم یہ پوری کہانی آپ کو علامہ طبری کی زبانی سناتے ہیں:

مغیرہؓ بن شعبہ نے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میرے آپ پر دو حق ہیں ایک اطاعت کا اور دوسرا نصیحت کا۔ پس آج کی بہترین رائے یہ ہے کہ آپ کل کو پیش آنے والے امور سے اپنی حفاظت کریں تاکہ آج کے ضائع ہونے سے کل ملنے والی چیزیں ضائع نہ ہوں۔

بنا بریں بہتر یہ ہے کہ آپ معاویہؓ اور ابن عامر کو اُن کے عہدوں پر قائم رہنے دیں۔ علاوہ ازیں دوسرے گورنروں کو بھی ابھی بحال ہی رکھیں، پھر جب یہ لوگ آپ کی بیعت کر لیں گے اور آپ کے تابع ہو جائیں گے تو ان کو تبدیل کیا جا سکے گا۔ علیؓ نے جواب دیا میں اس رائے پر غور کروں گا۔ اگلے روز مغیرہؓ پھر علیؓ سے ملے اور کہنے لگے کہ میں نے کل آپ کو مشورہ دیا تھا مگر اب میری رائے یہ ہے کہ آپ کا خیال صحیح تھا[1]

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ میں علیؓ سے ملا اور مغیرہؓ بن شعبہ کے آنے جانے کا سبب پوچھا تو علیؓ نے بتایا وہ کہتے تھے کہ عثمانؓ کے عمال کو ابھی معزول نہ کیجئے بلکہ اُن سے بیعت طلب کیجئے۔ جب وہ بیعت ہو چکیں تو آپ

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۲

جس کو چاہیں معزول کر دیجئے ، مگر میں نے جواب دیا کہ میں ایسی گری ہوئی طبیعت کے لوگوں کو اپنی خلافت میں کوئی عہدہ نہیں دے سکتا۔

خدا کی قسم اگر مجھے ایک ساعت بھی ایسی مہیا ہو سکے کہ میں اپنی رائے پر عمل کر سکوں تو میں معاویہؓ اور اُس جیسے لوگوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی کسی علاقہ کا والی رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

پھر مغیرہؓ نے کہا آپ معاویہؓ کو برقرار رہنے دیں اور دوسروں کو بیشک معزول کر دیں مگر میں نے جواب دیا کہ میں معاویہؓ کو تو دو روز بھی قائم نہیں رکھ سکتا۔ یہ سُن کر مغیرہؓ چلے گئے۔

وہ آج پھر آئے اور کہنے لگے کہ کل میں نے جو مشورہ دیا تھا جسے آپ نے قبول نہیں کیا تھا میں نے غور کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کی رائے درست تھی۔

ابن عباسؓ کہتے کہ میں نے کہا کہ پہلے روز مغیرہؓ نے آپ کی خیرخواہی کی مگر آج اُنہوں نے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔ میری رائے بھی یہی ہے کہ آپ معاویہؓ کو ضرور برقرار رکھیں۔ جب وہ بیعت کر لیں گے تو اُن کو ان کے عہدے سے ہٹانے کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میں تو معاویہؓ کو تلوار کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا۔

ابن عباسؓ نے کہا آپ بیشک بہت بہادر ہیں مگر تدابیرِ جنگ سے واقف نہیں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ پس آپ میری بات مان لیجئے میں مستقبل کو آپ کے حق میں یوں ہموار کر دوں گا کہ مخالف دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔ علیؓ نے فرمایا تم صرف میری اطاعت کرو اور بس۔

ابن عباسؓ نے کہا بہت بہتر یہ بات میرے لئے بہت آسان ہے[لہ]

لہ طبری جلد ۳ باب ۲

اس روایت کے راوی نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کے نام سے جو اُن کے دوسرے مشورہ کا ذکر کیا ہے وہ یکسر محلِ نظر ہے کیونکہ مغیرہؓ جیسے ذہین وفطین، اہلِ فکر ونظر اور صحابیٔ رسولؐ سے ایسے اخلاق کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ جس کی دوستی کا دم بھریں اسے اپنی اطاعت پیش کریں، جس کے لئے اپنے دل میں نصیحت کے بہترین جذبات رکھتے ہوں وہ ایسی پستی کا اظہار کریں گے جو اُن کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

اور نہ ہی حضرت ابن عباسؓ ایسے چھچھورے مزاج کے تھے کہ وہ چھوٹتے ہی اپنی ہی سطح کے بلکہ اپنے سے بھی فکر ونظر میں زیادہ شہرت رکھنے والے ایک صحابی بھائی کو دھوکہ باز کہنے لگتے۔ پھر اس روایت کے بموجب تو حضرت مغیرہؓ کے مقابلہ میں حضرت ابن عباسؓ کا کردار زیادہ قابلِ اعتراض ہے جو حضرت علیؓ کو نفاق کا مشورہ دے رہے ہیں کہ آپ میرے کہنے پر چند روز کے لئے معاویہؓ کو شام کا حاکم رہنے دیں میں اس کے خلاف ایسی چال چلوں گا کہ مخالف دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں اور غلبہ آپ کا حصہ ہو۔

حضرت مغیرہؓ نے اگر اپنی رائے تبدیل کر لی تو اس کی واضح وجہ موجود تھی کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے مزاج میں سختی پائی تو اپنے آپ کو علیؓ کی رائے کے تابع کر لیا جیسے بالآخر خود حضرت ابن عباسؓ نے بھی علیؓ کے سامنے اپنی مآل اندیشی سے دستبرداری دیدی تھی۔ مگر حضرت ابن عباسؓ کے کردار کی کیا تاویل کی جائے گی جبکہ اُن کا کردار ایک صحابی کے موافقِ حال نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روایت کا یہ حصہ اُس سازش کی تمہید ہے جو آگے چل کر حضرت مغیرہؓ کے خلاف روا رکھی گئی تھی ورنہ مغیرہؓ کا کردار ایسا نہیں تھا جس طرح ایک متعصب گروہی راوی نے اُنہیں پیش کیا ہے اور روایت

کا یہ حصہ سراسر جھوٹ اور صریح اختراع ہے۔

یہ لطیفہ بھی اپنی جگہ توجہ طلب ہی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی زبان سے جس گناہ کی پاداش میں حضرت مغیرہؓ کو دھوکہ باز کہلوایا گیا ہے یہ گناہ وہی ہے جو بالآخر حضرت ابن عباسؓ سے بھی سرزد ہوا کہ اگرچہ انہوں نے حضرت علیؓ کو بہت سمجھایا مگر جب وہ نہ سمجھے تو ابن عباس ان سے ہموار ہو گئے۔

اور اگر مغیرہؓ کا گناہ یہ ہے کہ اُنہوں نے حضرت علیؓ کی رائے کا احترام کیا تو کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ انہیں حضرت علیؓ سے اپنا اختلاف جاری رکھنا چاہیئے تھا؟ افسوس ہے کہ راوی نے اپنی اختراع میں ابن عباسؓ کا تحفظ بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

خود مولانا مودودی صاحب بھی جو اچھے اہلِ فکر و نظر لوگوں میں داخل ہیں۔ حضرت مغیرہؓ کے استخفاف کے شوق میں احتیاط کا دامن نہیں تھام سکے۔ حضرت مغیرہؓ کے حق میں مولانا کی تعریض کی شان قابلِ ملاحظہ ہے ارشاد ہے:

مورخین نے حضرت معاویہؓ کو معزول کرنے کا واقعہ کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے جس سے پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ (یعنی حضرت علیؓ) تدبیر سے بالکل ہی کورے تھے۔ مغیرہؓ بن شعبہ نے ان کو عقل کی بات بتائی کہ معاویہؓ کو نہ چھیڑیں مگر انہوں نے اپنی نادانی سے یہ رائے نہ مانی اور حضرت معاویہؓ کو خواہ مخواہ چھیڑ کر مصیبت مول لے لی[1]

حالانکہ یہاں حضرت مغیرہؓ کی آبرو سے کھیلنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اُن پر تعریض کا کوئی موقع نہیں تھا اور یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی کہ

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۳۳

ان کی عقل اور ان کے کردار کا مذاق اُڑا کر اپنے قاری کو تفریح مہیا کی جائے جبکہ اس باب میں حضرت علیؓ کے حقیقی ناصح مغیرہؓ نہیں بلکہ حضرت ابن عباسؓ تھے جن کی بصیرت نے حضرت علیؓ کی حربی فکر پر بھی اعتراض کی انگلی رکھی اور انہیں تدابیرِ جنگ سے بھی ناواقف قرار دیا۔

اور حضرت مغیرہؓ کی جس بات کو حضرت مولانا نے مغیرہؓ کی عقل کی بات کہہ کر انہیں اپنے پائے تعریض کا گیند بنایا ہے اسی بات کو حضرت ابن عباسؓ نے صحیح اور ہمدردی کی بات قرار دے کر حضرت علیؓ کو اسی عقل کی بات سے ہموار کرنے کی سعی فرمائی تھی اور اگر حضرت مغیرہؓ کی یہ عقل کی بات کسی تعریض یا استہزا کا محل بن سکتی ہے تو اس استہزا کا اصل محل تو حضرت ابن عباسؓ ٹھہرتے ہیں جو مغیرہؓ کی تائید پر بضد ہیں۔ مگر اس امر کو مولانا کی ہوشیاری ہی کہا جائے گا کہ اُنہوں نے اپنے خاص مصالح سے حضرت ابن عباسؓ کا نام حذف کر کے محض مغیرہؓ آزاری کے شوق میں ابن عباسؓ کا گناہ بھی مغیرہؓ کے کھاتے میں ڈال دیا ورنہ مغیرہؓ غریب نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔

تاہم گروہی متعصب راویوں کی ان ساری سازشوں اور چابکدستیوں کے باوجود ان روایات سے بھی یہ امر بہرحال ثابت ہے کہ بنو ہاشم کے دل بنو امیہ کے لئے انتہائی جارحیت کے امین تھے ان کی سوچ انتہائی غیر مآل اندیشانہ اور انتہائی خطرناک تھی اور وہ پوری تیزی سے اُس تصادم کو برپا کرنے پر بضد تھے جس نے مسلمانوں کو قیامت تک ایک دوسرے سے دُور کر دیا اور جس کا جواز پیدا کرنے کے لئے وہ کسی قسم کا اہتمام بھی بنا سب نہیں سمجھتے تھے۔

حضرت علیؓ کا ایک نادان دوست

اس مرحلہ پر "امیر معاویہؓ" کے مصنف پروفیسر غلام ربانی صاحب ایم اے پی ای ایس نے بات کی گرہ کھولنے کی یوں کوشش کی ہے:

قیاس چاہتا ہے کہ یقیناً اس موقع پر صلح پسند لوگوں نے دونوں طرف کے بھڑکتے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ہوگی. خلیفۂ وقت (علیؓ) سے عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کی درخواست کی ہوگی. حضور (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کا طرزِ عمل اور وقت کی نزاکت کا احساس دلایا ہوگا. خانہ جنگی کے نتائج اور اندرونی خلفشار کی خرابیوں سے متنبہ کیا ہوگا، یہ سب کچھ ہوا ہوگا لیکن حضرت امیرؓ بے بس تھے لہ

اور پھر اس ہوگا ہوگا اور ہوا ہوگا کے بعد تاریخی مفروضوں کے بعد حضرت علیؓ کا یہ نادان دوست وقت کی ضرورت کے مطابق راہِ عمل اختیار نہ کر سکنے میں حضرت امیر (علیؓ) کی بے بسی کی وجوہ بیان کرتا ہے:

۱۔ کچھ تو اس لئے کہ تابعینِ عثمانؓ بیعت ہو کر جناب امیر کے لشکر میں بھرتی ہو گئے تھے۔

۲۔ کچھ اس لئے کہ خلیفۂ وقت کو اپنا اقتدار اور وقار قائم رکھنے کے لئے اپنے احکام کو منوانا ضروری تھا لہ

آہ ۔ ۔ ۔ ۔ عمرؔ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اس مرحلہ پر حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی بات چیت پر مشتمل دوسری روایت یوں آتی ہے:

لہ امیر معاویہؓ صـ۱۰۱

لہ امیر معاویہؓ صـ۱۰۱

ابنِ عباسؓ نے جب حضرت علیؓ کو رائے دی کہ معاویہؓ کو برقرار رکھنے والی رائے ہی درست ہے تو علیؓ نے فرمایا تم مجھے نصیحت نہ کرو۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ جب آپ جانتے ہیں کہ معاویہؓ اور ان کے ساتھی دنیا دار لوگ ہیں تو آپ اگر انہیں اُن کے عہدوں پر برقرار رہنے دیں گے تو انہیں پھر اس بات کی پرواہ نہیں ہوگی کہ خلیفہ کون ہے لیکن اگر آپ اُن کو معزول کر دیں گے تو وہ کہیں گے کہ علیؓ کی خلافت بغیر مشورہ کے وجود میں لائی گئی ہے ہم اس کو نہیں مانتے اور وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عثمانؓ کو اس نئے خلیفہ نے ہی قتل کیا ہے اس طرح عراق والے آپ کے مخالف ہو جائیں گے اور دوسری طرف میں اس بات سے بھی ڈرتا ہوں کہ مبادا طلحہؓ اور زبیرؓ بھی آپ پر حملہ کر دیں۔

علیؓ نے کہا تمہاری مصلحت تو اچھی ہے مگر عثمانؓ کے عمال کے کردار کے پیشِ نظر میں اُن سے کسی کو بھی کسی عہدہ پر رکھنا نہیں چاہتا۔ پس اگر برطرفی کے باوجود یہ لوگ میری خلافت کو قبول کر لیں تو یہ انہی کے حق میں بہتر ہوگا ورنہ میں تلوار کو میان سے نکال لوں گا۔ ابن عباسؓ نے پھر کہا کہ آپ میری بات مان لیجئے ...... اگر آپ نے معاویہؓ پر لشکر کشی کی تو خدا کی قسم لوگ عثمانؓ کے خون کی ذمہ داری آپ پر ڈال دیں گے۔

علیؓ نے کہا میں تمہاری یہ بات نہیں مان سکتا۔ میں تمہیں معاویہؓ کی جگہ شام کا عامل مقرر کرتا ہوں تم شام کی طرف جانے کی تیاری کرو۔ اس کے جواب میں ابن عباسؓ نے (معاویہؓ کی جگہ شام کا عامل مقرر ہونے سے انکار کرتے ہوئے) حضرت علیؓ سے کہا وہاں معاویہؓ موجود ہیں وہ بنو امیہ میں سے ہیں اور عثمانؓ کے عم زاد بھی ہیں اگر میں آپ کی طرف سے وہاں کا حاکم بن کر گیا تو اوّل تو وہ میری گردن ہی اُتار دیں گے ورنہ قید خانے

میں ضرور ڈال دیں گے۔ مگر علیؓ اپنی بات پر لبضد رہے اور کہنے لگے تم جاؤ جو شخص تمہارے مزاحم ہوگا یا تم پر حملہ کرے گا وہ دراصل مجھ پر حملہ کرے گا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس پر میں نے عرض کیا کہ چلئے آپ کا اگر یہی حکم ہے تو میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں لیکن آپ مجھے معاویہؓ کے نام خط لکھ دیجئے۔ جس میں آپ ان سے کچھ وعدے بھی کیجئے۔ اور کچھ مزید احسانات بھی مناسب ہیں۔ مگر علیؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور سختی سے کہا خدا کی قسم یہ کام میں کبھی نہیں کر سکتا [1]

مولانا مودودی صاحب نے اس پوری روایت کو اپنے تمام پس منظر اور پیش منظر سمیت صحت کی سند سے نوازا ہے اور حضرت علیؓ کے ان تمام خیالات جذبات اور عزائم کی پوری حمایت کی ہے جو اس روایت کے راوی نے حضرت علیؓ کی ذات سے وابستہ کئے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے آگے بڑھ کر ان لوگوں کو نادان کا لقب بھی دیا ہے جو اس روایت کی صحت میں اس لئے شک کرتے ہیں کہ اس کے مندرجات حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کی ذواتِ عالیہ سے ہموار نہیں ہیں اور اس روایت کے بموجب حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ دونوں کا استخفاف ہوا ہے۔ مولانا کی تو خیر کوئی مجبوری ہوگی مگر کوئی بتائے کہ راوی نے خانوادۂ رسولؐ سے تعلق رکھنے والے ان دو بزرگوں کی گفتگو کی جو تفصیلات مرتب کر کے تاریخ کے حوالے کی ہیں اور ان میں اس نے اپنے ممدوحین کی اخلاقی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس نے حضرت علیؓ کو جس طرح عقل و شعور، معاملہ فہمی اور مآل اندیشی سے تہی ثابت کیا ہے وہ کہاں تک لائقِ فخر ہے۔ تعجب ہے کہ

---

[1] طبری جلد ۳ بابؔ نفاذِ خلافت

راوی نے عقل و شعور، فکر و نظر، فہم و تدبر، مصلحت کار، معاملہ فہمی، اور مآل اندیشی کی ساری دولت جمع کر کے حضرت ابن عباسؓ کی جھولی میں ہی ڈال دی ہے اور مطیع کو اپنے مطاع اور تابع کو اپنے متبوع سے ہر اعتبار سے ہی فائق بنا کر پیش کیا ہے مگر اس کو محض حضرت معاویہؓ کے خلاف ایک کاروائی کا حصہ ہونے کی وجہ سے ہی سند مان لیا گیا ہے۔

ذرا سوچیئے کہ جس بات کو بات کے موقع پر عین بروقت اور عین ضرورت سے علیؓ کے عم زاد حضرت ابن عباسؓ نادانی کہتے ہیں اُسے اگر کوئی بزرگ ڈیڑھ ہزار برس بعد یہ فرمانے کا شوق رکھے کہ:

حضرت علیؓ اگر ایسا نہ کرتے جو اُنہوں نے کیا تو یہ بڑی غلطی ہوتی[1]

تو اس علیؓ دوستی کی مثال دوسری جگہ کہیں نہیں ملے گی ؎

اگر شہ روز را گوید شب ست ایں
بباید گفت اینکہ ماہ و پرویں

ابن عباسؓ کا صحیح مشورہ

قارئین غور فرمائیں کہ راوی جب حضرت علیؓ کے نام یہ بات لگاتا ہے کہ اُنہوں نے ابن عباسؓ کو جھڑک دیا اور فرمایا کہ مجھے وعظ نہ سناؤ بلکہ میں جو کہتا ہوں اس کے مطابق عمل کرو۔ اور حکم دیا کہ:

جاؤ میں تمہیں معاویہؓ کی جگہ شام کا حاکم مقرر کرتا ہوں اُسے جا کر معزول کر دو اور ملک کی حکومت خود سنبھال لو۔

تو فرمائیے کہ اس محب علیؓ راوی نے حضرت علیؓ کی کیا خدمت

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۳۳

کی ہے اور اُن کے لئے شعور کی کتنی مقدار مہیا کی ہے اور تعجب ہے کہ عقل کی بات اُس نے یہ حضرت ابن عباسؓ کا حصہ ہی بنائی جب ان کی زبان سے حضرت علیؓ کے جواب میں یہ کہلوایا کہ:

امیرالمومنین! معاویہؓ کے ساتھ آپ کے تعلقات اچھے نہیں ہیں باہمی کشیدگی بھی چل رہی ہے۔ اگر میں آپ کی طرف سے اُسے معزول کرنے کے لئے وہاں گیا تو وہ مجھے قتل کردے گا یا قید میں ڈال دے گا۔

بات بڑی صاف تھی بڑی سچی تھی اور بآسانی قابلِ فہم تھی حضرت ابن عباسؓ کے اس اجمال میں بھی پوری تفصیل موجود تھی کہ امیرالمومنین! جب معاویہؓ کے عم زاد خلیفۂ رسولؐ حضرت عثمانؓ کا قتل وقوع میں آچکا ہے۔ اُس کی لاش تین روز تک اپنی تدفین کے لئے ترستی رہی۔ لوگوں نے انہیں قتل کیا، ان کا گھر لوٹا، اُن کی بیویوں بچیوں کے زیورات چھینے، ان کی بیوی بچانے کو بڑھی تو تلوار کا وار اُن پر بھی ہوا اور ان کی انگلیاں کٹ کر گر گئیں۔ پھر آپ نے ان کے قاتلوں سے ان کے خون کا قصاص بھی نہ لیا۔ بلکہ ان کے قاتلوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرکے اُن کو تحفظ بخشا۔ ان واقعات کو بنو امیہ کے لوگوں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے اور ان میں سے بہت سے لوگ یہاں سے بھاگ کر معاویہؓ کے پاس شام بھی پہنچ چکے ہیں۔ اور اب معاویہؓ ان سب واقعات سے بخوبی آگاہ ہوچکا ہوگا۔ علاوہ ازیں وہ ایک وسیع ملک کا طاقتور حاکم ہے، سارا شام اُس پر جان چھڑکتا ہے۔ اور آپ کے پاس معاویہؓ کے لئے سوائے تلوار کے دوسری کوئی چیز ہی نہیں۔ ایسے میں آپ مجھے بھیجتے ہیں کہ میں اسے جاکر معزول کردوں، جب اُسے پتہ چلا کہ میں اُسے معزول کرنے آیا ہوں وہ بھلا مجھے کیسے زندہ چھوڑے گا!

لیکن اتنی صاف بات بھی راوی کے نزدیک حضرت علیؓ کی عقل میں

نہیں بیٹھی۔ اُنہوں نے بڑی سختی سے ابن عباسؓ کو کہا کہ تم جاؤ، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ تم پر حملہ کرے گا تو میں اُسے اپنے اوپر حملہ سمجھوں گا۔

قارئین ملاحظہ فرمادیں کہ اس روایت کے جاہل مصنف نے علیؓ کو کتنا نافہم کم اندیش اور کوتاہ نظر ظاہر کیا ہے۔ جیسے وہ شعور سے اس درجہ معرا تھے کہ ان متصادم اور خطرناک حالات میں ابن عباسؓ کو معاویہؓ کے پاس اس زعم کے ساتھ بھیج رہے ہیں جیسے وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اور پھر ابن عباسؓ کے جواب میں علیؓ کی زبان نے جو جواب دلوایا گیا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا وہ اس پر مستزاد ہے۔

اب دیکھئے یہاں بھی ابن عباسؓ کی عقل ہی کام آئی جو اُنہوں نے گورنر شام بننے کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کے حکم کی تعمیل کرنے سے معذرت کر دی ورنہ اس روایت کے راوی نے حضرت علیؓ کے ہاتھوں ابن عباس کو مروا دیا تھا اور حضرت علیؓ نے پھر وہی کیا جو اُن کے پیشِ نظر تھا اور اس کا نتیجہ بھی وہی نکلا جس کی نشاندہی حضرت ابن عباسؓ نے پہلے ہی کر دی تھی۔ مگر کسی کے پاس اس کا کیا علاج ہے کہ مولانا کا ارشاد پھر بھی یہی ہے کہ حضرت علیؓ اگر ایسا نہ کرتے جو اُنہوں نے کیا تو یہ بڑی غلطی ہوتی۔

(خلافت و ملوکیت صہ ۱۳۳)

ایک لب برداشتہ سوال

خوارج حضرت علیؓ کی فوج کا ہی حصہ تھے۔ وہ حضرت علیؓ کی طرف سے بصرہ تک پہنچ کر بھی لڑے اور صفین کے میدان میں بھی حضرت علیؓ کے ہی ساتھی تھے۔

مگر جب حضرت علیؓ نے صفین کی جنگ کے نتیجہ میں ثالثی تسلیم کر لی تو خوارج حضرت علیؓ سے الگ ہو گئے۔ اُنہوں نے فتوے دیا کہ علیؓ نے

شائی تسلیم کر کے اسلام سے ارتداد اختیار کیا ہے۔ وہ کافر اور واجب القتل ہیں۔

حضرت علیؓ نے ان کی ناراضگی دُور کرنے اور انہیں منانے کے لئے خاص اہتمام کیا مگر وہ لوگ اپنے موقف سے دستبردار نہ ہوئے۔ بالآخر حضرت علیؓ نے اُن سے انہام و تفہیم کی راہ اختیار کی اور اس غرض سے حضرت ابن عباسؓ کو خاص طور سے متعین کیا جنہوں نے اس کام کو مہم کے بطور انجام دیا۔ کئی بار وہ خوارج سے ملے اُن کے ہاں جا جا کر انہیں تلقین و تبلیغ کرتے رہے مگر کامیابی نہ ہو سکی۔

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ جو حضرت علیؓ کو کافر مرتد اور واجب القتل سمجھتے تھے ان کو محض اپنی فوجی طاقت میں کمی واقع ہو جانے کے مفروضے سے ہی اگر مہینوں تک منانے کی مساعی جاری رکھی جا سکتی ہیں تو کیا اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ ہو جانے سے بچانے کے لئے معاویہؓ کی طرف رجوع نہیں کیا جا سکتا تھا؟ جو حضرت علیؓ کو بہر حال مومن سمجھتے تھے۔ جبکہ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ علیؓ اگر خوارج کے لئے کی گئی مساعی کے ہزارویں حصہ کے برابر بھی معاویہؓ کی طرف رجوع کرتے تو کم از کم صفین کے میدان میں کٹ مرنے والے نوّے ہزار مسلمانوں کی جانیں ضرور بچائی جا سکتی تھیں۔

حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم کرنے کے لئے معاویہؓ کی یہ ایک ہی شرط تھی کہ علیؓ اگر عثمانؓ کے خون کا قصاص لیتے ہیں تو ان کی بیعت کر لی جائے گی[1]

اگر حضرت علیؓ کا مقصد بہر حال حضرت معاویہؓ سے بھڑنا ہی نہ ہوتا

---

[1] طبری جلد ۳

اور وہ معاویہؓ سے تصادم کو بنو امیہ سے انتقام کا ایک سنہری موقع نہیں سمجھتے تھے تو عثمانؓ کے قصاص کی شرط پر بیعت کا مسئلہ حضرت علیؓ کے لئے کوئی اجنبی یا نیا مسئلہ نہیں تھا وہ اس شرط پر پہلے بھی کچھ بزرگوں سے بیعت لے چکے تھے۔

اگر انہوں نے اُس وقت یہ سوال نہیں اٹھایا تھا کہ پہلے بیعت کرو پھر قصاص کا سوال اُٹھاؤ تو انہیں معاویہؓ کے باب میں بھی اس سوال کو اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

اگر حضرت علیؓ مجبور اور محصور طلحہؓ و زبیرؓ کی بیعت کے لئے یہ شرط منظور کر سکتے تھے تو انتہائی طاقتور اور صاحب قوت معاویہؓ کے باب میں بھی یہ شرط قبول کرنے میں کوئی مانع نہیں تھا۔

جبکہ حقیقت یہی ہے کہ معاویہؓ کے مل جانے سے اس شرط کی تکمیل چشم زدن کی بات تھی اور یہ بات یقینی تھی کہ علیؓ اگر معاویہؓ کو لے لیتے تو قاتلین عثمانؓ از خود ہی راہِ فرار اختیار کر جاتے اور علیؓ کو بھی یہ کہنے کی مجبوری نہ رہتی کہ:

میں ان لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم ان پر۔

اور اس صورت میں حضرت مولانا مودودی صاحب کو بھی حضرت علیؓ کے حق میں یہ عذر پیدا کرنے کی مجبوری نہ رہتی کہ:

اگر تمام اہل حق حضرت علیؓ کے گرد جمع ہو جاتے اور اُن سے تعاون کرتے تو وہ ان جتھوں کو منتشر کرنے کے بعد اُن پر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ لیکن جب ایک طرف با اثر صحابہؓ کے ایک گروہ نے غیر جانبداری کی روش

اختیار کی۔ اور دوسری طرف بصرے اور شام میں طاقت ور فوجیں حضرت علیؓ سے لڑنے کے لئے جمع ہوگئیں تو اُن (یعنی علیؓ) کے لئے نہ صرف یہ کہ (قاتلوں کے) اس گروہ پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہ رہا بلکہ وہ (یعنی علیؓ) عملاً مجبور ہوگئے کہ ان طاقتور فوجوں کے مقابلہ میں جن لوگوں سے بھی مدد لے سکتے تھے اُن سے مدد لیں اور ایک تیسری لڑائی قاتلینِ عثمان کے جھگڑے سے نہ چھیڑ دیں [1]

اور اب ہمیں یہ سعادت مولانا کے دامن سے وابستہ کر کے بہت گھٹن محسوس ہوتی ہے کہ مولانا کے نزدیک حضرت علیؓ نے عثمانؓ کے قاتلوں کو اپنی فوج میں اس لئے شامل کر لیا تھا کہ سارے اہلِ حق حضرت کے گرد جمع نہیں ہوئے تھے اور صحابہؓ کا ایک مؤثر گروہ غیر جانبدار تھا۔ اور کچھ لوگ عثمانؓ کے قصاص کا سوال اُٹھا کر اُن کے خلاف آمادۂ پیکار تھے ایسے میں حضرت علیؓ کے لئے سوائے اس کے کیا چارۂ کار تھا کہ وہ عثمانؓ مقتول کا قصاص چاہنے والوں کے خلاف عثمانؓ کے قاتلوں سے مل جائیں اور جیسے بھی ہو اپنے اقتدار کو قائم رکھیں۔

علیؓ کی حمایت میں مولانا کا یہ تجزیہ اگر علیؓ کی طرف سے کوئی صفائی ہے تو افسوس ہے کہ یہ علیؓ سے نادان دوستی کی بہت ہی عظیم مثال ہے۔

بادشاہ اور خلیفہ

بہت مناسب ہوگا اگر اس مرحلہ پر ہم مولانا مودودی صاحب کے اپنے قلم سے ہی بادشاہ اور خلیفہ کا فرق اپنے قارئین کے سامنے رکھیں

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۲۴۳

مولانا فرماتے ہیں:

(حضرت عثمانؓ کے) محل میں ۷۰۰ آدمی لڑنے مرنے کے لئے موجود تھے مگر انہیں بھی وہ آخر تک روکتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس انتہائی نازک موقع پر حضرت عثمانؓ نے وہ طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک خلیفہ اور بادشاہ کے فرق کو صاف صاف نمایاں کر کے رکھ دیتا ہے۔ اُن کی جگہ کوئی بادشاہ ہوتا تو اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے کوئی بازی کھیل جانے میں بھی اُسے باک نہ ہوتا۔[۱]

حضرت عثمانؓ کو یہ رعایت عطا فرمانے کا شکریہ، مگر کاش مولانا حضرت علیؓ کے لئے بھی یہی خانہ خالی رکھتے اور یہ بادشاہ گردی حضرت علیؓ کے ساتھ ہموار بنانے کی سعی نہ کرتے۔

حضرت علیؓ کی پالیسی اور عمر النصر

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زمامِ اختیار سنبھالتے ہی جو پالیسی اختیار کی اُس کی غیر مشروط حمایت سوائے مولانا مودودی صاحب کے کسی دوسرے انصاف پسند مورخ اور مصنف نے نہیں کی۔

بڑے بڑے علیؓ دوست مورخین بھی یہاں پہنچ کر علیؓ کی پالیسی کو ان کی حاکمانہ ضرورت کہہ کر آگے نکل گئے ہیں۔ کسی نے اس پالیسی کو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں مانا۔ اور جب عین بروقت خود علی رضی اللہ عنہ کے قریبی ہمدرد، دوست اور بہی خواہ لوگ بلکہ ان کے اپنے فرزند گرامی حضرت حسنؓ تک بھی اس پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے تھے تو بعد کے لوگ کس

---

[۱] خلافت وملوکیت صفحہ ۱۲۰

دیں سے ان کی حمایت کر سکتے تھے۔

یہ لوگ حضرت علیؓ کو خلیفہ مان لینے کی وجہ سے اُن کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تھے اور انہیں ان کا حکم ماننے کی مجبوری تھی ورنہ ان سب کا حضرت علیؓ سے اختلاف بڑی واضح تاریخی حقیقت ہے۔

مورخ کی بھی ایک ذمہ داری ہے اور اُسے ٹھیک ٹھیک نبھانا ہی اس کے مورخ ہونے کی ضمانت ہے مگر مولانا مودودی صاحب کی مصنفہ کتاب **خلافت و ملوکیت** تو چونکہ بقول مولانا بھی کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے اور نہ تاریخ لکھنا انہیں مقصود ہی تھا بلکہ یہ اُن کی سیاسی ضرورت کا ہی ایک نقش ہے اور وہ اس کی ترتیب میں بھی شاید تاریخ نویسی کے منصفانہ آداب و قواعد کے پابند نہیں ہونگے۔ مگر امر واقعہ سے انکار ممکن نہیں ہے۔ عربی مصنف عمر ابوالنصر لکھتے ہیں:

حصولِ خلافت کے بعد پہلا کام حضرت علیؓ نے یہ کیا کہ حضرت عثمانؓ کے مقرر کئے ہوئے تمام عمال کو معزول کر دیا .... حضرت علیؓ کے صلاح کاروں اور خیر خواہوں نے انہیں صلاح دی کہ جب تک مملکت میں کامل طور پر امن و امان ہو کر حالات معمول پر نہ آ جائیں اور آپ کی خلافت مضبوط بنیادوں پر قائم نہ ہو جائے اس وقت تک وہ حضرت عثمانؓ کے عمال کو معزول کرنے کی غلطی نہ کریں۔ لیکن حضرت علیؓ نے اُن کے اس مشورے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں تمام عمال اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عمال کو معزول کر دینا اور اُن کی مرحمت کی ہوئی جائدادیں واپس لینے کے احکام جاری کرنا حضرت علیؓ کی خطرناک سیاسی غلطیاں تھیں۔ [1]

---

[1] علیؓ و عائشہؓ صہ ۶۱

یہی مصنّف مزید رقمطراز ہے:

ایک بات تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب لوگ اُن کے پاس آکر قاتلین عثمان رضؓ سے بدلہ لینے کا مطالبہ کرتے تھے تو وہ انہیں اس وقت تک صبر سے کام لینے کی تلقین کرتے تھے جب تک فتنہ فساد کا غبار کم ہو کر حالات معمول پر نہیں آجاتے۔

دوسری طرف وہ اُس وقت کے تشویش ناک حالات کو بالکل نظرانداز کر کے جائدادوں کی واپسی اور عمال کی معزولی کے احکام جاری کر دیتے ہیں اور اُنہیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ جائدادوں سے محروم ہونے والے لوگ اور حکومت سے محروم ہونے والے عمال موجودہ سیاسی ابتری سے فائدہ اُٹھا کر ان کے خلاف ایک ایسی بغاوت کھڑی کر دیں گے جس کو فرد کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ کم از کم معاویہ رضؓ کو معزول کرنے میں جلدی نہ کریں اور حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کریں۔ لیکن حضرت علی رضؓ نے اس معقول مشورہ کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر حضرت علی رضؓ کا اپنے ساتھیوں اور حامیوں پر پوری طرح دباؤ ہوتا تب تو اس قدر کڑی سیاست کے متعلق کوئی وجہِ جواز پیش کی جا سکتی تھی۔ لیکن جب اُنہیں خود معلوم تھا کہ اُن کے ساتھی کامل طور پر اُن کے وفادار نہیں ہیں اور وہ تردد اور تشکک کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں تو اُنہیں حضرت ابن عباس رضؓ کی نصیحت پر عمل کرنا اور اپنے مخالفین سے اسی طرح نرمی اور محبت و شفقت کا سلوک کرنا چاہیئے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخالفین مشرکینِ مکہ سے کیا تھا اور جس کے نتیجہ میں حضور علیہ السلام کو بالآخر عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ اور وہی کفار جو کبھی حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بات سُننے کو تیار نہ تھے۔ حضورؐ کی شفقت و عنایت اور محبت و اُلفت کو دیکھ کر آپ کے قدموں میں آ گرے تھے۔

اس مرحلہ پر پہنچ کر علیؓ و عائشہؓ کا مصنف پوچھتا ہے:

کیا حضرت علیؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے مسلمان سیاسی مخالفوں سے ملائمت کا برتاؤ نہیں کر سکتے تھے[1]

ہمارا کوئی قاری اس تحریر کو پڑھ کر یہ خیال نہ کر بیٹھے کہ مصنف "علیؓ و عائشہؓ" عمر ابوالنصر کوئی معاویہؓ دوست شخص ہو گا اور اُس نے محض حضرت معاویہؓ کی حمایت میں ہی حضرت علیؓ پر اتنی کڑی تنقید کی ہے۔ یہ بات نہیں ہے بلکہ عمر ابوالنصر حضرت علیؓ کے پُرجوش حامیوں اور معاویہؓ کے مقابلہ میں اُن کے طرفداروں میں سے ہے۔ وہ اپنی اس تصنیف میں حیلے بہانے حضرت معاویہؓ پر تیز و تند نکتہ چینی کے تیر برساتا ہے بلکہ اُن کی توہین کا مرتکب بھی ہے اور ایسے مراحل بھی آئے ہیں کہ ابوالنصر نے حضرت معاویہؓ کی عزت سے کھیلنے کی بھی سعی کی ہے۔ اُس نے حضرت معاویہؓ پر نہایت چھچھورے پن سے ذاتی حملے بھی کئے ہیں۔ اور اُن سے انتہائی گستاخ رویہ اختیار کیا ہے۔

مگر یہاں جو اس نے حضرت علیؓ کے بارے میں تلخ حقائق کا اظہار کیا ہے تو اس کا سبب مصنف کا یہ تعلق ہے کہ حضرت علیؓ کی ان غلطیوں اور غلط اندازۂ فکر نے ان کے مستقبل کو تاریکیوں کے سپرد کر دیا ہے ورنہ عمر ابوالنصر اور اُن کے حواری حضرت معاویہؓ اور اُم المؤمنین عائشہؓ سے بالکل ایسے ہی خفا ہیں جس طرح کوئی کینہ توز خفا ہو سکتا ہے۔ یہاں ہم اپنے قاری کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے حضرت معاویہؓ کے بارے میں

---

[1] علیؓ و عائشہؓ صـ ۶۲

ابوالنصر کے خیالات کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں۔ وہ تحریر کرتا ہے:
معلوم ہوتا ہے (جنگِ جمل کے برپا کرنے میں) امیر معاویہؓ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ حضرت معاویہؓ کی سرشت کو دیکھتے ہوئے ان سے اس قسم کی کاروائی بعید نہ تھی۔ وہ بہت مآل اندیش اور دُوربین نظر کے مالک تھے اُنہوں نے اپنی شخصی اغراض اب تک عامۃ المسلمین سے مخفی رکھی ہوئی تھیں اور وہ انہیں برابر یہ احساس دلاتے رہتے تھے کہ ان کا مقصد صرف اصلاح ملت اور حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا ہے اس کے سوا وہ کچھ نہیں چاہتے۔

حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سے اُنہیں کوئی ہمدردی نہیں تھی لیکن وہ انہیں دھوکے میں رکھ کر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ان کی غرض دراصل یہ تھی کہ جب اُن کے مخالفین آپس میں ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار ہو جائیں گے اور ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف تلوار نکال لے گا تو لازماً ان دونوں کی قوت کمزور ہو جائے گی۔ اس وقت اُن کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر وہ میدانِ عمل میں نکل آئیں گے چونکہ ہر دو فریق کی فوجی قوت ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے میں بہت زیادہ ضائع ہو چکی ہو گی اس لئے ان میں سے کوئی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکے گا اور مملکت کا کامل اقتدار اُن کے ہاتھ میں آ جائے گا۔[1]

یہاں ہمیں عمر ابوالنصر کے اُن کذبات پر محاکمہ مقصود نہیں ہے جو اس نے حضرت معاویہؓ کو جنگِ جمل میں ملوث کرنے کی غرض سے تصنیف کئے ہیں۔
آخر بے بنیاد مفروضوں کو کسی سنجیدہ بحث کا عنوان کیونکر بنایا جا سکتا ہے۔
معاویہؓ کے بارے میں یہ ساری جمع و ترتیب محض معاویہؓ دشمنی کا ہی

---

[1] علیؓ و عائشہؓ صفحہ ۱۴۱

ایک رخ ہے ورنہ معاویہؓ بے چارے کو شاید جنگِ جمل کی کہانی بھی جمل برپا ہو چکنے کے بعد معلوم ہوئی تھی کیونکہ جمل کی بنیاد تو مدینہ میں ہی پڑ گئی تھی جب حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ حضرت علیؓ کی روش سے مایوس ہو کر وہاں سے نکل آئے تھے۔ پھر اس جنگ کی تیاری مکہ میں ہوئی اور یہ جنگ بصرہ پہنچ کر لڑی گئی۔ اس جنگ کے اسباب اچانک پیدا ہوئے اور اچانک یہ معاملہ گفتار سے تلوار تک پہنچ گیا۔ اس عرصہ میں نہ طلحہؓ اور زبیرؓ کی معاویہؓ سے کوئی ملاقات ہوئی نہ مراسلت نہ معاویہؓ کو طلحہؓ و زبیرؓ سے ہی کوئی عناد تھا جو انہیں ان بزرگوں کی تباہی مطلوب ہوتی نہ معاویہؓ کی طرف سے اس لڑائی میں کوئی دلچسپی ثابت ہے نہ امداد نہ اس قسم کا کوئی مرحلہ ہی آسکا۔ ایسے میں معاویہؓ کو اس جنگ میں ملوث کہنا اپنی دنائت اور معاویہؓ دشمنی کا ثبوت ہی فراہم کرتا ہے ورنہ اس میں حقیقت کوئی نہیں ہے۔ پھر اس مصنف نے معاویہؓ کے بارے میں جو کچھ بھی جھوٹ تصنیف کئے ہیں ان میں سے کسی ایک کا بھی تاریخی طریقہ سے ثبوت فراہم نہیں کیا۔

پس اس کی جہالت محض کے جواب میں وقت اور کاغذ ضائع کرنا بیکار ہے۔ اس شخص نے بظاہر اپنی اس تحریر میں طلحہؓ اور زبیرؓ سے بھی بمقابلہ معاویہؓ ہمدردی کا اظہار کیا ہے مگر یہ ہمدردی بھی مگرمچھ کے آنسوؤں سے زیادہ نہیں ہے کیونکہ وہ حضرات طلحہؓ اور زبیرؓ سے بھی مخلص نہیں ہے جب اس نے لکھا کہ:

ان کا مقصد دراصل اپنے لئے خلافت حاصل کرنا تھا [1]

حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ اتنا بڑا جھوٹ ہے جسے صرف عمر ابوالنصر ہی اپنے ہاں جگہ دے سکتا تھا ورنہ کون نہیں جانتا کہ طلحہؓ اور زبیرؓ نے اس

---

[1] علیؓ و عائشہؓ صـ ۱۹۷

وقت بھی خلافت حاصل کرنے سے انکار کیا جب حضرت عمرؓ نے ان کو خلافت کا اہل پاکر ان لوگوں میں جگہ دی جن میں سے وہ ہر کسی کو ہی خلیفہ کے طور پر پسند کرتے تھے۔

پھر عمر ابوالنصر اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ جن باغیوں بلوائیوں اور قاتلین عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو خلیفہ نامزد کیا تھا وہ پہلے انہی دو بزرگوں کے پاس خلافت کا تاج لے کر پہنچے تھے مگر ان دونوں نے خلافت قبول کرنے سے انکار کیا۔ ان دونوں سے مایوس ہو کر پھر بلوائیوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کیا۔

یعنی جب اُن بزرگوں کو پلیٹ میں رکھ کر خلافت پیش کی جا رہی تھی۔ انہوں نے اسے اُس وقت بھی قبول نہیں کیا تھا تو اب اُن کی جان پر کیا مشکل آپڑی تھی کہ کانٹوں کے اس بستر کی تلاش میں وہ مدینہ سے مکّہ اور مکّہ سے بصرہ تک کے ویرانوں میں بھٹکتے پھرتے۔

بہر حال یہ سب واہی باتیں ہیں اور کسی سنجیدہ بحث کا محل نہیں ہیں ہمارا مقصد اس کی تحریر کو نقل کرنے سے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ شخص نہ صرف محبِ علیؓ تھا بلکہ معاویہؓ دشمن بھی تھا۔

ایک اور مُحبِّ علیؓ کی گواہی

حضرت علیؓ کی محبت ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے کیونکہ علیؓ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرب اعزہ کا حصہ ہیں وہاں وہ حضورؐ کے صحابی بھی ہیں اور صحابی سے محبت مسلمان کے لئے اس لئے جزوِ ایمان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے جو شخص میرے صحابی سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کرنے کی وجہ سے اس سے محبت کرتا ہے اور فرمایا جسے میرے صحابہ سے

بغض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے مجھ سے بُغض ہے۔ ایسے میں کون ہے جو علی سے محبت نہ کرے لیکن اگر کوئی علیؓ سے تو محبت کرتا ہے مگر علیؓ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے کسی دوسرے صحابی کے خلاف اپنے دل میں بُغض رکھتا ہے تو قرار دیا جا سکتا ہے کہ اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بُغض ہے اور ظاہر ہے کہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بُغض ہے اُسے اپنے آخری انجام کے بارے میں اسی دنیا میں سوچنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر غلام ربانی ایم اے، پی ای ایس کا ذکر ہم گزشتہ اوراق میں حضرت علیؓ کا ایک نادان دوست کے زیرِ عنوان کر چکے ہیں۔ ان بزرگوار نے "امیر معاویہؓ" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا ہے۔ یہ کتابچہ اس تاریخی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو وہ "ہمارے بزرگ" کے زیرِ عنوان ترتیب دے رہے ہیں۔ ان بزرگوں میں سے آپ نے ایک بزرگ معاویہؓ کو بھی اپنے فکر و نظر سے حصہ دیا ہے۔

ان کی حُبِّ علیؓ اور بُغضِ معاویہؓ کا یہ حال ہے کہ جب حضرت علیؓ کا ذکر کرتے ہیں تو انہیں امیر علیہ السلام لکھتے ہیں مگر جب حضرت معاویہؓ کا ذکر آتا ہے تو انہیں صرف معاویہ لکھتے ہیں اور اس پر رضی اللہ کا نشان بھی نہیں دیتے۔

مگر حضرت علیؓ کی پالیسی کے بارے میں جب انہیں بھی کچھ بیان کرنے کی مجبوری پیش آتی ہے تو وہ بھی اپنے مجہول مفروضوں یوں ہوا ہوگا یوں ہوا ہوگا یوں کہا ہوگا اور یوں سُنا ہوگا کی گردان ترک کر کے پورے اعتماد سے لکھنے لگتے ہیں۔

امیر معاویہ شام کے والی تھے اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ انہوں نے

وہاں نہایت اچھی طرح قدم جمالئے تھے اور کافی اقتدار حاصل کرلیا تھا اب جب بنوامیہ کے باقی حکام کے ساتھ جناب امیر علیہ السلام نے امیر معاویہ کو بھی معزول کرنا چاہا تو تمام خیرخواہوں نے آپ کو اس اقدام سے روکا اور اس کے نتائج بد سے ڈرایا۔

چنانچہ مغیرہ بن شعبہ اور حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی اختلاف کیا۔ یہ لوگ امیر معاویہ کی سیاسی اہمیت، ان کے دماغی رجحان اور ان کی ہردلعزیزی سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بنوامیہ کو حضرت عثمان کے قتل کے علاوہ اقتدارِ خلافت کے چلے جانے کا بڑا رنج ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ظاہری طور پر نہ سہی دماغی اور فکری طور پہ بنی ہاشم اور بنی امیہ میں رقابت قائم ہو چکی ہے۔ اگر امیر معاویہ کو حکومت شام سے علیحدہ کر دیا گیا تو اقتدار کی یہ جنگ کھُلم کھُلا شروع ہو جائے گی۔

ان دونوں حضرات نے امیر کو تمام اونچ نیچ سمجھائے، امیر معاویہ کی مقبولیت اور اُن کی ہوسِ اقتدار کا صحیح صحیح خاکہ کھینچ کر دکھایا۔ شہادتِ خلیفہ سے بنوامیہ کے اقتدار کو جو ٹھیس لگی تھی اُدھر توجہ دلائی۔ اور مصلحت اندیشی اور انجام بینی کے محاسن ایک ایک کر کے سنائے۔ لیکن جناب امیر کسی طرح بھی اپنا ارادہ بدلنے پر رضا مند نہ ہوئے اور امیر معاویہ کی معزولی کے احکام صادر کر دیئے [۱]

یہاں پہنچ کر مصنف "امیر معاویہؓ" ایک عنوان قائم کرتے ہیں "جناب امیر کا سہو" اور حضرت امیر کے اس سہو کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

حضرت عثمان کے حالات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ باغیوں کا اتنا زور تھا کہ دو دن تک خلیفہ کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی اور کسی کو اتنی جرأت

---

[۱] امیر معاویہؓ صنا

نہ ہو سکی کہ ان کی تجہیز و تکفین کرے۔

تیسرے دن جب جنازہ اٹھایا گیا تو بمشکل سترہ آدمی نماز جنازہ میں شریک ہو سکے۔ جب سپردِ خاک کئے جا چکے تو باغیوں کے ڈر سے قبر کا نشان مٹا دیا گیا[1]۔

یہ واقعات تحریر کر کے پروفیسر غلام ربانی مصنف کتاب اپنا تبصرہ پیش کرتے ہیں کہ ایسے ناخوشگوار حالات کا تقاضا تھا کہ اوّل فتنہ فساد کے سرغنوں کی سرکوبی کی جاتی اور جب یہ افراتفری مکمل طور پر رفع ہو جاتی تو عمال حکومت کی اصلاح کی کوشش کی جاتی۔ جو سنبھل جاتے انہیں اپنے عہدوں پر رہنے دیا جاتا۔ لیکن جو حالات کے تقاضوں کو نہ سمجھ سکتے انہیں نکال دیا جاتا۔

امیر معاویہ بنو امیہ میں سے سب سے زیادہ با اقتدار اور بیدار مغز حکمران تھے۔ اوّل ان سے بیعت لی جاتی، پھر ان کی حرکات و سکنات پر کڑی نگرانی رکھی جاتی۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد جب اور طرف سے مکمل اطمینان ہو جاتا اور جناب امیر پھر بھی اس امر کی ضرورت محسوس کرتے کہ امیر معاویہ کو حکومتِ شام سے علیحدہ کر دیا جائے تو انہیں اپنی سکیم کو کامیاب بنانے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ لیکن افسوس ہے کہ جناب امیر نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنے کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا[2]۔

مصنف کتاب لکھتے ہیں کہ اس کے بعد پھر مسلمان، شیعہ، سنی، خارجی اور رافضی میں بٹ گئے، خون کی ندیاں بہہ گئیں، ہزاروں بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، لاانتہا، سہاگ لٹ گئے اور لاکھوں بچے شفیق اور مہربان باپوں کے سائے سے محروم ہو گئے[3]۔

---

[1] امیر معاویہؓ صد ۱۰-۱۱ [2] ایضاً صد ۱۱ [3] ایضاً صد ۱۲

اس کے بعد مصنف امیر معاویہؓ ایک زبردست انکشاف کرتے ہیں کہ:

(جب ملک کی حالت یوں بگڑ گئی اور حالات ابتر ہو گئے تو) جناب امیر کو محسوس ہونے لگا کہ اُنہوں نے سیاسی مصلحت اندیشی کو نظرانداز کر کے درست قدم نہیں اُٹھایا۔[1]

اس کے بعد جناب مصنف حضرت امیر کو لقمہ دیتے ہیں کہ:

اگر جناب امیر مغیرہ بن شعبہ اور عبداللہ بن عباس کے مشورہ پر عمل کرتے تو بہت ممکن ہے کہ تلواریں نیاموں سے نہ نکلتیں، جلدی ہی ہر طرف امن بحال ہو جاتا۔[2]

اب دیکھئے فکر و نظر کی کونسی کوتاہی ہے اور عقل و خرد کی کونسی ابتری ہے جو ان محبانِ علیؓ نے حضرت علیؓ کی ذات سے وابستہ نہیں کی۔ ان سب نے مستقبل کے سارے باہمی قتل و قتال کی ذمہ داری حضرت علیؓ کی ضد پر ہی ڈالی ہے اور بقول مصنف امیر معاویہؓ مسلمانوں کے اندر شیعہ، سُنّی، خارجی اور رافضی کی تقسیم بھی حضرت علیؓ کی ضد کی کوکھ سے ہی اُچھلی ہے الفاظ اگرچہ دوسرے ہیں مگر ماحصل ان کا یہی ہے کہ علیؓ:

- محض ضدی ہیں، عقل کی بات ہی نہیں سُنتے۔
- غیر ذمہ دار ہیں، من مرضی کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ دراصل ان کے کرنے والے کام کونسے ہیں۔
- فرض ناشناس ہیں اور اُنہیں معلوم نہیں ہے کہ اب وہ صرف علیؓ نہیں بلکہ امیرالمومنین علیؓ ہیں۔
- غیر مآل اندیش ہیں، حالات کا اندازہ تک نہیں کرتے، انہیں اپنی روش کے نتائج پر ذرہ توجہ نہیں ہوتی۔

---

[1] امیر معاویہؓ صـ۱۳ [2] ایضاً صـ۱۴

- سیاست سے بے خبر ہیں، وقت کے تقاضوں کو نہیں جانتے اور انہیں بالکل معلوم نہیں کہ جذبات اور ضرورت کی راہیں الگ الگ ہیں۔
- حربی شعور سے تہی دامن ہیں، جری ہیں مگر جرأت کے محلات کی تعیین میں ناکام ہیں۔
- وقت ناشناس ہیں جبکہ وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا کامیاب زندگی کی پہلی شرط ہے۔
- اُمت کے مصالح سے لاپرواہ ہیں جبکہ اُمت کے سربراہ کی حیثیت سے ان کا پہلا فرض یہی تھا۔

"یہ ایک بڑا اسرار امر ہی ہے کہ لوگ اس بات کو بھی جانتے تھے کہ معاویہؓ حضرت علیؓ کی بیعت پر آمادہ ہیں مگر معاویہؓ سے صلح حضرت علیؓ کے ذاتی مصالح کے خلاف ہے۔

چنانچہ امیر معاویہؓ کے مصنف لکھتے ہیں:

شام کے عابد و زاہد بزرگ جن کا نام ابو مسلم خولانی تھا امیر معاویہؓ کے پاس آئے اور حضرت امیر کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے منع کیا۔ امیر معاویہؓ نے کہا مجھے علیؓ سے کوئی پرخاش نہیں، وہ بلاشبہ حضورؐ کے عم زاد اور داماد ہیں۔ ہمارا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ چونکہ حضرت عثمانؓ کو بلاوجہ شہید کیا گیا ہے اور عثمانؓ کے قاتل علیؓ کے لشکر میں ہیں وہ ہمارے حوالے کر دیئے جائیں ہم ان سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم سب لوگ علیؓ کی بیعت کر لیں گے[1]

پھر اگلی کہانی بھی یہی بزرگوار سناتے ہیں کہ ابو مسلم نے اس بات کو معقول مطالبہ سمجھتے ہوئے یہ خیال کر کے کہ آخر علیؓ کو اس معقول بات کے ماننے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ امیر معاویہؓ سے کہا۔ اچھا آپ اپنا مطالبہ لکھ کر مجھے دیدیں، میں اسے لے کر علیؓ کے پاس جاتا ہوں۔ میں انہیں قائل کرنے کی

---

[1] امیر معاویہؓ صـ۲۶

کوشش کروں گا۔ چونکہ کوئی بھی معقول آدمی کسی معقول بات کے ماننے میں کبھی پہلو تہی نہیں کر سکتا اس لئے اغلب ہے کہ میں اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤں گا [1]

اس پر امیر معاویہ نے جو کچھ زبانی کہا تھا حضرت علیؓ کی طرف ایک خط کی صورت میں لکھ دیا۔ مصنف "امیر معاویہؓ" کہتے ہیں:

ابو مسلم خولانی نے امیر معاویہ کا یہ خط جناب امیر (حضرت علیؓ) کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر علی نے جواب کے لئے ایک دن کی مہلت مانگی۔

دوسرے دن ابو مسلم کوفہ کی مسجد میں جناب امیر سے ملنے گئے تو دس ہزار مسلح سپاہی کھڑے نعرے لگا رہے تھے کہ ہم سب عثمان کے قاتل ہیں۔ جناب امیر معذور تھے فرمانے لگے:

اب آپ ہی کہیں کہ ان حالات میں بھلا میں کیا کر سکتا ہوں [2]

اب اگر کسی نے یہی فیصلہ کر رکھا ہو کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں، بات خواہ کوئی بھی ہو، قصور ہر حال میں معاویہؓ ہی کا ہے تو اس بیماری کا علاج تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں ہے۔

ورنہ کتنی صاف بات ہے کہ معاویہؓ علیؓ کی طرف راغب ہیں بشرطیکہ وہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لیں۔ بات بڑی معقول تھی۔ ابو مسلم خولانی نے یہ مطالبہ معاویہؓ سے تحریری طور پر حاصل کیا اور علیؓ کے حضور جا پہنچے اور ظاہر ہے کہ علیؓ اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہوئے۔ انہوں نے اگلے روز کی تاریخ دی کہ سوچ کر جواب دوں گا۔

اگلے روز جب ابو مسلم خولانی جواب لینے کے لئے مسجد میں پہنچے تو صورتحال

۱؎ امیر معاویہؓ ص۲۷ ۲؎ ایضاً ص۲۸

یہ تھی کہ حضرت علیؓ نے مسجد میں دس ہزار نعرہ باز لوگ مظاہرہ کے لئے جمع کر رکھے تھے۔ ابو مسلم آئے تو اُنہوں نے پروگرام کے مطابق مظاہرہ کیا اور اس طرح حضرت علیؓ نے اپنی مرضی حضرت ابو مسلم پر واضح کر دی۔ ورنہ مسجد میں دس ہزار ایجی ٹیٹروں کو جمع کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ اور جب آج تک حضرت علیؓ نے نہ کبھی کسی ساتھی کی مرضی پوچھی تھی نہ کبھی کسی سے مشورہ کیا تھا نہ کبھی کسی کا مشورہ مانا تھا تو اب ابو مسلم کو تاریخ دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ مطلب صاف ہے کہ حضرت علیؓ نہیں چاہتے تھے کہ اس بارے میں مصالحت کی کوئی گفتگو چلے۔ اور اُن کے پروگرام میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔ لہٰذا اُنہوں نے اس گفتگو کو پہلے قدم پر ہی ناکام بنا دیا۔ کیا اس سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ حضرت علیؓ کے نزدیک کوئی بحث طلب یا فیصلہ طلب مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ وہ صرف بنو اُمیہ کا استیصال ہی چاہتے تھے اور وہ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر کسی کو ہی مسترد کر دینے پر بضد تھے۔ خواہ وہ کوئی عبداللہ بن عباسؓ ہو یا مغیرہؓ بن شعبہ، حسنؓ بن علیؓ ہو یا ابو مسلم خولانی علیؓ کسی کی بھی ماننے پر تیار نہیں تھے۔ ایسے میں قصور اگر پھر بھی معاویہؓ ہی کا ہے تو ؏

حیف گر در پسِ امروز بود فردائے

دردناک لطیفہ

پچھلی تفصیل سے ظاہر ہے کہ جن لوگوں سے حضرت علیؓ کے لئے تلوار کے دباؤ سے بیعت لی گئی تھی وہ تو اب مدینہ میں موجود نہیں تھے مگر جو لوگ اب وہاں موجود تھے اُن سب نے حضرت علیؓ کی بیعت اپنی رضامندی سے ہی کی تھی اور اُن میں بہت کم لوگ ایسے رہ گئے تھے جو حضرت علیؓ سے اختلاف

رکھنے کے باوجود اپنی کسی کمزوری سے باہر نہیں جا سکے تھے اب مدینہ میں اکثر حضرت علیؓ کے ہی خواہ، ہمدرد اور رفقاء ہی تھے مگر یہ عجیب ہی بات ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک بھی اہلِ فکر و نظر شخص ایسا نہیں تھا جو حضرت علیؓ کی خلافتی پالیسی سے اتفاق کرتا ہو۔ یہ سب لوگ ہی حضرت علیؓ کی اطاعت تو کرتے تھے کہ وہ اُنہیں خلیفہ مانتے تھے مگر ان کی روش سے ذرا بھی متفق نہیں تھے کیونکہ مدینہ میں گزرنے والے سارے خونی واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے گزرے تھے۔ شہر میں ظہور پانے والی ساری کربناکیاں اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ شہر اور بیرونِ شہر لوگوں کے خیالات سے وہ اچھی طرح آگاہ تھے۔ مجبور اور غیر مجبور لوگوں کو وہ ذاتی طور پر جانتے تھے، آس پاس کے حالات ان کی نگاہ میں تھے لہٰذا اس بات میں شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ ان لوگوں کا مشورہ زیادہ صائب تھا، اُن کی رائے زیادہ دقیع تھی، ان کی صلاح زیادہ مناسبِ حال تھی۔ حضرت علیؓ نے زمامِ اقتدار سنبھالتے ہی بنو اُمیہ کے خلاف سخت کارروائی شروع کر دی۔ ان کے مناصب اُن سے چھین لئے، انہیں حکومت کے حلقوں سے نکال دیا، عثمانی عمال کو معزول کر دیا، ان کی جاگیریں اور جائدادیں ضبط کرنی شروع کر دیں تو ان کے دوست پریشان ہو گئے اور اُنہوں نے حضرت علیؓ سے درخواست کی کہ وہ حوصلے سے کام لیں۔ وہ اگر بنی اُمیہ کو برداشت نہیں کرتے تو یہ ان کی اپنی صوابدید ہے۔ مگر اپنی اس صوابدید کے خاکہ میں عملی رنگ بھرنے کے لئے جلدی نہ کریں بلکہ اپنا پروگرام صبر و تحمل سے چلائیں۔ ان کی موجودہ روش، ملک اور اسلام دونوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔

حضرت علیؓ نے جواب دیا تم مجھے وعظ نہ سناؤ۔ میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے میں اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں عثمانی عمال کو کسی طرح بھی برداشت نہیں

کر سکتا۔ میں اُنہیں ایک روز کے لئے بھی اُن کے مناصب پر قائم رکھنے پر تیار نہیں ہوں۔

حضرت علیؓ کے خیر خواہوں اور ان کے ہمدردوں نے جب دیکھا کہ ان کی روش سے خطرہ بالکل دروازوں پر آگیا ہے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جرأت کر کے حضرت علیؓ سے اصرار کیا کہ آپ اپنی اس روش پر نظر ثانی کریں۔ ابن عباسؓ نے بدلائل اُن پر زور دیا کہ آپ کی جلد بازی آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوگی۔ مگر حضرت علیؓ نے ان کو کچھ ایسا جواب دیا جسے جھڑکی ہی کہا جائے گا کہ میں کہہ چکا ہوں مجھے وعظ نہ سناؤ بلکہ میں جو کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔

ابن عباسؓ نے ہمت نہ ہاری اور جی کڑا کر کے پھر کہا کہ اچھا آپ جو چاہیں کریں مگر معاویہؓ کو اس کی جگہ سے ابھی نہ ہلائیں اور اس کی معزولی کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کردیں۔

حضرت ابن عباس نے اُنہیں سمجھایا کہ معاویہؓ ایک وسیع ملک کا نہایت طاقتور حاکم ہے۔ آپ نے اُسے اپنی بیعت کے لئے تو کہا نہیں اگر آپ اُسے بیعت کے لئے کہتے اور وہ انکار کرتا تو اُس کو معزول کرنے کی وجہ بھی تھی مگر آپ اُسے کس دلیل سے معزول کر سکتے ہیں جبکہ حال یہ ہے کہ اس کی سطوت سے قیصر کے جسم پر بھی لرزہ طاری ہو جاتا رہا ہے۔ وہ شام میں بے حد مقبول ہے، ہر دلعزیز ہے، شام کے لوگ اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ آپ اُسے اگر بے وجہ مسترد کر بن گے تو ملک کے اندر زبردست فساد کو دعوت دیں گے۔

آپ کے پاس ان لوگوں کو معزول کرنے کی دلیل صرف آپ کے جذبات ہیں کہ آپ بنو اُمیہ کے کسی شخص کو با اختیار دیکھنا نہیں چاہتے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی دلیل نہیں ہے یقین کیجئے کہ پوری دنیا میں آپ کی اس کاروائی کی

کوئی تائید نہیں کرے گا۔

اگر آپ معاویہؓ کو اس جرم میں معزول کرتے کہ اُس نے آپ کی بیعت سے انکار کیا ہے اور آپ کی نافرمانی کی ہے تو کوئی بات بھی تھی مگر آپ جب اُسے کہیں گے کہ میں تمہیں بنو اُمیہ کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے معزول کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ خلافت کی نافرمانی نہیں ہے بلکہ بنو ہاشم کے اُس تعصب کی علامت ہو گی جو ہمیں بنو اُمیہ کے خلاف چلا آ رہا ہے۔ ایسی صورت میں معاویہؓ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آپ کے مقابلہ میں نکل آئے گا اور آپ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ کے پاس تو معاویہؓ کے خلاف حملہ کرنے کے نکلنے کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہو گی مگر اُس کے پاس اپنے دفاع کے لئے دلیل موجود ہو گی۔

پھر کیا خبر حضرت ابن عباسؓ نے خلوت میں حضرت علیؓ سے کیا کچھ کہا ہو۔ مگر حضرت علیؓ کا ایک ہی جواب تھا کہ معاویہؓ کو میں ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

بالآخر ابن عباسؓ سمیت حضرت علیؓ کے سب رفقاء اور خیر خواہوں کو حضرت علیؓ کی مرضی کے مطابق کام کرنا پڑا اور پھر اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا جس کی ابن عباس نے بار بار نشاندہی کی تھی۔ حضرت علیؓ نے معاویہؓ کو معزول کر دیا اور اُن کے خلاف لشکر کشی کی۔ معاویہؓ مقابلہ پر نکلے اور پھر اس کا نتیجہ یہ تھا کہ صفین کا میدان مسلمانوں کی نعشوں سے اَٹ گیا۔ جب گنتی کی گئی تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تلواروں سے ۹۰ ہزار مسلمان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔

کہانی کا یہ رخ اتنا دردناک ہے کہ قاری اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکے مگر اس کو بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ اس کہانی کا وہ رُخ جو مولانا مودودی صاحب نے دریافت کیا ہے اتنا مضحک ہے کہ آدمی

روتے رونے ہنسنے لگے۔

اب دیکھئے کہ حضرت علیؓ کی جس پالیسی کو زمین نے بھی غلط کہا اور اہل زمین بھی اس کی غلطی پر متفق تھے جو آسمان کی پالیسی کے بھی خلاف تھی اور جس کے لئے آسمان سے بھی کوئی تائید میسر نہ آئی، جسے حضرت علیؓ کے اہل خانہ نے بھی غلط کہا اور آپ کے رفقاء نے بھی جس کی تغلیط کی جسے دنیا بھر کے اہل فکر و نظر نے بھی غلط مانا اور جسے مورخین کے ہاں بھی اصابت کی سند نہ ملی اس کے بارے میں ایک مولانا مودودی صاحب ہی ہیں جو یہی کہے جا رہے ہیں کہ:

کوئی سیاسی بصیرت رکھنے والا آدمی یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت علیؓ اگر حضرت معاویہؓ کی معزولی کا حکم صادر کرنے میں تاخیر کرتے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوتی [1]

اللہ اکبر! اسے کہتے ہیں ؂

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اب کوئی بتائے کہ مولانا کے پاس اپنے اس موقف کے حق میں سوائے اس کے کیا دلیل ہے کہ یہ کام حضرت علیؓ نے کیا ہے اور علیؓ جو بھی کرتے وہ بہر حال صحیح ہوتا۔ مولانا سے کون پوچھے کہ حضرت علیؓ جس غلطی کے ارتکاب سے بچ گئے تھے اس نے امت کے اندر خیر و خوبی کا کتنا ذخیرہ چھوڑا ہے!

اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ مولانا نے اس باب میں ان سب لوگوں کو بے بصیرت فرمایا ہے جو حضرت علیؓ کو مجبور کرتے تھے کہ معاویہؓ کو فی الحال معزول نہ کیجئے۔ ان میں مغیرہؓ بن شعبہ کی موجودگی تو خیر مولانا کے لئے

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۳۳

مسرت کا موجب بن سکتی ہے مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسروں کو مولانا کیا جواب دیں گے ؟

اور اس بحث کا یہ رُخ بے حد عبرتناک ہے کہ مولانا نے حضرت علیؓ کی جس ضد پر انہیں تھپکی دی اور تحسین و آفریں سے نوازا ہے، اس کے بارے میں حضرت معاویہؓ کا ایک معاند حضرت علیؓ کا عظیم محب اور حضرت مولانا کا رفیق سفر "امیر معاویہؓ" کا مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ :

(جب ملک کی حالت بہت بگڑ گئی ، حالات ابتر ہو گئے تو) جناب امیر کو محسوس ہونے لگا کہ انہوں نے سیاسی مصلحت اندیشی کو نظر انداز کر کے درست قدم نہیں اٹھایا[1] فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ !

اب مولانا کی مشکل کا اندازہ کون کرے آہ !

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

---

[1] امیر معاویہؓ صد ۱۳

فصلِ چہارم

پس منظر

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

جیسا کہ ہم علیؓ معاویہؓ تصادم کے تہہ منظر کے بیان میں عرض کر آئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے قتل اور قتل کے قصاص کا مسئلہ اس تصادم کا حقیقی سبب نہیں ہے۔ بلکہ یہ تصادم بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی اُس پُرانی عداوت کا ایک خوفناک نتیجہ ہے جو ان دونوں خاندانوں میں گزشتہ دو نسلوں سے چلی آ رہی تھی۔ اسلام کی آغوش میں آ جانے کے بعد اگرچہ بنو اُمیہ نے اس پُرانی عداوت کو فراموش کر دینے کی بہت کوشش کی تھی مگر بنو ہاشم نے ان کی اس خواہش کا احترام کرنے سے انکار کر دیا۔

بنو اُمیہ اپنی امن پسندی اور امن طلبی کے سبب شاید حضرت عثمانؓ کے قتلِ ناحق پر بھی صبر کر لیتے اور مسلمانوں کو باہمی قتل و خونریزی سے بچانے کے لئے کوئی مناسب راستہ اختیار کرتے مگر حضرت علیؓ نے جب حضرت معاویہؓ کے خلاف فوج کشی کر دی تو اتحادِ اسلامی کو قائم رکھنے کی یہ راہ بھی مسدود ہو گئی۔

حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد حالات نے جو صورت اختیار کی اور حضرت علیؓ نے خلافت کی زمام سنبھالنے کے بعد حضرت عثمانؓ کے قصاص کے سلسلہ میں

جو روش اختیار کی اس کی بنیاد پر اگرچہ بنو امیہ کا حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ کے قتل میں ملوث کرنا بھی بالکل قابل فہم ہی ہے۔ مگر حضرت علیؓ پر یہ الزام بنو امیہ کی طرف سے کسی ردِ عمل کے اظہار سے پہلے ہی لگ چکا تھا،

تاہم حضرت علیؓ نے بڑی شدت سے اس الزام کی صحت سے انکار کیا اور تاریخی روایات کے بموجب حضرت علیؓ نے فرمایا:

خدا کی قسم میں نے نہ حضرت عثمانؓ کو قتل کیا نہ کرایا، نہ میں نے قاتلوں کی امداد کی اور نہ ان کے قتل پر خوش ہوا۔

بلکہ ایک روایت کے بموجب حضرت علیؓ نے یہ بھی فرمایا کہ:

میں نے جب قتلِ عثمانؓ کی خبر سنی تو از دیادِ وحشت سے میری عقل جاتی رہی تھی۔ حضرت علیؓ کا بلاقسم کچھ کہنا بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا، لیکن جب وہ قسم کھا کر کوئی بات کہتے ہیں تو انہیں جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس مرحلہ پر حالات کچھ ایسے پیچیدہ ہو گئے تھے اور پس منظر کی روشنی میں پیش منظر کچھ ایسا ناقابلِ فہم بن گیا تھا کہ بہت سے لوگ حضرت علیؓ کے عذر کو صحیح نہیں سمجھتے تھے اور وہ حضرت علیؓ کو بالواسطہ طور پر حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک کہنے پر بضد تھے۔

اتفاق سے حضرت علیؓ کی ذات سے قتلِ عثمانؓ سے قبل بھی لوگوں کو ایسی شکایات پیدا ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے لوگ سمجھتے تھے کہ علیؓ عثمانؓ کی خلافت کو برداشت نہیں کرتے اور ساتھ ہی ساتھ واقعات بھی کچھ ایسی صورت میں ظہور پذیر ہو رہے تھے کہ وہ لوگ اپنے ذہن پر پختہ ہوتے گئے۔

پھر قتلِ عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کے رویّہ نے رہی سہی کسر بھی نکال دی جبکہ بعض واضح وجوہ سے حضرت علیؓ کی ساری سرگرمیاں قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لینے کے بجائے ان کو اپنے انجام پر پہنچنے سے بچا لینے پر

مرکوز ہوگئیں۔

اگرچہ حضرت علیؓ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینے کے لئے کسی مناسب وقت کے انتظار کا یقین بھی دلاتے تھے مگر تبدریج وہ اپنے اس موقف سے ہٹتے چلے گئے اور قصاص کو ناممکن بھی بتانے لگے۔ چنانچہ طبری میں ہے:

صحابہؓ کی ایک جماعت حضرت علیؓ کے پاس پہنچی اور کہا کہ ہم نے آپ کی بیعت حدود اللہ کو قائم کرنے کی شرط پر کی تھی۔ آپ کو علم ہے کہ باغیوں کی یہ پوری جماعت قتل عثمانؓ میں شریک ہے، ان سے قصاص لینا آپ پر واجب ہے۔

حضرت علیؓ نے کہا ہم اس قوم سے کیسے قصاص لے سکتے ہیں جو ہماری مالک بنی ہوئی ہے، ہم ان کے مالک نہیں ہیں۔

ان قاتلوں اور باغیوں میں تمہارے غلام بھی شریک ہیں اور دیہاتی بھی، پھر یہاں کئی قسم کے لوگ ہیں، کچھ آپ کی طرح قصاص کے طالب ہیں کچھ قصاص کے قائل ہی نہیں، کچھ دونوں باتوں کے خلاف ہیں پس جب تک سارے لوگ ایک ہی راستے پر جمع نہ ہو جائیں قصاص لینا ممکن نہیں ہے [۱]

اور اس امر کو ایک لطیفہ ہی کہنا چاہیئے کہ ہمارے مولانا رئیس احمد جعفری صاحب مترجم نہج البلاغہ اگر حضرت علیؓ کے مشیروں میں موجود ہوتے تو ان کی یہ سوچ حضرت علیؓ کے لئے بہت مفید رہتی کہ۔

قاتلوں کو نہ حضرت نائلہ ہی پہچانتی تھیں نہ محمد بن ابی بکرؓ، پھر شرعی شہادت نہ ہونے سے کسی کو قصاص کی سزا نہیں دی جا سکتی [۲]

---

[۱] طبری جلد ۳ باب ۲ [۲] نہج البلاغہ مطبوعہ لاہور صفحہ ۲۳۶

اب جعفری صاحب سے کون کہے کہ محمد بن ابی بکر تو خود قاتلوں میں داخل تھے، ان کے شریک کار تھے، ان کے رفیق کار تھے، قاتلوں کی ان سے خط و کتابت اور رفاقت تھی۔ اُن کے پہچاننے کا کیا سوال ہے۔ انہیں پولیس کے سپرد کر دیا جاتا تو وہ سب کچھ اُگل دیتے انہوں نے قتل کے مرحلہ پر حضرت عثمان رض کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچی تھی، بھلا کوئی پوچھنے والا ہوتا تو وہ قاتلوں کو کیوں نہ پہچانتے۔

بہر حال حضرت علی رض اپنے پہلے موقف پر قائم نہیں رہ سکے تھے ایسے میں جو لوگ ان واضح واقعات کی شہادت سے ان پر قتل کا الزام رکھتے تھے انہیں بھی جھٹلانا آسان نہیں رہ گیا تھا اور المیہ یہ تھا کہ حضرت علی رض کے قتل عثمان رض میں ملوث ہونے کے قرائن تو بہت سے تھے مگر اُن کی برأت کا سوائے ان کے اپنے بیان کے کوئی ایک بھی قرینہ نہیں تھا۔

قتلِ عثمان رض اور علی رض

بنو اُمیہ اور بہت سے دوسرے لوگوں کی طرف سے حضرت علی رض کی ذات پر قتلِ عثمان رض کے الزام کی حقیقت کو جاننے کے لئے، ہمیں کچھ پیچھے چلنا ہو گا تاکہ ہم صحیح طور پر جان سکیں کہ حضرت علی رض کے خلاف ان شکوک اور شبہات کے طوفان کی اصل وجہ کیا ہے۔

یہ بات تو ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ حضرت علی رض پر جب قتلِ عثمان رض میں ملوث ہونے کا الزام اُچھلا تو حضرت علی رض نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً اس الزام کی تردید کی اور وفورِ جذبات سے یہاں تک بھی کہا کہ:

لوگ مجھے قتلِ عثمان رض میں ملوث کرتے ہیں حالانکہ عثمان رض کے قتل کی خبر

سُن کر از دیاد وحشت سے میری عقل تک جاتی رہی تھی [۱]

حضرت علیؓ کی عظیم شخصیت کے ملحوظِ خاطر اس بیان کو مسترد کرنا آسان نہیں ہے۔ مگر جو لوگ حضرت علیؓ پر قتلِ عثمانؓ میں امداد یا تحریک وغیرہ کا الزام دیتے تھے۔ ان کے لئے حضرت علیؓ کے اس بیان کی صحت پر ایمان لانے میں ایک سب سے بڑی اور نہایت درجہ واضح رکاوٹ یہ تھی کہ علیؓ قتلِ عثمانؓ کا الزام تو اپنے سر لینے پر آمادہ نہیں تھے۔ مگر حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو انہوں نے اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی۔ وہ قاتلوں سے قصاص لینے پر تو آمادہ نہیں تھے مگر انہوں نے ان لوگوں سے لڑائیاں کیں جو عثمانؓ کے قتل کا قصاص طلب کرتے تھے۔

علیؓ لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص حاصل کرنے کا یقین بھی دلاتے تھے مگر انہوں نے قاتلوں کو پورا پورا تحفظ بھی مہیا کر رکھا تھا۔ وہ مقتول کے وارثوں اور تعلق داروں کو ایک ایک کر کے بے دست و پا کرنے میں مصروف تھے اور قاتلوں کو اپنی فوج میں کمانداروں کے مناصب دے رکھے تھے اور آگے چل کر انہیں گورنروں کے مناصب پر بھی فائز کیا یہ صورتِ حال معترضین کے لئے بالکل نا قابلِ فہم تھی اور ان میں سے اگر کوئی حضرت علیؓ کو قتلِ عثمانؓ سے بری کرنے کی خواہش بھی رکھتا تھا تو اُسے اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے کوئی بہانہ تک میسر نہیں تھا۔ خود مولانا مودودی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

جنگِ جمل کے بعد انہوں نے قاتلینِ عثمانؓ کے بارے میں اپنا رویّہ بدل لیا۔ جنگِ جمل تک وہ ان لوگوں سے بیزار تھے اور بادلِ نخواستہ اُن کو برداشت کرتے تھے اور ان پر گرفت کرنے کے لئے موقع کے منتظر

---

[۱] طبری جلد ۳

تھے ..... لیکن اس کے بعد بتدریج وہ لوگ اُن کے ہاں تقرب حاصل کرتے چلے گئے جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کرنے اور بالآخر اُنہیں شہید کرنے کے ذمہ دار تھے [1]

اس سب کچھ کے باوجود حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ کو قتلِ عثمانؓ یا اُن کے قتل کی سازش میں شریک قرار دینے پر بضد نہیں تھے بلکہ وہ کہتے تھے کہ قرائن یہی کہتے ہیں کہ علیؓ عثمانؓ کو قتل کرنا یا کرانا چاہتے تھے اور وہ از اوّل تا آخر اس قتل کی سازش کی ایک کڑی بنے رہے ہیں۔ لیکن اگر علیؓ اپنے عمل سے اس شبہ کو باطل کر سکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ اور میں علیؓ کو نہ صرف اس سازش سے بری سمجھوں گا بلکہ میں اپنے تمام ساتھیوں سمیت ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اُن کو خلیفہ تسلیم کر لوں گا۔ بلکہ ایک مرحلہ پر حضرت معاویہؓ سے یہ بات بھی نقل کی گئی ہے کہ:

اگر علی عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لے کر حدود اللہ کو قائم کریں تو میں اُن کی کمان میں اُن کے حکم سے اور اُن کی مرضی کے مطابق کام کروں گا [2]

علاوہ ازیں حضرت علیؓ پر قتلِ عثمانؓ کی سازش میں شامل ہونے کا الزام صرف اُنہیں حالات کا نتیجہ نہیں تھا جو قتلِ عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کے رویہ سے پیدا ہوئے۔ بلکہ اس شبہ یا الزام کے لئے زمین حضرت عثمانؓ کی زندگی میں ہی ہموار ہو گئی تھی اور نہ صرف بنو امیہ میں سے عام لوگ بلکہ خود حضرت عثمانؓ کو بھی پورا شک بلکہ ایک حد تک یقین ہی تھا کہ علیؓ اُن کے خلاف کام کر رہے ہیں اور ان کی حکومت کے خلاف

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۴۶ [2] طبری جلد ۳

سازشوں میں مصروف ہیں۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ کے قتل سے قبل دارالخلافت میں بنوامیہ اور بنو ہاشم کی وہ رقابت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اثر سے حوالۂ نسیان اور صدیق اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کے دبدبہ سے زیرِ زمین چلی گئی تھی اب کھُل کر سامنے آ چکی تھی۔

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں مسلمان نما یہودی عبداللہ بن سبا نے مسلمانوں کے اندر نفاق کا بیج بونے کے لئے دونوں خاندانوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور خلافت بر بنائے قرابت کے نعرہ سے بنو ہاشم کی دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھی اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے زمین پہلے سے ہی تیار تھی۔ لہٰذا یہ بیج بوتے ہی اُگ آیا اور مسلمانوں کے یہ دونوں بڑے گروہ ایک بار پھر آپس میں کھنچے تنے رہنے لگے۔

عبداللہ بن سبا نے اگرچہ اسلام کا لبادہ تو فاروقِ اعظمؓ کے دورِ خلافت میں ہی اوڑھ لیا تھا۔ مگر فاروقِ اعظمؓ سے تو شیطان بھی راہ کترا کر چلتا تھا۔ پھر شیطان کا یہ مرید اُن سے کیونکر آنکھ ملاتا۔ یہ ان کے دور میں تو خاموش رہا مگر حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں ان کے مزاج کی نرمی سے فائدہ اٹھا کر اپنے غلاف سے نکل آیا اور خوب ہی کھل کھیلنے لگا۔ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف تو بنو ہاشم کے دل و دماغ اور اعصاب پر حضور علیہ السلام کی وفات سے لے کر اب تک غیر بنو ہاشم افراد کے صاحبِ اختیار رہنے کی وجہ سے بے مقدار بوجھ تھا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو بھی اپنی حق تلفی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بنو ہاشم نے چھ ماہ تک حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے بھی انکار کئے رکھا اور وہ اگرچہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو ختم کرنے کے لئے اکثر مشورے کرتے رہتے تھے مگر حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا اقرب رفیق ہونے کی وجہ سے اُمت میں جو بے پناہ رسوخ حاصل تھا اس کی وجہ سے وہ اُن کے خلاف کسی تحریک کی جسارت نہ کر سکے۔ پھر حضرت عمرؓ کی خلافت کی بھی تقریباً یہی صورت تھی۔ ابوبکرؓ کے بعد اُمت کے ہاں سب سے بڑھ کر رسوخ حضرت عمرؓ کا ہی تھا چنانچہ بنو ہاشم کے لئے ان کی خلافت کو برداشت کرنے کی بھی مجبوری تھی۔

دوسری طرف اُن کے پُرانے حریف بنو اُمیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہی حکومت کے بڑے بڑے مناصب پر قابض تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حکومت اور فرمانروائی کے لئے وہ لوگ دوسرے سارے ہی قبائل کے مقابلہ میں زیادہ اہل تھے اس لئے آپ نے اسلامی سلطنت کے نظم میں استحکام قائم رکھنے کے لئے ان کی صلاحیتوں کو اپنے لئے خاص کر لیا تھا اور انہیں اس باب میں ہمیشہ ترجیح دی تھی۔ پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی اپنے اپنے دورِ خلافت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کو ہی اختیار کئے رکھا۔

بنو ہاشم یہ سب کچھ دیکھتے تھے مگر اپنے بخت کی کوتاہی پر کفِ افسوس ملنے کے سوائے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ پھر اب جب حضرت عثمانؓ کے خلیفہ بن جانے سے اُمت کا یہ سب سے بڑا اعزاز بھی بنو اُمیہ کی طرف ہی منتقل ہو گیا تو بقول مورخین بنو ہاشم ازدیاد رنج و غضب سے بے قابو ہو گئے اور اب جب حضرت عثمانؓ کی بُردباری اور نرم دلی سے ابن سبا کو کھل کھیلنے کا موقع بھی میسر آ چکا تھا تو بنو ہاشم نے اس کے پروگرام کو حسبِ منشا پاکر اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ حضرت علیؓ کے بارے میں ایک روایت آئی ہے کہ اُنہوں نے ابن سبا کی سیاسی سرگرمیوں کو ناپسند کیا تھا مگر دوسرے بنو ہاشم نے اسے خوب پذیرائی بخشی۔ بنو ہاشم کی طرف سے حمایت حاصل ہونے سے ابن سبا کو پر پرواز میسر آ گئے تھے۔ لہٰذا اس کی سازش

حیرتناک تیزی کے ساتھ اپنی تکمیل کی طرف بڑھنے لگی۔

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت علیؓ خلافت کو بہرحال اپنا حق سمجھتے تھے مگر جب اس بار بھی مسلمانوں نے حضرت عثمانؓ پر اتفاق کر لیا تو حضرت علیؓ کو طبعاً کچھ زیادہ ہی رنج پہنچا اور وفورِ رنج سے اُن کے مُنہ سے ایک بات نکل گئی کہ :

میری بات توجہ سے سُن لو کیونکہ ممکن ہے اس اجتماع کے بعد تم یہ دیکھو کہ تلواریں بے نیام ہو گئی ہیں [۱]

علیؓ کی یہ تلخی بھی بجا ہی تھی کیونکہ وہ اس مرحلہ پر خلافت حاصل کرنے کے لئے سخت محنت بھی کرتے رہے تھے۔ خلیفہ کا انتخاب جن چھ بزرگوں کے سپرد تھا حضرت علیؓ اُن کو اپنے لئے ہموار کرنے کے لئے ہر طرح کی تحریک بھی کرتے رہے تھے۔ ایک مرحلہ پر وہ مجلس کے ایک رُکن حضرت سعدؓ بن وقاص سے تو یہاں تک بھی کہہ گئے کہ :

میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے بیٹوں (حسنؓ اور حسینؓ) اور اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی قرابت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ میرے خلاف عثمانؓ کی خلافت کے لئے عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے مددگار نہ بننا [۲]

مگر جب فیصلہ حضرت عثمانؓ کے حق میں ہو گیا تو حضرت علیؓ نے تلوار کا ذکر فرمایا۔ پھر جونہی عبداللہ بن سبا نے خلافت بربنائے قرابت کا مصرع طرح عرض کیا تو بنو ہاشم کو اب پوری غزل کہنا ہی تھی چنانچہ وہ شعر پر شعر کہنے لگے۔

---

[۱] طبری جلد ۳ باب ۱۴ [۲] طبری جلد ۳ باب ۱۴ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو یہ حق حضرت علیؓ نے خود ہی دیا تھا کہ وہ فریقین (علیؓ اور عثمانؓ) میں سے
(باقی اگلے صفحہ پر)

خیالات میں چنگاریاں اُڑنے لگیں، دل کی باتیں زبانوں پر اُچھل آئیں، مجلسوں اور محفلوں میں بحثیں چل نکلیں اور پھر نہایت پُراسرار طریقہ سے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حضرت عثمانؓ کی حکومت کے خلاف سازشوں کے جال بچھا دیئے گئے۔

مدینہ سے باہر کوفہ، بصرہ اور مصر سازشوں کے مراکز تھے جہاں عبداللہ بن سبا کی زیرِ ہدایات بیک وقت حضرت عثمانؓ کی حکومت کے خلاف تدابیر سوچی جاتی تھیں۔ ان لوگوں کا آپس میں ایک دوسرے سے باقاعدہ رابطہ قائم تھا۔ یہ مدینہ منورہ میں بھی اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے آتے تھے اور مدینہ میں اپنے ساتھیوں کو ہر ہر بات سے باخبر رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ان لوگوں کا مرجع حضرت علیؓ کا سوتیلا بیٹا محمد بن ابی بکر تھا۔ اور یہ لوگ جب مدینہ میں آتے تو اسی محمد بن ابی بکر اور اس کے ہمراز ساتھیوں عمار بن یاسر اور محمد بن ابی حذیفہ کے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔

اہلِ سازش نے ایک خاص طریق سے حضرت عثمانؓ کے خلاف شکایات تصنیف کیں اور پھر انہیں پوری سلطنت میں اپنے خاص ذرائع سے پھیلایا۔ اور پھر جب حضرت عثمانؓ کے خلاف ان شکایات کا طوفان کھڑا کر دیا گیا تو حضرت عثمانؓ نے ان شکایات کی حقیقت معلوم کرنے اور بصورتِ صحت

جسے لائق خلافت پائیں نامزد کر دیں۔ مگر حضرت علیؓ کو شبہ تھا کہ ابن عوف ان کی حمایت کے بجائے مسلمانوں کے رجحان کی پیروی کریں گے۔ سعدؓ بھی حضرت عمرؓ کی مقرر کردہ مجلسِ انتخاب خلافت کے رکن تھے مگر چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں تھے اور رشتہ میں حضرت علیؓ کے زیادہ قریب تھے اس لئے آپ نے اپنے دل کی بات کہنے کے لئے ان کا انتخاب کیا۔

اُن کے ازالہ کی تدابیر کی دریافت کے لئے حج کے موقع پر ارباب حل وعقد کا ایک اجتماع طلب کیا جس میں ملک بھر سے اہل الرائے بزرگوں اصحاب فکر ونظر، صوبائی گورنروں، بڑے بڑے ملکی حکام اور اصحاب رسولؐ کو مدعو کیا۔

یہ اجتماع اپنے وقت پر منعقد ہوا جس میں مملکت اسلامی کے تمام ہی بڑے بڑے حکام اور اصحاب رسولؐ کی موجودگی میں شکایات کی تحقیق شروع ہوئی مگر ملک بھر سے کسی طرف سے بھی کوئی ایسی قابل ذکر شکایت اس اجتماع میں پیش نہ ہوئی جس کو اس غیر معمولی صورتحال کا سبب سمجھا جا سکے۔

صورتِ حال کی خرابی کا ذکر تو سب کرتے تھے مگر اس خرابی کا سبب کوئی بھی نہ بتا سکا۔ شکایات پیش کرنے کی عام اجازت تھی مگر کوئی شخص شکایت لے کر سامنے نہ آیا۔

مجلس کے سارے ہی شرکاء حیران تھے کہ ملک میں ابتری عام ہے مگر اس ابتری کا کوئی سبب سامنے نہیں آ رہا۔ بالآخر اس اجتماع نے یہ فیصلہ کیا کہ صورتِ حال کو سمجھنے کے لئے سرکاری سطح پر فہیم افراد پر مشتمل تحقیقاتی وفود ملک میں ہر طرف بھیجے جائیں اور وہ عوام وخواص سے مل کر معلوم کریں کہ عثمانؓ کے خلاف شور مچانے والوں کو عثمانؓ سے شکایت کیا ہے۔ یہ وفود مملکت میں ہر طرف ہی پھیلا دیئے گئے مگر شکایات چونکہ واقعاتی نہیں تھیں بلکہ اہل شر اپنی سیاسی ضرورتوں سے ہی شور مچا رہے تھے اس لئے پوری مملکت میں کوئی ایسی شکایت دریافت نہ ہو سکی جسے عثمانؓ دشمنی پر وپیگنڈا کے لئے وجہ جواز سمجھا جا سکے۔

عوام کو اپنے حکام سے کوئی شکایت نہیں تھی اور سازشی ادساں کے آلۂ کار سامنے نہیں آتے تھے کیونکہ ان کے پاس سامنے آنے کے لئے

کوئی بنیاد موجود نہیں تھی۔ چنانچہ ہر طرف سے آنے والی رپورٹیں بالکل تسلی بخش ہی تھیں۔

مگر چونکہ مقامی طور پر بھی بعض بزرگ حضرت عثمانؓ سے تعاون نہیں کر رہے تھے۔ اگرچہ اس عدم تعاون کا بھی کوئی ظاہری سبب موجود نہیں تھا۔ اس کے باوجود شہر میں صورتِ حال کھنچی کھنچی تھی۔ واقعاتی اعتبار سے موصول ہونے والی اطلاعات تسلی بخش تھیں مگر حالات میں تسلی والی کوئی بات موجود نہیں تھی۔

حج کے موقع پر منعقدہ مجلسِ مشاورت میں شام کے والی حضرت معاویہؓ بھی شریک تھے۔ وہ حضرت عثمانؓ کے قریبی عزیز تھے اور چونکہ انہوں نے مدینہ منورہ میں اپنے قیام کے دنوں اپنے کانوں سے بعض لوگوں کی زبان سے امت کے بعض بلند پایہ اور با اثر بزرگوں کی خلافت کے اذکار سنے تھے اور پھر یہ بات بھی اب عام ہو چکی تھی کہ بعض لوگ خلافت کی تبدیلی کی کوششوں میں مصروف ہیں بلکہ بقول علامہ طبری:

یہ صورتِ حال ۳۳ھ سے ہی بہت سے لوگوں کے نوٹس میں تھی کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کو ختم کرنے اور اپنے کسی محبوب کو اُن کی جگہ خلیفہ بنانے کی غرض سے اندرونِ خانہ مصر، بصرہ اور کوفہ میں سازش کے مراکز قائم ہو چکے ہیں۔

اہلِ مصر حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے، اہلِ بصرہ حضرت طلحہؓ کے طرفدار تھے اور کوفہ والے حضرت زبیرؓ کو آگے لانا چاہتے تھے۔ اور اگرچہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے خلاف بغاوت پر تو سب کا ہی اتفاق تھا۔ مگر یہ سب کے سب اندر ہی اندر اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے ممدوح کے لئے ہی مصروفِ سعی تھے [1]

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۹

علاوہ ازیں بقول مورخ طبری ہی :

۳۴ھ میں ہی یہ مصری، بصری اور کوفی سازشی درپردہ اپنے اپنے ممدوح سے ملاقات کر کے اُن پر اپنے عزائم کا اظہار کر چکے تھے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے ممدوح کو یقین دلا چکا تھا کہ اگر دوسرے سازشیوں نے (جو دوسروں کے طرفدار ہیں) آپ کی بیعت نہ کی تو ہم اُن کے خلاف خروج کریں گے [1]

اور اب جب حضرت معاویہؓ اپنی آنکھوں بھی ایک دوسرے کے حامیوں کو سرگرم کار دیکھ چکے تھے اور انہوں نے اپنے کانوں اُن کے عزائم سے اطلاع پالی تھی تو انہیں مستقبل کے بارے میں بجا طور پر سخت تشویش تھی۔

مورخین کے بقول حضرت معاویہؓ کو بعض دوسرے ذرائع سے بھی یہ اطلاعات مل چکی تھیں کہ مستقبل میں جن لوگوں کی خلافت کا ذکر چل رہا ہے وہ خود بھی یہ ذکر چلانے والوں سے ہموار ہیں اور شاید وہ ان کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ حضرت معاویہؓ نے مستقبل کے خطرات کو بھانپ کر حضرت عثمانؓ کو متوقع خطرناکیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اُن کے سامنے اپنی خدمات پیش کیں اور عرض کیا کہ شامی فوج کو آنے والی بدنظمی اور خلفشار پر قابو پانے اور خود خلیفۃ المسلمین کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے کے لئے دار الخلافہ میں رہنے کی اجازت دیں۔ مگر حضرت عثمانؓ نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ فوج کا بوجھ اہل مدینہ پر پڑے گا اور وہ اہل مدینہ کو کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے جب اپنی پیشکش کو قبول کرنے کے لئے اصرار کیا تو آپ نے یہ فرما کر بات ختم کردی کہ "تم مجھے اللہ کے سپرد کردو"

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۹

پھر جب حضرت معاویہؓ واپس جانے لگے تو آپ نے ایک مجلس سے خطاب کیا۔ جس میں حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ تینوں بزرگ بھی موجود تھے۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا:

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اور روئے زمین کے بہترین لوگ ہیں۔ آپ اس اُمت کے ارباب حل وعقد ہیں۔ یقیناً آپ کے ہوتے کوئی بھی دوسرا شخص یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ اس اُمت کا حکمران بن سکتا ہے۔ مگر آپ کو اپنے بارے میں لوگوں کو اُمید نہیں دلانی چاہیئے۔

عثمانؓ کو آپ نے بلا جبر و اکراہ منتخب کیا تھا۔ وہ اب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور وہ اپنے رب کو بہت ہی عزیز ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ اب انہیں زیادہ دیر تک یہاں نہیں رکھیں گے بلکہ جلد ہی اپنے پاس بُلا لیں گے۔ اس لئے آپ کو ان کی زندگی کی آخری ساعت کا انتظار کرنا چاہیئے اور یہ ساعت کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔

یہاں میں نے خلافت کے بارے میں جو افواہیں سُنی ہیں اگر لوگ آپ کی وجہ سے انہی راہوں پر سوچنے لگے تو اس کا نتیجہ ادبار اور زوال ہی ہو گا۔[1]

حضرت معاویہؓ کی اس تقریر کا پس منظر کچھ ایسا پُراسرار نہیں ہے جسے سمجھنے کے لئے عقل کی کوئی زیادہ مقدار مطلوب ہو۔ بڑی صاف بات ہے جسے کسی کا نام لئے بغیر کہہ دیا گیا ہے۔

حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کی اس بات کا بہت بُرا منایا، اور ناراضگی کا اظہار کیا مگر بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ صورت حال کی

---

[1] طبری جلد ۳ واقعات ۳۵ھ

تشویشناک بالکل واضح تھی مگر اس پورے ماحول میں بات پھر کر حضرت علیؓ تک پہنچ کر ہی ختم ہوتی تھی۔ اور حضرت عثمانؓ کے قتل میں یا قتل کی سازش میں شریک ہونے کا شبہ دوسرے سب ہی لوگوں کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کے حق میں زیادہ طاقتور قرائن پر مشتمل تھا کیونکہ بقول مورخ طبری:

حضرت عثمانؓ کی شہادت سے قبل جب باغیوں سے دریافت کیا گیا کہ مدینہ میں تمہارا ساتھی کون ہے تو انہوں نے محمد بن ابی بکر، محمد بن ابی حذیفہ اور عمار بن یاسر کا نام لیا۔ اور ساتھ ہی یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ان تینوں کی خط و کتابت بھی باغیوں کے ساتھ جاری ہے [1]

یہ تینوں اشخاص جو مدینہ میں باغیوں کے مرجع، مشیر اور صلاح کار تھے، ان کا تعلق حضرت علیؓ کے گروہ سے ہی تھا۔ ان میں ایک تو ان کا سوتیلا بیٹا ہی تھا جو علیؓ کے گھر پلا، جو نہ صرف حضرت علیؓ کا ربیب ہی تھا بلکہ ان کا صلاح کار بھی تھا اور باقی دونوں بھی نہ صرف حضرت علیؓ کے حامی ہی تھے بلکہ اپنی بعض غلطیوں کی پاداش میں عثمانؓ کی طرف سے سزا دیئے جانے پر ان کے خلاف اپنے دل میں بغض بھی رکھتے تھے۔ پھر بات یہاں پہنچ کر ہی نہیں رک جاتی بلکہ مزید آگے چلتی ہے۔

حضرت عثمانؓ نے جب باغیوں کو بر سر مجلس مطمئن کر دیا اور ان کی حسب خواہش مصر کا حاکم بھی بدل دیا تو اپنے عذرات و اعتراضات کے ازالہ کے بعد اب ان کے لئے عثمانؓ سے بغاوت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی تھی اور وہ بظاہر واپس چلے گئے مگر چونکہ ان کا مقصد اپنی شکایات کا ازالہ نہیں بلکہ فتنہ کاری تھا اس لئے جلدی واپس لوٹ آئے اور حضرت

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۹

عثمانؓ کے نام سے ایک جعلی خط بنا لائے جس میں عثمانؓ کی طرف سے عامل مصر کو لکھا گیا تھا کہ جو لوگ تمہارے پاس تمہاری معزولی پر مشتمل میرا خط لے کر آئیں اُن کو قتل کر دو۔

باغیوں نے یہ خط لا کر حضرت علیؓ کو دیا اور کہا کہ چلو عثمانؓ سے چل کر بات کرو، اُس کے اس فعل کی وجہ سے اب اس کا خون حلال ہو گیا ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنی کسی شخصی مصلحت سے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو بہت سے باغیوں نے بیک زبان حضرت علیؓ سے کہا کہ:

اگر آپ نے ہمارا ساتھ نہیں دینا تھا تو پھر آپ ہمیں خطوط کیوں لکھتے تھے؟

حضرت علیؓ نے جواب دیا میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اس پر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ کیا تم اس شخص کے لئے ہی جنگ کر رہے ہو؟ [1]

حضرت علیؓ نے بات کو سمیٹتے ہوئے باغیوں کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے ہاں جانے کی حامی بھر لی۔

پھر یہ سب لوگ حضرت عثمانؓ کے ہاں پہنچے تو حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ سے خط کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت عثمانؓ نے انکار کیا کہ میں نے یہ خط نہیں لکھا نہ لکھوایا ہے اور نہ لکھنے کو کہا ہے۔ علیؓ نے کہا خط پر مہر تمہاری ہے، خط لے جانے والا غلام تمہارا ہے، غلام جس اونٹ پر سوار ہو کر جا رہا تھا وہ اونٹ بھی تمہارا ہے۔ پھر یہ خط تمہارا کیوں نہیں ہو سکتا!

حضرت عثمانؓ نے کہا علیؓ! تم جانتے ہو کہ یہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے حضرت علیؓ کہنے لگے اگر یہ کام تمہارے خلاف کسی کی سازش کا حصہ ہے تو اس بات میں تمہارا شبہ کس پر ہے؟

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۹

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ میرے کاتب نے غداری کی ہے اور سازش کے سلسلہ میں اے علیؓ! میرا شبہ تم پر ہے [1]

ظاہر ہے کہ حضرت عثمانؓ کو اپنے خلاف کی جانے والی کارروائیوں کے بارے میں غالب یقین یہی تھا کہ یہ ساری کارروائی علیؓ ہی کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ اُنہی کی ہدایات کے مطابق ہو رہا ہے۔

یہی باعث ہے کہ عثمانؓ جب اپنے مکان میں محصور ہو گئے اور ان پر حملہ یقینی ہو گیا تو کچھ اصحاب نے اپنے بیٹوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لئے، ان کے دروازہ پر پہرہ دینے کے لئے مامور کیا۔ ان میں حضرت علیؓ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ بھی تھے۔ حالات جب زیادہ نازک صورت اختیار کر گئے تو آپ نے حضرت حسنؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

عزیزم! تمہارے والد (علیؓ) اس وقت بہت بڑے کام میں مصروف ہیں اس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ [2]

ایک مزید روایت ہے:

بلوائیوں، باغیوں کا قاصد حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کے پاس رات کے وقت آیا۔ محمد بن ابی حذیفہ نے (مصر سے) حضرت علیؓ کے نام ایک خط بھیجا تھا۔ یہ خط اُنہی بلوائیوں نے حضرت علیؓ کو لا کر دیا جو مصر سے حضرت عثمانؓ کے خلاف بلوہ کرنے کی غرض سے آئے تھے اس خط کا مضمون ظاہر نہیں کیا گیا [3]

مزید ایک روایت جو اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے جب عثمانؓ ابھی محصور نہیں تھے مگر باغی مدینہ میں مصروفِ شورش تھے۔ حضرت عثمانؓ ایک

---

[1] ازالۃ الخفا شاہ ولی اللہؒ مقصد دوم مطبوعہ سعید اینڈ سنز کراچی صفحہ ۲۷۴

[2] طبری جلد ۳ باب ۲۰ [3] طبری جلد ۳ باب ۲۰۔

روز خود چل کر حضرت علیؓ کے ہاں گئے اور انہیں اپنی قرابت اور رشتہ داری کے واسطے سے کہا کہ باغی تمہارا کہنا مانتے ہیں تم ان کو واپس جانے کے لئے کہو۔ علیؓ نے کہا میں انہیں کس بنیاد پر واپس کروں! عثمانؓ نے کہا کہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں آئندہ صرف تمہارے کہنے پر ہی عمل کیا کروں گا اور مروانؒ، سعیدؓ بن العاص، معاویہؓ اور ابن عامر کی بات پر کان نہیں رکھوں گا (جن کو تم پسند نہیں کرتے) اس کے بعد علیؓ نے جاکر باغیوں کو واپس کر دیا۔[1]

محاصرہ کے دنوں میں حضرت عثمانؓ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ باغیوں نے ان پر سخت سنگ باری کی جس سے عثمانؓ بے ہوش ہو کر گر گئے، انہیں اٹھا کر ان کے گھر لایا گیا۔ علیؓ بھی مزاج پرسی کے لئے وہاں پہنچے وہاں بنو امیہ میں سے جو لوگ بیٹھے تھے وہ حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے۔

علیؓ! تم نے ہم کو برباد کر دیا ہے۔ امیر المومنین کے ساتھ یہ بدسلوکی تمہارے کہنے سے ہی ہوئی ہے۔ مگر آگاہ رہو کہ اگر تم اپنے مقصد (عثمانؓ کو راہ سے ہٹا کر، اس کی جگہ خلیفہ بننے) میں کامیاب بھی ہو گئے تو خود تمہارا زمانہ بھی تم پر بہت تلخ گزرے گا۔[2]

ایک روایت مزید آئی ہے کہ:

قتل سے چند لمحے پہلے حضرت عثمانؓ نے کسی نہ کسی طرح حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے رابطہ قائم کیا اور انہیں ایک خاص پیغام دے کر حضرت علیؓ کے پاس بھیجا۔ مورخ طبری لکھتے ہیں:

سعدؓ بن ابی وقاص (جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے) حضرت علیؓ کے پاس پہنچے

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۹ [2] طبری جلد ۳ باب ۱۹

علیؓ اس وقت مزارِ رسولؐ اور مسجد نبویؐ کے درمیان بیٹھے تھے۔ حضرت سعدؓ نے آ کر کہا ابوالحسن! میری جان آپ پر قربان، میں ایک بڑے ہی نیک کام کے لئے حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ بس جلد چلئے (حالات سخت نازک مرحلہ پر ہیں) اپنے چچا زاد بھائی (عثمانؓ) سے صلہ رحمی کا سلوک کیجئے اور ان کی جان بچانے کی سعی فرمایئے۔ اس کے بعد پھر آپ جو کچھ بھی کہیں گے وہی ہو گا۔

عثمانؓ نے تمہارے لئے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ اللہ اس کی توبہ قبول کرے بخدا، میں نے ہمیشہ ان کی حمایت کی ہے یہاں تک کہ اب مجھے شرم آنے لگی ہے، یہ میری بات مانتے ہی نہیں بلکہ ہمیشہ مروانؓ، معاویہؓ، عبداللہؓ بن عامر اور سعیدؓ بن العاص کی بات ہی مانتے ہیں۔

دونوں ان باتوں میں ہی مصروف تھے کہ محمد بن ابی بکرؓ آیا اور علیؓ کو الگ لے جا کر پوشیدہ طور پر ان سے کوئی بات کہی اور (تیزی سے) واپس چلا گیا۔ (سعدؓ کہتے ہیں کہ اس مرحلہ پر) علیؓ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور کہنے لگے ان کی توبہ کتنی اچھی ہے (تاہم وہ میرے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوئے) پھر میں ان سے جدا ہو کر اپنے گھر آ گیا اور یہ خبر سنی کہ عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے [1]

ان روایات سے جو کچھ ثابت ہے وہ بالکل واضح ہے اور اس میں کوئی بھی ابہام موجود نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کو ان کے مصری حامیوں نے ۳۵ھ سے ہی عثمانؓ کو ہٹا کر خلیفہ بنانے کا یقین دلا رکھا تھا اور ان روایات سے بھی ظاہر ہے کہ محمد بن ابی بکرؓ عثمانؓ کے خلاف حضرت علیؓ کی طرف سے ہی مامور تھا ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۲۰ واقعات ۳۵ھ

کر علیؓ اُسے اس مہم کی سربراہی سے روک نہ دیتے جبکہ وہ اُنہی کے پاس رہتا تھا، اُنہی سے وابستہ تھا اور اس مہم کے ہر مرحلہ پر اُن کے پاس آتا جاتا تھا اور اُنہیں ہر قسم کی خبریں مہیا کرتا تھا۔

عثمانؓ کے خلاف علیؓ کی کاروائیوں سے بنو اُمیہ پوری طرح آگاہ تھے اور انہوں نے حضرت علیؓ کو یہ بات برملا بھی کہہ دی تھی کہ یہ آگ آپ کی ہی لگائی ہوئی ہے۔ خود حضرت عثمانؓ کا رجحان بھی یہی تھا کہ علیؓ ان کے خلاف سازش کی رہنمائی کر رہے ہیں اور اس بات کا اظہار انہوں نے خود حضرت علیؓ سے برسرِ مجلس کیا تھا۔

قتل سے قبل جب حالات زیادہ نازک ہو گئے تو حضرت عثمانؓ نے حضرت حسنؓ کو برملا کہہ دیا تھا کہ آپ تشریف لے جائیں آپ کے والد اس وقت بڑے ضروری کام (یعنی میرے قتل کی تدبیروں کو بروئے کار لانے) میں مصروف ہیں (آپ میری حفاظت کے بجائے ان کی امداد فرمائیے)۔

حضرت علیؓ طبعاً چاہتے ہوں گے کہ ان کی سرگرمیاں عام نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ مگر حالات کی شدت نے اُن کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی جبکہ ایک مرحلہ پہ خود باغیوں نے ہی برسرِ مجلس حضرت علیؓ سے کہہ دیا کہ اگر آپ ہماری کاروائیوں میں ہمارا برابر کا ساتھ نہیں دیتے تو آپ ہمیں خطوط کیوں لکھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے جب ایک مرحلہ پہ حضرت علیؓ کو یقین دلایا کہ اب میں آپ کی ہی بات پر عمل کیا کروں گا، آپ کے ناپسندیدہ لوگوں کی بات پر کان نہیں رکھوں گا۔ تو حضرت علیؓ نے باغیوں کو واپس کر دیا اور وہ حضرت علیؓ کے کہنے پر واپس چلے گئے۔

عثمانؓ کی زندگی کے آخری مرحلہ پہ جب اُن کا قتل کچھ لمحوں کی ہی بات تھی علیؓ سب سے الگ مسجد نبویؐ اور مزارِ رسولؐ کے درمیان اکیلے بیٹھے فساد اور اس کے انجام کے بارے میں خبریں حاصل کر رہے تھے جبکہ ان کا سوتیلا بیٹا

محمد بن ابی بکرؓ انہیں قتلِ عثمانؓ کی خبر بھی وہیں دے کر گیا تھا اور اُسے علم تھا کہ علیؓ وہاں خبروں کے منتظر ہیں اور اس وقت وہ اپنی کارگزاری ہی بتانے آیا تھا علیؓ نے قتلِ عثمانؓ کی خبر سنی مگر سعدؓ جو اس وقت حضرت علیؓ کے پاس عثمانؓ کے پیغامبر کی حیثیت سے بیٹھے ان کی منت سماجت کر رہے تھے۔ حضرت علیؓ نے اس خبر کو حضرت سعدؓ سے پوشیدہ رکھا اور راوی کا خیال ہے کہ یہ احتیاط اس لئے تھی کہ سعدؓ انہیں اس معاملہ میں ملوث نہ سمجھیں۔ پھر عثمانؓ جب قتل ہو چکے تو قتل کے بعد جو واقعات رونما ہوئے علیؓ وہاں موجود تھے۔ سب کچھ ان کے سامنے ہوا جو کچھ ہوا ان کی اطلاع میں تھا مگر انہوں نے ان ناکردنیوں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی کوئی مزاحمت نہیں کی۔

عثمانؓ قتل ہوئے ان کا گھر لوٹ لیا گیا، پھر گھر کو آگ لگا دی گئی، گھر کی عورتوں کی توہین کی گئی اور ایک روایت کے مطابق باغیوں کے سردار غافقی نے حضرت نائلہ کی چھاتیوں پر بھی ہاتھ ڈالا اور یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اوہو یہ تو بہت بوڑھی ہو چکی ہے[1]

گھر کی عورتوں کے سروں سے اُن کی چادریں کھینچ لی گئیں، ان کے کانوں اور ہاتھوں سے زیور گھسیٹ لئے گئے۔ حضرت عثمانؓ کو بچاتے بچاتے حضرت نائلہ کی اُنگلیاں کٹ گئیں۔

حضرت عثمانؓ کی لاش کو گھسیٹ کر باہر ڈال دیا گیا اور وہ تین روز تک وہیں بے گور و کفن پڑی رہی۔

علیؓ خلیفہ بن چکے تھے مگر ان کے دفن کی اجازت نہ مل سکی۔ جب اجازت ملی تو ان کے جنازہ پر سنگباری کی گئی۔ باغیوں نے آگے بڑھ کر جنازہ کو گرا دیا۔ پھر ان کی نعش پر چھلانگ پھلانگ کر ان کی پسلیاں توڑ دی گئیں اور بالآخر انہیں یہودیوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ حد یہ ہے کہ

---

[1] حضرت عثمانؓ شہید از محمد بن یحییٰ بن ابی بکرؓ مالکی شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی ص ۱۵۴

حضرت علیؓ اپنے بیشرو خلیفہ کے جنازہ تک میں شریک نہ ہوئے۔ ان کے ساتھ شہید ہونے والے خدام کو گھسیٹ کر گڑھوں میں ڈال دیا گیا، جن کو کتے کھا گئے۔

یہ سب کچھ حضرت علیؓ کے سامنے ہوا، دارالخلافہ میں ہوا، حرم مدینہ میں ہوا۔ مگر انہوں نے ان میں سے کسی ظالمانہ کارروائی کی کوئی مزاحمت نہیں کی۔

پھر حضرت علیؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے بوجوہ قاتلین عثمان سے قصاص لینے سے انکار کردیا۔ مگر جو لوگ قصاص لینے کے لیے باہر نکلے اُن کے خلاف جنگ کی۔ قاتلوں کو اپنے لشکروں میں شامل کرکے انہیں تحفظ عطا فرمایا۔ ایسے میں بنو امیہ تو رہے بجائے خود اگر دوسرے لوگ بھی حضرت علیؓ کو قتل عثمان میں ملوث سمجھتے تو ایسے قرائن موجود تھے۔

مگر اس میں رکاوٹ یہ ہے کہ حضرت علیؓ اس قتل یا قتل کی سازش میں شریک ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ اور یہی ایک قرینہ ہے جو اُن کے قتل عثمانؓ میں ملوث ہونے میں رکاوٹ ہے ورنہ واقعات کا رخ دوسرا ہی ہے۔

ایک آخری پیشکش

عرب کے ادوارِ جاہلیت میں بنو ہاشم اور بنو امیہ کی عداوت کی تفصیل ہم اسی باب کے اندر "تہہ منظر" کے زیرِ عنوان بیان کر آئے ہیں کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ کا تصادم خواہ وہ کسی عنوان سے اور کسی کی بھی سربراہی میں ہوتا ایک ناگزیر امر ہی تھا۔ اور اس تصادم میں اگر تاخیر کی کوئی وجہ تھی تو وہ صرف یہی کہ بنو ہاشم با اختیار نہیں تھے۔ اور اب جب اختیار ان کی طرف منتقل ہو گیا تھا تو اب اس تصادم کے برپا ہونے میں کوئی رکاوٹ

نہیں رہ گئی تھی سوائے اس کے کہ بنو اُمیہ کسی تصادم پر راضی نہیں تھے، اور وہ اسلام قبول کر چکنے کے بعد جاہلی دور کی روایات اور باہمی عداوت کو فراموش کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مگر بدقسمتی سے بنی ہاشم کا مزاج اس ذہن سے ہموار نہیں تھا۔

اب جب حالات کا قافلہ تصادم کی حدود میں داخل ہونے ہی والا تھا تو حضرت معاویہؓ نے، جو بنو اُمیہ کے فکر و نظر کے ترجمان تھے، حضرت علیؓ کی طرف جو بنو ہاشم کے مزاج کی علامت تھے صلح سے رہنے کی غرض سے ایک وفد بھیجا۔ اہلِ وفد نے حضرت علیؓ کے ساتھ صلح صفائی سے رہنے کے لئے دیر تک باتیں کیں۔ مگر حضرت علیؓ اپنی ضد پر قائم رہے بالآخر اہلِ وفد نے حضرت علیؓ کے تابع ہو کر رہنے کے عوض اُن سے صرف اتنا سا چاہا کہ وہ قتلِ عثمانؓ کا قصاص خواہ جب چاہیں لیں مگر ہمیں یہ یقین ہو جانا چاہیئے کہ حضرت علیؓ انہیں مظلوم شہید مانتے ہیں چنانچہ اہلِ وفد نے حضرت سے گزارش کی۔

کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ عثمانؓ مظلوم شہید کئے گئے ہیں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ وہ مظلوم شہید کئے گئے اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ وہ ظالم مارے گئے۔ اس پر حضرت معاویہؓ کے قاصد یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ جو شخص عثمانؓ کی مظلومیت کا ہی قائل نہیں، ہم اس کے ساتھ کیونکر جمع ہو سکتے ہیں [۱]

ظاہر ہے کہ اس مرحلہ پر اگر حضرت علیؓ اپنے پیشرو خلیفہ کو مظلوم مان لیتے تو بات یہیں ختم ہو جاتی اور بنو اُمیہ مسلمانوں کو قتل دختوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس پر بھی قناعت کر لیتے کہ قصاص کا لینا حضرت

---

[۱] طبری جلد ۳ باب ۳

علیؓ کی ذمہ داری ہے۔ اس طرح وہ خوفناک تصادم رُک جاتا جس کے نتیجہ میں نوے ہزار مسلمانوں کی نعشیں صفین کے میدان میں بچھا دی گئیں۔

بنو اُمیہ تصادم سے بچنے کے لئے جس طرح بے چین تھے۔ قیاس یہ ہے کہ حضرت علیؓ اپنے اندر ذرا سی بھی نرمی پیدا کر لیتے تو وہ حضرت علیؓ کے مُنہ سے حضرت عثمانؓ کے حق میں ایک کلمۂ خیر پر ہی اپنا دعوٰے ترک کر دیتے۔ مگر حضرت علیؓ کے حربی اقدام نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنے دفاع کا سامان کریں اور قصاص کے لئے اپنا دعوٰی قائم رکھیں۔ افسوس ہے کہ ان حالات میں امّت کا قافلہ ایک ایسے موڑ مڑ گیا جہاں حدِ نگاہ تک ہلاکتیں ہی ہلاکتیں کھڑی نظر آتی تھیں اور یہ ہلاکتیں پھر ہمیشہ کے لئے امّت کا مقدر بن گئیں۔

فصل پنجم

کیا علیؓ سے لڑائی امام عادل سے بغاوت تھی؟

جن اصحابِؓ رسولؐ نے حضرت علیؓ سے اختلاف کیا وہ بالکل حضرت علیؓ کی طرح ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور بالکل حضرت علیؓ کی طرح ہی الصحابۃ کلھم عدول کے حکم میں تھے وہ حضرت علیؓ کی طرح ہی مجتہد بھی تھے۔ اُنہیں محض خلافت اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے فرق کا بھی پوری طرح عرفان حاصل تھا۔

پس اگر اُنہوں نے حضرت علیؓ سے اختلاف کیا یا متصادم ہوئے تو انہیں خوب طرح سے اس بات کا علم حاصل تھا کہ حضرت علیؓ سے اختلاف اور تصادم کی پوری گنجائش موجود ہے کیونکہ اُن کے نزدیک حضرت علیؓ وہ خلیفہ نہیں تھے جس کی خلافت اسلام کے نظامی رُخ سے عبارت ہو اور جس سے اختلاف نظامِ اسلام کے خلاف بغاوت ہو۔

حضرت علیؓ کی خلافت کا انعقاد جن حالات میں ہوا وہ ان بزرگوں کی چشم دید کہانی تھی جس کے نتیجہ میں جنگِ جمل کی شکل میں اُن کا تصادم وقوع میں آیا۔ وہ حضرت علیؓ کی خلافت کے پورے حدود اربعہ سے بھی آگاہ تھے اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں انہیں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا بھی پورا پورا شعور حاصل تھا۔ اس عنوان سے خلافت و ملوکیت کے نامور مصنف سے بڑھ کر کس کی گواہی معتبر ہو سکتی ہے۔ ہم یہ کہانی اپنے قارئین کو اُنہی کی زبانِ قلم سے سناتے ہیں۔ ارشاد ہے:

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جن حالات میں حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ باہر سے آئے ہوئے دو ہزار شورشی دار الخلافہ پر مسلط تھے اور خلیفۂ وقت کو قتل تک کر گزرے تھے۔

خود دار الخلافہ میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد ان کی ہم خیال موجود تھی۔ نئے خلیفہ کے انتخاب میں یقیناً وہ لوگ بھی شریک ہوئے اور ایسی روایات بھی بلا شبہ موجود ہیں کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا تو ان لوگوں نے بعض حضرات کو زبردستی بھی بیعت پر مجبور کیا[1]

مولانا نے بڑی محتاط زبان میں بچ بچا کر اظہارِ حقیقت کی مجبوری قبول کی ہے۔ اور مہیب صورتِ حال اور دہشت اثر کارروائیوں کو لپیٹ سمیٹ کر آگے نکل گئے ہیں۔

تاہم ان کے اس اجمال میں بھی تفصیلی کہانی موجود ہے، اور آنکھ بچا کر بات کرنا اُن قباحتوں کا پتہ دیتا ہے جو وہاں گزریں۔ مدینہ کی گلیوں میں اُن دنوں بھتنوں کے ناچ نے خدا کے خوف سے جس طرح بے تعلقی اختیار کر رکھی تھی، مولانا کے نقوشِ قلم کی ہر جنبش سے اس کا اظہار ہوتا ہے ؎

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

تاہم مولانا کا یہ اعتراف غنیمت ہے کہ حضرت علیؓ کا انتخاب فی الواقع ہی مدینہ منورہ کے غیر یقینی حالات میں اُمت کے اشرار اور شورشی

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۳۲۵

لوگوں کے زیرِ اہتمام عمل میں آیا تھا بلکہ بعض پر تلوار کا بوجھ ڈال کر اُن سے بیعت حاصل کی گئی۔

بات ڈیڑھ ہزار برس بعد آنے والے کسی ضرورت مند کی نہیں بلکہ اُن اصحابِ رسولؐ کی ہے جو ٹھیک حضرت علیؓ کی طرح ہی شرفِ صحابیت سے مشرف تھے اور اُنہی کی طرح اجتہاد کا حق رکھتے تھے۔

جب ایسے لوگ حضرت علیؓ کے خلاف خروج کرتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی خلافت کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک حضرت علیؓ کی خلافت محض خلافت تھی، جس کی حیثیت سوائے ایک مسلمان بادشاہ کے اور کچھ نہیں تھی۔ وہ لوگ حضرت علیؓ کو خلیفۂ رسولؐ نہیں بلکہ ایک بادشاہ مانتے تھے جس کی اطاعت بھی کی جاسکتی ہے اور اُسے مسترد بھی کیا جاسکتا ہے۔

ان کا مؤقف بڑا واضح تھا کہ علیؓ اگر خلیفۂ رسول ہیں تو حدود اللہ کو نافذ کریں۔ اور اگر حدود اللہ اُن کے ذاتی مصالح کی وجہ سے ترک یا مؤخر کی جائیں گی تو یہ امر حاکم کو خلافۃ نبوۃ کے حلقے سے نکال دے گا اور ایسے حاکم کی مخالفت نہ خلافِ شرع ہے نہ معصیت۔ حضرت علیؓ کے خلاف خروج کرنے والے اصحابِ رسولؐ کوئی عام درجہ کے لوگ نہیں تھے بلکہ اُن میں سے ہر کوئی ہی اس مقام پر فائز تھا کہ حضرت علیؓ کے لئے اُن کے مقابلہ میں عظمت کی بنیاد اُن کی زندگی کا صرف یہی ایک پہلو تھا کہ علیؓ دامادِ رسولؐ ہیں مگر فاطمہؓ کی وفات کے بعد عظمت کا یہ پہلو بھی اب اپنی مؤثریت کم کر چکا تھا۔

حضرت علیؓ سے اصحابِ رسولؐ کا پہلا تصادم بصرہ میں جنگِ جمل کی صورت میں پیش آیا ہے جبکہ حضرت علیؓ ان لوگوں کے قلع قمع کے لئے اُن کے تعاقب میں بصرہ پہنچے تھے۔ اس جنگ میں مخالفِ علیؓ گروہ کے دو عظیم سرگردہ حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ اور حضرت زبیرؓ بن العوام تھے۔ جبکہ اُم المومنین حضرت

عائشہ صدیقہ طاہرہ و مطہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی رائے بھی اُن کے ساتھ ہموار تھی۔

حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ وہ بزرگ ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلماً شہید ہونے والے بزرگوں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ساتھ شمار کیا تھا (مسلم) اُنہوں نے جنگِ اُحد میں دشمنوں کے تیروں کی بوچھاڑ میں اپنے بازو کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں ڈھال کے بطور استعمال کیا جس سے وہ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گیا۔ یہ بزرگوار جب حضرت علیؓ کے ہاتھوں جنگِ جمل میں شہید ہوئے تو ان کی لاش کو دیکھ کر خود حضرت علیؓ بھی عتاتم نہ رہ سکے۔ اُن کا مفلوج بازو اُٹھاتے تھے، چومتے تھے اور کہتے تھے۔ کاش میں اس حادثہ کو دیکھنے سے ۲۰ برس پہلے مر چکا۔

دوسرے بزرگ حضرت زبیرؓ بن العوام تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ حضرت علیؓ سے بھی اُن کا یہی رشتہ تھا، وہ حضرت ابوبکرؓ کے داماد تھے۔ ذات النطاقین حضرت اسماءؓ کے شوہر تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زلف تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيٌّ وَحَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ کہ ہر نبی کا ایک مصاحب ہوتا ہے اور میرے مصاحب زبیرؓ ہیں۔ جنگِ اُحد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں آگے بڑھاتے فرمایا تھا فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ (مسلم) کہ میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی ظلماً شہید ہونے والوں کے ساتھ شمار کیا تھا (مسلم)، صدیقہ طاہرہؓ نے حضورؐ سے روایت کی ہے کہ ابوبکرؓ کے ساتھ زبیرؓ بھی اُن لوگوں میں شامل ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم میں وارد ہوا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا

اَصَابَتْهُمُ الْقَرْحُ (مسلم)

یہ بزرگوار حضرت علیؓ کے لئے ہمیشہ آمادۂ ایثار رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جب حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان ہوا تو اگرچہ حضرت ابوبکرؓ ان کے سُسر تھے مگر وہ حضرت علیؓ کی حمایت میں اتنے بڑھ گئے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو بھی مسترد کر دیا۔ اُنہوں نے یہ سُنتے ہی کہ حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا ہے تلوار کھینچ لی اور اعلان کرنے لگے کہ جب تک ابوبکرؓ کو مسترد کر کے علیؓ کی بیعت نہیں کر لی جائے گی یہ تلوار میان میں نہیں جائے گی۔ پھر حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے قبل نئے خلیفہ کے انتخاب کے لئے ایک چھ رُکنی کمیٹی مقرر کی تو حضرت زبیرؓ خلافت کے مستحق لوگوں کے ساتھ اس کمیٹی کے بھی رُکن تھے۔

مگر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی اس تجویز پر کہ انتخاب کو آسان بنانے کے لئے ہمیں اپنے دوسرے ساتھیوں کے حق میں اپنے حقِ خلافت سے دستبردار ہو جانا چاہیئے۔ تو حضرت زبیرؓ فوراً ہی اپنے ماموں زاد بھائی حضرت علیؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔

اس طرح حضرت زبیرؓ زندگی بھر ہمیشہ ہی حضرت علیؓ کو اپنے پر ترجیح دیتے رہے تھے تو اب اگر وہ حضرت علیؓ کے خلاف خروج کے لئے مجبور ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کا کوئی عظیم سبب ہی ہو گا۔

اصل یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ سے اب بھی نفرت نہیں کرتے تھے مگر وہ ان کی خلافت کو خلافۃ علیٰ منہاج النبوۃ نہیں سمجھتے تھے، کیوں کہ حضرت علیؓ کی خلافت ان کے سامنے جن حالات اور جن طریقوں سے تشکیل پائی تھی وہ سمجھتے تھے کہ یہ سارے طریقے خلافتِ نبوت کو قائم کرنے والے طریقوں کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت علیؓ کی حکومت اسلام کی نظامِ حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے چند ماہ تک

وہیں ٹھہر کر حضرت علیؓ کو ان کے اصل مقام کی طرف غور کرنے کی بھرپور تحریک کی اور ترغیب دی مگر حضرت علیؓ نے قاتلینِ عثمانؓ کو ناراض کرنا پسند نہ کیا۔

حضرت علیؓ نے اگرچہ اپنے لئے حضرت زبیرؓ کی قدیم ایثار پیشگی کو نظر انداز کر کے اُن سے جبری بیعت حاصل کرنا بھی پسند کر لیا تھا۔ لیکن اگر حضرت علیؓ حدود اللہ کو نافذ کر دیتے تو حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ دونوں ہی اپنی جبری بیعت کو بیعتِ رضا میں تبدیل کرنے پر آمادہ تھے مگر حضرت علیؓ کے انکار سے وہ مجبور ہوئے کہ صورتِ حال کو اسلام کی نظامی حکومت کے حق میں ہموار کرنے کے لئے دوسرے طریقوں سے کام لیا جائے اور ظاہر ہے کہ حق کو اگر بالرضا قبول نہیں کیا جائیگا تو طاقت حاصل کر کے حق کا نفاذ عین منشائے اسلام ہے۔ اس کو بغاوت کہنا صحیح نہیں ہے اور حالات کا کہنا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کے خلاف اس خروج کو ایک ایسا فریضہ سمجھنے پر مجبور ہوئے تھے جو آن پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے واجب الادا تھا۔ اور وہ یقین رکھتے تھے کہ اس مرحلہ پر اُن کا سابقہ ایک بادشاہ سے ہے خلیفۂ رسولؐ سے نہیں۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ لوگ حضرت علیؓ کے بارے میں جس نتیجہ پر پہنچے تھے اس باب میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایسی روایات وارد ہو چکی تھیں جن کے بموجب خلافت نبویؐ حضرت ابو بکرؓ سے چل کر حضرت عثمانؓ تک ختم بتائی گئی ہے، چنانچہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خواب کا ذکر ہوا ہے، جو حضور علیہ السلام نے اپنے اصحاب کی مجلس میں بیان کیا۔ آپ نے فرمایا:

میں نے دیکھا کہ ایک کنواں ہے جس کی منڈیر پر ایک ڈول رکھا ہے میں نے اس کنوئیں سے جس تعداد میں خدا کو منظور ہوا ڈول نکالے۔ پھر میں نے ڈول رکھ دیا تو ابو بکرؓ نے آسے اپنے ہاتھوں میں لیا اور پانی کے

ڈول نکالنے شروع کئے مگر ابوبکرؓ کے ڈول نکالنے میں کچھ کمزوری تھی۔

پھر عمرؓ آگے بڑھے اور ڈول نکالنے لگے اور انہوں نے اتنے زیادہ ڈول نکالے کہ سب لوگوں کو اور ان کے جانوروں کو سیراب کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے ایسا زوردار آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا جیسا زور میں نے عمرؓ کے اندر پایا [1]

ترمذی اور ابن مردویہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل ہوا ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس ایسے وقت تشریف لائے جب سورج کافی اوپر چڑھ آیا تھا اور فرمایا کہ:

میں نے آج شب فجر سے قبل خواب دیکھا ہے کہ مجھے مقالید اور موازین یعنی کنجیاں اور ترازو دو چیزیں عطا کی گئی ہیں۔ پھر مجھے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا گیا اور دوسرے پلڑے میں میری ساری امت رکھی گئی جب وزن کیا گیا تو میں اپنی ساری امت سے بھاری نکلا، میرے بعد ابوبکرؓ کو لایا گیا اور انہیں بھی میری طرح وزن کیا گیا وہ بھی میری طرح ہی پوری امت سے بھاری نکلے۔ پھر عمرؓ بن الخطاب کو لایا گیا اور اسی طرح ان کا بھی وزن کیا گیا وہ بھی ساری امت سے بھاری رہے۔ پھر اسی طرح عثمانؓ کو اسی ترازو میں اتارا گیا، وہ بھی ہم تینوں کی طرح پوری امت سے بھاری نکلے۔ اس کے بعد یہ ترازو آسمان کی طرف اٹھا لی گئی [2]

ابوداؤد میں ہے:

حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا خواب بیان کیا، اس نے کہا:

---

[1] بخاری و مسلم [2] ازالۃ الخفا شاہ ولی اللہؒ مقصد اول فصل سوم

آسمان سے ایک ترازو اُتری ، میں نے دیکھا کہ اس کے ایک پلڑے میں آپ کو اور دوسرے میں ابوبکرؓ کو رکھا گیا۔ جب وزن کیا گیا تو آپ ابوبکرؓ سے بھاری نکلے۔
پھر ابوبکرؓ کو عمرؓ کے ساتھ وزن کیا گیا تو ابوبکرؓ عمرؓ سے بھاری نکلے۔ پھر عمرؓ کو عثمانؓ کے ساتھ تولا گیا تو عمرؓ عثمانؓ سے بھاری نکلے۔ پھر وہ ترازو اٹھا لی گئی ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی تعبیر خَلَافَةُ نُبُوَّةٍ یعنی خلافت نبوت یا خلافت علی منہاج النبوۃ یا خلافتِ راشدہ ہے (جو ابوبکرؓ سے چل کر عثمانؓ پر ختم ہو جائے گی) اور فرمایا: ثُمَّ يُؤْتِي اللّٰهُ الْمُلْكَ مَنْ يَّشَآءُ اس کے بعد بادشاہت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا بادشاہت عطا فرمائے گا [1]

ابوداؤد میں ہی حضرت جابرؓ کی زبان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خواب ذکر ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
میں نے دیکھا کہ ابوبکرؓ کو میرے دامن سے باندھ کر لٹکا دیا گیا ہے اور ابوبکرؓ کے دامن سے عمرؓ کو لٹکایا گیا ہے اور عمرؓ کے دامن سے عثمانؓ کو باندھ کر لٹکایا گیا ہے [2]

سَمُرَہؓ بن جندب روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا میں نے خواب دیکھا ہے کہ:
ایک ڈول آسمان سے لٹکایا گیا، ابوبکرؓ آئے اور انہوں نے اس کا کنارہ پکڑا اور پیٹ بھر کر پیا، پھر عمرؓ آئے اور انہوں نے کنارہ پکڑا اور شکم سیر حد تک پیا۔ پھر عثمانؓ آئے اور انہوں نے ڈول کا کنارہ پکڑا۔

---

[1] ازالۃ الخفا مقصد اوّل فصل ۳ [2] ازالۃ الخفا حوالہ مذکور

اُنہوں نے بھی پیٹ بھر کر پیا۔ پھر علیؓ بڑھے اُنہوں نے بھی ڈول کے کنارے پر ہاتھ ڈالا مگر ڈول کی رسّی کھُل گئی اور ڈول گر گیا۔ جس کے گرنے سے پانی کی کچھ چھینٹیں علیؓ پر پڑیں ؓ مگر وہ پانی نہ پی سکے)

بخاری اور مسلم میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے ابر کا ایک ٹکڑا دیکھا جس میں سے گھی اور شہد ٹپک رہا ہے اور لوگ اُسے حاصل کر رہے ہیں۔ پھر آسمان سے ایک رسّی اتری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پکڑا اور اس کے ذریعہ آسمان پر چڑھ گئے۔ پھر ایک اور شخص بھی اس رسّی کے ذریعہ اوپر چڑھ گیا اس کے بعد ایک اور شخص بھی اسی طرح آسمان پر چڑھ گیا۔ پھر ایک اور شخص آگے بڑھا اُس نے رسی کو پکڑا اور اوپر چڑھنے لگا مگر وہ رسی ٹوٹ گئی۔ تاہم وہ رسّی اُس کے لئے پھر جوڑ دی گئی اور وہ بھی اوپر چڑھ گیا۔

حضرت ابو بکرؓ مجلس میں موجود تھے اُنہوں نے حضورؐ سے اس خواب کی تعبیر بیان کرنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے اجازت دے دی۔ ابو بکرؓ نے اس خواب کی تعبیر بیان کی کہ ابر سے مراد اسلام ہے، گھی اور شہد قرآن کریم ہے۔ گھی قرآنِ پاک کی نرمی اور شہد اس کی مٹھاس کو بیان کرتا ہے۔ رسّی سے مراد حبل اللہ یعنی دینِ حق ہے جسے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ پھر اللہ جب آپ کو اٹھائے گا تو ایک اور شخص اس رسّی کو پکڑے گا اور بلند مرتبہ حاصل کرے گا۔ پھر جب وہ بھی بُلا لیا جائے گا تو اس کے بعد ایک اور شخص اُس رسّی کو تھام لے گا اور

لہ ازالۃ الخفا حوالہ مذکور

وہ بھی بلند مرتبہ حاصل کرے گا۔ پھر تیسرا اُس رسی کو سنبھالے گا تو تھوڑی سی گڑبڑ کے بعد وہ بھی بلند مراتب کو پہنچ جائے گا۔

پھر ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ! کیا میری بیان کردہ تعبیر درست ہے؟

فرمایا ہاں تم نے صحیح تعبیر بیان کی ہے مگر ایک ذرا سی کمی رہ گئی ہے۔ ابو بکرؓ کہنے لگے آپ کو اللہ کی قسم ہے وہ کمی ضرور بیان فرمایئے

فرمایا ابو بکرؓ! چھوڑو قسم نہ دو [1]

اس پر حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

میرے خیال میں کمی یہ رہ گئی تھی کہ ابو بکرؓ حضورؐ کے بعد رسی کو تھامنے والے ان تینوں بزرگوں کے نام بیان نہیں کر سکے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کی خلافت کے منصب پر فائز ہونے والے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعارہ کے رنگ میں اس کوتاہی کو غلطی یا کمی بیان فرمایا۔

یہ سب کی سب روایات حضورؐ کے اپنے یا آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے خوابوں پر مشتمل ہیں۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بیان کردہ تعبیرات کے ساتھ ذخیرۂ حدیث میں موجود ہیں۔ ان میں سے ہر روایت خلافت نبوت کو آپ کے تین خلفاء تک پہنچا کر ہی بات کو ختم کر دیتی ہے مگر یہ تین کی خلافت کا معاملہ صرف صلحاء کے خوابوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اسی باب میں جاگتے دیکھتے اور سنتے بھی بہت سی روایات وارد ہو چکی ہیں۔ ان میں سے چند روایات ہم یہاں درج کرتے ہیں:

- عن علیؓ ماخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الدنیا

---

[1] ازالۃ الخفا حوالہ مذکور

حتی عھدَ اِلیَّ ان ابا بکرؓ یلی الامر بعدہ ثُمَّ عمرؓ ثُمَّ عثمان ثُمَّ اِلیَّ فلا یجتمع علیَّ [1]

یعنی خود حضرت علیؓ ہی روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام دنیا سے تشریف نہیں لے گئے جب تک اُنھوں نے مجھے یہ خبر نہ دے دی کہ میرے بعد ابوبکرؓ صاحبِ امر ہوں گے پھر عمرؓ اور پھر عثمانؓ، پھر میری (یعنی علیؓ) کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ مگر میرے اوپر مسلمانوں کا اتفاق نہیں ہو گا (یعنی مسلمانوں کے اتفاق سے صرف تین ہی خلافتیں منعقد ہوں گی)

اور ظاہر ہے کہ یہ تقدیر ربانی ہی تھی اور یہ واقعات بھی ٹھیک اسی طرح وقوع پائے جس طرح اور جس ترتیب سے حدیثِ رسول علیہ السلام میں ذکر ہوئے ہیں۔ اور روایت کا آخری حصہ بھی ایک حقیقت ثابتہ اور بیّنہ بن کر ہی سامنے آیا جو حضرت علیؓ کے بارے میں حدیث میں ذکر ہوا ہے۔

- حاکم حضرت سفینہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مسجدِ نبوی کی بنیاد رکھی تو پہلا پتھر آپ نے اپنے دستِ مبارک سے خود رکھا۔ پھر آپ نے ابوبکرؓ کو حکم دیا اور اُنھوں نے آپ کے رکھے ہوئے پتھر کے پہلو میں ایک پتھر رکھا۔ پھر یہی حکم عمرؓ کو ہوا اور اُنھوں نے اپنا پتھر حضرت ابوبکرؓ کے پتھر کے پہلو میں رکھا۔ پھر آپؐ نے حضرت عمرؓ کے پتھر کے پہلو میں حضرت عثمانؓ سے پتھر رکھوایا اور فرمایا ھٰولآء خلفاء بعدی کہ میرے بعد یہ میرے خلیفے ہوں گے۔

---

[1] ازالۃ الخفا مقصد اوّل فصل سوم تفسیر آیاتِ خلافت

یہی روایت ابویعلیٰ اور حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی وارد ہوئی ہے۔

- سہیل بن ابی حثمہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کوئی چیز فروخت کی اور رقم اُدھار رہی۔ اعرابی واپس جا رہا تھا کہ حضرت علیؓ سے ملاقات ہوگئی اُنہوں نے اعرابی سے معاملہ معلوم کرکے اُسے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس جاؤ اور دریافت کرو کہ اگر میں آیا اور آپ نہ ملے یعنی وفات پا چکے ہوئے تو یہ رقم کون ادا کرے گا؟ اعرابی نے واپس جاکر حضورؐ سے یہ سوال کیا تو آپ نے فرمایا میرے بعد یہ رقم ابوبکرؓ ادا کریں گے۔ وہ پھر حضرت علیؓ کے پاس واپس آیا اور اُنہیں حضورؐ کے جواب سے مطلع کیا۔ حضرت علیؓ نے اعرابی کو پھر واپس کیا۔ کہا کہ جاکر پوچھو کہ اگر اُس وقت ابوبکرؓ بھی وفات پا چکے ہوئے تو پھر یہ قرض کون ادا کرے گا۔ اعرابی پھر واپس گیا اور اپنا سوال دُہرایا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ کے بعد میرا یہ قرض عمرؓ سے طلب کرنا وہ ادا کرے گا۔ اعرابی جب واپس لوٹا تو علیؓ نے حضورؐ کا جواب سن کر اُسے پھر واپس لوٹایا کہ پھر جاکر دریافت کرو کہ اگر اس وقت تک عمرؓ بھی فوت ہوگئے ہوں تو پھر یہ قرض کون ادا کرے گا۔ حضورؐ نے یہ سوال سن کر فرمایا کہ پھر عثمانؓ کے پاس آنا وہ میرا قرض ادا کردے گا۔ حضرت علیؓ نے اعرابی کو پھر واپس جانے کو کہا اور فرمایا کہ جاکر پوچھو اگر عثمانؓ بھی نہ ہوئے تو پھر کیا صورت ہوگی؟ اعرابی نے اپنا سوال پھر جاکر دُہرایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اگر تمہارا قرض ادا کئے بغیر میں بھی فوت ہو چکوں، ابوبکرؓ بھی فوت ہو چکیں، عمرؓ بھی فوت ہو چکیں اور عثمانؓ بھی وفات پا چکے ہوں تو پھر تُو زندہ رہ کر کیا کرے گا اگر ہو سکے

تو تم بھی مرجانا۔ حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں :

فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَمُوْتَ فَمُتْ

یہی روایت حضرت ابوہریرہؓ سے بھی ملتے جلتے الفاظ میں وارد ہوئی ہے [1]

پس روایات کے بموجب جب حضرت علیؓ کی خلافت وہ خلافت ہی نہیں جو خلافت نبوت کے معیار پر پوری اُترتی ہو، بلکہ وہ ایک مسلمان بادشاہ تھے تو مسلمانوں کا بادشاہ یا سلطان اگر حدود اللہ کے نفاذ میں غفلت کرے، کوتاہی کرے، پہلو تہی کرے یا اُن کو نافذ کرنے سے انکار کردے تو ایسے بادشاہ کو حدود اللہ کے نفاذ پر مجبور کرنے کے لئے اُس کے خلاف جنگ محض جائز ہی نہیں واجب بھی ہے۔ اور قرآن کریم نے ایسے بادشاہ کے خلاف لڑائی کی تحریک بھی کی ہے۔ قرآن نے جب یہ فرمایا کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ تو وہ اس آیت میں مسلمانوں کی طرف سے اپنے اولی الامر کے کسی انحراف عن الحق کے خلاف واقع ہونیوالے کسی تصادم کے جواز کی ہی بات کرتا ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں جس نزاع کا ذکر ہے وہ مسلمانوں کی اپنے مسلمان اولی الامر سے ہی نزاع ہے یعنی اگر وہ اولی الامر مسلمانوں کی مساعی یا تحریک یا تبلیغ و تلقین سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹ نہیں آتا تو پھر مسلمانوں کا اور ایسے اولی الامر کا معاملہ اُن حدود میں داخل ہو جاتا ہے جہاں ارشاد ہے کہ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ج (حجرات ع ۱)

---

[1] یہ سب روایات ازالۃ الخفا مقصد اول مطبوعہ کارخانہ تجارت نور محمد کراچی کی فصل سوم میں بضمن تفسیر آیات خلافت کے صفحہ ۱۰۸ تا صفحہ ۱۱۸ پر درج ہوئی ہیں۔

کہ مسلمانوں کے دو گروہ اگر کسی بات پر آپس میں لڑ پڑیں تو کوشش کرو اُن کے درمیان (حق کی طرف لوٹنے کی شرط پر) صلح ہو جائے اور اگر کوئی گروہ حق کو قبول کرنے سے اعراض کرتا ہوا دوسرے پر زیادتی جاری رکھے تو زیادتی کرنے والے گروہ کے خلاف جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکم برداری کو قبول کرلے۔

اس حال میں جب حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص نہ لے کر اپنی منصبی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوتاہی کی تھی اور وہ اپنے اور پرائے کسی کی بھی ترغیب و تلقین کو خاطر میں نہیں لاتے تھے تو مسلمانوں پر فرض ہو گیا تھا کہ وہ جیسے بھی ممکن ہو انہیں مجبور کرتے کہ وہ اپنے منصب کی ذمہ داریوں کو سرانجام دیں اور اُن کے خلاف لڑنے والے مسلمانوں نے قرآنِ پاک کے اسی حکم پر عمل کیا ہے۔

حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے خلاف جو جنگ جاری کر دی تھی تو ان کی حد تک اس کی وجہ اگرچہ اُن کی بنو اُمیہ سے پُرانی عداوت ہی تھی مگر حضرت علیؓ کے خلاف لڑنے والوں میں سے کسی کے پیشِ نظر بھی کسی خاندانی نزاع کے سلسلہ کی انتقامی کارروائی نہیں تھی بلکہ اُن کے خلاف طلحہؓ و زبیرؓ نے اقدام کیا ہو یا معاویہؓ نے سب کا مطلوب حضرت علیؓ کو حدود اللہ کے نفاذ پر مجبور کرنا ہی تھا، اس لئے اُن میں سے کوئی بھی نہ صرف باغی نہیں تھا بلکہ وہ سب ہی اُس فرض کو ادا کر رہے تھے جو قرآن نے اُن پر عائد کیا تھا۔

ایک پہلو یہ بھی ہے تصویر کا

بات ایک اصولی سوال کی حیثیت ہی رکھتی ہے کہ اولی الامر اگر کوئی کام

خلافِ عدل کرے اور اُسے حق و انصاف کی طرف واپس لوٹانے میں کوئی درخواست یا احتجاج بھی کفایت نہ کر سکے تو کیا ایسے اولی الامر کے خلاف خروج کرنا حق سے بغاوت کے ضمن میں آتا ہے؟

اس صاف اور سادہ سوال کا جواب بھی بالکل صاف اور سادہ ہی ہے کہ جو اولی الامر حق سے تجاوز یا خلافِ عدل کام کرتا ہے وہ قرآنی اولی الامر نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآنِ کریم نے جس اولی الامر کی اطاعت اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ شامل کی ہے اس کی تعریف بھی کر دی ہے جب فرمایا:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط (الحج)

(اہلِ ایمان کی صفت یہ ہے کہ) اگر ہم اُن کو زمین میں استحکام عطا کریں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں (اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر لگاتے ہیں) خود زکوٰۃ دیتے ہیں (اور زکوٰۃ جمع کرنے کا نظام قائم کرتے ہیں) لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ حدود اللہ سے تجاوز اور عدل و انصاف کے خلاف چلنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے صریحاً منافی ہے اور اگر اولی الامر قرآنِ پاک کے اس نظامِ حیات کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ہے تو وہ اس اولی الامر کی تعریف سے نکل جاتا ہے جس کی اطاعت قرآنِ پاک نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ شامل کی ہے اور اُس کے خلاف خروج تو نصِ قرآنی سے ہی ثابت ہے جب فرمایا کہ:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط (پ۵ ع ۵)

کہ اگر تم (حاکمِ وقت یا اولی الامر سے ہی) کسی بات میں لڑ جھگڑ پڑو تو پھر اولی الامر کی اطاعت کا حکم ساقط ہو جاتا ہے اس حال میں تم اپنے جھگڑے کا فیصلہ صرف اللہ اور اُس کے رسولؐ سے ہی طلب کرو۔

مسلمانوں کی یہی باہمی لڑائی ہے جس کے بارے میں قرآنِ پاک نے اہلِ فکر و تدبیر کو ہدایت فرمائی ہے کہ باہم لڑنے والے مسلمانوں میں مصالحت کرا دو اور ساتھ ہی فرمایا کہ:

فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ (پ ۲۶ ع ۱)

کہ اگر مصالحانہ مساعی کے باوجود لڑنے والوں میں سے کوئی فریق دوسرے پر زیادتی جاری رکھے تو پھر سب مل کر اُس کے خلاف جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے فیصلہ کی طرف لوٹ آئے۔

اس اصولی بحث کی روشنی میں حضرت معاویہؓ کے خلاف بغاوت کے الزام کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں اولی الامر کی حیثیت کا تعین کرنا ہوگا۔ پس یاد رہے کہ اولی الامر تین طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) امام جائر (۲) امام عادل (۳) نہ جائر نہ عادل

۱۔ امام جائر وہ ہے جو زور و جبر سے حاکم بنا ہو اور زور و جبر سے ہی حکومت کرتا ہو۔ حکومت کے کاروبار میں از اوّل تا آخر صرف اُس کی مرضی ہی قانون کا درجہ رکھتی ہو یعنی قانون اس کی مرضی کو کہا جاتا ہے اور ملک کے اندر اس کی مرضی سے الگ کوئی قانون موجود نہیں ہوتا۔ یہ وہ ظالم حکمران ہے جس کے خلاف خروج واجب ہے اور اگر کوئی شخص ہمت رکھتے بھی اس کے خلاف خروج نہیں کرے گا تو وہ گنہگار ہے۔ یہی وہ حکمران ہے جس کے خلاف بموجب حدیثِ پاک افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جائر کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ ظالم اور جابر بادشاہ کے سامنے سچی بات کہنا بھی

افضل ترین جہاد ہے۔

اگر ایسے حکمران کے خلاف خروج کی ہمت نہ ہو تو مسلمانوں کو حکم ہے کہ اس کی حکمداری کے علاقہ سے ہجرت کر جائیں۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ط قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ط قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ط (پ۵ ع ۱۱)

کہ جب فرشتے اُن لوگوں کی جان قبض کرتے ہیں جو عمر بھر اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے (اور اپنی زندگی کو خدا کی راہ میں جدوجہد سے دُور رکھا) تو اُن سے کہتے ہیں کہ تم نے اس خلاف منشاءِ ربانی زندگی پر کیوں قناعت کر رکھی تھی! وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم یہاں بے بس تھے (اور جو لوگ ہم پر مسلط تھے وہ زبردست تھے) فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی، تم یہاں سے کسی دوسری جگہ ہجرت کر جاتے۔

۲۔ امام عادل دوسرا اولی الامر وہ ہے جو خدا تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی مرضی کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ اس اولی الامر کے خلاف خروج یا بغاوت یکسر حرام ہے۔ امام عادل کے خلاف بغاوت یا خروج صرف امام عادل کے خلاف ہی نہیں ہے بلکہ یہ خروج اللہ اور اس کے رسول کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ امام عادل جو کچھ کرتا ہے یا کہتا ہے وہ اپنے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ہی کرتا اور کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اولی الامر کے خلاف بغاوت اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بغاوت شمار ہوگی۔ جیسے ارشاد ہے:

فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ۔

(اللہ کے رسول!) یہ لوگ آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ یہ ظالم دراصل

اللہ کی آیات سے انکار کر رہے ہیں اس امام کے خلاف خروج نہیں بلکہ اس کی امداد کا حکم دیا گیا ہے اور یہی وہ اولی الامر ہے جس کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ رکھ کر بیان کیا ہے۔ جب فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (پ۵ ع ۵)

کہ اے مسلمانو! اپنے اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے (ان) حاکموں کی اطاعت کرو (جو اللہ کے قانون کو اس کے بندوں پر نافذ کرتے ہیں)

۳۔ نہ جائر نہ عادل: تیسری قسم کا اولی الامر وہ ہے جو نہ اپنے زور سے حاکم بنتا ہے جیسے سلطان جائر اور نہ وہ صلحاء امت کے مشورہ اور رائے سے حکومت پاتا ہے جیسے امام عادل کہ اُسے صرف صلحاء ہی مقرر کرتے ہیں۔ بلکہ یہ ایسا سلطان ہے کہ جسے بُرے بھلے سارے ہی لوگ جمع ہو کر اپنا حاکم بناتے ہیں۔ چونکہ اس اولی الامر کو صاحب امر بنانے والوں میں نیک و بد ہر قسم کے لوگوں کی رائے کو دخل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ نہ اپنی مرضی چلا سکتا ہے نہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کا پابند ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے رائے دہندگان کی مرضی سے اور انہی کے مفاد میں کام کرتا ہے۔ وہ اُنہی کے لئے سوچتا ہے اور اُنہی کی رضا کو اپنے شامل حال رکھنے کے لئے سرگرم کار رہتا ہے۔ اُنہیں کسی کام کے صحیح یا غیر صحیح ہونے سے بحث نہیں ہوتی بلکہ اس کے نزدیک صحیح وہ ہے جسے اس کے ووٹر صحیح کہتے ہوں اور غلط وہ ہے جو اس کے ووٹروں کے نزدیک غلط ہو۔ اس لئے اپنے رائے دہندگان کے مفاد میں کبھی وہ عدل کو نظر انداز بھی کر دیتا ہے اور کبھی اس کی

کاروائی عدل کے مطابق بھی ہو سکتی ہے اس اولی الامر کی مثال ٹھیک وہی ہے جو ہمارے ہاں مغرب کے جمہوری نظام کے ماتحت مروج ہے۔ کہ ایک شخص امامت کے عہدہ کے لئے امیدوار ہوتا ہے اور پھر وہ ہر کسی سے ہی اپنی کامیابی کے لئے مدد طلب کرتا ہے۔ اس کے مددگاروں میں نیک لوگ بھی ہوتے ہیں، چور، ڈاکو بھی ہوتے ہیں، فاسق و فاجر بھی ہوتے ہیں، شرابی اور زانی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ وہ سب سے مدد لیتا ہے اس لئے وہ سب کے ہی مفاد پر نگاہ رکھنے کا مکلف ہے۔

یہ اولی الامر ایک ایسا اولی الامر ہے جس کی امامت جس کی ولایت اور جس کی حکومت کے لئے اسلام کے اندر کوئی سند نہیں پائی جاتی، اس حکومت کا حاکم ایک کمزور حاکم ہوتا ہے جس کی حاکمیت دوسروں کے رحم وکرم پر ہے، وہ جب چاہیں اور جو چاہیں اس سے کام لیں، وہ دوسروں پر غالب نہیں بلکہ ان سے مغلوب ہوتا ہے اور ہمیشہ مغلوب رہتا ہے۔ وہ غلطی پر مجبور تو ہوتا ہے مگر اسے اپنی غلطی کی اصلاح کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ حاکم اگر اپنے حالات پر قابو حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اور وہ اپنی اور اپنے رائے دہندگان کی رائے کو اللہ اور اللہ کے رسول کی رائے کے تابع نہ بنا سکے تو وہ مسلمانوں کا حاکم بنے رہنے کے قابل نہیں ہے کیونکہ اس کی حکومت مسلمانوں کی حکومت تو ہو سکتی ہے مگر وہ اسلام کی حکومت نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ

اولی الامر کی حیثیت کی تعیین و تعریف کے بعد اب سوال یہ ہے کہ حضرت علیؑ اولی الامر کے کس زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں؟

آیا وہ امام جائر ہیں؟ امام عادل ہیں؟ یا نہ جائر ہیں نہ عادل؟ یہ سوال جس درجہ اہم ہے اس کا جواب سوال کی اہمیت سے آگے بڑھ کر کہیں زیادہ پیچیدہ اور نازک ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے باغی ہونے یا باغی نہ ہونے کا فیصلہ بھی اس سوال کے جواب پر ہی موقوف ہے۔

۱- اب یہ بات تو ایک امر واقعہ کی حیثیت ہی رکھتی ہے کہ حضرت علیؓ امام جائر نہیں تھے کہ انہیں بہرحال کچھ لوگوں نے منتخب کیا تھا وہ اپنے زور سے حاکم نہیں بنے تھے۔

اور اگرچہ ان کو منتخب کرنے والوں میں اکثریت ان فساق و فجار کی ہی تھی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ ارشد حضرت عثمانؓ کے خلاف بلوہ کرکے ان کو قتل کیا تھا۔ مگر بلاشبہ ان کے انتخاب میں کچھ صلحا کا نام بھی ذکر ہوا ہے اور اگرچہ وہ لوگ اپنی رائے کے مختار تو نہیں تھے مگر ان کی رائے ساتھ ضرور شامل ہو گئی تھی۔

۲- جی چاہتا ہے کہ علی امام عادل ہی ہوں مگر بدقسمتی سے امامت عادلہ کی وہ خصوصیات جو خلافتِ نبوت سے عبارت ہیں پیش آمدہ حالات نے ان کو حضرت علیؓ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ نہیں ہونے دیا تھا۔

حضرت علیؓ اپنے وقت کے مخصوص حالات میں امامت پر فائز کئے جانے اور انہی حالات کے دباؤ کی وجہ سے بعد میں بھی ان خصوصیات کو اپنا لینے کا موقع حاصل نہ کر سکے جو امامتِ عادلہ کی اصل و بنیاد ہیں اور شاید آسمان کی پسند بھی یہی تھی جیسا کہ ان احادیثِ رسولؐ سے ظاہر ہے جن کو ہم گزشتہ مضمون میں زیرِ عنوان "کیا علیؓ سے لڑائی امام عادل سے بغاوت تھی؟" صحیحین اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ازالۃ الخفا کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں۔

۳- مولانا مودودی صاحب اپنے جن معتبر مؤرخین کی معتبر کتابوں کی معتبر روایات کی مدد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اخص اصحاب کی کردار کشی کرتے ہیں - بدقسمتی سے انہی معتبر مؤرخین کی معتبر کتابوں کی معتبر روایات کے مطابق امامت کی تیسری صورت ہی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات سے مطابقت رکھتی ہے کیونکہ بحسبِ روایات حضرت علیؓ کی امامت ٹھیک انہی ذرائع اور وسائل

کے اجتماع سے ہی منعقد ہوئی ہے جو اس امامت کا حصہ ہیں یعنی وہی صالحین اور مفسدین کا اجتماع وہی اصحابِ اتقا اور فساق و فجار کی جدوجہد اور وہی اخیار و اشرار کا اشتراک سب کچھ وہی تھا جو اس امامت کے تخلیقی عناصر ہیں -

بحث کا یہ نتیجہ بلاشبہ بڑا تلخ ہے، بڑا دردناک ہے بلکہ یہ ایک ایسا المیہ ہے جو دلوں کی دنیا میں اضمحلال پیدا کر دے -

حضرت علیؓ کے بارے میں یہ المیہ ہماری چاہت کے خلاف ہے ہماری پسند کے منافی ہے مگر کوئی کیونکر کہے کہ یہ المیہ مولانا کی کج اندیشی، کج روی اور کج نویسی کا عین منطقی نتیجہ ہے - کاش یہ نتیجہ مولانا کے دل کا بھی المیہ بن سکے اور وہ اپنی دنیا کے لئے خدا کے پاکیزہ بندوں کی کردار کشی کے بجائے اپنی عاقبت کی فکر کریں -

فصل ششم

حدیث عمار مودودی اور معاویہؓ

بخاری شریف میں ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ حضرت عکرمہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن عباس نے مجھے اور اپنے بیٹے علیؒ کو کہا کہ جاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابوسعیدؓ خدری کی باتیں سنو! چنانچہ ہم حضرت ابوسعیدؓ کی خدمت میں پہنچے اور ان کے ارشادات کو اپنے دامانِ دل کی دولت بنانے لگے۔

ایک مرحلہ پر مسجد نبویؐ کی تعمیر کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا مسجد نبویؐ کی تعمیر کے موقع پر ہم سب ایک ایک اینٹ اٹھا کر لاتے تھے مگر عمارؓ دو دو اینٹیں اٹھاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف دیکھا، آگے بڑھے اور اس کے دامن سے مٹی جھاڑنے لگے اور فرمایا:

وَيْحَ عَمَّارٍ تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ يَدْعُوهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيَدْعُونَهُ إِلَى النَّارِ [1]

اُف عمار نے یہ اپنا کیا حال بنا رکھا ہے پھر اس کے بارے میں ایک مزید خبر دی اور فرمایا) اس کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ یہ انہیں جنت کی طرف دعوت دے گا اور وہ اس کو آگ کی طرف بلائیں گے۔

---

[1] بخاری شریف جلد اوّل کتاب الصلوٰۃ حدیث ۴۴۱

عمارؓ کے بارے میں چونکہ روایات میں وارد ہوا ہے کہ وہ جنگِ صفین میں علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے معاویہؓ کے لشکر کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اس لئے مولانا مودودی صاحب نے علیؓ معاویہؓ جنگ میں علیؓ کو حق اور معاویہؓ کو باطل ثابت کرتے ہوئے اس روایت کو فیصلہ کُن دلیل ٹھہرایا ہے۔

مولانا کا استدلال یہ ہے کہ چونکہ حضرت عمارؓ کو معاویہؓ کے گروہ نے قتل کیا تھا اس لئے معاویہؓ اور ان کا گروہ اس حدیث کے بموجب باغی گروہ ہے جس نے حق یعنی علیؓ کے خلاف خروج کیا تھا اور حدیثِ رسولؐ میں جس باغی گروہ کا ذکر ہوا ہے وہ معاویہؓ کا ہی گروہ ہے۔

اس باب میں مولانا نے اپنے موقف کو سیدھا رکھنے کے لئے اپنے جنودِ فکر و نظر کی پوری فورس اور اپنے قلم کی ساری توانائیاں اس محاذ پر جھونک دی ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمالیں، مولانا لکھتے ہیں:

اس جنگ کے دوران میں ایک واقعہ ایسا پیش آگیا جس نے نص صریح سے یہ بات کھول دی کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون؟ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمّارؓ بن یاسر جو حضرت علیؓ کی فوج میں شامل تھے حضرت معاویہؓ کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

حضرت عمّارؓ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحابہ میں مشہور و معروف تھا اور بہت سے صحابیوں نے اس کو حضورؐ کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ تَقْتَلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا[1]

اس پر مولانا فرماتے ہیں:

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۳۶

متعدد صحابہ و تابعین نے جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ میں متذبذب تھے۔ حضرت عمارؓ کی شہادت کو یہ معلوم کرنے کے لئے ایک علامت قرار دے لیا تھا کہ فریقین میں حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے[1]

مزید ارشاد ہے:

جنگِ جمل میں حضرت زبیرؓ کے ہٹ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد تھا اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ کے لشکر میں عمارؓ بن یاسر موجود ہیں[2]

الغرض مولانا نے اس عنوان سے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۶ سے ۱۳۹ تک اپنے زورِ قلم کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اور انہیں اس ضمن میں حضرت معاویہؓ کے خلاف جتنے بھی بھلے بُرے ریمارکس اِدھر اُدھر سے دستیاب ہو سکے ہیں، انہوں نے یہاں ان کی خوب ہی بھرتی ڈالی ہے۔

یہاں مولانا کی ایک یہ مصلحت بھی بڑی معنی خیز ہے کہ انہوں نے بخاری شریف کی اس حدیث کو جس میں حضرت عمارؓ کے قتل کا ذکر بصیغۂ غائب آیا ہے ترک کر کے مسند احمد کی روایت کو بہ تکلف اختیار کیا ہے جس میں عمارؓ کے قتل کا ذکر حضورؐ کی زبان سے بصیغۂ خطاب عمارؓ کو مخاطب کر کے نقل ہوا ہے۔

روایت کے اس انتخاب میں مولانا اپنا مقصد حاصل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکے ہیں اور انہوں نے اپنی سوچ کے رہوار کو اس راہ پر ڈال کر کتنا کچھ فائدہ حاصل کیا ہے ہم اس بحث میں نہیں پڑتے تاہم اہل علم و خبر کے لئے مولانا کی اس فکری مہم میں بھی بہت سی عبرتیں پوشیدہ ہیں۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۱۳۷ [2] ایضاً

اب زیرِ بحث حدیثِ پاک کی بات تو الگ ہے۔ اس سلسلہ کی گزارشات ہم آگے چل کر پیش کر رہے ہیں۔ مگر اس بحث میں مولانا نے جن دوسری تاریخی روایات پر اپنے موقف کی سچائی کی بنیاد استوار کی ہے۔ وہ روایات سب کی سب الحاقی، اختراعی اور از اوّل تا آخر جھوٹ ہیں۔ بحث کا یہ رُخ بات کو لاحاصل طول بھی دیتا ہے اور بے خبری بھی ہے، اور ہمیں اس بحث کو قبول کرنے پر دلی صدمہ اور سخت قلق ہے۔ مگر مولانا نے اپنی اس بحث میں ایسی بہت سی باتیں جمع کر دی ہیں جو سراسر خلافِ واقعہ اور غلط ہیں۔ اگر ان باتوں کا ازالہ نہ کیا گیا تو یہ باتیں عوام کو فکری گمراہی میں مبتلا کر دیں گی مثلاً:

مولانا کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اصحابِ رسولؐ عمارؓ کی موت کو حق و باطل کی علامت قرار دے بیٹھے تھے اور وہ منتظر تھے کہ دیکھیں عمارؓ کب اور کس کے ہاتھ سے قتل ہوتے ہیں تاکہ انہیں حق و باطل میں تمیز کا موقع میسّر آ سکے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اصحابِ رسولؐ کے ہاں حق و باطل میں تمیز کا معیار اب عمارؓ کی موت ہی تھی اور علیؓ معاویہؓ تصادم اگر دس بیس برس تک جاری رہتا تو یہ لوگ حق کے حق ہونے کا اور باطل کے باطل ہونے کا کوئی فیصلہ نہ کر سکتے۔ پھر جونہی عمارؓ کا قتل وقوع میں آیا ان لوگوں نے چین کی سانس لی کہ شکر ہے حق کی راہ اُن پر کھل گئی۔

حضرت مولانا سے اب کون کہے کہ یہ لوگ سب کے سب حق کے داعی حق کے علمبردار اور حق کے امین تھے۔ اُن میں سے ہر کوئی ہی مومن تھا اور ہر اک کا سینہ مومن کی فراست کا خزینہ تھا۔ وہ اس جنگ میں اگر غیر جانبدار تھے تو اس لئے نہیں کہ وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہ اس جنگ کو اُمت کے لئے جنگِ فتنہ سمجھتے تھے اور حضور علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ہی اس سے الگ تھلگ ہو رہے تھے۔

ورنہ اُنہیں علم تھا کہ عمّارؓ علیؓ کے ساتھی ہیں، علیؓ کے ساتھی رہے ہیں اور علیؓ کے ہم راز ہیں۔ وہ علیؓ کے محب ہیں، علیؓ کے مشیر ہیں، علیؓ کے صلاح کار ہیں۔ وہ جب بھی قتل ہوں گے تو علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے علیؓ کے کسی مخالف کے ہاتھوں ہی قتل ہوں گے۔ اس میں بجھارت والی کونسی بات تھی جسے اصحابِ رسولؐ نہیں جانتے تھے۔

دوسری طرف حضرت عثمانؓ سے ان کی عداوت بھی سب پر ظاہر تھی۔ وہ حضرت عثمانؓ کے دشمنوں کے ہمدرد تھے، رفیق تھے، صلاح کار تھے بلکہ "المنتقیٰ" کی روایات کے مطابق تو اُنہوں نے ایک مجلس میں جہاں حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ دونوں موجود تھے برملا کہا کہ عثمانؓ کافر ہے۔ حضرت حسنؓ نے حضرت عمّارؓ کی اس بات سے بہت بُرا منایا، حضرت علیؓ نے بھی عمار کی یہ بات پسند نہ کی۔ مگر انہیں بڑے ہی پیار سے کہا کہ عمّار! کیا تم اُس خدا کے منکر ہو جس پر عثمانؓ ایمان لائے تھے؟ [1]

بڑی عجیب بات ہے کہ عمّار جنگِ جمل میں بھی علیؓ کی طرف سے لڑتے رہے اور قتل کی زد میں رہے۔ صفین میں بھی ان کی طرف سے ہی شریکِ جنگ تھے۔ مگر مولانا کے نزدیک اصحابِ رسولؐ اس وقت تک فریقین جنگ میں سے کسی ایک کے برسرِ حق ہونے کا فیصلہ نہ کر سکے۔ جب تک عمّار کی لاش میدان میں نہ تڑپ گئی۔

عمّار کے مزاج میں حضرت علیؓ کی حمایت کرتے اتنا زیادہ تشدّد پیدا ہو چکا تھا کہ جنگِ جمل کے دنوں اُنہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ بھی سخت گستاخانہ سلوک کیا اور اُنہیں دُو در دُو ایسی ناشائستگی سے پیش

---

[1] المنتقیٰ صفحہ ۵۷۶

آئے کہ اُنہوں نے غصہ سے کہا۔ میرے سامنے سے چلے جاؤ میں تمہاری ماں نہیں ہوں [1]

کیا اصحابِ رسولؐ کو اس شخص کے قاتل کی تلاش میں کوئی رکاوٹ تھی جو وہ اس کے قتل ہونے تک نہ جان سکے کہ یہ کس کے ہاتھوں قتل ہوگا!

۲۔ اسی طرح مولانا کا یہ کہنا بھی ہرگز درست نہیں ہے کہ حضرت زبیرؓ علیؓ سے لڑتے لڑتے اس لئے جنگ سے الگ ہو گئے تھے کہ اُنہوں نے عمارؓ کو علیؓ کے لشکر میں دیکھ لیا تھا۔ اور اُنہیں یاد آگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے قتل کو حق و باطل کی علامت قرار دے رکھا ہے۔ اگر یہ ہمارے ہاتھوں قتل ہوا تو ہم ہی وہ باغی گروہ ہوں گے جس کے بارے میں حضورؐ سے نص موجود ہے۔

کیونکہ حضرت زبیرؓ کو تو عمارؓ اور علیؓ کی دوستی اُس وقت سے ہی معلوم تھی جب عمارؓ حضرت عثمانؓ کو ہٹانے اور حضرت علیؓ کو آگے لانے کے لئے شہر بہ شہر تقریریں کرتے پھرتے تھے۔

یہ بات ہرگز قابلِ فہم نہیں کہ زبیرؓ یہ نہ جانتے ہوں کہ عمارؓ کا مقام کہاں ہے اور یہ نہ جانتے ہوں کہ عمارؓ یقیناً علیؓ کے لشکر میں شامل ہیں۔

علاوہ ازیں یہ اس لئے بھی غلط ہے کہ بقول مودودی صاحب ہی انہیں خود حضرت علیؓ نے ہی پیغام بھیج کر اپنے پاس بلایا اور "ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یاد دلا کر جنگ سے باز رہنے کی تلقین کی اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت زبیرؓ میدانِ جنگ سے ہٹ کر الگ چلے گئے۔"
(خلافت و ملوکیت ص۱۲۹ سطر ۱۹ – ۲۰)

---

[1] طبری جلد ۳

اب یہ بھید تو مودودی صاحب اور ان کے راوی کو ہی معلوم ہو گا کہ حضرت علیؓ نے جمل کے میدان میں حضرت زبیرؓ کو جو ارشادات نبویؐ یاد دلائے تھے انہیں وہ اس وقت بھی یاد تھے یا نہیں جب انہوں نے حضرت زبیرؓ کی گردن پر تلوار رکھ کر ان سے اپنے لئے بیعت وصول کی تھی؟

تاہم روایت سے یہ امر بہرحال واضح ہے کہ حضرت زبیرؓ کی جنگ سے کنارہ کشی کا سبب وہاں حضرت عمارؓ کو دیکھ لینا ہرگز نہیں تھا۔

اور پھر عمارؓ کا قتل تو اصحابِ رسولؐ کے نزدیک بقول مولانا مودودی صاحب حق کا نشان تھا مگر اُس ذات شریف کے بارے میں مولانا کا کیا ارشاد ہے جس نے حضرت زبیرؓ کو بحالتِ نماز شہید کر دیا اور خوشخبری لے کر حضرت علیؓ کے پاس پہنچا۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت علیؓ سے ہی فرما رکھا تھا یا علیؓ بشر قاتل ابن صفیہ بالنار، کہ علیؓ صفیہ کے بیٹے (زبیرؓ) کے قاتل کو جہنم کی خبر دے دو۔ فرمائیے یہ بزرگوار جنہوں نے زبیرؓ کو قتل کیا کس گروہ سے تعلق رکھتے تھے؟ کیا زبیرؓ کے قاتل کا جہنمی ہونا حضرت علیؓ کے موقف کو کمزور تو نہیں کرتا؟ اور اگر حضرت زبیرؓ عمارؓ کے حملہ کے نتیجہ میں عمارؓ کے ہاتھوں قتل ہو جاتے تو کیا خیال ہے مولانا کا حدیثِ رسولؐ کے بموجب عمارؓ بھی جہنمی ہوتے یا نہیں؟ اور پھر یہ باطل کس قسم کا تھا کہ باطل کی حمایت میں جو لوگ جمل کی جنگ میں قتل ہوئے حضرت علیؓ نے ان کی نماز جنازہ ادا کی اور ان کے حق میں دعائے مغفرت فرمائی اور ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ یہ لوگ جنتی ہیں۔

مولانا نے حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کے گروہ کو بار بار باغی گروہ فرمایا ہے لیکن اگر باغی گروہ کی نشانی یہ ہے کہ اُن کے ہاتھوں عمارؓ قتل ہوں گے

تو مولانا بھی عمار کے قتل کا انتظار فرما لیتے۔ عمار کے قتل ہونے سے پہلے طلحہؓ و زبیرؓ کو باغی قرار دینے کی کیا تک تھی۔ اور پھر کیا مولانا بتا سکیں گے کہ اگر عمار جمل کے میدان میں ہی قتل ہو جاتے تو ظاہر ہے کہ اصحابِ جمل یعنی طلحہؓ و زبیرؓ ہی باغی گروہ ٹھہرتے۔ تو پھر معاویہؓ کے باغی ہونے کی دلیل آپ کہاں سے مہیا کرتے جبکہ باغی گروہ صرف وہی تھا جس کے ہاتھوں عمار قتل ہوتے۔

بات کا ایک اور رُخ

بات کے اُلجھے ہوئے رُخ سے قطع نظر جس پر بحث کی مجبوری پیدا ہو گئی۔ عمار کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد فی نفسہٖ بھی گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں جمع و ترتیب کرنے والوں نے حضرت معاویہؓ سے زیادتی ہی کی ہے۔

مگر حدیث زیرِ بحث کے سلسلہ میں اپنی گزارشات پیش کرنے سے پہلے ہم مولانا مودودی صاحب کے سامنے زیرِ بحث مسئلہ کے ایک ایسے پہلو کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو اس پہلو سے اُنہیں بہت کچھ رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔

اس حدیثِ رسول پر بحث کرتے وقت یا اس کے بغیر بھی حضرت مولانا مودودی صاحب کی ساری توجہ اور ان کی فکری توانائیوں کا سارا زور حضرت معاویہؓ کو باغی ثابت کرنے پر ہی مرکوز رہا ہے اور وہ جیسے کیسے بھی حضرت علیؓ کو حق اور معاویہؓ کو باطل ثابت کرنے پر بضد ہیں۔

لیکن اگر وہ اپنی یادداشت کو تازہ کرنا چاہیں تو ہم عرض کریں گے کہ اُمت کے اختلافی مسائل میں اُن کا موقف یہ رہا ہے کہ وہ ایسے مراحل

پر اگر کتاب و سنت سے رہنمائی حاصل کرنے میں ناکام رہیں تو وہ حضرت امام ابو حنیفہ رح کے مذہب پر عمل کرتے ہیں یعنی خواہ حضرت امام ابو حنیفہ رح کے مقابلہ میں دوسرے آئمہ کا مذہب قرآن و سنت سے زیادہ قریب بھی ہو۔ وہ بہر حال ایسے مراحل پر امام ابو حنیفہ رح کی ہی تقلید کرتے ہیں۔

تو کیا وہ حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ کے بارے میں جب اصحابِ رسولؐ بھی آپس میں مختلف الخیال تھے، حضرت ابو حنیفہ رح سے مسئلہ دریافت نہیں کر سکتے تھے؟ اور ہم پورے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر مولانا حضرت معاویہؓ پر مبینہ بغاوت کے الزام کے بارے میں حضرت امام ابو حنیفہ رح سے دریافت کرتے تو وہ اُنہیں پورے اعتماد سے بتاتے کہ:

مولانا! امیر معاویہؓ اور اصحابِ معاویہؓ میں باغی لشکر کی شرائط نہیں پائی جاتی تھیں [1]

حضرت امام ابو حنیفہ رح کے علاوہ حضرت امام مالک اور حضرت امام احمد بن حنبل رح کا بھی یہی عقیدہ ہے [2]

علامہ محب الدین خطیب تحریر کرتے ہیں:

حضرت معاویہؓ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ جنگِ صفین میں ان کی حیثیت اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت کی ہرگز نہیں ہے کیونکہ اُنہوں نے اس جنگ کا آغاز نہیں کیا تھا، بلکہ معاویہؓ لڑائی کے لئے اس وقت نکلے تھے جب حضرت علیؓ نے کوفہ سے نکل کر شام (یعنی معاویہؓ کے ملک) پر حملہ کرنے کی نیت سے نخیلہ میں آکر پڑاؤ ڈال دیا تھا [3] مگر اس بات کو ستم ظریفی ہی کہنا چاہیئے کہ ریاست کے اصل

---

[1] المنتقیٰ ص ۲۶۶ [2] منہاج السنۃ
[3] العواصم من القواصم

باغیوں سے تو مولانا صاحب چشم پوشی فرماتے ہیں۔ یعنی جو لوگ درحقیقت باغی تھے جنہوں نے ایک ارشد خلیفہ کے خلاف بلوہ کیا، انہیں قتل کیا اور حدود اللہ کو پامال کیا۔ مولانا اُن کو علیؓ کی مجبوری بتا کر بات ختم کر دیتے ہیں جبکہ ایک مملکت گیر فساد اور مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل و خون کی پوری ذمہ داری اُنہی لوگوں کے سر ہے۔ مگر جن لوگوں نے حدود اللہ کی حفاظت کے لئے جدّوجُہد کی ان کو وہ بے دریغ باغی کہتے ہیں اور اُنہیں اپنے اس موقف پر اصرار بھی ہے۔

محب الدین خطیب تحریر کرتے ہیں:

میری ذاتی رائے یہی ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کے قتل سے لے کر جنگِ صفین سمیت جتنے بھی مسلمان مارے گئے ان سب کے قتل کی ذمہ داری حضرت عثمانؓ کے قاتلوں پر ہی عائد ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے فتنہ کے دروازے کھولے اور پھر ایک طویل عرصہ تک فتنہ کی آگ کو ہوا دیتے رہے۔

اگر حضرت عثمانؓ کے قتل کا سانحہ فاجعہ پیش نہ آتا تو نہ جنگِ جمل وقوع پاتی نہ صفین کی جنگ برپا ہوتی۔ پس جس طرح یہ فتنہ کار احمق قتلِ عثمانؓ کے مرتکب ہوئے۔ اسی طرح اس واقعہ کے بعد نہ تیغ ہونے والے تمام مسلمانوں کے قاتل بھی وہی ہیں۔

پھر ایک حضرت عمارؓ کا ہی کیا ذکر ہے۔ اس فتنہ کے مقتولین میں عمارؓ سے کہیں بڑھ چڑھ کر مرتبہ رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ جیسے حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور بالآخر خود حضرت علیؓ بھی اسی فتنہ کا شکار ہوئے۔ اور اُنہی فتنہ کار لوگوں کے ہاتھوں قتل ہوئے جنہوں نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا تھا۔ یہ سب لوگ حضرت علیؓ کے لشکر کا ہی حصہ تھے[1]

---

[1] العواصم من القواصم صفحہ ۲۸۲-۲۸۳ حاشیہ

المنتقیٰ میں حضرت امام ابو حنیفہؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ:

باغیوں کے خلاف بھی جنگ اس وقت ہی جائز ہے جب وہ حاکم وقت کے خلاف نبرد آزما ہوں۔

امام صاحب کے اس ارشاد پر حضرت علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ:

امام ابو حنیفہؒ کے اس قول کی بنیاد وہ آیۂ قرآنیہ ہے جہاں ارشاد ہے مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑتے ہوں تو ان میں صلح کرا دو۔ پھر جو گروہ زیادتی کرے اس کے خلاف لڑو۔[1]

مگر حضرت معاویہؓ کا معاملہ بالکل دوسرا ہے کیونکہ یہاں لڑائی کی ابتدا حضرت علیؓ کی طرف سے ہوئی ہے اور انہی کی طرف سے حملہ کیا گیا ہے۔ معاویہؓ دفاع کی مجبوری سے نکلے تھے اس لئے انہیں باغی نہیں کہا جا سکتا۔

چنانچہ حضرت امام مالک اس جنگ کو جنگِ فتنہ کہتے ہیں۔[2]

حضرت امام ابن تیمیہ کا ارشاد ہے:

اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ امام حق کے لئے بھی معصوم ہونا شرط نہیں ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ امام کی حمایت میں ہر اس شخص سے لڑائی کی جائے جو اس کی اطاعت کے دائرہ سے باہر ہو (جیسے حضرت معاویہ جو حضرت علیؓ کی اطاعت میں نہیں تھے)

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ معصیت میں بھی امام کی اطاعت کی جائے بلکہ اس حالت میں امام کا ساتھ چھوڑ دینا زیادہ افضل ہے، جس طرح علیؓ، معاویہؓ تصادم میں اصحاب رسولؐ کی کثیر تعداد نے حضرت علیؓ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔[3]

---

[1] سورہ حجرات [2] المنتقیٰ صـ ۳۶۶ - ۳۶۷

[3] منہاج السنۃ زیر عنوان حدیث عمار

حدیث عمّار کا متن

حدیث عمّار کے سلسلہ میں حضرت علامہ ابن حجرؒ نے بحث کا ایک رُخ یہ بھی پیش کیا ہے کہ حضرت امام بخاریؒ کی مرتب کردہ اصل کتاب میں وَیْحَ عَمَّارٍ کے بعد کی پوری عبارت موجود ہی نہیں تھی۔ حدیث کا یہ مبینہ حصہ بعد میں کسی مرحلہ پر اس روایت کے ساتھ شامل ہوا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ بخاری کے علاوہ بعض دوسری کتابوں میں یہ روایت اسی طرح موجود تھی اس لئے امتدادِ زمانہ سے کسی نے اس مضمون کو روایت کا ہی حصہ سمجھ کر بخاری میں بھی درج کر دیا ؎

حضرت ابن حجرؒ کی اس تحقیق کی تصدیق بزار میں وارد شدہ ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جو حدیث عمّار کے اسی الحاقی حصہ کے بارے میں خود حضرت ابو سعید خدریؓ سے ہی نقل ہوئی ہے جس کا ذکر حدیث بخاری میں حضرت عکرمہ کی زبان سے ہوا ہے۔

حضرت ابو سعیدؓ خدری فرماتے ہیں:

میں نے بعض لوگوں کی زبان سے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وَیْحَ عَمَّارٍ کے بعد یہ الفاظ بھی ارشاد فرمائے تھے تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ کہ اسے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔

اس پر حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ عمّار کا یہ پورا واقعہ میرے سامنے گزرا ہے۔ میں اس موقع پر وہیں موجود تھا۔ میں نے حضورؐ کی یہ بات اپنے کانوں سُنی ہے آپ نے وَیْحَ عَمَّارٍ کے سوائے اور کچھ نہیں کہا تھا۔

؎ فتح الباری شرح صحیح بخاری بعنوان حدیث عمّار۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کے اس ارشاد کے بموجب بات صرف اتنی ہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عمار کو دوسرے سب لوگوں سے زیادہ مشقت کرتے پایا، اُن کے کپڑے مٹی سے آلودہ تھے اور زیادہ تھکے ماندے معلوم ہوتے تھے تو آپ کی محبت نے جوش مارا اور از راہِ ہمدردی آگے بڑھ کر اُس کے کپڑوں سے مٹی جھاڑنے لگے اور فرمایا۔ اُف اُف، عمار نے یہ اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ اور بس۔

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں بخاری شریف کی اس حدیث کے بارے میں کسی منقولی یا عقلی جمع و ترتیب یا کسی مزید تحقیق کی حاجت ہی نہیں ہے۔ بڑی سیدھی بات ہے کہ حدیثِ رسولؐ کے بموجب حضرت عمارؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ اور ہم بدلائل جانتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ اور ان کا گروہ سرے سے باغی ہی نہیں تھے۔ ایسی صورت میں حدیث کے یہ الفاظ انہیں کیونکر مؤثر ہو سکتے ہیں اور ان الفاظ سے ہمارے مؤقف پر کیا اثر پڑتا ہے۔

ان کو بلاشبہ حضرت علیؓ سے لڑنے جھگڑنے کی مجبوری پیدا ہو گئی تھی مگر علیؓ سے لڑائی ان کے باغی ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت علیؓ سے جنگ کرنا ان کے نزدیک امام عادل کے خلاف جنگ نہیں تھی جو ان کی بغاوت کی دلیل بن سکتی۔

پھر باغی کون ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ جب حدیثِ رسولؐ میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا اور مشہور یہی ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے گروہ کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ اب اگر عمار کو قتل کرنے کے باوجود معاویہؓ اور ان کا گروہ باغی گروہ نہیں ہے

تو پھر حدیثِ رسولؐ کا کیا بنا اور وہ باغی گروہ کون ہے جس کو حدیثِ رسولؐ کے بموجب باغی کہا جا سکے اور جس کے ہاتھوں عمارؓ کا قتل وقوع میں آیا ہو؟

یہ ایک بڑا ہی سیدھا سوال ہے اور اس کا جواب بھی نہایت ہی سیدھا ہے کہ عمارؓ کو فی الواقعہ ہی باغی گروہ نے قتل کیا تھا۔ حدیثِ رسولؐ میں بعد میں داخل کردہ الحاقی عبارت کے بارے میں اگر حضرت ابن حجرؒ کی تحقیق کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور یہی بات مان لی جائے کہ عمارؓ کے قتل کی بات بھی حضورؐ کی بات ہی ہے تب بھی کوئی اُلجھن موجود نہیں ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ عمارؓ کا قاتل باغی گروہ ہی تھا۔

مگر یہ باغی گروہ وہ نہیں جسے کوئی اپنی سیاسی ضرورتوں سے باغی کہہ دے بلکہ باغی اُنہی لوگوں کو کہا جائے گا جن کی بغاوت ثابت اور جن کو باتفاق ہر مکتبِ فکر نے ہر زمانہ میں ہی باغی کہا ہے، باغی سمجھا ہے اور باغی قرار دیا ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے مولانا مودودی صاحب سمجھتے ہیں کہ باغی گروہ وہ ہے جس نے حضرت علیؓ سے لڑائی کی یعنی اُن کے نزدیک طلحہؓ باغی تھے، زبیرؓ باغی تھے اور معاویہؓ باغی تھے۔

مگر یہ عجیب ہی بات ہے کہ جو لوگ باغی نہیں تھے مولانا اُن کو باغی کہتے ہیں اور جو دراصل باغی تھے اُن کو مولانا مودودی صاحب حضرت علیؓ کی مجبوری کہہ کر آگے نکل جاتے ہیں۔

جبکہ صحیح یہ ہے کہ باغی وہ نہیں تھے جو علیؓ کے مقابلہ پر تھے بلکہ باغی وہ ہیں جو حضرت علیؓ کے لشکر میں تھے اور اپنی مجبوری سے حضرت علیؓ کی طرف سے لڑ رہے تھے اور عمارؓ کو بھی انہی باغیوں نے ہی قتل کیا تھا جنہوں نے خلیفہ ارشد حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کی اور بالآخر اُنہیں قتل کیا۔ ان باغیوں کو مولانا مودودی بھی باغی اور بلوائی مانتے ہیں اور دنیا کی ساری تواریخ

ان کو باغی قرار دیتی ہیں۔ مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر اُن کو باغی سمجھتے ہیں پھر جب وہ اپنی زندگی کے ہر رُخ سے باغی مانے گئے ہیں تو عمار کے قتل کے مرحلہ پر مولانا کو یہ باغی کیوں فراموش ہو جاتے ہیں۔ انہی باغیوں نے عمارؓ کو قتل کیا تھا اور فی الواقع ہی عمارؓ جس گروہ کے ہاتھوں قتل ہوئے وہ باغیوں کا ہی گروہ تھا۔

اگر عمارؓ کے بارے میں کوئی روایت مشہور تھی کہ اُسے ایک باغی گروہ قتل کرے گا تو ظاہر ہے کہ باغیوں کے لئے عمار کو قتل کر کے عمارؓ کے مقابلہ میں لڑنے والے گروہ کو باغی گروہ کہہ کر بدنام کرنے کا موقع اس سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

ان باغیوں کو عمارؓ کے قتل کی غرض سے نہ کوئی خاص اہتمام کرنے کی حاجت تھی نہ کسی سازش کی ضرورت تھی۔ عمارؓ اُن کے پہلو بہ پہلو اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے، سوتے جاگتے تھے، وہ جب چاہتے انہیں قتل کر کے معاویہؓ اور اُن کے گروہ کو باغی مشہور کر سکتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے پوری کامیابی سے اپنے پروگرام کو نبھایا، عمارؓ کو قتل کیا اور معاویہؓ کو باغی بنا دیا۔ اس سے سستا سودا انہیں کہاں سے مل سکتا تھا۔ یہ ایک سیاسی مسئلہ تھا، سیاسی اجتماع تھا، اس جنگ کا اوّل و آخر سیاسی تھا اور سیاست میں سب کچھ ممکن ہے۔

مولانا مودودی صاحب کے لئے تو خصوصیت سے اس معاملہ میں تعجب والی کوئی بات نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ وہ خود ایک ایسے ہی واقعہ کی خبر دے چکے ہیں اور اپنی خبر کو صحیح بھی سمجھتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

مشہور روایات کے مطابق حضرت طلحہؓ کو مروان بن الحکم نے قتل کر دیا تھا [1]

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۳۰

اور پھر مولانا نے اپنی اس خبر کی صحت پر بڑے ہی اعتماد کے ساتھ علامہ طبری، ابنِ اثیر اور علامہ ابنِ کثیر کو گواہ پیش کیا ہے۔ اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ مروان رض حضرت طلحہ رض کے لشکر کا حصہ تھے۔ حضرت طلحہ رض کی کمان میں لڑتے تھے، حضرت طلحہ رض کی فوج کے ایک سپاہی تھے اور یہ بات مولانا کے لئے بھی ناقابلِ فہم نہیں ہونی چاہیئے کہ اگر مروان رض اپنی کسی غرض سے اپنے سردار کو قتل کر سکتے ہیں تو عثمان کے قاتل اور خلیفہ ارشد کے باغی اپنے مفاد سے حضرت عمار کو کیوں قتل نہیں کر سکتے تھے!

عثمان رض کے قاتلوں اور اُمت کے اندر ایک مسلمہ باغی گروہ کی اس کارروائی سے سب سے بڑا فائدہ خود مولانا مودودی صاحب کو ہی حاصل ہوا ہے۔ جب اُنہیں باغیوں کی اس کارروائی سے حضرت معاویہ رض کو باغی قرار دینے کی زبردست دلیل مہیا ہو گئی۔

مروان رض کی طرف سے حضرت طلحہ رض کو قتل کرنے کے مقابلہ میں حضرت علی رض کے لشکر میں پناہ گزین فِئَۃُ الْبَاغِیَہ کے لئے عمار کو قتل کرنا زیادہ قریب الفہم ہے۔ کیونکہ مروان رض کی کارروائی سے مستقبل کی تاریخ کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی جبکہ اس باغی گروہ کی کارروائی نے ان کے حسبِ منشا مسلمانوں کے اندر اختلافات کا ایسا بیج بو دیا جس کا تلخ پھل ہمیشہ کھاتے رہنے کی مجبوری پوری اُمت کا مقدر بن گئی ہے۔

خوفناک تاریخی دھماکہ

حدیث عمار کے سلسلہ میں یہ ساری بحث ہم نے محض مولانا مودودی صاحب کی طرف سے حضرت معاویہ رض کے خلاف اس فتویٰ کی وجہ سے ہی کی ہے جو انہوں نے اس حدیث کو دلیل بنا کر حضرت معاویہ رض کے خلاف صادر کر رکھا ہے۔

اور اس بحث سے ہمارا مقصود صرف اتنا ہی ہے کہ بات کا یہ رُخ بھی واضح ہو جائے اور مولانا کے غلط اور غیر محل استدلال کی وجہ سے پھیلنے والی گمراہی کا سدِباب ہو سکے اور تاریخ کے اس رُخ کو اغراض کے تاریک سائے تحقیق اور تجسس کی روشن آنکھ سے اوجھل نہ کر سکیں ورنہ اس بحث کی فی الحقیقت ضرورت نہیں تھی کیونکہ جہاں اہلِ سیاست کی سازشوں اور چالوں نے اپنی ضرورت سے ایسی روایات کی تخلیق کروا رکھی ہے جن کو مولانا استعمال کر سکیں اور جن کے بموجب متعصب گروہی راوی حضرت عمارؓ کو جمل کے میدان میں طلحہؓ اور زبیرؓ کے خلاف مصروفِ جنگ دکھاتے ہیں اور پھر اُنہی روایات کے بموجب زبیرؓ جونہی عمار کو وہاں پاتے ہیں تو سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ کر لڑائی سے دستبردار ہو جاتے ہیں کہ مبادا عمار کا قتل اُن کو باغی گروہ بنا کر رکھ دے۔

اور پھر یہ راوی وہاں سے عمار کو صفین کے میدان میں لے آتے ہیں اور پھر اسے حضرت معاویہؓ کے گروہ کے ہاتھوں قتل کروا کر معاویہؓ اور اُن کے گروہ کو باغی گروہ بناتے ہیں۔

وہاں تاریخ اپنے دامن میں ایسے دھماکے بھی محفوظ رکھتی ہے، جن کی روشنی میں یہ ساری تخلیقات اور ہوائی روایات هَبَآءً مَّنثُورًا بن کر رہ جاتی ہیں۔

مولانا مودودی صاحب ان دھماکوں سے بے خبر نہیں ہیں مگر وہ اُنہیں اپنے خلاف مفاد پا کر ان سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔ لیکن یہ دھماکے اُن کے قارئین کے لئے ایک انکشاف کی حیثیت ہی رکھتے ہیں۔

ہمارے قارئین یقیناً تاریخ کے اس رُخ کو انکشاف ہی کہیں گے اور واضح رہے کہ اس انکشاف کے بعد مولانا کی تاریخی صنعت کاری کا پورا ایوان منہدم ہو جاتا ہے اور اس ڈرامہ کا ڈراپ سین ہو جاتا ہے جسے مولانا نے حضرت

معاویہؓ کو باغی ثابت کرنے کے لئے تاریخ کے گھپلوں سے ترتیب دے رکھا ہے۔

مولانا کی مساعی کا احترام اپنی جگہ مگر ہم اپنے قارئین کو اُسی تاریخ کا اگلا ورق اُلٹنے کی تکلیف دیتے ہیں۔ جہاں سے مولانا اپنے ایوانِ سیاست کی تعمیر کے لئے حمّاءٍ مَسنُون کے ذخیرے فراہم کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی زندگی میں ہی جب سبائی سازش بڑی کامیابی سے اسلامی حکومت کے خلاف سرگرمِ عمل تھی اور اس سازش کی کامیابی کا ایک بڑا سبب بعض مسلمانوں کا اپنی اغراض سے باغیوں کے ساتھ تعاون تھا۔ سبائی سازشی عثمانؓ اور عثمانی عمّال کے خلاف بالکل غیر واقعی اور بے بنیاد شکایات کی بنا پر شورش پھیلا رہے تھے۔ صورتحال جب خراب ہونے لگی تو حضرت عثمانؓ نے اکابر صحابہ کے مشورہ سے تفحصِ حال کی غرض سے سازش کے تینوں مراکز کوفہ، بصرہ اور مصر میں اپنے نمائندے بھیجے تاکہ وہ شورش کے اسباب و شکایات کی حقیقت معلوم کر کے مرکز کو رپورٹ کریں۔ اس غرض سے مصر کے لئے حضرت عمّارؓ بن یاسر کو منتخب کیا گیا۔

اب یہ بات تو معلوم نہیں کہ اس غرض سے مصر کے لئے حضرت عمّار کا انتخاب کیوں اور کس کے مشورہ یا کس مجبوری سے عمل میں آیا کیونکہ حضرت عثمانؓ کے باب میں حضرت عمّار اچھی شہرت نہیں رکھتے تھے اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت عمّار حضرت عثمانؓ کے خلاف مصری باغیوں کی سازش میں شامل تھے۔ مگر صورت جو بھی پیش آئی مصر کے لئے حضرت عمّار کو ہی منتخب کیا گیا۔ اب اگلی کہانی یوں بیان ہوئی ہے:

عمّار جب اپنی کارکردگی کے بعد مدینہ کی طرف واپس لوٹے تو نہ جانے مصری سازشیوں اور باغیوں کو اُن کے بارے میں کیا شبہ گزرا کہ اُنہوں نے اُن کا تعاقب کر کے راستہ میں ہی جا لیا اور دھوکہ سے گھیر کر قتل کر دیا۔ اس سلسلہ میں حضرت عمّار کے جن قاتلوں کا نام ذکر ہوا ہے وہ تینوں کے تینوں مصری باغیوں اور بلوائیوں کے سرغنہ خالد بن ملجم، سودان بن حمران اور کنانہ

بن بشر ہیں [1]

علامہ طبری مزید رقمطراز ہیں کہ:

ملعون باغی گروہ نے حضرت عثمانؓ کے نمائندہ حضرت عمار کو کسی شبہ کے سبب مصر سے مدینہ جاتے راستہ میں قتل کر دیا اور پھر آگے چل کر اسی ملعون گروہ نے حضرت عثمانؓ کو بھی شہید کیا [2]

اس واضح شہادت کی موجودگی میں مولانا مودودی صاحب نے صرف انہی روایات کو اپنے ہاں شرف تبولیت بخشا پسند کیا ہے جن کو اہل سیاست نے اپنی ضرورت سے تخلیق بخشی ہے تاکہ انہیں اپنے پہلے سے ہی طے کردہ موقف کی تائید مہیا ہو سکے۔

علامہ طبری کی یہ شہادت ایسی نہیں جسے مولانا مسترد کر سکیں۔ کیونکہ اس مورخ کے بارے میں خود مولانا مودودی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ابن جریر طبری جن کی جلالت قدر بحیثیت مفسر، محدث، فقیہہ اور مورخ مسلّم ہے۔ علم اور تقویٰ دونوں کے لحاظ سے ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ ان کو قضاء کا عہدہ پیش کیا گیا اور انہوں نے انکار کر دیا۔ دیوان المظالم کی صدارت پیش کی گئی اور اس کو بھی انہوں نے قبول نہ کیا۔

چند سطور بعد مزید ارشاد ہے:

تاریخ میں کون ہے جس نے ان پر اعتماد نہیں کیا ہے خصوصیت سے دور فتنہ کی تاریخ کے معاملہ میں تو محققین انہی کی آراء پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں [3]

علاوہ ازیں مولانا مودودی صاحب نے اپنی اسی کتاب میں حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ، ان کے رفقاء، ان کے عمال حکومت، گورنروں دوسرے انتظامی حکام اور ان کے اعزہ واقرباء کے بارے میں تاریخ کی ہر خساست جن کتابوں کے حوالہ سے اپنی کتاب کی زینت بنائی ہے ان میں طبری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے [4]

---

[1] تلخیص طبری جلد ۵ [2] طبری جلد ۵ صد ۱۰۴ [3] خلافت وملوکیت صد ۳۱۲
[4] خلافت وملوکیت از صد ۱۶۲ تا صد ۱۸۶ اور صد ۲۹۹ تا صد ۳۴۶

پھر کوئی وجہ نہیں کہ مولانا اپنے اتنے بڑے معتمد علیہ مورخ کی اس عظیم شہادت کو ردّ کر دیں اور محض اپنی گروہی عصبیت کی تسکین کے لئے ہی فوت شدہ عمّار کو قبر سے نکال کر کبھی جمل کے میدان میں لئے پھریں اور کبھی انہیں صفین کے محاربہ میں لا کھڑا کریں اور جو بزرگ ایک بار قتل ہو چکے ہیں انہیں دوبارہ اس لئے قتل کرائیں کہ معاویہؓ کو باغی ثابت کیا جا سکے۔

اب اگر مولانا مودودی صاحب کے ان معتبر مورخ کی روایت صحیح ہے تو مولانا کو اس حدیثِ رسولؐ کے سمجھنے میں کوئی مشکل باقی نہیں رہے گی جہاں ارشاد ہے کہ عمّار کو باغی گروہ قتل کرے گا اور ظاہر ہے کہ ان کے تینوں قاتل خالد بن ملجمؓ سودان بن حمران، اور کنانہ بن بشر باغیوں کے ہی سوار تھے۔

حضرت عمارؓ کی پہیلی

حضرت معاویہؓ اور ان کے گروہ کو باغی ثابت کر چکنے کے بعد اب مولانا کے ہاتھوں اپنی مسلمہ معتمد تاریخی کتب کی یہ پہیلی حل کر کے بھی تاریخ کے طالب علم پر احسان فرماتے جائیں :

- عمارؓ حضرت عثمانؓ کے سخت دشمن تھے، انہیں کافر کہتے تھے اُن کی خلافت کے خلاف سازشوں میں شریک تھے اور باغی جب کبھی مدینہ آتے تو عمارؓ کے پاس ہی ٹھہرتے تھے (طبری جلد ۳)
- ۳۴ھ میں حضرت عمارؓ حضرت عثمانؓ کی طرف سے سفیر بن کر مصر گئے تا کہ شورش بپا کرنے والوں کی شکایات معلوم کریں۔ اس وقت حضرت عمارؓ کی عمر ۹۰ برس سے متجاوز تھی (طبری جلد ۳ جلد ۵)
- مصر سے واپس آتے، باغیوں نے انہیں گھیر لیا اور قتل کر کے ان کی لاش ٹھکانے لگا دی (تلخیص طبری جلد ۵ ابن خلدون جلد ۳)
- (اپنے قتل کے) اگلے برس ۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ پر حملہ کے دوران میں وہ قاتل بلوائیوں کے مددگار تھے (طبری جلد ۳)
- (قتل سے تیسرے برس) ۹۳ برس کی عمر میں وہ مدینہ سے چل کر بصرہ پہنچے اور حضرت علیؓ کی طرف سے جنگِ جمل میں شریک ہوئے (طبری جلد ۳)
- (اپنی موت کے چوتھے برس) ۳۷ھ میں وہ حضرت علیؓ کی فوجوں میں شامل ہو کر شام کی جانب نکلے اور صفین کے مقام پر حضرت معاویہؓ کے ہاتھوں انہوں نے پھر قتل ہو کر حضرت معاویہؓ کے گروہ کو باغی گروہ ثابت کر دیا۔ فجزاہ اللہ۔

(ملخص خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۴۷)

عمر شد پریشاں خراب من از کثرتِ تعبیر ہا

باب سوم

ملوکیّت کی مرحلہ وار کہانی

فصل اوّل

خلافتِ راشدہ سے ملوکیّت تک

خلافتِ راشدہ کیا ہے؟

مولانا مودودی فرماتے ہیں:

خلافتِ راشدہ جس کے امتیازی خصائص اور بنیادی اصول گزشتہ صفحات (خلافت وملوکیت) میں بیان کئے گئے ہیں۔ حقیقت میں محض ایک سیاسی حکومت نہ تھی بلکہ نبوت کی مکمل نیابت تھی۔

یعنی اس کا کام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ملک کے نظم ونسق کو چلائے، امن قائم کرے اور سرحدوں کی حفاظت کرتی رہے۔ بلکہ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں معلّم، مربّی اور مرشد کے وہ تمام فرائض انجام دیتی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیاتِ طیبہ میں انجام دیا کرتے تھے۔

اور اس کی ذمہ داری تھی کہ دارالاسلام میں دینِ حق کے پورے نظام کو اس کی اصل شکل وروح کے ساتھ چلائے اور دنیا میں مسلمانوں کی پوری اجتماعی طاقت اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی خدمت پر لگادے۔ اس

بنا پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ صرف خلافتِ راشدہ ہی نہ تھی بلکہ خلافت مرشدہ بھی تھی [1]

یہی خلافت راشدہ ہے، یہی خلافت نبوت اور خلافت علے منہاج النبوۃ ہے۔

مولانا مودودی صاحب نے اس خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے کے چھ خاص مراحل بیان کئے ہیں اور بعد میں ایک مزید مرحلہ آخری مرحلہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔

ہم یہاں پہلے ہر مرحلہ پر مولانا کی طویل بحث کا اختصار بطور خلاصۂ بحث خود مولانا کے اپنے الفاظ میں ہی پیش کریں گے اور پھر اس کے بارے میں اپنی گزارشات نذرِ قارئین کریں گے۔

ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ اس اختصار کے الفاظ اور الفاظ کی ترتیب اور بندشیں تک خود مولانا کے اپنے الفاظ میں ہی بیان ہوں۔ تاکہ نہ صرف مولانا کی عبارت کا پورا مفہوم مولانا کے الفاظ میں بیان ہو سکے بلکہ عبارت کا مطلب بھی کہیں خبط نہ ہونے پائے۔ تاہم قارئین اگر کہیں کوئی کوتاہی پائیں تو توجہ دلانے پر ہم اس کوتاہی کے فوری ازالہ پر آمادہ ہیں۔

مولانا مودودی صاحب نے اپنی بات حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شروع کی ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک جا کر ختم کی ہے اور خلافتِ راشدہ سے انحراف کی پوری بحث انہی دونوں بزرگوں کے گرد گھومتی ہے۔

ضمناً اگرچہ انہوں نے اپنی بحث میں اُن دونوں بزرگوں کے چند ساتھیوں

---

[1] خلافت وملوکیت صد ۱۰۵

کو بھی ان کی شخصیت اور اہمیت کے مطابق اُنہیں پورا حصہ دیا ہے مگر بحث کے بنیادی کردار یہی دونوں بزرگ ہیں۔

یہاں ہماری گزارشات سے مطلوب اگرچہ اصل میں حضرت معاویہؓ پر مولانا کی زیادتیوں کا دفاع ہی ہے مگر بات کو سیدھا رکھنے کی غرض سے یہاں ہم ان دوسرے معتوب بزرگوں کا ذکر بھی کریں گے جن کو مولانا نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ ابواب واساسین ملوکیت قرار دیا ہے۔ تاکہ مرحلہ وار کہانی کے بیان میں خلا کی موجودگی بات کے فہم میں حائل نہ ہو۔

ملوکیّت کا پہلا مرحلہ

دورِ عثمانی ــــ جب ملوکیّت نے اسلام میں دخل پایا

مولانا کی مبینہ ملوکیت کا پہلا مرحلہ از اوّل تا آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گرد ہی گھومتا ہے اور مولانا نے اپنی گفتگو کی بنیاد مندرجہ ذیل روایت پر رکھی ہے۔

حضرت عمرؓ کو اپنے آخری زمانہ میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اُن کے بعد عرب کی قبائلی عصبیتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود ابھی بالکل ختم نہیں ہوگئی تھیں) پھر نہ جاگ اُٹھیں اور اُن کے نتیجے میں اسلام کے اندر فتنے برپا ہوں۔

چنانچہ ایک مرتبہ اپنے امکانی جانشینوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اُنہوں نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے حضرت عثمانؓ کے متعلق کہا کہ اگر میں اُن کو اپنا جانشین تجویز کروں تو وہ بنی ابی مُعَیط (بنی اُمیّہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمانؓ یہی کریں گے۔

اور اگر عثمانؓ نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب کریں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمانؓ کو قتل کر دیں گے [1]

حضرت عثمانؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ کے خدشات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حضرت عمرؓ کے ہی حوالہ سے اگلی بات اُٹھاتے ہیں۔

چھ آدمیوں کی انتخابی شوریٰ کے لئے اُنہوں نے جو ہدایات چھوڑیں اُن میں دوسری باتوں کے علاوہ ایک یہ بات بھی شامل تھی کہ منتخب خلیفہ اس بات کا پابند رہے کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے گا۔ مگر بدقسمتی سے خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ اس معاملے میں معیار مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔ ان کے عہد میں بنی اُمیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے عطیے دیئے گئے ...... اس کا نتیجہ آخر کار وہی ہوا جس کا حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا۔ اُن کے خلاف شورش برپا ہوئی اور صرف یہی نہیں کہ وہ خود شہید ہوئے بلکہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سُلگ اُٹھیں۔ جن کا شعلہ خلافتِ راشدہ کے نظام ہی کو پھونک کر رہا [2]

تھوڑا آگے چل کر "تغیر کا آغاز" کے عنوان سے مولانا نے اپنی مہم کا باقاعدہ آغاز کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اس تغیر کا آغاز ٹھیک اُسی مقام سے ہوا جہاں سے اس کے رونما ہونے کا حضرت عمر فاروقؓ کو اندیشہ تھا۔

اپنی وفات کے قریب زمانہ میں سب سے بڑھ کر جس بات سے وہ ڈرتے تھے وہ یہ تھی کہ کہیں اُن کا جانشین اپنے قبیلے اور اپنے اقربا کے معاملہ میں اُس پالیسی کو نہ بدل دے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۹۸-۹۹ [2] ایضاً صہ ۹۹-۱۰۰

اُن کے زمانے تک چلی آ رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پورے عہدِ حکومت میں حضرت علیؓ کے سوا بنی ہاشم میں سے کسی کو بھی کوئی عہدہ نہ دیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنے قبیلے اور خاندان کے کسی شخص کو سرے سے کسی منصب پر مامور نہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دس سال کے عہد میں بنی عدی کے صرف ایک شخص کو ایک چھوٹے سے عہدے پر مقرر کیا اور اس سے بھی اُن کو بہت جلد سبکدوش کر دیا[1]

یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں قبائلی عصبیتوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملا.... لیکن اُن کے بعد جب حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ

---

[1] مولانا کو یاد نہیں رہ سکا کہ وہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کے خاندان سے دو آدمیوں کا ذکر کر آئے ہیں جن کو فاروقِ اعظمؓ نے مناصبِ حکومت عطا کئے تھے۔ ایک حضرت نعمان بن عدی جن کو حضرت عمرؓ نے میسان کا تحصیلدار مقرر کیا تھا اور دوسرے حضرت عمرؓ کے بہنوئی حضرت قدامہ بن مظعون جن کو انہوں نے بحرین کا عامل مقرر کیا تھا مگر ان دونوں بزرگوں کی واپسی یا برطرفی اس لئے عمل میں نہیں آئی تھی کہ حضرت عمرؓ انہیں اپنے خاندان کے افراد ہونے کی وجہ سے قائم نہیں رہنے دینا چاہتے تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ انہیں مقرر ہی کیوں کرتے؟ بلکہ جیسا کہ مولانا نے خود بھی لکھا ہے کہ ان دونوں کو اُن کے جرائم کے نتیجہ میں برطرف کیا گیا تھا۔ اوّل الذکر کا جرم معمولی تھا اس لئے اُسے صرف معزول ہی کیا، مگر قدغن لگا دی کہ ان کو آئندہ کوئی عہدہ نہ ملے اور دوسرے بزرگ پر حد جاری کی گئی تھی (خلافت و ملوکیت صہ ۹۸ حاشیہ نمبر ۴۰)

اس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔

اُنہوں نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور اُن کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں۔ جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں[1]

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو معزول کر کے اُنہوں نے کوفے کی گورنری پر اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عُقبہ بن ابی مُعیط کو مقرر فرمایا اور اس کے بعد یہ منصب اپنے ایک اور عزیز سعید بن عاص کو دیا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کو بصرے کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر کو ان کی جگہ مامور کیا۔ حضرت عمرو بن العاص کو مصر کی گورنری سے ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سَرح کو مقرر کیا۔

حضرت معاویہؓ سیدنا عمرؓ فاروق کے زمانے میں صرف دمشق کی ولایت پر تھے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی گورنری میں دمشق، حمص، فلسطین، اردن اور لبنان کا پورا علاقہ جمع کر دیا۔ پھر اپنے چچازاد بھائی مروان بن الحکم کو اُنہوں نے اپنا سیکرٹری بنا لیا جس کی وجہ سے سلطنت کے پورے دَر و بست پر اس کا اثر و نفوذ قائم ہو گیا۔ اس طرح عملاً ایک ہی خاندان کے ہاتھ میں سارے اختیارات جمع ہو گئے[2]

مزید ارشاد ہے:

اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اپنے خاندان کے جن لوگوں کو

---

[1] ان دوسری عنایات کی مثال میں مولانا نے لکھا ہے "مثال کے طور پر انہوں نے افریقہ کے مالِ غنیمت کا پورا خمس (۵ لاکھ دینار) مروان (اپنے چچازاد بھائی) کو بخش دیا" (خلافت و ملوکیت صد ۱۰۶ حاشیہ نمبر ۲) [2] ایضاً صد ۱۰۷ - ۱۰۸

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے حکومت کے یہ مناصب دیئے۔ انہوں نے اعلیٰ درجے کی انتظامی اور جنگی قابلیتوں کا ثبوت دیا۔ اور اُن کے ہاتھوں بہت سی فتوحات ہوئیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ قابلیت صرف اُنہی لوگوں میں نہ تھی دُوسرے لوگ بھی بہترین قابلیتوں کے موجود تھے اور اُن سے زیادہ خدمات انجام دے چکے تھے۔ محض قابلیت اس بات کے لئے کافی دلیل نہ تھی کہ خراسان سے لے کر شمالی افریقہ تک کا علاقہ ایک ہی خاندان کے گورنروں کی ماتحتی میں دے دیا جاتا اور مرکزی سیکرٹریٹ پر بھی اُسی خاندان کا آدمی مامور کردیا جاتا۔

یہ بات اوّل تو بجائے خود قابلِ اعتراض تھی کہ مملکت کا رئیسِ اعلیٰ جس خاندان کا ہو مملکت کے تمام اہم عہدے اُسی خاندان کے لوگوں کو دے دیئے جائیں مگر اس کے علاوہ چند اسباب اور بھی تھے جن کی وجہ سے اس صورتِ حال نے اور زیادہ بے چینی پیدا کردی۔

اوّل، یہ کہ اس خاندان کے جو لوگ دورِ عثمانی میں آگے بڑھائے گئے۔ وہ سب طُلَقَاء میں سے تھے۔

دوسرے یہ کہ اسلامی تحریک کی سربراہی کے لئے یہ لوگ موزوں بھی نہ ہو سکتے تھے، کیونکہ وہ ایمان تو ضرور لے آئے تھے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے اُن کو اتنا فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ بہترین منتظم اور اعلیٰ درجے کے فاتح تو ہو سکتے تھے اور فی الواقع وہ ایسے ہی ثابت بھی ہوئے۔ لیکن اسلام محض ملک گیری اور ملک داری کے لئے ہی تو نہیں آیا تھا۔

تیسرے یہ کہ اُن میں سے بعض کا کردار ایسا تھا کہ اُس دَور کے پاکیزہ ترین اسلامی معاشرہ میں اُن جیسے لوگوں کو بلند مناصب پر مقرر کرنا کوئی اچھا اثر پیدا نہ کر سکتا تھا[1]

---

[1] خلافت و ملوکیت ملخص از ص ۱۰۹ تا ص ۱۱۱

یہ تھے وہ وجوہ جن کی بنا پر حضرت عثمانؓ کی یہ پالیسی لوگوں کے لئے اور بھی زیادہ بے اطمینانی کی موجب بن گئی۔

خلیفۂ وقت کا اپنے خاندان کے آدمیوں کو پے درپے مملکت کے اہم ترین مناصب پر مامور کرنا بجائے خود کافی وجۂ اعتراض تھا۔ اس پر جب لوگ دیکھتے تھے کہ آگے لائے بھی جا رہے ہیں تو اس طرح کے اشخاص تو فطری طور پر اُن کی بے چینی ہیں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا[1]

اور مولانا مودودی صاحب کے نزدیک حضرت عثمانؓ کی یہی پالیسی دراصل خلافتِ راشدہ کے خصائص سے انحراف کے مترادف اور خلافت سے ملوکیت کی طرف پہلے قدم کے قائم مقام تھی اور پھر اسی پر مولانا نے اسلام کے اندر ملوکیت کے دخل وعمل کا پہلا مرحلہ ختم کیا ہے۔

مولانا مودودی صاحب نے اپنی مرحلہ شماری کے پہلے مرحلہ میں ملوکیت کو اسلام کے اندر داخل کرنے کی ذمہ داری خلیفۂ رسول حضرت عثمانؓ ذوالنورین پر ڈالتے ہوئے حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے مکالمے پر مشتمل جس روایت کو اپنی مہم کی بنیاد کار بنایا ہے۔ ہم اُسے پچھلے صفحات میں مولانا کی زیرِ بحث کتاب کے حوالے سے پہلے مرحلہ کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے درج کر آئے ہیں۔

اس روایت کو اگر ہم خود مولانا کی ہی تجویز کردہ درایت کی ترازو میں اتاریں تو شائد اس سے زیادہ ہلکی روایت کم ہی مل سکے گی۔

تاریخ اور سیر کی کتابوں میں ایسی لاطائل روایات بھی موجود ہیں کہ اگر ان کو مدارِ بحث بنانے کی رسم چل نکلے تو ماضی کے بزرگانِ کرام تو رہے ایک طرف، آنکھوں کے سامنے بسنے والے لوگ بھی اپنی آبرو محفوظ نہیں رکھ سکیں گے

---

[1] خلافت وملوکیت ملخص از صہ ۱۱۴ تا ۱۱۵

مولانا کو معلوم ہوگا کہ ایسی لغو اور لاطائل باتیں خود ان کی ذات کے بارے میں بھی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔

ماضی میں خود انہی کے فیض یافتہ اور معنوی فرزند جناب کوثر نیازی صاحب نے مولانا کے بارے میں اپنے دستاویزی اور غیر دستاویزی بیانات سے ملکی اخبارات کو جو شہ سرخیاں مہیا کی تھیں۔ اگر کوئی ان کو سچ مان کر کہانی لکھنے بیٹھے تو وہ کیا کچھ ناگفتنی نہیں کہے گا! پھر کیا ایسے بیانات کو محض اس لئے سچ مان لیا جائے کہ وہ اخبارات میں طبع ہوئے ہیں اور دیر تک ایک اخبار سے دوسرے اخبار میں نقل ہوتے رہے ہیں۔

کیا مولانا کی نقل کردہ روایت کو محض اس لئے صحیح قرار دے لیا جائے کہ حضرت نے اس کو بڑی بڑی کتابوں سے نقل کیا ہے اور مولانا مودودی صاحب جن مفتریات کے بل بوتے پر اصحاب رسول ﷺ کی آبرو سے کھیلتے ہیں کیا وہ نہیں جانتے کہ ان راویوں میں ایسے ایسے مفتری اور صنعت ساز لوگ موجود ہیں جنہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن عصمت پر بھی دھبوں کی نشاندہی کر رکھی ہے۔ "الاستیعاب" کے حوالہ سے مولانا نے حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا جو مکالمہ نقل فرمایا ہے الاستیعاب کی دوسری بہت سی وضعی روایات کی طرح یہ بھی ایک وضعی داستان ہی ہے۔ اور روایت کے اسلوب پر بادنیٰ غور و تعمق ہی یہ بات کھل جاتی ہے کہ یہ کہانی کسی ضرورت سے بنی ہے۔ ورنہ عمرؓ جیسے خشیتِ الٰہی کے حامل شخص کے منہ سے ایسی بے احتیاطی کی بات کیونکر نکل سکتی ہے۔ جس کے لئے محشر میں کسی ادنیٰ سی جواب طلبی کا خطرہ بھی متصور ہو۔ ایک قیاس کو یوں موکد بہ حلف بیان کرنا عمرؓ کے مزاج اور ان کی روایات سے ہرگز ہموار نہیں ہے۔

روایت کا مضمون بالکل شیعی طریقِ نگارش کی نقل ہے کہ وہ لوگ

واقعات کو ان کے وقوع کے بعد ماضی میں گزر رہے ہوئے اپنے بزرگوں کی زبان پر جاری کر کے انہیں اُن کی غیب دانی کی دلیل بنا لیتے ہیں۔

روایت میں جس بات پر عمرؓ کو قسم اٹھاتے دکھایا گیا ہے اس کی واقعیت کے لئے اُن کے پاس کوئی آسمانی ذریعہ موجود نہیں تھا۔ پس ان کا یہ کہنا کہ اللہ کی قسم عثمانؓ یہی کرے گا اور اس کے نتیجے میں بلوہ ہوگا، شورش ہوگی اور لوگ بالآخر عثمان کو قتل کر دیں گے، کسی خدا و رسولؐ کے مزاج شناس بزرگ سے ہرگز متوقع نہیں ہے۔

مستقبل کے واقعات کو ماضی کے زمانہ میں عمرؓ کے نام سے بیان کرنے کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد اس کے سوائے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ عثمانؓ کے خلاف بلوہ و بغاوت کو جواز کی سند مہیا کی جائے اور باغیوں اور قاتلوں کے بوجھ کو زیادہ سے زیادہ ہلکا کر دیا جائے۔

حیاتِ رسولؐ سے ایک شہادت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت درجہ متقی صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون جب فوت ہوئے تو حضرت ام العلا انصاریہؓ نے جن کے ہاں وہ فروکش تھے اپنے انتہائی حسنِ ظن کے پیشِ نظر کہا کہ:

عثمانؓ! میں تیرے حسنِ انجام کی گواہی دیتی ہوں!

نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ آپ نے یہ بات فوراً ٹوک دی اور فرمایا تو اُس بات کی گواہی کیونکر دے سکتی ہے جس کا تجھے علم نہیں بخشا گیا ہے اور ارشاد ہوا: وَاللّٰہِ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَا اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ کہ اللہ کی قسم میں اگرچہ اللہ کا رسول ہوں مگر یہ

بات میں بھی نہیں جانتا کہ مرے ساتھ یا تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے۔

اور حضرت عمرؓ جن کی خدا شناسی کی گواہی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے دے رکھی ہے وہ ایسی بات کیونکر کہہ سکتے تھے جس کا انہیں علم نہیں دیا گیا تھا جبکہ ایسی قطعی الانجام خبر صرف رسولؐ اور نبی کا ہی حصہ ہے۔ وہ بھی اس وقت جب انہیں اس کا علم دیا جائے

فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ

کہ خدا تعالیٰ سوائے اپنے رسولوں کے غیب کی باتیں کسی کو نہیں بتایا کرتے۔

اور عمرؓ تو اس باب میں اتنے محتاط تھے کہ حدیثِ رسولؐ کی روایت کرتے ڈرتے تھے کہ مبادا حضورؐ کے الفاظ میں کمی بیشی کر بیٹھوں اور پکڑا جاؤں۔ وہ اپنے اللہ پر اتنے دلیر کیونکر ہو سکتے تھے جتنا دلیر اُن کو اس روایت کے راوی نے ظاہر کیا ہے۔

اصل بات

افسوس ہے کہ مولانا نے انتہائی بے انصافی کے ساتھ اس وضعی روایت کا بھی صرف اتنا ہی ٹکڑا کاٹ کر پیش کیا ہے جس سے اُن کے مقصد کو تقویت ملتی تھی۔ اگر وہ ساری روایت نقل کر دیتے تو قارئین دیکھتے کہ عمرؓ کے نام سے اس صنعت کو صحیح مان کر بھی ان کی بات نہیں بنتی۔

واقعہ یہ ہے کہ عمرؓ کے نام سے مبینہ اس روایت میں ان تمام ہی بزرگوں کی تنقیص وارد ہوئی ہے جن میں سے ہر کسی کو ہی آپ نے اپنی وفات کے مرحلہ پر اپنے جانشین کے بطور پسند کیا تھا اور یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اپنے ناپسندیدہ افراد کو بھی اپنے جانشینوں کے بطور پسند کرتے۔ بات کی گرہ کو

کھولنے کے لئے ہم یہاں وہ پوری روایت نقل کرتے ہیں جس کے صرف ایک مفید مطلب حصے کو مولانا نے اپنی مہم کے لئے انتخاب کیا ہے۔

اخرج ابو عمر فی الاستیعاب عن ابن عباس قال بینا انا اَمشی مَعَ عُمر یومًا اذ تنفّسَ نفسًا ظننتُ اِنّہ قد قُضّت اضلاعہ فقلتُ سبحان واللہ مَا اَخرج ھٰذا مِنکَ یا امیر المومنین اِلّا اَمرٌ عظیمٌ! قَال ویحکَ یا ابن عبّاسٍ مَا اَدری مَا اَصنَعُ بِاُمّۃِ محمّدٍ صلی اللہ علیہ وسلّم!

قلتُ وَلِمَ وَاَنتَ بحمدِ اللہ قادر ان تضع ذٰلک مکان الثقۃ قال انی اَراکَ تقول انّ صاحبکَ اَولی النّاسِ یعنی علیًّا قلتُ اَجل واللہِ انی لَاقول ذٰالک فی سابقۃ وعلمہٖ وَقرابتہٖ وَصھرہٖ قال اِنّہٗ کما ذکرت ولکنّہٗ کثیرُ الدُّعابۃ۔

قلت فعُثمانُ؟ قال وَاللہِ لو فعلتُ لجعل بنی اَبی مُعیط علیٰ رقاب النّاس یعملونَ فیھم بمعصیۃ اللہ وَاللہ لو فعلتُ لفعلَ وَلو فعلَ لفعلوا فوثبَ النّاسُ اِلیہ فقتلوہُ۔

قلتُ طلحۃُ بن عبید اللہ؟ قال اَلاَکیسعُ ھُوَ اَزھیٰ مِن ذٰلکَ ماکان اللہُ لیُریَنی اُولّیہِ امر اُمّۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وھو علی ما فیہ من الزّھوِ۔

قلتُ الزّبیر بن العوّام؟ قال اذًا کان یظل یلاطم النّاس فی الصّاعِ وَالمُدّ۔

قلت سعد بن ابی وقاص؟ قال لیس بصاحب ذٰلکَ ذاکَ صاحبُ مقنبٍ یقاتل فیہ۔

قلتُ عبد الرّحمٰن بن عوفٍ؟ قال نِعمَ الرّجلُ ذکرتَ ولکنّہٗ ضعیفٌ عن ذٰلکَ۔

واللّٰہ یا بن عباس ما یَصلح لِھٰذا الامر اِلّا القوِیُّ فی غیر عُنفٍ اللّیّن فی غیر ضعف الجَوَادُ فی غیر سَرَفٍ المُمسِکُ فی غیر بُخلٍ ۔ قال ابن عباسٍ کان واللّٰہ عمر کذٰلک [1]

ترجمہ: ابو عمر سے استیعاب میں نقل ہوا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ایک روز میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ چل رہا تھا کہ اُنہوں نے اس طرح (ٹوٹی اُکھڑی) سانس لی جیسے اُن کی پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ میں نے کہا سبحان اللہ امیرالمومنین! آپ کی یہ سانس تو کسی بہت بڑے امر میں (نہایت گہری) سوچ کی غماز ہے۔
کہنے لگے ابن عباس! مجھے افسوس ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اُمت محمدیہ کے مستقبل کی بہتری کے لئے کیا کارروائی کروں (یعنی آنے والے دَور میں مسلمانوں کی سربراہی کے لئے کس کا انتخاب کروں)
مَیں نے کہا آپ اس امر کا پورا اختیار رکھتے ہیں کہ (اگر آپ چاہیں تو) خلافت ایک باوثوق شخص کے سپرد کر جائیں۔ کہنے لگے میں نے تمہاری بات سمجھ لی ہے۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس امر کے لئے تمہارا آدمی (علیؓ) دوسرے سب ہی لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ اہل ہے۔
میں نے کہا اللہ کی قسم، میں یہی خیال کر رہا تھا اور اس کی وجہ میرے نزدیک ان کا سابق الایمان ہونا، اُن کا صاحبِ علم ہونا، ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت اور اُن کا دامادِ رسولؐ ہونا ہے۔
فرمانے لگے ابن عباس! بے شک علیؓ ایسے ہی ہیں جس طرح تُو نے بیان کیا ہے مگروہ کثیر المزاح (یعنی ہنسوڑ آدمی) ہیں (اور ان کی یہ عادت خلافت جیسے سنجیدہ امر سے ہموار نہیں ہے)

---

[1] ازالۃ الخفاء عن الخلفاء شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی مقصد اوّل فصل ششم در فضیلت شیخین صہ ۵۴۱ - ۵۴۲ - مطبوعہ کارخانہ تجارت نور محمد آرام باغ کراچی۔

میں نے کہا پھر عثمان رضؓ موجود ہیں (ان کو نامزد فرما دیجئے) فرمانے لگے نہیں وہ بھی اس امر کے اہل نہیں ہیں) اللہ کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو وہ بنو امیہ کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دیں گے جو ان میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کریں گے۔

اللہ کی قسم اگر میں نے انہیں مقرر کر دیا تو وہ ضرور وہی کچھ کریں گے جس کا مجھے ان سے خطرہ ہے) اور اگر انہوں نے یہی کچھ کیا تو لوگ (بلوہ اور بغاوت کریں گے اور) عثمانؓ پر حملہ کر کے اُسے قتل کر دیں گے۔

میں نے عرض کیا پھر طلحہؓ بن عبید اللہ کو تجویز کر لیجئے! فرمانے لگے وہ آکیتع[1] سے بھی (کئی قدم) آگے ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ زمانہ یہ جائے کہ میں اُمتِ محمدیہ کا معاملہ اس کے سپرد کر دوں اور وہ ہمیشہ کسی کی سی حالت میں ہی مبتلا رہے۔

میں نے کہا پھر زبیرؓ بن العوام موجود ہے اُسے تجویز فرما لیجئے! فرمانے لگے اس کی تقرری کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ (امور سلطنت کی سرانجام دہی کے بجائے) صاع اور مُد (تولنے ناپنے کے پیمانوں) کے سلسلہ میں لوگوں کو دھول دھپیہ کرتا پھرے گا۔

اس پر میں نے عرض کیا اچھا تو پھر سعدؓ بن ابی وقاص موجود ہیں ان کا انتخاب فرما لیجئے! کہنے لگے وہ تو اس امر (خلافت) کے بالکل ہی اہل نہیں۔ وہ صرف ایک فوجی افسر کی حیثیت سے ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

---

[1] کسی کی ندامت عربی زبان کا ایک محاورہ ہے اور ایسے مقام پر بولتے ہیں، جب کوئی شخص سخت غصہ کی حالت میں کوئی غلط کام کرے اور پھر جب اُسے اپنی غلطی کا پتہ چلے تو وہ فوراً ندامت سے اپنا سر ادھ نچا نہ کر سکے (باقی اگلے صفحہ پر)

انسان کے لئے یہی جگہ زیادہ موزوں بھی ہے۔
پھر آخر میں میں نے عرض کیا عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے بارے میں کیا رائے گرامی ہے؟ فرمایا یہ بہت اچھے آدمی ہیں مگر خلافت ان کی ہمت سے بڑھ کر بوجھ ہے۔ وہ کمزور ہیں اور یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔
پھر فرمایا ابن عباسؓ! اللہ کی قسم خلافت کے لائق صرف وہ شخص ہی ہو سکتا ہے جو بہت طاقتور تو ہو مگر تند خو نہ ہو، بہت نرم ہو مگر اس کی یہ نرمی اس کی کمزوری کی وجہ سے نہ ہو، وہ بہت فیاض اور سخی ہو مگر فضول خرچی کرنے والا نہ ہو۔ وہ مال کی حفاظت کے لئے بہت سخت ہو مگر بخیل نہ ہو۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اللہ کی

یہ محاورہ الکسع قبیلہ کے ایک شخص محارب بن قیس کے غصہ اور ندامت کے ایک واقعہ سے چلا اور پھر پورے ملک میں شہرت پا گیا۔ محارب ایک ماہر تیر انداز تھا۔ تاریکی میں بھی اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے تاریکی میں گدھوں پر تیر چلائے اور اس نے محسوس کیا کہ نشانہ خطا ہوا ہے۔ اس پر اس نے بلا تحقیق ہی ازدیاد غضب سے کمان توڑ کر پھینک دی اور قسم کھائی کہ آئندہ تیر اندازی نہیں کروں گا۔ صبح جب اس نے دیکھا کہ نشانہ ہدف پر ہی پڑا تھا خطا نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کے تیروں کے ہدف گدھے مرے پڑے تھے تو وہ اپنے کئے پر سخت نادم ہوا۔ اور اس واقعہ نے ہوتے ہوتے ایک ضرب المثل کی صورت اختیار کر لی۔ اب اس روایت میں جو حضرت عمرؓ کی زبان سے طلحہؓ کو اس محاورہ کا مصداق ٹھہرایا گیا ہے تو مطلب یہ ہے کہ طلحہؓ ایک مغلوب الغضب آدمی ہیں، بے سوچے سمجھے غصہ سے غلط کام کرتے رہا کریں گے اور بار بار اظہارِ ندامت کے چکر میں ہی رہیں گے۔ ایسا آدمی خلافت کے لائق نہیں ہے۔

تم عمرؓ خود ایسے ہی تھے۔

یہ ہے وہ طویل روایت جس کا ایک حصہ مولانا نے اپنی ضرورت سے اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے اور بات اس اعتماد اور اس اہتمام سے اٹھائی ہے جیسے مولانا نے حضرت عثمانؓ کی کوئی چوری پکڑ لی ہے اور ان کے خلاف مولانا کے ہاتھ میں ایک ایسی مستحکم دلیل آگئی ہے جس کا کوئی توڑ ممکن نہیں ہے۔

اب دیکھئے وہ چھ کے چھ بزرگ ہیں جن کو حضرت عمرؓ اپنے بعد قبائے خلافت کو پہن سکنے کی صلاحیتوں سے مالا مال سمجھتے تھے، جو ان کے نزدیک پوری امت کے بہترین لوگ تھے اور جن کو حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت اپنے میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینے کی ہدایت فرمائی تھی مسلم شریف میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے۔ فَاِنْ عَجِلَ بِیْ اَمْرٌ فَالْخِلَافَۃُ شُوْرٰی بَیْنَ ھٰؤُلَاءِ السِّتَّۃِ الَّذِیْنَ تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ عَنْھُمْ رَاضٍ (ازالۃ الخفا مقصد اوّل فصل ششم ص۳۱۶)

کہ اگر مجھے موت آجائے تو خلافت ان چھ اصحاب کے مشورہ سے طے کی جائے جنکی شان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک ان سے خوش رہے۔ روایت کے راوی نے خود حضرت عمرؓ کی زبان سے ہی انہیں ایک ایک کر کے جس طرح خلافت کے نا اہل قرار دلوایا ہے وہ تو روایت کا کمال ہی ہے۔ مگر مولانا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس غیر واقعی، وضعی اور ناقابل یقین روایت سے بھی اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے پورا پورا استفادہ کیا ہے اور اس کا وہ حصہ الگ کر کے اپنے قارئین کی تفریح اور اپنے شوق عثمان آزاری کی تسکین کا سامان بنا لیا ہے۔ جو حضرت عثمانؓ کی توہین و تنقیص سے تعلق رکھتا تھا۔

حضرت عثمانؓ پر حملہ کے لئے یہ زمین تیار کر لینے کے بعد مولانا نے پھر حضرت عثمان پر ایسی ہی شدت سے حملہ جاری کر دیا ہے جو ان کے مہیا کردہ اہتمام کا فی الواقعہ ہی متقاضی تھا، آپ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ مولانا فرماتے ہیں:

انہوں نے کوفے کی گورنری اپنے ماں جائے بھائی کو، بصرے کی گورنری اپنے ماموں زاد بھائی کو، مصر کی گورنری اپنے دودھ بھائی کو دے دی۔

دمشق، حمص، فلسطین، اردن اور لبنان اپنے چچا زاد بھائی معاویہؓ کو بخش دیئے اور اپنا سیکرٹری اپنے دوسرے چچا زاد بھائی مروان کو بنا لیا [1]

مولانا نے اس تحریر میں حضرت عثمانؓ کی جن مبینہ کارروائیوں پر طعن توڑے اور تعریفات کی بارش برسائی ہے اس کے لئے نہ تو شریعت میں ہی کوئی سند موجود ہے، نہ دینِ حق نے مملکتِ اسلامی کے حاکم پر ہی کوئی قدغن لگائی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے باصلاحیت لوگوں کی خدمات سے استفادہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اگر شریعت نے ایسا کوئی اصول وضع کیا ہوتا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی حکومت کی طرف سے سفارت کے عظیم ترین منصب پر مامور نہ فرماتے۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ بنو ہاشم میں قدرتی طور پر باصلاحیت لوگوں کی ویسے ہی کمی تھی ورنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی صلاحیتوں کو ناکارہ بنا رکھنے پر کبھی راضی نہ ہوتے۔ اور جہاں تک حضرت عثمانؓ کی طرف سے اپنے بعض قریبی عزیزوں کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کا تعلق ہے جسے مولانا نے ماں جائے بھائی، ماموں زاد بھائی اور رضاعی بھائی کی تعریفات کے ساتھ زیادہ تیکھا بنا کر پیش کیا ہے تو اس کا جواب خود ان کی اپنی ہی تحریر میں موجود ہے۔ جب فرمایا:

اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اپنے خاندان کے جن لوگوں کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے حکومت کے یہ مناصب دیئے انہوں نے اعلیٰ درجے کی

---

[1] خلافت و ملوکیت کے صفحات ۱۰۷ - ۱۰۸ کا حاصل

انتظامی اور جنگی قابلیتوں کا ثبوت دیا اور ان کے ہاتھوں بہت سی فتوحات ہوئیں [1]

اب اس کے بعد اُن کے اٹھائے ہوئے اس نکتہ کی کوئی قیمت نہیں رہتی کہ: ظاہر ہے قابلیت صرف اُنہی لوگوں میں نہ تھی اور دوسرے لوگ بھی بہترین قابلیتوں کے مالک موجود تھے [2]

ویسے بھی حضرت مولانا کا یہ نکتہ اُن کے دل کی حسرت کا عکاس تو ضرور ہے مگر امر واقعہ نہیں ہے کیونکہ دوسروں میں بنوامیہ کے مقابلہ میں قابلیت رکھنے والے لوگ فی الواقع ہی موجود نہیں تھے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت علیؓ کی خوشی کے لئے اُن کے ایک نہایت ہی گہرے حامی اور جاں نثار ساتھی حضرت عمارؓ بن یاسر کو حمص کا عامل مقرر کر دیا مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس تجربہ کو ناکام پاکر انہیں واپس بلا لیا۔

خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت عثمانؓ کی سنّت پر عمل کرتے ہوئے حضرت مولانا مودودی صاحب کی زبانِ قلم میں:

- یمن اپنے چچا زاد بھائی عبید اللہ بن عباس کے سپرد کر دیا۔
- مکہ اپنے دوسرے چچا زاد بھائی قثم بن عباس کی تحویل میں دیدیا۔
- مدینہ اپنے تیسرے چچا زاد بھائی عبداللہ بن عباس کے حوالے کر دیا۔
- عراق اپنے سمدھی زاد یعنی داماد جعدہ بن ہبیرہ کو بخش دیا۔
- خراسان کی حکومت اپنے بیوی زاد بیٹے محمد بن ابی بکر کو دی۔
- اسلامی افواج کے سالارِ اعلیٰ کا منصب اپنے خود زاد بیٹے محمد بن حنفیہ کو عطا فرمایا۔

اور اب یہ بات مولانا ہی بتائیں کہ ان میں سے کون بزرگوار تھے جنہوں نے

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۰۸ [2] ایضاً صہ ۱۰۸

اپنے فرائض کو اپنے منصب کی ضرورت کے مطابق انجام دیا۔

اس مقام پر حضرت عثمانؓ کے خلاف اپنی مہم کی تائید میں مولانا نے ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پورے عہدِ حکومت میں حضرت علیؓ کے سوا بنو ہاشم میں سے کسی شخص کو کوئی عہدہ نہ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے قبیلے اور خاندان کے کسی شخص کو سرے سے کسی منصب پر مامور نہ کیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دس سال کے عہد میں بنی عدی کے صرف ایک شخص کو ایک چھوٹے سے عہدے پر مقرر کیا اور اس سے بھی ان کو بہت جلد سبکدوش کر دیا[۱]

جواباً گزارش ہے کہ اگر اپنے خاندان کے کسی شخص کو مناصب حکومت میں حصہ دینا شرعاً جواز نہ رکھتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو بھی کسی منصب پر فائز نہ کرتے۔ حضورؐ کا حضرت علیؓ کو عظیم منصب حکومت سے نوازنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ شرع شریف میں بلاامتیاز اخیار و اغیار ہر باصلاحیت مسلمان کو حاکمیت کا حصہ بلا جھجک دیا جا سکتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے ہاں ان کی نگاہِ انتخاب میں کوئی شخص ان کے معیار کا نہیں ہوگا ورنہ وہ بھی اس باب میں کوئی بخل روا نہ رکھتے۔

اور جہاں تک حضرت عمرؓ کا اپنے کسی عزیز کو اس کے عہدے سے سبکدوش کر دینے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ اس شخص کا حضرت عمرؓ کے خاندان کا حصہ ہونا نہیں تھا کیونکہ اگر یہ بات خلافِ شرع ہوتی تو حضرت عمرؓ اُسے کسی منصب پر مامور ہی کیوں کرتے بلکہ اس کی وجہ جیسا کہ ہم عرض

---

[۱] خلافت و ملوکیت صد۱۰۶

کر آئے ہیں اُس شخص سے کسی مجرمانہ کاروائی کا صدور تھا۔

اور پھر جب حضرت علیؓ نے بھی اپنے دورِ حکومت میں اپنے تقریباً تمام ہی اقرب عزیزوں کو اساطینِ حکومت کی حیثیت سے اپنا دست و بازو بنایا تھا تو حضرت عثمانؓ پر اعتراض کی قیمت کیا رہ جاتی ہے۔ بالخصوص جبکہ حضرت عثمانؓ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے حکام سب کے سب حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ نہیں تھے بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ حکومت سے ہی مناصبِ حکومت پر فائز تھے، اور وہ صدیقِ اکبرؓ کے عہدِ حکومت میں بھی بدستور ہی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ پھر حضرت عمرؓ بھی اپنے دَور میں اُن لوگوں کی خدمات سے استفادہ کرتے رہے یعنی ان میں سے بہت سے لوگ کم و بیش بائیس بائیس اور پچیس پچیس برس سے مناصبِ حکومت سے وابستہ تھے، عثمانؓ نے ان کو اپنے دورِ حکومت میں مناصب نہیں دیئے تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خاندان کے جن لوگوں اور جن اقرب اعزہ کو مناصبِ حکومت سے نوازا، اُنہیں عثمانی عمالِ حکومت کو برطرف کر کے اُن کی جگہ حاکم مقرر کیا تھا۔

تو کیا مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عثمانؓ جب حاکم بنے تھے تو انہیں چاہیئے تھا کہ وہ اپنے خاندان کے ان تمام عمال و حکام کو ایک ایک کر کے اس جرم میں برطرف کر دیتے کہ وہ اُن کے کنبہ سے کیوں تعلق رکھتے ہیں؟

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

حضرت علیؓ کا اپنے اعزہ و اقربا کو بے جواز ہی مناصبِ حکومت سے نوازنا مولانا کی عبرت کے لئے بہت کافی تھا مگر وہ تاریخ کے اس رُخ سے

اپنی بھلائی کے لئے کوئی سامان مہیا نہیں فرما سکے۔

اُنہیں جب تاریخ کے اس رُخ سے آگاہ کیا گیا تو وہ کمال بے اعتنائی سے یہ فرما کر طرح دے گئے کہ :

میں اس کتاب میں تاریخ نہیں لکھ رہا بلکہ اس سوال پر بحث کر رہا ہوں کہ وہ کیا واقعات تھے جو آغاز فتنہ کا سبب بنے۔ اور ظاہر ہے کہ اس مسئلہ پر کلام کرتے وقت حضرت عثمانؓ کا دَور ہی زیر بحث آئے گا نہ کہ حضرت علیؓ کا۔

اُنہوں نے اپنے عہد میں جو کچھ بھی کیا اُسے آغاز فتنہ کے اسباب میں شمار نہیں کیا جا سکتا لہ

مولانا کی یہ توجیہ اگر کتمانِ حق نہیں ہے تو بتایا جائے کہ سیدنا عثمانؓ کے قتل کے بعد سیدنا علیؓ اور سیدنا حسنؓ کی دو خلافتیں پھلانگ کر اسبابِ فتنہ کو اگر دورِ سیدنا معاویہؓ تک پھیلایا جا سکتا ہے تو جن واقعات کے نتیجہ میں سیدنا عثمانؓ قتل ہوئے اور سیدنا علیؓ کو خلیفہ بنایا گیا، آخران واقعات کو اسبابِ فتنہ سے باہر رکھنے کی وجہ سوائے اسکے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ معاویہؓ ہیں جو حضرت عثمانؓ کے قریبی عزیز ہیں جن سے حضرت مولانا ناراض ہیں اور ان کی کوئی سیدھی بات بھی سیدھی نہیں ہو سکتی مگر یہ علیؓ ہیں جن کے لئے مولانا ہمیشہ فکر مند رہے جیسا کہ خود ہی تحریر فرماتے ہیں کہ :

(اپنی زندگی کے) ایک ایک مرحلے پر آن (یعنی حضرت علیؓ) کا جو رویہ رہا ہے اس کے ہر جزو کا ایک صحیح محل میں نے تلاش کیا ہے اور ان کے اپنے بیانات میں یا اُس وقت کے حالات و واقعات میں وہ مجھے مل گیا ؎

لہ خلافت و ملوکیت صہ ۳۴۸ ؎ ایضاً صہ ۳۴۴

مگر یہ مشقت مولانا سیدنا عثمانؓ یا اُن کے کسی عزیز اور رفیق کے لئے کیوں کریں گے۔ مولانا یہ بات جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے متوقع جانشینوں میں ہر ایک کو سیدنا علی سمیت اپنے پاس بُلا کر یہ تاکید کی تھی کہ دیکھنا اگر میرے بعد تم خلیفہ بنو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو عوام کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا[1]

سوال یہ ہے کہ اگر مولانا کے نزدیک حضرت عثمانؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ کے وہ تاثرات جو روایت میں ذکر ہوئے حضرت عثمانؓ کے مغلوب النسب ہونے کی وجہ سے تھے تو حضرت عمرؓ کی اس تاکید کے بارے میں کیا رائے گرامی ہے جو انہوں نے حضرت علیؓ کو بلا کر ان کے قبیلے بارے میں کی تھی؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کو حضرت عثمانؓ کی افتادِ طبع سے۔ جو خطرہ دامنگیر تھا وہی خطرہ آپ حضرت علیؓ سے بھی محسوس کرتے تھے اور حضرت مولانا کی ہی زبان میں حضرت علیؓ کے دورِ حکومت میں حضرت عمرؓ کا وہ خطرہ پھر حقیقت بھی بن گیا جیسے یہی خطرہ حضرت عثمانؓ کے دورِ حکومت میں بقول مولانا حقیقت بن گیا تھا[2]

اور پھر حضرت عمرؓ کو تو ایک صرف سیدنا علیؓ کی ذات سے ہی خدشہ تھا کہ مبادا وہ خاندان نوازی کی راہ پر چل نکلیں، مگر مولانا جن تاریخی روایات کو معتبر روایات قرار دیتے ہیں ان معتبر روایات کے مطابق قریش کی پوری قوم ہی حضرت علیؓ کے عصبیتی رُجحان سے خائف تھی، بلکہ قریش کے لوگ بنو ہاشم کی خاندانی عصبیت کے خوف سے اس کنبہ کے کسی بھی فرد کو، کسی مرحلہ پر اور کسی حالت میں بھی آگے لانا پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ طبری لکھتے ہیں:

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۹۹ سطرہ [2] ایضاً صہ ۹۹

حضرت عبداللہ بن عباسؓ (یعنی حضرت علیؓ کے چچا زاد بھائی) سے روایت ہے کہ:

میں ایک روز حضرت عمرؓ کا شریکِ سفر تھا۔ ایک شب جب میں دورانِ سفر اُن کے پاس آکر بیٹھا .... تو فرمانے لگے ابن عباس!.... تمہارے والد (حضرت عباسؓ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے تم حضورؐ کے چچا زاد بھائی، تو پھر تمہاری قوم (قریش) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد تمہیں خلیفہ منتخب کرنے میں کیا امر مانع ہوا؟ میں نے کہا مجھے اس باب میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ کہنے لگے لیکن مجھے معلوم ہے۔ بات یہ ہے کہ قریش تم (بنو ہاشم) کو ناپسند کرتے تھے... میں نے کہا کیوں؟ ہم تو ان میں سے بہترین لوگ تھے۔ عمرؓ کہنے لگے قریش نہیں چاہتے تھے کہ تمہارے اندر نبوت اور خلافت دونوں چیزیں جمع ہو جائیں۔ انہیں خطرہ تھا کہ تم اقتدار حاصل کر گئے تو اپنی قوم کے دوسرے قبائل سے بدسلوکی کرو گے۔[۱]

اور جب صورتِ حال یہ ہے تو مولانا کا ایک کمزور، نالائق اور شترگربہ روایت کو بہانہ بنا کر صرف ایک عثمانؓ کو ہی اپنے خدنگِ قلم کا ہدف بنا لینا بے انصافی بھی ہے اور بناء فاسد علی الفاسد بھی ہے۔

ملوکیت کا دوسرا مرحلہ

پھر وہی عثمانؓ کی غلطیاں

اسلام کے اندر خلافتِ راشدہ سے ہٹ کر ملوکیت کی طرف بڑھنے کا دوسرا مرحلہ بھی مولانا کے نزدیک حضرت عثمانؓ کے دورِ حکومت میں ہی

---

[۱] طبری جلد ۳ باب ۱۳

انتہام کو پہنچا ہے۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو بلا شبہ غلط تھا اور غلط کام بہر حال غلط ہے خواہ وہ کسی نے کیا ہو۔

اس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے اور نہ دین کا ہی یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ کہا جائے۔[1]

مولانا کی اس شوخ نگاری میں حضرت عثمانؓ کے خلاف زہر اور کینہ کی جو مقدار موجود ہے وہ ان کی اس تحریر کے ایک ایک حرف سے ظاہر ہے۔ یقیناً حضرت عثمانؓ کے خلاف غصہ نکالنے کا یہ طریق انتہائی غیر مہذب ہے۔ اور پھر ستم یہ ہے کہ مولانا اپنی اس تحریر کے نفرت اثر اور زہر بھرے اسلوب پر نازاں بھی ہیں اور ان کا یہی ناز ان کے اس اسلوبِ نگارش کا حسن اور اس کی جان ہے۔ مگر نہ جانے مولانا نے یہ کیوں محسوس کر لیا کہ مبادا ان کی شوخی ان کی کھلی عثمانؓ دشمنی پر دلیل ہو۔ اس لئے انہوں نے اپنے متاثرین کے حلقہ میں موجود صحابہ دوست لوگوں کے دل کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے یہاں حضرت عثمانؓ کی تھوڑی تعریف بھی درج کر دی ہے، ارشاد ہے۔

اس ایک پہلو کو چھوڑ کر باقی جملہ پہلوؤں سے ان کا کردار بحیثیت خلیفہ ایک مثالی کردار تھا۔[2] لاحول ولا قوۃ ؎

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

کوئی پوچھے کہ جب انہوں نے اسلام کے نظامِ حیات کو رُشد و ہدایت

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۱۶ [2] ایضاً

کی راہ سے ہٹا کر گمراہی کے سپرد کر دیا تو ان کی زندگی کا کوئی دوسرا رُخ اگر اچھا بھی ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ ؎

جب میکدہ چھٹا تو اب پھر کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

دو کشتیوں میں سوار

مولانا حضرت عثمان کے بارے میں بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں اور کھل کر کہنا چاہتے ہیں مگر مصلحت کی مجبوری سے کہتے کہتے رُک جاتے ہیں۔ تاہم اُن کی تلملاہٹ میں ان کے اندرونی جذبات کا کافی اثر موجود ہے ؎

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی!

وہ عثمان رض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ بھی کہتے ہیں اور اُنہیں اسلام میں ملوکیت کا دروازہ بھی قرار دیتے ہیں۔ اُنہیں عثمان رض پسند نہیں ہیں مگر وہ اُنہیں ناپسند بھی نہیں کر سکتے۔ اُنہیں عثمان رض کے کردار پر اعتراض بھی ہے اور اُنہیں یہ کہنے کی مجبوری بھی ہے کہ ان کے کردار پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں [1] یعنی ؎

معشوق ما بہ شیوۂ ہر کس برابر ست
با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۱۱۶

وہ عثمانؓ کو مظلوم مقتول بھی مانتے ہیں اور ان کے خلاف باغیوں بلوائیوں کو بھی تقریباً حق بجانب ہی قرار دیتے ہیں۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عثمانؓ کے خلاف تحریکِ بغاوت کے علمبرداروں نے الزامات کی ایک طویل فہرست مرتب کی جو زیادہ تر بالکل بے بنیاد یا ایسے کمزور الزامات پر مشتمل تھی جن کے معقول جوابات دیئے جا سکتے تھے[1]

اور اس یقین کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ:

حضرت عثمانؓ کے خلاف جو شورش برپا ہوئی اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی سبب کے بغیر محض سبائیوں کی سازش کی وجہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی یا وہ محض اہل عراق کی شورش پسندی کا نتیجہ تھی۔ تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے۔ اگر لوگوں میں ناراضی پیدا ہونے کے واقعی اسباب موجود نہ ہوتے اور ناراضی فی الواقع موجود نہ ہوتی تو کوئی سازشی گروہ شورش برپا کرنے اور صحابیوں اور صحابی زادوں تک کو اس کے اندر شامل کر لینے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا[2]

جہاں وہ یہ فرماتے ہیں کہ عثمانؓ کے خلاف بغاوتوں اور بلوؤں کا ہجوم بے سبب نہیں تھا اور ضرور ہے کہ اس بغاوت کی اصل وجہ عثمانؓ کی قصورواری ہی ہو وہاں وہ عثمانؓ کے مظلومانہ قتل پر آنسو بھی بہاتے ہیں اور اس طرح کھینچ گھسیٹ کر معاملہ کو درمیان میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

اس تحریک (شورش و بغاوت) کے علمبردار مصر، کوفہ اور بصرہ سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے باہم خط و کتابت کر کے خفیہ طریقہ سے یہ طے کیا کہ اچانک مدینہ پہنچ کر حضرت عثمانؓ پر دباؤ ڈالیں .... یہ لوگ

---

[1] خلافت و ملوکیت ص۱۱۱ [2] ایضاً ص۳۲۸-۳۲۹

جن کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہ تھی مصر، کوفہ اور بصرے سے بیک وقت مدینے پہنچے ..... اور اُنہوں نے مدینہ میں گھس کر حضرت عثمانؓ کو گھیر لیا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ حضرت عثمانؓ خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ حضرت عثمانؓ کا جواب یہ تھا کہ میں تمہاری ہر اُس شکایت کو دُور کرنے کے لئے تیار ہوں جو صحیح اور جائز ہو، مگر تمہارے کہنے سے مَیں معزول نہیں ہو سکتا۔ اس پر ان لوگوں نے چالیس روز تک ایک عظیم ہنگامہ برپا کئے رکھا... آخر کار ان لوگوں نے ہجوم کر کے سخت ظلم کے ساتھ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ تین دن تک اُن کا جسد مبارک تدفین سے محروم رہا اور قتل کرنے کے بعد ظالموں نے ان کا گھر بھی لُوٹ لیا [۱]

اب جہاں صورتِ حال یہ ہو کہ ؏

جناب شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تو بات کسی ٹھکانے نہیں لگتی۔ حضرت عثمانؓ نے اگر خلافتِ راشدہ کی راہ کو ترک کر کے اپنے عزیزوں کے گھر بھر دیئے تھے تو اُنہوں نے اپنے کئے کی سزا پالی۔ یہ مکافاتِ عمل ہے، اس میں مظلومیت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے اور اگر وہ مظلوم ہیں تو بلوائی ظالم ہیں، ان کی بھرپور مذمت کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ مولانا عثمانؓ کے لئے بھی اپنی مصلحت قائم رکھیں، بلوائیوں کے لئے بھی ہمدردی کی گنجائش پیدا رکھیں اور ان کی بغاوت کے جرم کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے سخن سازیوں کی راہ اختیار کریں۔

یہ بات صاف ہو جانی چاہیئے کہ مولانا ملوکیت کی طرف اس دوسرے مرحلہ کو حضرت عثمانؓ کی ذات سے کس دلیل کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں جبکہ انہوں نے اپنی ساڑھے چار سو صفحات کی اس پوری قلمکاری میں بات کو باغیوں بلوائیوں

---

[۱] ملخص خلافت و ملوکیت ص ۱۱۷ - ۱۱۸

شورشیوں اور سازشیوں کی زیادتیوں اور شرارتوں اور حضرت عثمانؓ سے تعزیت اور تسلیوں تک ہی محدود رکھا ہے اور حضرت عثمانؓ پر اپنے معمول کے مطابق جو تھوڑی بہت نوازش فرمائی ہے تو اس سلسلہ میں وہ سب کچھ پہلے مرحلہ میں ہی کہہ آئے ہیں۔ مولانا نے سطور میں تو بات کھل کر نہیں کی مگر بین السطور میں ان کا یہ معنی خیز جملہ ان کی ان کہی بات کی ضرور غمازی کرتا ہے جب انہوں نے کہا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوشش شروع بھی کر دی تھی اور حضرت عثمانؓ نے اصلاح کا وعدہ بھی کر لیا تھا[1]

مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے باغیوں اور عثمانؓ کے درمیان فصل قضیہ کی ذمہ داری تو لے لی تھی لیکن عثمانؓ نے اصلاح حال کی غرض سے جو وعدے کئے تھے وہ انہیں پورا نہ کر سکے مگر مولانا نے حضرت عثمانؓ کے ایفائے عہد یا عدم ایفا کا ذکر کئے بغیر بات کا رخ اچانک بدل دیا کہ:

تاہم اگر شکایت رفع نہ بھی ہوتی ...... الخ

معلوم ہوتا کہ مولانا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے اصلاح حال کا، وعدہ کرنے کے باوجود جب اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو ایک طرف اپنے قتل کا سامان اپنے ہاتھوں مہیا کیا اور دوسرے یہ کہ ان کی اس وعدہ خلافی نے حالات کو اس راہ پر ڈال دیا کہ خلافت نے ملوکیت کی طرف ایک مرحلہ اور طے کر لیا۔

اور مولانا مودودی کے بقول حضرت عثمانؓ اگر حضرت علیؓ کے ارشاد کے مطابق ان کے پیش کئے گئے خطوط پر کام کرنے لگتے۔ تو نہ خود قتل ہوتے نہ ملوکیت کو اسلام کے اندر در آنے کا موقع ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرحلہ پر مولانا کا قلم جذبات سے کچھ زیادہ ہی مغلوب ہو گیا تھا جب فرمایا:

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۱۹ سطر ۱۱-۱۲

حضرت عثمان رضؓ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا اور غلط کام بہرحال غلط ہے خواہ وہ کسی نے کیا ہو[1]

مولانا نے اس دور میں اُچھلنے والے سارے ہی مفاسد کی ذمہ داری اکیلے حضرت عثمان رضؓ پر ہی ڈال دی ہے اور مولانا کی اس گرامی قدر سعی کا یہ پہلو بے حد عبرت انگیز ہے کہ ان کی اس کوشش سے ایک یہودی نژاد مسلمان یہودی عبداللہ بن سبا کے سر سے اُس کی اُن مجرمانہ کارروائیوں کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا ہے جنہوں نے اُسے اسلام اور مسلمانوں کے اندر بدنام کر رکھا تھا اور ظاہر ہے کہ جب اس کی جرائم کاری عثمان رضؓ کو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے کے ساتھ ساتھ عثمان رضؓ کے دامن میں ڈال دی جائے گی تو اس کا بوجھ ضرور ہلکا ہو جائے گا۔ ہمارے مورخین اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ عبداللہ بن سبا کی دسیسہ کاریوں، سازشوں اور فتنہ آرائیوں نے جو اُس نے اسلام اور مسلمانوں سے یہودیت کی شکست کا انتقام لینے کی غرض سے جاری کی تھیں۔ مسلمانوں کے اندر فتنہ و فساد کی آگ جلائی اور مسلمانوں کی وہ تلواریں جو کفار کے لئے وقف تھیں خود مسلمانوں کی گردنوں کی ہی پیمائش کرنے لگیں۔ اس کی فتنہ کاریوں کی وجہ سے خلیفہ ارشد کے خلاف بغاوت ہوئی اور بالآخر اپنے خلیفہ کو خود مسلمانوں نے ہی انتہائی بے دردی سے قتل کیا جس کی وجہ سے مسلمان بدنام بھی ہوئے اور ان کی سلطنت کا شکوہ بھی ختم ہوا اور وہ ایک ایسے اختلاف کے سپرد ہو گئے جس کا دامن قیامت کی گھڑی تک طویل ہے۔ مگر مولانا نے جب اس سب کچھ کے لئے حضرت عثمان رضؓ کو مجرم گردانا ہے تو ظاہر ہے انہوں نے عبداللہ بن سباء کو اس کے جرم سے بری کیا ہے کیونکہ اُنہوں نے بڑے اعتماد سے کہہ رکھا ہے کہ:

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ۱۱۶

حضرت عثمانؓ کے خلاف جو شورش برپا ہوئی اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی سبب کے بغیر محض سبائیوں (یعنی عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں) کی سازش کی وجہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی یا وہ محض اہل عراق کی شورش پسندی کا نتیجہ تھی، تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے [1]

اب مولانا کی اس سعی کو سبائیوں کے لئے اس صدی کا بہترین تحفہ ہی کہنا چاہیئے کہ مولانا نے چودہ صدیوں کی اسلام دشمن تاریخ کا پورا ملبہ جو ابن سبا اور اس کی معنوی اولاد کی کمر توڑ رہا تھا اٹھا کر مظلوم عثمانؓ کی نحیف کمر پر رکھ دیا اور اُن کے قتل کی ذمہ داری خود انہی پر ڈال کر تاریخ اسلام کا رُخ سیدھا کر دیا۔ سبحان اللہ ؏

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ملوکیّت کا تیسرا مرحلہ

اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ، حضرت طلحہؓ، زبیرؓ اور دوسرے اصحاب رسولؐ کی پیدا کردہ خرابیاں

ملوکیت کے در آنے کا تیسرا مرحلہ مولانا کے نزدیک صدیقہ طاہرہؓ ام المومنین عائشہؓ، حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت معاویہؓ بن ابو سفیانؓ اور دوسرے بہت سے اصحاب رسولؐ کی طرف سے پیدا کردہ خرابیوں کا رہین منت ہے۔ چنانچہ مولانا رقمطراز ہیں:

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد) اس وقت ان چھ اصحاب رسول میں سے چار موجود تھے جن کو حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت اُمت کے

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۲۳

مقدم ترین اصحاب قرار دیا تھا۔

ایک حضرت علیؓ، دوسرے حضرت طلحہؓ، تیسرے حضرت زبیرؓ، چوتھے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص؛ ان میں سے حضرت علیؓ ہر لحاظ سے پہلے نمبر پہ تھے ... اس لئے یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ خلافت کے لئے اُنہی کی طرف رجوع کرتے.... چنانچہ معتبر روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور دوسرے اہل مدینہ اُن کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ یہ نظام کسی امیر کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، لوگوں کے لئے ایک امام کا وجود ناگزیر ہے۔

آج آپ کے سوا ہم کوئی ایسا شخص نہیں پاتے جو اس منصب کے لئے آپ سے زیادہ مستحق ہو، نہ سابق خدمات کے اعتبار سے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرب کے اعتبار سے۔ اُنہوں نے انکار کیا اور لوگ اصرار کرتے رہے۔ آخر کار اُنہوں نے کہا میری بیعت گھر بیٹھے خفیہ طریقہ سے نہیں ہو سکتی، تمام مسلمانوں کی مرضی کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں۔

پھر مسجد نبویؐ میں اجتماع عام ہوا اور تمام مہاجرین اور انصار نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، صحابہ میں سے صرف ۱۷ یا ۲۰ ایسے بزرگ تھے جنہوں نے بیعت نہیں کی۔

اس رُوداد سے اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حضرت علیؓ کی خلافت قطعی طور پر ٹھیک اُنہی اصولوں کے مطابق منعقد ہوئی تھی جن پر خلافتِ راشدہ کا انعقاد ہو سکتا تھا۔ وہ زبردستی اقتدار پر قابض نہیں ہوئے تھے، اُنہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے برائے نام بھی کوئی کوشش نہیں کی تھی، لوگوں نے خود آزادانہ مشاورت سے ان کو خلیفہ منتخب کیا تھا، صحابہ کی عظیم اکثریت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، بعد میں شام کے سوا تمام بلادِ اسلامیہ نے ان کو خلیفہ تسلیم کیا۔ اب اگر حضرت سعد بن عبادہ

کے بیعت نہ کرنے سے ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت مشتبہ نہیں ہوتی تو، ایا ۲۰ صحابہ کے بیعت نہ کرنے سے حضرت علیؓ کی خلافت کیسے مشتبہ قرار پا گئی ہے .... اس طرح اُمت کو یہ موقع مل گیا تھا کہ خلافت راشدہ کے نظام میں جو خطرناک رخنہ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پیدا ہوا تھا وہ بھر جاتا اور حضرت علیؓ پھر سے اس کو سنبھال لیتے۔ لیکن تین چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے اس رخنے کو نہ بھرنے دیا بلکہ اسے اور زیادہ بڑھا کر ملوکیت کی طرف اُمت کو دھکیلنے میں ایک مرحلہ اور طے کرا دیا۔

ایک حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے میں اُن لوگوں کی شرکت جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کرنے کے لئے باہر سے آئے ہوئے تھے، اُن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے بالفعل قتل کا ارتکاب کیا تھا اور وہ بھی جو قتل کے محرک اور اس میں اعانت کے مرتکب ہوئے تھے....

دوسرے بعض اکابر صحابہ کا حضرت علیؓ کی بیعت سے الگ رہنا... وہ بہرحال اُمت کے نہایت بااثر لوگ تھے ان میں سے ہر ایک ایسا تھا جس پر ہزاروں مسلمانوں کو اعتماد تھا۔ ان کی علیحدگی نے دلوں میں شک ڈال دیئے...

تیسرے حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ جسے لے کر دو طرف سے دو فریق اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ۔

ان دونوں فریقوں کے مرتبہ و مقام اور جلالت قدر کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ دونوں کی پوزیشن آئینی حیثیت سے کسی طرح درست نہیں مانی جا سکتی۔

ظاہر ہے کہ یہ جاہلیت کے دور کا قبائلی نظام تو نہ تھا کہ کسی مقتول کے خون کا مطالبہ لے کر جو چاہے اور جس طرح چاہے اُٹھ کھڑا ہو، اور جو طریقہ چاہے اُسے پورا کرانے کے لئے استعمال کرے۔

یہ ایک باضابطہ حکومت تھی جس میں ہر دعویٰ کے لئے ایک ضابطہ اور قانون موجود تھا۔ خون کا مطالبہ لے کر اٹھنے کا حق مقتول کے وارثوں کو تھا، جو زندہ تھے اور وہیں موجود تھے۔ حکومت اگر مجرموں کو پکڑنے اور ان پر مقدمہ چلانے میں واقعی دانستہ ہی تساہل کر رہی تھی تو بلاشبہ دوسرے لوگ بھی اس سے انصاف کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ لیکن کسی حکومت سے انصاف کے مطالبے کا یہ کونسا طریقہ ہے اور شریعت میں کہاں اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے کہ آپ سرے سے اس حکومت کو جائز حکومت ہی اس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ آپ کے اس مطالبہ کے مطابق عملدرآمد نہ کر دے....

اس سے بھی زیادہ غیر آئینی طریق کار یہ تھا کہ پہلے فریق (طلحہؓ وزبیرؓ) نے بجائے اس کے کہ وہ مدینے جا کر اپنا مطالبہ پیش کرتا جہاں خلیفہ اور مجرمین اور مقتول کے ورثا سب موجود تھے اور عدالتی کارروائی کی جا سکتی تھی، البصرے کا رخ کیا اور فوج جمع کر کے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی کوشش کی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ ایک خون کے بجائے دس ہزار مزید خون ہوں اور مملکت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔

شریعتِ الٰہی تو درکنار دنیا کے کسی آئین وقانون کی رُو سے اسے ایک جائز کارروائی نہیں مانا جا سکتا۔

اس سے بدرجہا زیادہ غیر آئینی طرزِ عمل دوسرے فریق یعنی حضرت معاویہؓ کا تھا جو معاویہؓ بن ابو سفیانؓ کی حیثیت سے نہیں بلکہ شام کے گورنر کی حیثیت سے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لئے اُٹھے تھے۔

مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کیا، گورنری کی طاقت اپنے اس مقصد کے لئے استعمال کی اور مطالبہ بھی یہ نہیں کیا کہ حضرت علیؓ قاتلینِ عثمانؓ پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دیں بلکہ یہ کہ وہ قاتلینِ عثمانؓ کو اُن کے حوالہ کر دیں تاکہ وہ خود انہیں قتل کریں۔ یہ سب کچھ دورِ اسلام کی نظامی حکومت کے بجائے

زمانہ قبل از اسلام کی قبائلی بدنظمی سے اشبہ ہے ..... اپنی ذاتی حیثیت میں وہ خلیفہ کے پاس مستغیث بن کر جا سکتے تھے اور مجرمین کو گرفتار کرنے اور اُن پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ گورنر کی حیثیت سے اُنہیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت ہو چکی تھی اور جس کی خلافت کو اُن کے زیرِ انتظام صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی، اس کی اطاعت سے انکار کر دیتے اور اپنے زیرِ انتظام علاقے کی فوجی طاقت کو مرکزی حکومت کے مقابلے میں استعمال کرتے اور ٹھیٹھ جاہلیتِ قدیمہ کے طریقے پر یہ مطالبہ کرتے کہ قتل کے ملزموں کو عدالتی کاروائی کے بجائے مدعیٔ قصاص کے حوالے کر دیا جائے تا کہ وہ خود اُن سے بدلہ لے لہ

تاریخ کا غلط مطالعہ دراصل یہ ہے

اس تحریر کے بموجب بقول مولانا مودودی صاحب ملوکیت کی طرف خلافتِ راشدہ کو تیسرا دھکا حضرت عائشہؓ نے لگایا ہے۔ کیونکہ انہوں نے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے ساتھ مل کر حضرت علیؓ سے خونِ عثمانؓ کا مطالبہ کیا تھا۔

یعنی حضرت مولانا کے نزدیک اگر خونِ عثمانؓ کو بھی آمریت کے طریقہ پر ظلم و طغیانی کی آندھی سے اڑنے والی گرد کی تہوں میں چھپا دیا جاتا اور کوئی شخص بھی قتلِ عثمانؓ کا ذکر اپنی زبان پر نہ لاتا تو یہی بات دراصل خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے مزاج سے ہموار تھی۔ لیکن یہ جوان لوگوں نے

لہ خلافت و ملوکیت از صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۶

عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت کا بدلہ لینے کے لئے قصاص قصاص پکارنا شروع کر دیا تھا تو یہ بات خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے دور میں قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔

مولانا نے یہ بات بڑے اعتماد سے کہی ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے انعقاد سے ملت کو یہ موقع مل گیا تھا کہ خلافتِ راشدہ کے نظام میں اب تک جو ابتری پیدا ہو چکی تھی اس کی تلافی ہو سکتی۔ مگر ایک طرف حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے قصاص قصاص، پکارنا شروع کر دیا اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ نے بھی یہی رٹ لگا دی اور مزید یہ کہ انہوں نے ایک نہایت درجہ غلط اور غیر شرعی مطالبہ بھی کیا کہ قاتلینِ عثمانؓ کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ اس غلط طریق کار اور غلط مطالبہ سے نپٹنے کے لئے حضرت علیؓ کو بامرِ مجبوری ان لوگوں کے خلاف نبرد آزما ہونا پڑا اور خلافتِ راشدہ ملوکیت کی طرف ایک موڑ اور مڑ گئی۔
مگر یہ قصاص قصاص کا شور مچانے سے ملوکیت کیونکر ایک قدم اور بڑھ آئی؟
مولانا نے یہ بھید بھی کھول دیا ہے کہ:

ان لوگوں کو بصرے پہنچ کر قصاص قصاص کی رٹ لگانا اور قصاص حاصل کرنے کے لئے عملی کوشش کرنے یا دمشق میں بیٹھ کر انتقام انتقام پکارنے کے بجائے حضرت علیؓ کے پاس مدینہ منورہ پہنچنا چاہیئے تھا اور وہاں پہنچ کر حضرت علیؓ سے درخواست کرنی چاہیئے تھی کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لیجئے اگر حضرت علیؓ نہ مانتے تو لوگ خود ہی ان کو معزول کر دیتے۔ مگر ان لوگوں کے ناجائز اقدام کی وجہ سے خلافتِ راشدہ کا نظام پیچھے ہٹ گیا اور ملوکیت آگے بڑھ آئی۔ تاریخ کے اس دور میں جس کی بات مولانا کر رہے ہیں اور جس کے بارے میں مولانا دوسرے سب لوگوں سے ہی زیادہ جانتے ہیں کہ مدینہ میں جہاں حضرت مولانا ان لوگوں کو حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش ہونے کا مشورہ

دے رہے ہیں حضرت علیؓ کی حکومت سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ وہاں کی حکومت عثمانؓ کے قاتلوں کے ہاتھ میں تھی۔ یعنی مولانا کا مشورہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کا بدلہ چاہنے والے لوگ عثمانؓ کے قاتلوں کے حضور پہنچتے اور انتہائی برخورداری کے ساتھ اپنی گردنیں اُن کے سامنے رکھ دیتے تاکہ انہیں بھی حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا دیا جاتا۔

مولانا جانتے ہیں کہ ان کا یہ خیال صریحًا غلط اور بے بنیاد ہے کہ علیؓ اگر قصاص طلب کرنے پر بھی قصاص نہ لیتے تو لوگ ان کو معزول کر دیتے کیونکہ حضرت علیؓ کی تقرری اور معزولی اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہی نہیں تھی جو اپنی رائے رکھتے تھے بلکہ حضرت علیؓ کا حال اور مستقبل از سر تا پا قاتلینِ عثمانؓ کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے مولانا کے ان قیمتی مشوروں میں سے کوئی مشورہ بھی مولانا کے علم سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ ان کی ساری باتیں ان کی ضرورت کی پیداوار ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ مولانا اس دور کی تاریخ سے ہرگز ناواقف نہیں ہیں۔ اور مولانا یہ بھی جانتے ہیں کہ جو مشورہ وہ اب دے رہے ہیں یہ مرحلہ مطالبہ کرنے والے بزرگ گزار کر ہی مدینہ سے نکلے تھے اور اُنہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر جب ان کے مطالبہ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا تو وہ مدینہ چھوڑ کر نکل گئے اور دوسرے ذرائع سے حق کو نافذ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

مسجدِ نبویؐ میں اجتماعِ عام

مولانا نے حضرت علیؓ کی خلافت علی منہاج النبوۃ کی دلیل میں ارشاد کیا ہے کہ:

مسجدِ نبویؐ میں اجتماعِ عام ہوا اور تمام مہاجرین اور انصار نے اُن کے

ہاتھ پر بیعت کی۔ صحابہ میں سے صرف ۱۷ یا ۲۰ ایسے لوگ تھے جنہوں نے بیعت نہیں کی۔

ان سترہ یا بیس اصحاب کے بیعت نہ کرنے سے حضرت علیؓ کی خلافت پر جو اعتراض آتا تھا اُسے دُور کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ:

اگر سعد بن عبادہ کے بیعت نہ کرنے سے ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت مشتبہ نہیں ہوتی تو ۱۷ یا ۲۰ صحابہ کے بیعت نہ کرنے سے حضرت علیؓ کی خلافت کیسے مشتبہ قرار پا سکتی ہے؟

حضرت علیؓ کی خلافت پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ سب مسلمان انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چوتھا خلیفہ مانتے ہیں۔ خواہ ان کی خلافت علی منہاج النبوۃ نہ بھی ہو، جب بھی وہ خلیفہ رسولؐ ہی ہیں اور ان کی خلافت سے کسی کو انکار نہیں۔

مگر حضرت علیؓ کی خلافت کے غیر مشتبہ ہونے میں مولانا کی یہ دلیل ہرگز صحیح نہیں کہ سعد بن عبادہ کے بیعت نہ کرنے سے اگر ابوبکرؓ اور عمرؓ کی خلافت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو ۱۷ یا ۲۰ اصحابِ رسولؐ کا علیؓ کی خلافت سے انکار اُن کی خلافت کے کمزور پہلو کی نشاندہی نہیں کرتا اور ان کی بیعت ٹھیک اُنہی اصولوں کے مطابق منعقد ہوئی تھی جن پر خلافت راشدہ کا انعقاد ہو سکتا تھا۔

کیونکہ ایک ابن عبادہ اور بیس صحابہ میں وہی فرق ہے جو ایک اور بیس کے ہندسے میں ہے۔ سعد بن عبادہ کی بیعت کی روایات بھی آئی ہیں لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا جب بھی سعد بن عبادہ کے معاملہ کو سترہ یا بیس صحابہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ سعد بن عبادہ کا معاملہ ایک ذاتی قسم کا معاملہ تھا۔ جو اُن کی ذات سے آگے نہیں بڑھا اور اُن کی پوری زندگی اُن کے ساتھ دوسرا کوئی ایک بھی شامل نہیں ہوا۔ جبکہ ان بیس صحابہ کے بارے

میں مولانا کو اعتراف ہے کہ:

وہ بہر حال اُمت کے نہایت با اثر لوگ تھے اور اُن میں سے ہر ایک ایسا تھا جس پر ہزاروں مسلمانوں کو اعتماد تھا[1]

اب اگر مولانا سے سوال کیا جائے کہ اگر آپ کے ان مسلمہ بیس اصحابِ رسولؐ اور ان کے لاکھوں چاہنے والوں کے انکار سے حضرت علیؓ کی خلافت مشتبہ نہیں ہوتی تو بسیار تلاش کے بعد صرف چار دریافت شدہ اصحابِ رسولؐ کے انکار سے یزید کی خلافت کس طرح مشتبہ ہو جاتی ہے۔ جبکہ ان چار میں سے بھی دو یعنی حضرت حسینؓ بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ خود خلافت کے دعویدار تھے، تو مولانا کا جواب کیا ہو گا؟ مولانا نے یہ نہایت درجہ بے خیر، بے مقصد اور غیر ضروری بحث چھیڑ دی ہے اور افسوس ہے کہ وہ اپنی اس کتاب میں ایسی بہت سی بحثوں کو بالجبر گھسیٹ لائے ہیں، جن سے اُن کا مقصود بجز اس کے کوئی نہیں کہ حضرت علیؓ کی ذات گرامی سے تعلق رکھنے والا ہر وہ پہلو جس کو جذبات نے تخلیق بخشی ہے اس کے بار بار ذکر سے اپنے موقف کے کمزور رُخ کے لئے توانائی حاصل کرنے کا سامان مہیا ہے۔ ورنہ جہاں تک ان کے اس بیان کا تعلق ہے کہ مدینہ کے اہلِ فکر و تدبیر اور ارباب حل و عقد اصحابِ رسولؐ کا کوئی اجتماع ہوا تھا۔ اس کی حقیقت خود مولانا سے بہ نہاں نہیں ہے۔ مدینہ کے اندر بسنے والے ارباب حل و عقد کی موثریت سے کسی کو بھی انکار نہیں اور اُن کے فیصلہ کو ہمیشہ اُمت کا فیصلہ تسلیم کیا گیا ہے مگر اصحابِ حل و عقد سے مراد مدینہ شہر کی دیواریں اصحابِ حل و عقد کی قیام گاہوں کی اینٹیں اور کھجور کے پیڑ نہیں ہیں۔ مدینہ کے اصحاب

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۲۳

حل و عقد کا فیصلہ خلافتوں کو منعقد کرتا رہا ہے ۔ مگر یہ فیصلے آزاد اور اپنی رائے کے مختار اصحابِ حل و عقد کے فیصلے ہوتے تھے ۔ مدینہ کی مرکزیت سے بھی انکار نہیں مگر مدینہ کی مرکزیت بھی کھجور کے باغات کی وجہ سے نہیں تھی اربابِ حل و عقد کی وجہ سے تھی ۔ اور اب جب وہی وہاں موجود نہیں تھے اور جو موجود تھے اُن کے سینے عثمانؓ کے قاتلوں اور خلافت کے باغیوں کی سنگینوں کی اَنیوں اور ریوائیوں کے تیز دھار خنجروں کی زد میں تھے تو یہ اربابِ حل و عقد کہاں رہ گئے تھے ۔ کیا خلافت علیٰ منہاج النبوہ کے انتخاب کا اب تک یہی دستور چلا آ رہا تھا؟ اور کیا یہی صورتِ حال وہ صورتِ حال ہے جس کے بارے میں مولانا کا ارشاد ہے کہ :

مدینہ منورہ مرکزِ اسلام ہونے کی وجہ سے اور اربابِ حل و عقد کی موجودگی کے باعث انتخاب کا مجاز تھا اور یہاں جس کا انتخاب بھی ہوگا اس کی خلافت منعقد سمجھی جائے گی ۔

مگر ہم اس پہلو سے بھی مولانا کی اُس غلط پذیری کا ازالہ کر دینا چاہتے ہیں جب وہ مدینہ کے اندر مسجدِ نبویؐ کے عظیم اجتماع میں تمام انصار و مہاجرین کی عام اور اجتماعی بیعت کی بات کرتے ہیں [۱]

اس مرحلہ پر مدینہ کی صورتِ حال تاریخی روایات کے بموجب کچھ اس طرح کی تھی کہ :

امام شعبی کہتے ہیں کہ مجھے اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں حضرت علیؓ کے ساتھ اس دورِ فتنہ میں صرف چھ یا سات بدری شامل تھے آٹھواں کوئی شامل نہیں ہوا [۲]

حضرت علیؓ کے اس جواب پر کہ کچھ لوگ قصاص کے حق میں ہیں، کچھ

---

[۱] خلافت و ملوکیت صـ ۱۲۲ [۲] طبری جلد ۳

خلاف ہیں، کچھ دونوں باتوں کے قائل نہیں اس لئے ان حالات میں قصاص لینا ہرگز ممکن نہیں ہے ۱؎ لوگوں کو سخت صدمہ ہوا اور وہ تیزی کے ساتھ مدینہ سے بھاگنے لگے ۲؎

بنو امیہ شام کی طرف نقل مکانی کر گئے ۳؎

۱۷ یا ۲۰ اصحاب رسولؐ نے علیؓ کی بیعت سے انکار کر دیا ۴؎

بعض اکابر صحابہ حضرت علیؓ کی بیعت سے الگ رہے .... اور یہ لوگ بہر حال اُمت کے نہایت بااثر لوگ تھے۔ ان میں سے ہر ایک ایسا تھا کہ جس پر ہزاروں مسلمانوں کو اعتماد تھا ۵؎

حضرت علیؓ کو اُمت سے جس دلجمعی کی ضرورت تھی بدقسمتی سے وہ حاصل نہ ہو سکی ۶؎

بکثرت صحابہ اور اُن کے زیر اثر لوگ جو مسلمانوں کی ناراضگی کو فطری طور پر ایک فتنہ سمجھ رہے تھے اس مہم میں علیؓ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ ہوئے ۷؎

اور پھر تاریخ کا ہر قاری اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سے جبری بیعت حاصل کی گئی تھی۔ مگر جونہی اُنہوں نے موقع پایا وہ مدینہ منورہ سے نکل گئے اُنہوں نے نہ صرف بیعت توڑ دی بلکہ انہیں حضرت علیؓ سے تصادم کی مجبوری بھی پیدا ہو گئی۔

اور جیسا کہ ہم عرض کر آئے ہیں کہ زبیرؓ حضرت علیؓ کے نہایت قریبی رشتہ دار تھے، اُن کے دوست تھے، اُن کی حقیقی پھوپھی کے بیٹے تھے۔ عثمانؓ کے انتخاب کے موقع پر وہ اپنے حق سے حضرت علیؓ کے حق میں دستبردار ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ

۱؎ طبری جلد ۳ ۲؎ طبری جلد ۳ باب ۱ ۳؎ طبری جلد ۳ ۴؎ خلافت و ملوکیت صہ ۱۲۲
۵؎ ایضاً صہ ۱۲۳ ۶؎ ایضاً صہ ۱۲۴ ۷؎ ایضاً صہ ۱۲۹

خلیفہ بنے تو یہی زبیرؓ اپنے خسر کے خلاف تلوار لہراتے اُٹھے تھے کہ جب تک علیؓ کی بیعت نہیں کی جائے گی میری تلوار میان میں واپس نہیں جائے گی۔

مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ علیؓ کی جس بیعت کے لئے اُنہوں نے تلوار نکال لی تھی اب جب اُنہی علیؓ کی بیعت کا وقت آیا تو زبیرؓ اُن کی بیعت کرنے میں متامل تھے اور علیؓ کی حمایت میں اٹھنے والی تلوار آج کُند تھی اور علیؓ کے ساتھیوں کی تلوار زبیرؓ کی گردن پر تھی۔ اللہ اکبر! تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ ط

تو یہ ہے مولانا کا مبینہ مسجد نبوی کا وہ اجتماع عام جس میں تمام کے تمام انصار اور مہاجرین نے حضرت علیؓ کی بیعت کی تھی اور مدینہ کے اصحابِ حل وعقد نے اپنے قدیم دستور کے مطابق ان کا انتخاب کیا تھا۔ اس اجتماع کی حقیقت بس یہی ہے جو تاریخی روایات سے سامنے آئی ہے۔ تاہم مولانا کی اپنی ایک سوچ ہے اور ان کی سوچ کا تعلق تاریخی واقعات سے نہیں بلکہ اپنی گروہی اور سیاسی خواہشات سے ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ مولانا کی ضرورت نے ایک بے خیر بحث پیدا کر دی اور ہمیں اپنی خواہش کے خلاف محض اپنے قارئین کے فکر و نظر کو گمراہی سے بچانے کے لئے اس بحث میں ملوث ہونا پڑا۔

یہ غلط فہمی نہیں صریحاً غلط اندیشی ہے

مولانا مودودی صاحب کی ایک اور بے خیر بحث

حضرت علیؓ کی عظمت ایک امر واقعہ ہے اور ایک حقیقت بیّنہ ہے، اُمت کے اندر اُن کے اثر و رسوخ کے بارے میں بھی کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ وہ عظیم ہیں اور بلاشبہ عظیم ہیں مگر خلافت و ملوکیت کے گرامی قدر مصنف نے

ان کی عظمت کے بیان میں بھی ایک ایسی غیر ضروری، بے جواز اور بے محل بحث چھیڑ دی ہے۔ جس سے اُنہوں نے حضرت علیؓ کی ذات کو بحث کا عنوان بنا لیا ہے۔ بلا شبہ اس بحث سے مولانا کا ایک خاص مقصد بھی ہے مگر اس طریقے سے اپنے مقصد کو حاصل کرنا علیؓ دوستی کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔ اور اس کو اُن کا ایک اور کارِ بے خیر ہی کہا جائے گا۔ مولانا مودودی چلتے چلتے اچانک ایک جگہ اٹک گئے اور بغیر کسی محل اور ضرورت کے فرماتے ہیں:

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اُمت کی رائے عامہ معلوم کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا تھا کہ حضرت عثمانؓ کے بعد دوسرے شخص جن کو اُمت کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل ہے حضرت علیؓ ہی ہیں۔ اس لیے یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ خلافت کے لئے اُنہی کی طرف رجوع کرتے [۱]

یہ بات کہنے کا کوئی محل اس لئے نہیں تھا کہ بات کسی مقابلہ کی زیرِ بحث نہیں تھی کچھ لوگوں نے ہجوم کر کے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا اور پھر اپنی ضرورت سے انہوں نے حضرت علیؓ پر لوگوں کو جمع کیا اور حضرت کے ہاتھ پر بیعت کر لی گئی۔ اس بیعت کی نوعیت کیا تھی اور کیفیت کیا تھی۔ یہ الگ سوال ہے مگر امر واقعہ یہی ہے کہ باغیوں کو جتنے کچھ بھی لوگ مدینہ منورہ میں میسّر آسکے۔ وہ خواہ صحابی تھے یا غیر صحابی ان سے جبری بیعت لی گئی یا انہوں نے بالرضا بیعت کی۔ باغیوں کے اہتمام میں یہ ایک ضروری مرحلہ بہر حال طے ہو گیا۔ نہ ماننے والے نہ مانے، چلے جانے والے لوگ چلے گئے، مجبور ہونے والے مجبور ہوئے اور رضا مندی سے بیعت کرنے والوں نے بالرضا بیعت کر لی۔ اس مرحلہ پر آخر وہ سوال کیونکر پیدا ہوتا ہے جو مولانا نے پیدا کیا ہے۔

---

[۱] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۲۱

اس سوال کے پیدا ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ مولانا خود انتخاب کی اس صورت سے مطمئن نہیں تھے اور انہوں نے الفاظ کی جمع و ترتیب سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی سعی کی ہے۔

دوم، وہ علیؓ کی عظمت کے اظہار کے بہانے بالواسطہ دوسروں کی تنقیص سے اپنا جی خوش کرنا چاہتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے انعقاد کے موقع پر چونکہ حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ بورڈ میں علیؓ کے ساتھ دوسرے پانچ بزرگوں کا نام بھی موجود تھا اس لئے اب علیؓ کی خلافت کے مرحلہ پر مولانا نے ضرورت محسوس کی کہ لگے ہاتھوں اُن کی خبر بھی لے لی جائے اس طرح مولانا نے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی بالخصوص بالواسطہ تنقیص کا موقع پیدا کر لیا ہے ورنہ اس کا موقع کوئی نہیں تھا۔

حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے موقع پر صرف دو ہی آدمی تھے جو ایک دوسرے کے مقابلہ میں اُمّت کے اندر اثر و نفوذ کا معیار بن گئے تھے۔ اُن میں سے جو جیت جاتا وہ زیادہ بارسوخ تھا جو ہار جاتا اس کے رسوخ کی کمی بالکل ظاہر بات ہے۔ تیسرا کوئی مقابلہ میں شامل ہی نہیں تھا جو کسی تیسرے کے رسوخ کی پیمائش بھی ہو سکتی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے فیصلہ دیا کہ علیؓ کے مقابلہ میں عثمانؓ اُمّت کے اندر زیادہ اثر و نفوذ رکھتے ہیں اور زیادہ مقبول ہیں۔ چنانچہ ان کو خلیفہ بنا لیا گیا اور علیؓ میدان سے ہٹ گئے۔ آخر اس میں حضرت علیؓ کے لئے فخر کی کونسی بات تھی جو مولانا کو یہ بات اٹھانی پڑی۔

رہی یہ بات کہ علیؓ اپنے انتخاب کے موقع پر اُمّت میں سب سے بڑھ کر اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ ہمیں اس سے انکار کی ضرورت ہی نہیں ہے وہ یقیناً بہت بڑے رسوخ کے مالک تھے مگر اس اثر و رسوخ کا پتہ تو مقابلہ سے ہی چل سکتا تھا۔ اگر علیؓ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا شخص خلافت کا

مدعی بن کر میدان میں آتا تو فریقین میں سے زیادہ رسوخ والے کا فیصلہ امت کے ہاتھوں میں تھا مگر علیؓ تو اکیلے ہی منتخب کیے گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان کو منتخب کر لینا چاہا اور وہ منتخب ہو گئے۔ اس میں رسوخ اور عدم رسوخ کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات کوئی زیادہ پیچیدہ نہیں جو کسی کی سمجھ میں نہ آسکے کہ عثمانؓ اور علیؓ کے مقابلہ میں عثمانؓ اگر ایک ہزار ووٹوں میں سے ساڑھے نو صد ووٹ حاصل کر لیتے اور علیؓ صرف پچاس ہی ووٹ لے سکتے تب بھی عثمانؓ کے بعد دوسرا نمبر علیؓ کا ہی تھا کیونکہ میدان میں صرف یہی دو تھے۔

اس میں عثمانؓ کے بعد امت کے اندر صرف انہی کے رسوخ کی اولیت کس اصول سے فرض کی جاسکتی ہے۔ اب مولانا کے اس اضطراب یا اضطرار کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ چونکہ حضرت علیؓ کی خلافت پر امت کا اجماع نہیں ہو سکا تھا جس طرح حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافتوں پر ہوتا رہا ہے کہ پوری امت ان میں سے ہر ایک کی خلافت پر ہی متفق تھی۔ ایک سعد بن عبادہ تھے جن کو مولانا نے اپنی ضرورت سے بار بار اچھالا ہے کہ وہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کو نہیں مانتے تھے مگر اس بات کو بھی مولانا ابن عبادہ سے آگے نہیں لے جا سکے۔

اور چونکہ حضرت علیؓ کی خلافت ان کی زندگی کی آخری سانس تک امت کے اندر متنازعہ فیہ مسئلہ ہی رہی تھی اس لئے مولانا نے ضرورت محسوس کی کہ علیؓ پر اجماع کے ثبوت میں سخن سازی کو ذریعہ بنایا جائے اور پھر یہ مرحلہ آپ آسانی سے طے کر گئے۔ ع

رسید بود بلائے ولے بخیر گزشت

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے بیان میں اس مرحلہ پر علیؓ کے بارے میں کسی ایسے یقین کا اظہار قابلِ فہم بھی نہیں ہے کیونکہ جن حالات میں عثمانؓ کو

کامیاب قرار دیا گیا تھا۔ حضرت علیؓ کے بارے میں ایسے کلمات ان کے لئے تعریف کے ضمن میں ہی شمار کئے جاتے لیکن اگر حضرت ابن عوف سے منسوب یہ قول فی الحقیقت اُنہی کا ہی قول ہے تو اس کو زیادہ سے زیادہ حضرت علیؓ کے لئے تعزیت کا ہی ایک کلمہ کہنا چاہیئے۔ کیونکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے فیصلہ سے حضرت علیؓ کو جو سخت رنج پہنچا تھا اور آپ نے اس فیصلہ کو سن کر جس طرح اظہار رنج و غضب کیا تھا ایسے مراحل پر دستور رہی ہے کہ حضرت ابن عوف حضرت علیؓ کا حوصلہ بڑھاتے اور اُن سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔ چنانچہ اُنہوں نے حضرت علیؓ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے اُنہیں تسلی دی، ہوگی اس میں ناقابل فہم بات کوئی نہیں ہے مگر ابن عوف سے منسوب الفاظ میں جبر اور زور سے کوئی اور معنی داخل کرنا فکر و نظر کا کوئی اچھا نقش نہیں ہے۔

ہمیں حضرت علیؓ سے وہی تعلق خاطر ہے جو کسی مسلمان کو خلیفۂ رسولؐ سے ہو سکتا ہے اور ہم مان لیتے کہ اگر کوئی مقابلہ بھی ہوتا تو عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ ہی خلیفہ بنتے۔ مگر بدقسمتی سے امر واقعہ یہ نہیں ہے کیونکہ مورخین اور بالخصوص حضرت معاویہؓ اور حضرت عثمانؓ کے خلاف حضرت علیؓ کے ساتھ رغبت رکھنے والے مورخین بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ علیؓ اگر جبر کے ساتھ خلیفہ نہ بنا دیئے جاتے اور اُنہیں کسی کے مقابلہ میں انتخاب لڑنا پڑتا تو پھر شکست ہی کھاتے۔

ہم مصری مصنف عمر ابو النصر کا ذکر کر آئے ہیں، ان کی علیؓ دوستی اور معاویہؓ دشمنی دونوں باتیں ہی غیر مشتبہ ہیں حضرت معاویہؓ کے حق میں اُن کی تحریر بھی مولانا کی طرح ہی تیر و نشتر کے سانچے میں ڈھل کر اور زہر میں بجھ کر نکلی ہے۔ مگر اس باب میں مولانا مودودی سے وہ بھی متفق نہیں ہیں۔ وہ حضرت طلحہؓ اور

حضرت زبیرؓ پر تنقید کرتے ہوئے حضرت علیؓ کے انتخاب کا ذکر بھی موقع کی رعائت سے کر گئے ہیں، لکھتے ہیں:

حصولِ خلافت کے بارے میں (طلحہؓ وزبیرؓ) دونوں ہی حضرت علیؓ سے زیادہ پُرامید تھے۔ جب عثمانؓ شہید ہوگئے تو انہیں اپنی امید برآتی نظر آئی اور اگر اشتر اور اُس کے ساتھی لوگوں کو حضرت علیؓ کی بیعت کرنے پر مجبور نہ کر دیتے تو طلحہؓ اور زبیرؓ کے مقابلہ میں علیؓ کبھی یہ منصب حاصل نہ کر سکتے [1]

ہم اس بحث کو جو واقعات سے بڑھ کر بزرگوں اور اکابر اُمت کی ذاتیات سے تعلق رکھتی ہے اور جس کو پھیلانا ادب کے بھی منافی ہے اپنے ہاں قبول نہ کرتے مگر مولانا مودودی صاحب نے بعض اکابر اصحابِ رسولؐ کے خلاف اپنی سیاسی ضرورتوں اور گروہی و نسلی تعصب سے جو تشنیع اور غلط فہمیاں پھیلانے کی مہم جاری کر رکھی ہے اس کا ازالہ بھی ایک ناگزیر ضرورت ہی ہے۔

کاش مولانا ان ہوائی باتوں سے قبل تاریخ کے اس ورق کا مطالعہ بھی کر لیتے جہاں اُن کے معتمد مورخ جناب علامہ طبری نے بڑی صراحت سے تحریر کر رکھا ہے کہ حضرت علیؓ قاتلینِ عثمانؓ کے نزدیک بھی تیسرے نمبر پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علیؓ کو منتخب کرنے سے قبل وہ طلحہؓ اور زبیرؓ دونوں کے پاس باری باری گئے تھے کہ خلافت کا تاج اپنے سر پہ رکھ لو، مگر انہوں نے انکار کیا اور بالآخر قاتلینِ عثمانؓ نے ان سے مایوس ہوکر علیؓ کو اس غرض سے اختیار کر لیا [2]

---

[1] علیؓ و عائشہؓ ص ۲۶، [2] طبری جلد ۳

قاضی ابوبکر ابن العربیؒ

حضرت عثمانؓ کے قتلِ ناحق کے قصاص کی بحث میں مولانا کے نظم سے ملوکیت کے اس تیسرے مرحلہ کا بیان نہایت درجہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہی وہ مرحلہ ہے جس میں مولانا نے حضرت علیؓ کی طرف سے قصاص نہ لئے جانے کے حق میں اور قصاص طلب کرنے والوں کے خلاف اپنے موقف کا بھرپور طریقہ سے اظہار کیا ہے۔

اس مرحلہ میں اُنہوں نے حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ اور معاویہؓ پر بھرپور طعن توڑے اور تعریضوں کے تیر چلائے ہیں۔ اُنہیں دینِ حق اور اس کے تقاضوں سے بے خبر قرار دیا ہے، کہیں اُنہیں دینِ حق کا شعور تلقین کیا ہے، کہیں ان کی غلطیوں کی صراحت کی ہے اور اُن کو دھونس اور دھکا کا علمبردار بیان کیا ہے۔

حضرت معاویہؓ پر تو وہ اس باب میں بہت ہی مہربان رہے ہیں اُنہوں نے حضرت معاویہؓ کے مطالبہ قصاص طلبی اور قاتلینِ عثمانؓ کو اپنے حوالے کئے جانے کے مطالبہ کو بالکل ناجائز، غلط، خلافِ شرع اور خالصتہً جاہلیت قدیمہ کے دور کا مطالبہ بیان کیا ہے لہ

اس مرحلہ پر مولانا نے اپنے موقف کی تائید میں بیرونی امداد کی ضرورت بھی محسوس کی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنی ایک مسترد کردہ کتاب العواصم من القواصم کے گرامی قدر مصنف حضرت قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کی زبان سے اس مسئلہ کی صحیح شرعی پوزیشن یوں بیان کی ہے:

لہ خلافت و ملوکیت ملخص از صہ ۱۲۴ تا ۱۲۶

(حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد) لوگوں کو بلا امام چھوڑ دینا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ امامت ان باقی ماندہ اصحاب کے سامنے پیش کی گئی جن کا ذکر حضرت عمرؓ نے شوریٰ میں کیا تھا مگر انہوں نے اُسے ردّ کر دیا۔ اور حضرت علیؓ نے جو اس کے سب سے زیادہ حقدار اور اہل تھے اسے قبول کر لیا تاکہ اُمّت کو خونریزی اور آپس کی پھوٹ سے بچایا جا سکے جس سے دین و ملّت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جانے کا خطرہ تھا۔ پھر جب اُن سے بیعت کر لی گئی تو شام کے لوگوں نے ان کی بیعت قبول کرنے کے لئے یہ شرط لگائی کہ پہلے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو گرفتار کر کے اُن سے قصاص لیا جائے۔ حضرت علیؓ نے ان سے کہا پہلے بیعت میں داخل ہو جاؤ پھر حق کا مطالبہ کرو اور وہ تمہیں مل جائے گا۔ مگر انہوں نے کہا آپ بیعت کے مستحق ہی نہیں ہیں جبکہ ہم قاتلینِ عثمانؓ کو صبح و شام آپ کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اس معاملہ میں حضرت علیؓ کی رائے زیادہ صحیح تھی اور اُن کا قول درست تھا۔ کیونکہ وہ اگر اس وقت قاتلینِ عثمانؓ سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے تو قبائل اُن کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوتے اور لڑائی کا تیسرا محاذ کھل جاتا۔ اس لئے وہ انتظار کر رہے تھے کہ حکومت مضبوط ہو جائے اور تمام مملکت میں اُن کی بیعت منعقد ہو لے، اس کے بعد باقاعدہ عدالت میں اولیاءِ مقتول کی طرف سے دعویٰ پیش ہو اور حق کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے۔ علماءِ اُمّت کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ امام کے لئے قصاص کو مؤخر کرنا ایسی حالت میں جائز ہے جبکہ اس سے فتنہ بھڑک اُٹھنے اور تفرقہ برپا ہونے کا خطرہ ہو۔[۱]

آخر میں مولانا نے انہی قاضی ابوبکر ابن العربی سے نقل کیا ہے کہ:

---

[۱] خلافت و ملوکیت صد ۱۳۶ بحوالہ احکام القرآن ابوبکر ابن العربی

(باغیوں کے لئے) صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ حضرت علیؓ کی بات مان لیتے اور اپنا مطالبۂ قصاص عدالت میں پیش کر کے قاتلین پر مقدمہ ثابت کرتے۔ اگر ان لوگوں نے یہ طریق اختیار کیا ہوتا اور پھر حضرت علیؓ مجرموں سے بدلہ نہ لیتے تو انہیں (یعنی باغیوں کو) کشمکش کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوتی جماعۃ المسلمین خود ہی حضرت علیؓ کو معزول کر دیتے [۱]

ہم نے مولانا کی حمایت میں حضرت قاضی ابو بکر ابن العربی کے نام سے مولانا کی نقل کردہ پوری تحریر یہاں نقل کر دی ہے تاکہ بحث کا کوئی گوشہ ابہام کا شکار نہ ہو۔ تاہم اس تحریر کے تاریخی تسامحات پر ہم یہاں کوئی بحث نہیں کریں گے کہ یہ ایک الگ مضمون ہے اور جہاں تک صحیح واقعات کا تعلق ہے وہ ہمارے قارئین اس کتاب میں جگہ بہ جگہ موجود پائیں گے۔ یہاں اس تحریر کے نقل کرنے کا مقصد دوسرا ہے۔

مولانا نے جس مسئلہ پر قاضی صاحب سے اُن کی کتاب "احکام القرآن" کے ذریعہ امداد طلب کی ہے اس مسئلہ پر قاضی صاحب کی ایک نہایت مفصل اور مایہ ناز کتاب "العواصم من القواصم" کے نام سے موجود ہے۔ کاش مولانا اپنے قارئین کو اس باب میں اُس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ دیتے تاکہ اُن پر مفاد پرستی کا الزام نہ آسکتا۔ اصل یہ ہے کہ قاضی ابو بکر کی مولانا مودودی صاحب سے رفاقت صرف حضرت علیؓ کی ذات گرامی تک ہی محدود ہے اس سے آگے نہیں بڑھتی اور اس جزوی توافق و تطابق کے علاوہ مولانا اور قاضی صاحب کے موقف میں کوئی یکسانیت موجود نہیں ہے۔

علیؓ معاویہؓ تصادم میں بلاشبہ قاضی صاحب معاویہؓ کے مقابلہ میں علیؓ کو حق سے زیادہ قریب سمجھتے ہیں مگر دونوں کے اس باہمی تصادم میں وہ معاویہؓ کو بھی باطل پرست یا گمراہ قرار نہیں دیتے اور وہ انہیں بھی اُن کے جوابی خروج میں

---

[۱] خلافت و ملوکیت صـ۱۲۷ بحوالہ احکام القرآن جلد ۴

ایک مجتہد کی حیثیت سے ثواب کا ہی مستحق جانتے ہیں۔

اور جہاں تک حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہؓ کا تعلق ہے وہ اُن کے خروج کو کسی اعتبار سے کسی مرحلہ پر اور کسی حیثیت سے بھی غیر صحیح یا غلط قرار نہیں دیتے اور یہی موقف منہاج السنّۃ اور تحفہ اثنا عشریہ کے مصنّفین گرامی کا بھی ہے۔ جبکہ مولانا کے نزدیک یہ سب لوگ باغی اور حق سے تجاوز کرنے والے ہی ہیں اور اصل مآخذ کی طرف رجوع کے نام سے ان کی کتابوں کو مسترد کرنے کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے۔ مولانا نے قاضی صاحب سے اپنے مطلب کی چیز عقبی دروازہ سے حاصل کرلی ہے اور اس طرح اپنے موقف میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا حضرت قاضی صاحب کو بہرحال عادل نہیں سمجھتے اس لئے ان کی گواہی مولانا کو کسی طرح بھی مفید نہیں ہے اور مولانا کا ان کی تفصیلی گفتگو سے اپنے مطلب کی ایک بات کا اُچک لینا وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی کو ترک کرکے لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ پر عمل کرنے کے ہی مترادف ہے۔ یہ قاضی صاحب جہاں پہنچ کر مولانا کی رفاقت سے انکار کردیتے ہیں وہاں مولانا بھی اُن سے فوراً آنکھیں بدل لیتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

مآخذ کی اس بحث کو ختم کرکے آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ بات بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میں نے قاضی ابوبکر ابن العربی کی العواصم من القواصم، امام ابن تیمیہ کی منہاج السنّۃ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی تحفہ اثنا عشریہ پر انحصار کیوں نہ کیا[1] میں ان بزرگوں کا نہایت عقیدت مند ہوں اور یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی کبھی نہیں آئی کہ یہ لوگ اپنی دیانت و امانت اور صحتِ تحقیق کے

---

[1] مولانا مودودی صاحب نے جن تین کتابوں کو مسترد کیا ہے یہ تین کی تین ہی اسلامی لٹریچر کا وہ بیش قیمت ذخیرہ ہیں جس پر پوری اُمّت کو ناز ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

لحاظ سے قابلِ اعتماد نہیں ہیں لیکن جس وجہ سے اس مسئلے میں میں نے ان پر

اور جو اپنے موضوع کے اعتبار سے اتنی مکمل اور اپنی مقبولیت کے اعتبار سے اتنی کامیاب ہیں کہ دفاعِ صحابہ کی مہم میں ان کو مینارِ نور کہنا صحیح ہے اور اس راہ کے ہر مسافر کے لئے اس مینار سے اقتباسِ نور اس راہ کی ناگزیر ضرورت ہے،

اور واقعہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں اصحابِ رسول کے خلاف رفض و اعتزال اور شبابِ شیعہ اور سبائیوں کے وارد کردہ مطاعن کا ردّ اور اصحابِ رسول کے بارے میں مسلّمہ "اصول الصحابۃ کلھم عدول" کا اثبات اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ان کے مطالعہ سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

ان میں پہلی کتاب قاضی ابوبکر ابن العربی کی العواصم من القواصم ہے جو چھٹی صدی ہجری کی دولت ہے دو بڑی جلدوں میں لکھی گئی ہے اس کی دوسری جلد کی ایک بڑی فصل اصحابِ رسولؐ کے مسائل سے خاص ہے اور اپنے موضوع پر ایک نادر تصنیف ہے۔

دوسری تصنیف حضرت الامام علامہ ابن تیمیہ کی منہاج السنّۃ ہے جس کا پورا نام "منہاج السنّۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ" ہے۔ یہ کتاب اس زمانہ کے ایک غالی شیعہ ابن المطہر کی غیر مطہر اور شدّاس اثر تصنیف الموسوم "منہاج الکرامۃ فی معرفۃ الامامۃ" کے جواب میں لکھی گئی ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل کتاب ہے۔ بڑی ضخیم کتاب ہے اور چار بڑی جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب لکھتے ہی اتنی مقبول ہوئی اور اس کی مانگ اتنی بڑھی کہ انہی دنوں حضرت ابن تیمیہ کے شاگرد رشید اور مشہور محدث حافظ ذہبی کو افادہ عام کی غرض سے اس کی ایک تلخیص لکھنی پڑی۔ یہ تلخیص المنتقیٰ کے نام سے منہاج السنّۃ کا کامیاب جوہر ہے اور اس میں پوری کتاب کا نچوڑ بڑی خوبی سے سمو دیا گیا ہے۔

تیسری کتاب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے لائق فرزند اور جانشین حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی تحفہ اثنا عشریہ ہے جس میں انہوں نے شیعہ کے مطاعن کا رد اس کامیابی سے کیا ہے کہ شیعہ کی زبانیں اس کے جواب میں گُنگ ہیں اور وہ مُنہ چڑانے کے بجز کچھ نہیں کر سکے۔ یہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کی یادگار ہے اور زندہ یادگار ہے۔

انحصار کرنے کے بجائے براہ راست اصل مآخذ سے خود تحقیق کرنے اور اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ وہ یہ ہے کہ ان تینوں حضرات نے دراصل اپنی کتابیں تاریخ کی حیثیت سے بیان واقعات کے لئے نہیں بلکہ شیعوں کے شدید الزامات اور ان کی افراط و تفریط کے رد میں لکھی ہیں جس کی وجہ سے عملاً ان کی حیثیت وکیل صفائی کی سی ہو گئی ہے۔ اور وکالت خواہ الزام کی ہو یا صفائی کی اس کی عین فطرت یہ ہوتی ہے کہ اس میں آدمی اُسی مواد کی طرف رجوع کرتا ہے جس سے اس کا مقدمہ مضبوط ہوتا ہو اور اس مواد کو نظرانداز کر دیتا ہے جس سے اُس کا مقدمہ کمزور ہو جائے۔

خصوصیت کے ساتھ اس معاملہ میں قاضی ابوبکر تو حد سے تجاوز کر گئے جس سے کوئی ایسا شخص اچھا اثر نہیں لے سکتا جس نے خود بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہو[1]

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

مولانا کی ساری تحریر از اوّل تا آخر تضادات کا مجموعہ ہے۔ وہ قاضی صاحب کے عقیدت مند بھی ہیں، ان کی امانت پر بھی ایمان رکھتے ہیں، ان کی دیانت کے بھی قائل ہیں، ان کی صحت تحقیق سے بھی انکار نہیں کرتے مگر وہ ان کو ایک ایسے وکیل کے بطور پیش کرتے ہیں جو سراسر کتمانِ حق کی راہ کا مسافر ہو وہ اس تمام مواد کو نظر انداز کرے جو اس کے مقدمہ کو کمزور کرتا ہو۔ اگرچہ وہ مواد عین حق ہو اور وہ صرف اُسی مواد کو اختیار کرے جو اس کے موقف کو مضبوطی بخشے خواہ وہ حق و انصاف کے صریحاً خلاف ہو۔ آخر وکیل کی اس کج کاری اور باطل اندیشی میں امانت اور دیانت والی کونسی بات ہے۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صت۳۲

اور یہ عقیدت مندی کی کونسی قسم ہے کہ مولانا جس شخص کے لئے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اُسے سب سے بڑا بے انصاف بھی کہتے ہیں جو اپنے مقدمہ کو سدھار کھنے کے لئے حق سے اتنا تجاوز کرے کہ ساری حدیں پھلانگ کر آگے نکل جائے۔

اور کسی کی صحتِ تحقیق پر ایمان کا یہ کونسا رُخ ہے کہ اس کی تحقیق کو لائقِ انحصار و اعتماد نہ سمجھا جائے۔

قاضی صاحب کی امانت و دیانت پر مولانا مودودی صاحب کا یہ اعتماد کچھ ایسے ہی معلوم ہوتا ہے جس طرح حضرت مولانا نے حضرت عثمان رضؓ کے دامن میں وہ تمام گناہ ڈال کر بھی جن کی وجہ سے خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ اپنے معاملہ کو ہموار رکھنے کے لئے یہ بھی تحریر فرما رکھا ہے کہ:

سیدنا عثمان رضؓ نے اپنے اقربا کے معاملے میں جو طرزِ عمل اختیار فرمایا اس کے متعلق میرے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ شبہ نہیں آیا کہ معاذ اللہ وہ کسی بدنیتی پر مبنی تھا[1] سبحان اللہ نہ

کئے اس پیار میں بھی آپ نے لاکھوں ستم ہم پر
خدانا خواستہ گر خشمگیں ہوتے تو کیا کرتے

قاضی ابوبکر ابن العربی کی احکام القرآن سے ایک بات مولانا کے موقف سے ہموار تھی وہ اُنہوں نے لی مگر جب قاضی صاحب نے یہ فرما دیا کہ:

باقی رہا حضرت امیر معاویہ رضؓ کو والی بنانے کا واقعہ تو ان کو حضرت عثمان رضؓ نے نہیں بلکہ حضرت عمر رضؓ نے والی بنایا تھا۔ اور شام کے تمام علاقے ان کی تحویل میں دے دیئے تھے اور حضرت عثمان رضؓ نے ان کو برقرار رکھا۔ بلکہ آپ کی ولایت کا

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۳۲۱

تعلق حضرت ابوبکر صدیق سے ہے کیونکہ انہوں نے ان کے بھائی یزیدؓ بن ابوسفیانؓ کو والی بنایا اور یزیدؓ نے ان کو اپنا جانشین مقرر کیا تو حضرت عمرؓ نے آپ کو برقرار رکھا۔ چنانچہ اس کا تعلق حضرت ابوبکرؓ سے تھا کہ انہی کے والی نے ان کو مقرر کیا تھا تو پھر حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کی پیروی کرتے ہوئے ان کو برقرار رکھا۔

اب اس سلسلہ کو دیکھو کہ اس کی کڑیاں کتنی مضبوط ہیں اور ان کے بعد اس جیسا شاندار سلسلہ کوئی نہ لا سکا [1]

جبکہ حضرت مولانا مودودی حضرت عثمانؓ کے اسی ایک عمل پر ہی زیادہ برہم ہیں جب فرمایا کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت معاویہؓ کو مسلسل بڑی طویل مدت تک ایک ہی صوبے کی گورنری پر مامور کئے رکھا۔ وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں چار سال سے دمشق کی ولایت پر مامور چلے آرہے تھے حضرت عثمانؓ نے ایلہ سے سرحد روم تک اور الجزیرہ سے ساحل بحر ابیض تک کا پورا علاقہ اُن کی ولایت میں جمع کر کے اپنے پورے زمانۂ خلافت (۱۲ سال) میں ان کو اسی صوبے پر برقرار رکھا [2]

مزید ارشاد گرامی ہے:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا اور غلط کام بہرحال غلط ہے خواہ وہ کسی نے کیا ہو [3]

ایسے ہی حضرت مولانا مودودی صاحب حضرت ابوبکر ابن العربی کو بھی کیونکر معاف کرتے۔ یہ بات یقیناً ناقابل فہم نہیں ہے جو اس پر مولانا کو الزام دیا جائے۔ پھر قاضی صاحب نے اہل سنۃ کے اس موقف کو قدم قدم پر دہرایا ہے

---

[1] العواصم من القواصم شائع کردہ ادارہ احیاء السنۃ گھر جاکھ ص ۱۵۲

[2] خلافت و ملوکیت ص ۱۱۵ [3] خلافت و ملوکیت ص ۱۱۶

جسے مولانا مودودی اپنے موقف کے منافی پاکر سختی سے مسترد کر دیتے ہیں۔قاضی صاحب نے ان تمام امور پر مولانا کے موقف کے خلاف رائے دے رکھی ہے جو مولانا کے موقف کی بنیاد ہیں اور جن کو بنیاد بنا کر مولانا نے حضرت عثمانؓ یا حضرت معاویہؓ کو ہدفِ تنقید و تنقیص ٹھہرایا ہے۔

چند مزید مثالیں

حضرت معاویہؓ کی طرح حضرت مروانؓ کے حق میں بھی مولانا بہت دلیر ہیں وہ اگرچہ حضرت عثمانؓ کے لئے بھی کوئی رحم اپنے دل میں نہیں رکھتے تاہم ان کی حد تک وہ رکھ رکھاؤ سے بھی کام لے لیتے ہیں مگر معاویہؓ مروانؓ اور عمروؓ بن العاص کو تو وہ کسی کروٹ بھی معاف نہیں کرتے

حضرت مروانؓ

حضرت مروانؓ کے ایمان و اخلاص کی تاریخ بیان کرنے سے بات لمبی ہو گی، وہ تاریخ کی ایک عظیم دولت ہیں۔ اتفاق سے حضرت عثمانؓ کے قریبی عزیزوں میں سے تھے اور ایک بیدار مغز اور صاحب فکر و نظر شخص ہونے کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کے بہت زیادہ قریب آ چکے تھے، مولانا ان سے بھی بڑے خفا ہیں۔

مولانا ان کے اقتدار کو حضرت عثمانؓ کا گناہ قرار دیتے ہیں اور اُن کے نزدیک حضرت عثمانؓ مروانؓ کے ہاتھ میں موم کی ناک تھے۔ جدھر وہ انہیں گھما دیتے وہ گھوم جاتے۔ چنانچہ خلافت سے ملوکیت کی طرف ان کی پیش رفت میں بھی مولانا کے نزدیک مروانؓ کی شرارتِ نفس کا ہی زیادہ دخل تھا: تاہم وہ زیادہ سنگین گفتگو اکثر دوسروں کے حوالے سے کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

یہ مان لینا لوگوں کے لئے سخت مشکل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معتوب (حکم) کا بیٹا (مروانؓ) اس بات کا بھی اہل ہے کہ تمام اکابر صحابہ کو چھوڑ کر اُسے خلیفہ کا سیکرٹری بنا دیا جائے [1]

مزید ارشاد ہے:

ان صاحب نے حضرت عثمانؓ کی نرم مزاجی اور اُن کے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر بہت سے کام ایسے کئے جن کی ذمہ داری لامحالہ حضرت عثمانؓ پر پڑتی تھی۔ حالانکہ ان کی اجازت اور علم کے بغیر ہی وہ کام کر ڈالے جاتے تھے علاوہ بریں یہ صاحب حضرت عثمانؓ اور اکابر صحابہ کے باہمی خوشگوار تعلقات کو خراب کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے [2]

پھر طبری کے ذریعہ حضرت عثمانؓ کی اہلیہ محترمہ کی زبان سے حضرت عثمانؓ کو یوں انتباہ دلایا گیا ہے:

اگر آپ مروانؓ کے کہنے پر چلیں گے تو یہ آپ کو قتل کرا کے چھوڑے گا۔ اس شخص کے اندر نہ اللہ کی قدر ہے نہ ہیبت نہ محبت [3]

پھر حضرت علیؓ کی زبان سے حضرت عثمانؓ کو کہلوایا ہے کہ آپ خود منبر رسولؐ پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مطمئن کر دیتے ہیں آپ کے جاتے کے بعد آپ ہی کے دروازے پر کھڑا ہو کر مروان لوگوں کو گالیاں دیتا ہے۔
(خلافت و ملوکیت صہ ۳۳۲)

پھر ارشاد ہے:

بنو امیہ میں سے سعید بن العاص اور مروانؓ بن الحکم بھی ان (طلحہؓ زبیرؓ، عائشہؓ) کے ساتھ (بصرے جانے کے لئے) نکلے مرّ الظہران (موجودہ وادیٔ فاطمہؓ) پہنچ کر سعید بن العاصؓ نے اپنے گروہ کے لوگوں سے کہا کہ اگر تم قاتلین

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۲۶ [2] ایضاً صہ ۱۱۱ [3] ایضاً صہ ۱۱۶

عثمانؓ کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو ان لوگوں (طلحہؓ و زبیرؓ) کو قتل کر دو....

مروانؓ نے کہا نہیں، ہم ان (یعنی طلحہؓ، زبیرؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم) کو ایک دوسرے سے لڑائیں گے۔ دونوں میں سے جس کو بھی شکست ہو گی وہ تو یوں ختم ہو جائے گا اور جو فتحیاب ہو گا وہ اتنا کمزور ہو جائے گا کہ ہم بآسانی اُس سے نمٹ لیں گے [۱]

پھر مزید ارشاد ہے:

مشہور روایات کے مطابق حضرت طلحہؓ کو مروان ابن الحکم نے قتل کر دیا [۲]

نیز فرمایا: حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے تصادم کا یہی نتیجہ تھا جس کے رونما ہونے کی توقع مروان ابن الحکم رکھتا تھا اور اسی لئے وہ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے ساتھ لگ کر بصرے گیا تھا اور افسوس کہ اُس کی یہ توقع سو فیصد پوری ہو گئی (ص ۱۳۰) اس سلسلہ میں مولانا نے حضرت عثمانؓ کے ایک عزیز ولید بن عقبہ کی شراب نوشی کی ایک اختراعی کہانی کا پورا ملبہ بھی حضرت عثمانؓ پر ڈالا ہے۔

یعنی مولانا کے نزدیک مروان اپنے زمانہ کا سب سے بڑا سازشی، شریر اور فاسق انسان تھا۔ جبکہ حضرت مروان کے بارے میں مولانا کے اپنے خاص گواہ حضرت قاضی ابوبکر ابن العربی کا ارشاد یہ ہے کہ:

باقی رہا مروان اور ولید کے متعلق معترضین کا اعتراض تو یہ بہت بڑا افترا ہے اور ان دونوں (مروان اور ولید) پر فسق کا الزام لگانے والا خود فاسق ہے۔

مروان ایک عادل آدمی تھا اور صحابہ، تابعین اور فقہاء مسلمانوں کے نزدیک

---

[۱] خلافت و ملوکیت صہ ۱۲۸ [۲] ایضاً صہ ۱۳۰

اُمت کے کبار میں سے تھا۔ صحابہ میں سے سہل بن سعد ساعدی نے اس سے روایت کی ہے اور تابعین میں سے اس کے ہم عمر تابعین نے اور دو قولوں میں سے ایک قول کے مطابق مروان صحابی ہے۔ شہروں کے علماء سب اُس کی تعظیم کرتے ہیں، اس کی خلافت صحیح سمجھتے ہیں، اس کے فتویٰ پر متوجہ ہوتے ہیں اور اُس کی روایت قبول کرتے ہیں۔ باقی رہے بیوقوف مؤرخ اور ادیب تو وہ اپنے انداز کے مطابق کہتے ہیں [1] اور جہاں تک مروان کے طلحہؓ کو قتل کرنے کا تعلق ہے تو اس بارے میں کسی ثقہ راوی سے کوئی روایت وارد نہیں ہوئی (ص۲۶۳)

طلحہؓ اور زبیرؓ

ہمارے قارئین حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور اُم المومنین عائشہؓ کے سفرِ بصرہ کے بارے میں مولانا کے ارشادات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مولانا نے اپنے ارشادات میں جس طرح حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کے طرزِ عمل کی مذمت کی ہے اور جس طرح اُم المومنینؓ پر تعریفات کا مینہ برسایا ہے وہ ہم پیچھے درج کر آئے ہیں۔ لیکن مولانا کے اپنے حضرت قاضی ابوبکر کی اس سلسلہ میں تحقیق کا حاصل یہ ہے:

ان حضرات کا بصرہ کی طرف نکلنا تو بالکل صحیح ہے۔ اس میں تو کسی قسم کا اشکال نہیں۔ لیکن یہ لوگ کیوں نکلے؟ اس کے متعلق کوئی صحیح روایت نہیں ہے اور نہ اس میں کسی روایت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کیونکہ کسی ثقہ راوی نے اسے نقل نہیں کیا اور متعصب آدمی کا کلام سُننے کے قابل نہیں ہوتا اور متعصبین

---

[1] العواصم من القواصم ص۱۶۳ - ۱۶۴

میں ایسے لوگ شامل ہیں جو اسلام میں طعن کرنا اور صحابہ کرامؓ کی تنقیص اور توہین کرنا چاہتے ہیں [1]

اس کے بعد ان حضرات کے بصرہ کی طرف نکلنے کے احتمالات پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے خروج کی صحیح وجہ یہی ممکن ہے کہ:

وہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو اکٹھا کرنے اور متفرق کو متفق کرنے اور ایک قانون کی طرف بلانے کے لئے آئے ہوں تاکہ بے چینی ختم ہو جائے۔ اور جنگ کا احتمال نہ رہے اور یہی صحیح ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات درست نہیں ہے اور صحیح روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے [2]

مزید لکھتے ہیں:

یہ احتمال بھی کمزور ہے کہ یہ حضرات حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لینے کے لئے آئے تھے کیونکہ اصل معاملہ قصاص سے پہلے مسلمانوں کے اتفاق کا ہے۔

اور ممکن ہے دونوں چیزیں مقصود ہوں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان (طلحہؓ و زبیرؓ) کا مدینے سے نکلنا لوگوں کے شور و شر کو ختم کرنے کے لئے تھا۔ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور اُم المومنین عائشہؓ اس امید پر مدینہ سے چلے آئے تھے کہ لوگ اپنی ماں (صدیقہ طاہرہؓ) کے پاس چلے آئیں گے اور اپنے نبی کی آبرو کا پاس کریں گے ....

اور صلح کے لئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی گئے تھے اور دوسروں کو بھی بھیجا تو حضرت عائشہؓ نے بھی ثواب کی امید پر اس موقع کو غنیمت سمجھا مگر معاملہ تقدیر کے مطابق پیش آیا [3]

آگے چل کر قاضی صاحب نے پھر اپنی تحقیق پر اصرار کیا ہے کہ:

یہ لوگ نہ جنگ کے لئے آئے تھے نہ یہ والی تھے (کہ جنگ کے مکلف ہوتے)

---

[1] العواصم من القواصم صـ۲۵۳ [2] ایضاً صـ۲۵۴ [3] ایضاً صـ۲۵۶

ان کا مقصد محض صلح جوئی تھا اور وہ مسلمانوں کے اندر اتحاد کے سوا اور کوئی مقصد نہیں رکھتے تھے [1]

قاضی صاحب کی تصریحات

جہاں تک قاضی صاحب کی طرف سے پیش کردہ اُن تصریحات کا تعلق ہے جو انہوں نے نفس مسئلہ پر ظاہر کی ہیں تو اُن میں اور مولانا مودودی صاحب کے بیان میں بس لہجہ کی نرمی و گرمی اور جذبات کی رَو کے شیریں اور تلخ ہونے کا ہی فرق ہے۔ قاضی صاحب نے جو باتیں اپنی تحقیق کی بنا پر نرم لہجے میں بیان کی ہیں مولانا نے اپنی انتخابی سیاست کی ضرورت سے وہ باتیں سخت "تلخ" اسلوب میں بیان کی ہیں اور ان تصریحات کا مسئلہ کی حد تک جو ہم نے مولانا کی خدمت میں جواب عرض کیا ہے وہی جواب قاضی صاحب کے لئے بھی کفایت کرتا ہے۔

قاضی صاحب نے بھی طلحہؓ، زبیرؓ اور معاویہؓ کو مدینہ کی ہی راہ دکھائی ہے کہ انہیں چاہیئے تھا عدالتی طریق پر اپنا مقدمہ حضرت علیؓ کے حضور پیش کرتے اور مولانا نے اپنی زبان میں اس مطلب کو یوں بیان کیا ہے کہ معاویہؓ ٹھیٹھ جاہلیت کے طریق پر اپنا مطالبہ منوانا چاہتے تھے۔

بہر حال بات خواہ جس اسلوب سے بھی کہی گئی ہے جواب ایک ہی ہے کہ مدینہ میں علیؓ کی عدالت موجود نہیں تھی، علیؓ قاتلین عثمانؓ کے قبضہ اور گھیرے میں تھے۔ وہ اپنی مرضی سے نہ کچھ کہہ سکتے تھے نہ کر سکتے تھے۔ بس اُن کے حضور جانا قاتلینِ عثمانؓ کے حضور ہی پیش ہونا تھا۔ اس لئے قاضی صاحب اور مولانا دونوں کا مشورہ غلط اور غیر منطقی ہے اس پر عمل نہ درست ہی تھا اور نہ مناسب ادب مانع نہ ہوتا۔ تو حضرت قاضی

---

[1] حوالہ مذکور

صاحب سے ایک بات ضرور پوچھتے کہ ہمارے حضرت مولانا مودودی صاحب تو ایک خاص ضرورت سے یہ موقف اختیار کرنے کے لئے مجبور تھے مگر آپ کو کیا مجبوری تھی کہ آپ نے بھی ایک نہایت درجہ ہلکی بات کہہ دی کہ:

(علیؓ کے مخالفین کے لئے) صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ حضرت علیؓ کی بات مان لیتے اور اپنا مطالبہ قصاص (علیؓ کی) عدالت میں پیش کرتے .... پھر حضرت علیؓ اگر مجرموں سے بدلہ نہ لیتے تو .... عامۃ المسلمین خود ہی حضرت علیؓ کو معزول کر دیتے۔

آپ نے علیؓ کے خلاف شکایت رکھنے والوں کو بڑی ہی سادگی سے تلقین فرمادی ہے کہ انہیں چاہیئے تھا وہ حضرت علیؓ کی بات مان لیتے۔ لیکن آپ کا خیال غلط سمت چلا گیا ہے۔ اگر آپ کی سوچ صحیح سمت اختیار کرتی تو آپ کو کہنا یہ چاہیئے تھا کہ حضرت علیؓ کے لئے یہی مناسب تھا کہ وہ شکایت کنندگان کی بات مان لیتے۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ جنگِ جمل برپا ہوتی نہ دس ہزار مسلمانوں کی جان جاتی، نہ جنگِ صفین وجود پاتی، نہ نوّے ہزار مسلمان یہاں اپنی جان سے ہاتھ دھوتے۔ کتنی سیدھی بات تھی جس کی طرف قاضی صاحب کی توجہ مبذول نہیں ہو سکی۔ اور یہ فرما کر تو انہوں نے سادگی کی حد ہی کر دی کہ اگر علیؓ مجرموں کو سزا نہ دیتے تو عامۃ المسلمین خود ہی ان کو معزول کر دیتے۔

یہ بات مولانا مودودی کے کرنے والی تھی قاضی صاحب سے ہموار نہیں تھی۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہاں کوئی عامۃ المسلمین ایسے بھی موجود تھے جو علیؓ کو معزول کر سکتے۔ اگر وہاں کوئی با اختیار عامۃ المسلمین موجود ہوتے تو یہ صورتِ حال ہی کیوں پیش آتی، وہ خود بڑھتے اور قاتلوں سے لڑائی کرتے علیؓ کو ان کے نرغے سے نکال لیتے اور پھر قدیم دستور کے مطابق خلافت کا فیصلہ کرتے خواہ یہ فیصلہ علیؓ کے حق میں ہی ہوتا مگر فیصلہ کی کوئی بنیاد تو ہوتی۔

قصہ کوتاہ گشت ورنہ درد سر بسیار بود

مولانا کا ایک بے نظیر کارنامہ

یہ ماننے میں کچھ مانع نہیں ہے کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص حاصل کرنے میں اوّل اوّل مدینہ منورہ کی بحرانی صورتِ حال حضرت علیؓ کو مزاحم رہی ورنہ حضرت علیؓ کی طرف سے قصاص لینے سے انکار کی بظاہر کوئی وجہ موجود نہیں تھی۔ لیکن حالات پر قابو حاصل کر چکنے کے بعد بھی حضرت علیؓ کا قاتلوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنا حضرت علیؓ کے حق میں نہیں ہے۔

مزید یہ کہ پھر حضرت علیؓ آخر تک اپنی اسی روش پر قائم رہے جبکہ یہ امر اُن کی منصبی ذمہ داریوں کے بھی منافی ہے اور اس طرح حضرت علیؓ کے ذمہ ایک بوجھ باقی رہ گیا جسے وہ اُتار بھی سکتے تھے مگر اُنہوں نے اُسے اُتارنا نہ چاہا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑی ہی تشویشناک صورتِ حال ہے حضرت علیؓ کے ذمہ سے اس تشویشناکی کو ساقط سمجھنے کے لئے اُمت نے دو طریق پر سوچا ہے۔

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ علیؓ نے جو کچھ کیا، جو کہا اور جو سوچا عین حق ہے۔ بلاشبہ یہ بھی ایک موقف ہی ہے مگر ظاہر ہے کہ اس موقف کے پاؤں تلے زمین نہیں ہے اور یہ موقف اختیار کرنے والوں نے اپنے ضمیر سے بوجھ اُتارنے کی جو سعی کی ہے اس سے حضرت علیؓ کا بوجھ نہیں اترتا اور یہ بے دلیل موقف معترض کو اپیل نہیں کرتا۔ دوسرے گروہ کا موقف یہ ہے کہ قصاص کے طالب اور قصاص سے انکار پر عامل دونوں ہی مجتہد تھے اور دونوں نے جو کچھ کیا پوری نیک نیتی سے کیا، ان میں سے کسی کی روش صحیح ہو یا غلط وہ دونوں فریق ہی ثواب کے مستحق ہیں۔ اور اُمت کے لیے ان کی صحابیت کے اصول واحترام میں اُن کے بارے میں خاموشی ہی سلامتی کی راہ ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ موقف زیادہ محفوظ ہے مگر یہ کوئی

علی موقف نہیں ہے بلکہ دفع الوقتی کی ایک صورت ہے اور اس کو اختیار کر لینے سے تجسّس کی راہیں بند نہیں ہوتی ہیں۔

مگر پوری اُمت کو مولانا مودودی صاحب کا احسان مند ہونا چاہیئے کہ اس باب میں جو موقف انہوں نے دریافت کر لیا ہے۔ بڑا دو ٹوک اور بڑا ہی نہایا نکھرا ہے۔ یہ موقف اختیار کر کے حضرت کا اپنا کام بھی سیدھا رہتا ہے اور حضرت علیؓ کے ذمہ کوئی بوجھ سرے سے ثابت ہی نہیں ہوتا۔ مولانا کی یہ دریافت مستعار ہی ہے مگر اس کے تیور ملاحظہ فرمائیے:

"(حضرت عثمانؓ کے قاتل محض قاتل نہیں تھے) بلکہ باغی تھے اور باغی وہ ہوتا ہے جس کے پاس طاقت ہوتی ہے اور اپنے فعل بغاوت کی تاویل بھی، چنانچہ وہ لوگ (یعنی حضرت عثمانؓ کو قتل کرنے والے) طاقت بھی رکھتے تھے اور تاویل بھی پیش کرتے تھے۔ ان کو حضرت عثمانؓ کے بعض کاموں پر اعتراض تھا اور اُس کی بنا پر ہی وہ اپنی بغاوت کو حلال قرار دیتے تھے۔

اس قسم کے باغیوں کا حکم شریعت میں یہ ہے کہ اگر وہ امام اور اہل عدل (اُس زمانہ میں حضرت علیؓ) کی اطاعت قبول کر لیں تو پہلے جو کچھ وہ اہل عدل (اُس زمانہ میں حضرت عثمانؓ) کی جان و مال کا نقصان کر چکے ہوں اس پر اُن سے مواخذہ نہ کیا جائے۔ اس بنا پر اُن کو خود اپنے ہاتھوں) قتل کرنا یا انہیں قصاص کا مطالبہ کرنے والوں (حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاویہؓ اور عثمانؓ کے دوسرے ورثا) کے حوالے کرنا حضرت علیؓ پر واجب نہیں تھا (خلافت و ملوکیت صفحہ ۳۴۰-۳۴۱) دیکھئے مولانا نے کس ہوشیاری سے اپنے دل کی بات دوسروں کی زبان سے نکلوائی ہے اسے کہتے ہیں ؎ خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں ❊ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مولانا مودودی صاحب نے اس ایک بات کو اپنی کتاب میں کئی جگہ

بار بار دہرایا ہے کہ معاویہؓ جو حضرت علیؓ سے مطالبہ کرتے تھے کہ عثمانؓ کے قاتلین کو ہمارے حوالے کر دو ہم خود ان کو قتل کریں گے۔ تو یہ مطالبہ نہ صرف جاہلیت کے جاہلی دساتیر سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اسلام میں بھی اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ ارشاد ہے:

اس (طلحہؓ و زبیرؓ اور عائشہ صدیقہؓ کے غیر آئینی طریق کار) سے بدرجہا زیادہ غیر آئینی طرزِ عمل دوسرے فریق یعنی حضرت معاویہؓ کا تھا .... (جنہوں نے) مطالبہ بھی یہ نہیں کیا کہ حضرت علیؓ قاتلینِ عثمانؓ پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دیں بلکہ یہ کیا کہ وہ قاتلینِ عثمانؓ کو اُن کے حوالے کر دیں تاکہ وہ خود انہیں قتل کریں اور یہ سب کچھ دورِ اسلام کی نظامی حکومت کے بجائے زمانہ قبل از اسلام کی قبائلی بدنظمی سے اشبہ ہے[1]

مزید ارشاد ہے:

انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ .... کہ ٹھیٹھ جاہلیتِ قدیمہ کے طریقے پر یہ مطالبہ کرتے کہ قتل کے ملزموں کو عدالتی کارروائی کے بجائے مدعیٔ قصاص کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ خود اُن سے بدلہ لے[2]

مولانا کے علم و خبر سے تو انکار نہیں مگر ان کی سیاسی ضرورت نے شاید اُن کے شعور پر علم و خبر کا یہ دروازہ بند کر دیا ہے کہ قصاص کے سوال پر شریعت کے ہاں دونوں طریقوں کی حسبِ حالات گنجائش ہے۔ یعنی قاتل کو حکومت اپنے اہتمام میں بھی قتل کر سکتی ہے اور اُسے مقتول کے ورثاء کے سپرد بھی کر سکتی ہے تاکہ وہ اُسے قتل کر دیں۔ اور ہماری تاریخ میں دونوں طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ یعنی قاتل کا مقتول کے وارثوں کے سپرد کرنا نہ تو قبائلی بدنظمی سے اشبہ ہے اور نہ ہی یہ ٹھیٹھ جاہلیتِ قدیمہ کی پیروی ہے جیسا کہ مولانا مودودی نے بیان کیا ہے بلکہ یہ امر رسول اللہ

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۲۵ [2] ایضاً ص ۱۲۶

صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت میں بھی داخل ہے اور اس پر دورِ خلافت راشدہ میں بھی عمل ہوتا رہا ہے۔

خود مولانا نے جب حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ کے خون پر قصاص لینے کی ذمہ داری سے بری کرنے کی ضرورت محسوس کی تو اس باب میں انہوں نے حضرت ملّا علی قاری کو گواہ ٹھہرایا تھا۔ حضرت ملّا علی قاری کی گواہی ہم گزشتہ تحریر میں بعنوان "قصہ کوتاہ گشت ورنج کرآئے ہیں۔ حضرت مولانا مودودی نقل کرتے ہیں۔

(طاقتور اور تاویل بدست باغیوں کے بارے میں شرعی مسئلہ یہ ہے کہ) اگر وہ امام اور اہلِ عدل کی اطاعت قبول کرلیں تو پہلے جو کچھ وہ اہلِ عدل کی جان و مال کا نقصان کر چکے ہوں اس پر ان سے مواخذہ نہ کیا جائے۔ اس بنا پر اُن کو قتل کرنا یا انہیں قصاص کا مطالبہ کرنے والوں کے حوالے کرنا حضرت علیؓ پر واجب نہ تھا[1]

یعنی مولانا کے گواہ یہ نہیں فرماتے کہ قاتل کو قصاص طلب کرنے والوں کے حوالے کرنے کا سوال خارج از بحث ہے کیونکہ یہ امر خلافِ شرع اور جاہلیتِ قدیمہ اور قبائلی بدنظمی کے اشبہ ہے بلکہ انہوں نے یہ دونوں صورتیں شرعی صورتوں کے بطور قائم رکھی ہیں اور انکار صرف اس سے کیا ہے کہ علیؓ ان میں سے کسی صورت پر بھی عمل کرنے کے مکلف نہیں تھے اور قصاص لینا ان کے لئے واجب نہیں رہ گیا تھا۔

ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کئے جانے کے طریقہ کو زمانہ قبل از اسلام کی جاہلیت کا طریقہ قرار دینا سنتِ رسول علیہ السلام اور اُمت کے تعامل سے مولانا کی بے خبری کا نتیجہ ہے یا اپنی سیاسی اغراض سے اپنے مؤلفۃ القلوب کو اپنی وفاداری

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۳۴۱

بشرطِ استواری کا یقین دلانے اور انہیں بہرحال خوش رکھنے کے لئے اپنے ایمان کی قربانی کا ایک رُخ ہے۔

کیونکہ یہ بات ماننے میں نہیں آتی کہ مولانا اس امر سے بے خبر ہوں کہ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات موجود ہیں؛ آپ خود بھی اس پر عمل کرتے رہے ہیں اور آپؐ کے خلفاء راشدینؓ کے زمانہ میں بھی اس پر عمل رہا ہے اور اس کے بعد بھی اُمت میں بطریقِ جاری رہا ہے۔

چند واقعات پیشِ خدمت ہیں:

ایک قاتل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش کیا گیا۔ وہ کوئی لکڑہارا تھا جس نے دوسرے لکڑہارے کو کلہاڑی کے وار سے قتل کر دیا تھا۔ قاتل کو مقتول کے بھائی نے پکڑ لیا اور اس کے گلے میں رسی ڈال کر اسے کھینچتا گھسیٹتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لے آیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے پر قاتل نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا جس کے نتیجہ میں حضور علیہ السلام نے اُسے قصاص میں قتل کرنے کے لئے مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دینے کا حکم دیا۔

تاہم آپ نے کوشش کی کہ قاتل اگر مقتول کی دیت ادا کر دے تو اُس کی جان بچ جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکا چنانچہ آپ نے اُسے مدعی کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اُسے اپنے بھائی کے قصاص میں قتل کر دے۔ حدیث میں اس واقعہ کے بارے میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں فَدَمٰی اِلَیهِ بِنِسْعَتِهِ وَقَالَ دُوْنَكَ صَاحِبَكَ کہ آپ نے وہ رسی جس سے قاتل کو

باندھ کر لایا گیا تھا مدعی کی طرف پھینک دی کہ لے جاؤ اور اپنے بھائی کے قصاص میں قتل کر دو۔ راوی کا بیان ہے کہ فَانْطَلَقَ بِهِ الرجل کہ پھر وہ اسے لے چلا۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: فانطلق بِهِ وفِی عُنُقِهِ نِسعته یَجُرُّها کہ وہ اس کے گلے میں بندھی رسی کو پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا لے چلا (مسلم شریف جلد ۲ باب صحۃ الاقرار بالقتل وتمکین ولیّ القتیل فی القصاص)

ترمذی شریف میں ہے مَنْ قَتَلَ مُتَعَمِّدًا دُفِعَ اِلیٰ اَوْلِیَآءِ المقتولِ فَاِن شَآءُوْا قَتَلُوْا واِن شَآءُوْا اَخَذُوا الدِّیَةَ کہ قصداً قتل کرنے والے کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا جائے پھر وہ خواہ اسے قتل کر دیں یا دیت پر راضی ہو جائیں (مشکوٰۃ شریف کتاب القصاص فصل ۲)

علامہ شبلیؒ حضرت امام شافعیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عبادی کو قتل کر دیا۔ خلیفۃ المومنین حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی تو انہوں نے لکھ بھیجا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ شخص مقتول کے وارث کو جس کا نام حنین تھا حوالہ کیا گیا جس نے اسے قتل کر دیا (الفاروق جلد ۲ صفحہ ۳۷۶ طبع ثانی کتاب منزل لاہور۔

حضرت امام مالکؒ نقل فرماتے ہیں اَنّ عَبدَ الْمَلِکِ اَقَادَ وَلِیّ الرَّجُل قَاتِلَهٗ بِعَصًا فَقَتَلَهٗ وَلِیُّهٗ بِعَصًا کہ ایک شخص نے کسی دوسرے کو لاٹھی کی ضرب سے مار ڈالا اس پر امیر المومنین عبد الملک کے حکم سے قاتل کو مقتول کے ولی کے حوالے کر دیا گیا جس نے اس کو لاٹھی کی ضرب سے ہی قصاص میں مار ڈالا (موطا امام مالکؒ باب ما یجب فی العمد

یہ واقعات حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں اور یہ بات تو قابلِ فہم نہیں ہے کہ مولانا مودودی صاحب ان سے بے خبر ہوں۔ البتہ اس صورتِ حال کو ہم حضرت معاویہؓ کے بخت کی خوبی پہ ہی محمول کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اُن کا صدقہ جاریہ بنا دیا کہ یہ اُنہیں گالیاں دیتے رہیں اور اُن کے درجات بلند سے بلند تر ہوتے رہیں بقول حضرت اقبالؒ سہ

یہ خبر ملتی ہے تاتار کے افسانوں سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے

ممکن ہے حضرت عثمانؓ کے دخل کی وجہ سے یہ امر مولانا کے لئے حجت نہ ہو مگر تاریخ کا حصہ ہونے کی وجہ سے ایک واقعہ مزید پیشِ خدمت ہے:

حضرت فاروقِ اعظم عمرؓ بن الخطاب کے قتل کے بعد جب یہ راز کھلا کہ فاروقِ اعظمؓ کے قتل کی سازش میں ہرمزان بھی شریک ہے تو فاروقِ اعظمؓ کے صاحبزادہ عبیداللہ بن عمرؓ نے جوشِ انتقام سے ہرمزان کو قتل کر ڈالا۔

حضرت عثمانؓ نے جب عنانِ سلطنت سنبھالی تو پہلا مقدمہ جو آپ کے رُو برو پیش ہوا وہ یہی تھا۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی، جرم ثابت تھا چنانچہ آپ نے ہرمزان کے قتل کے عوض عبیداللہ بن عمرؓ کو ہرمزان کے بیٹے کے سپرد کر دیا۔

(طبری جلد ۵ صفحہ ۴۴)

ملوکیت کا چوتھا مرحلہ

جنگِ جمل

چوتھا سبب جو خلافت کی جگہ ملوکیت کے اسلام میں داخل ہونے کا موجب بنا، مولانا کے نزدیک اس کی صورت یہ ہے:

حضرت علی رضؓ نے خلافتِ راشدہ کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لے کر ابھی کام شروع کیا ہی تھا اور شورش برپا کرنے والے دو ہزار آدمیوں کی جمعیت مدینے میں موجود تھی کہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما چند دوسرے اصحاب کے ساتھ اُن سے ملے اور کہا کہ ہم نے اقامتِ حدود کی شرط پر آپ سے بیعت کی ہے۔ اب آپ اُن لوگوں سے قصاص لیجئے جو حضرت عثمان رضؓ کے قتل میں شریک تھے۔ حضرت علی رضؓ نے جواب دیا:

بھائیو! جو کچھ آپ جانتے ہیں اُس سے میں بھی ناواقف نہیں ہوں مگر میں ان لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم اُن پر۔

کیا آپ حضرات اس کام کی کوئی گنجائش کہیں دیکھ رہے ہیں جسے آپ کرنا چاہتے ہیں؟ سب نے کہا نہیں!

اس پر حضرت علی رضؓ نے فرمایا خدا کی قسم میں بھی وہی خیال رکھتا ہوں جو آپ کا ہے۔ ذرا حالات سکون پر آنے دیجئے تاکہ لوگوں کے حواس برجا ہو جائیں۔ خیالات کی پراگندگی دُور ہو اور حقوق وصول کرنا ممکن ہو جائے اس کے بعد یہ دونوں بزرگ حضرت علی رضؓ سے اجازت لے کر مکہ معظمہ تشریف

لے گئے وہاں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مل کر ان کی رائے یہ قرار پائی کہ خون عثمان رض کا بدلہ لینے کے لئے بصرہ و کوفہ سے جہاں حضرت طلحہ رض و زبیر رض کے بکثرت حامی موجود تھے، فوجی مدد حاصل کی جائے۔ چنانچہ یہ قافلہ مکہ سے بصرے کی طرف روانہ ہوگیا [1]

دوسری طرف حضرت علی رض جو حضرت معاویہ رض کو تابع فرمان بنانے کے لئے شام کی طرف جانے کی تیاری کر رہے تھے، بصرے کے اس اجتماع کی اطلاعات سن کر پہلے اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ .... بصرے کے باہر جب ام المومنین حضرت عائشہ رض اور امیر المومنین حضرت علی رض کی فوجیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں۔ اس وقت دردمند لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اس بات کے لئے کوشاں ہوئی کہ اہل ایمان کے ان دونوں گروہوں کو متصادم نہ ہونے دیا جائے .... مگر وہ جنگ جمل برپا ہو کر رہی جسے دونوں طرف کے اہل خیر روکنا چاہتے تھے .... اس جنگ میں دونوں طرف کے دس ہزار آدمی شہید ہوگئے۔ یہ تاریخ اسلامی کی دوسری عظیم ترین بدقسمتی ہے جو شہادتِ عثمان رض کے بعد رونما ہوئی اور اس نے امت کو ملوکیت کی طرف ایک قدم اور دھکیل دیا [2]

آبروئے رسولؐ صدیقہ طاہرہؓ کے خلاف مولانا کی افسوسناک مہم

جب کوئی شخص گھر سے یہ فیصلہ کر کے ہی نکلے کہ وہ کسی دوسرے کے لئے کوئی بھلائی نہیں سوچے گا اور اُس نے جس سے کشیدہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس کی بھلائی کو بھی بُرائی بنائے گا اور قصور خواہ کسی کا ہو وہ ہر تاویل سے اسے اپنے مغضوب کے کھاتے میں ہی ڈالے گا۔ تو ظاہر ہے کہ اس کی راہ کو کوئی

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۲۷-۱۲۸ [2] ایضاً ملخص صہ ۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱

روک نہیں سکتا۔ وہ ہر لمحہ اپنا طے کردہ مقصد ہی اپنے سامنے رکھے گا اور وہی کرے گا جس کا فیصلہ کر کے وہ گھر سے نکلا ہے سه

مگہ لکھوائے اس کو کوئی خط تو ہم سے لکھوائے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

اپنے سیاسی استعلا کو جلد قریب لانے کے لئے (جو شائد انہیں کبھی نصیب نہ ہو سکے) مولانا کو ہر بازی ہی کھیلنے کا حق تو ہے۔ تاہم اب تک ان کے خدنگِ تنقید کے نخچیر حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ اور ان کے قریبی رفقاء ہی تھے۔ مگہ یہاں پہنچ کر انہوں نے کسی گہری داخلی تحریک سے اس ثواب میں آبروئے رسولؐ حضرت عائشہ صدیقہ، طاہرہ و مطہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی حصہ دار بنا لینے کا فیصلہ کیا۔ اور خلافت سے ملوکیت کی طرف پیش رفت کا ایک مرحلہ اُن کے نام سے بھی تصنیف کر ڈالا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزا۔

اس غرض سے انہیں تاریخ میں بہت کچھ توڑ مروڑ کا عمل روا رکھنا پڑا۔ مگر وہ یہ گھاٹی بھی بڑی خوبی سے عبور کر گئے ہیں اور پھر اس باب میں آپ نے صدیقہ طاہرہؓ کو ہر اس سلوک کا مستحق جانا جو کوئی اچھا بیٹا اپنی ماں کے لئے کبھی پسند نہیں کرے گا۔

مولانا کہتے ہیں کہ اگر حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو حضرت علیؓ کے خلاف خروج پر آمادہ نہ کرتیں تو خود حضرات طلحہؓ و زبیرؓ کا اپنا ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔ کیونکہ وہ مدینہ منورہ سے حضرت علیؓ کی اجازت سے مکہ آئے تھے اور مطمئن تھے کہ علیؓ نے جو کہا ہے وہی حق ہے۔ یعنی جب لوگوں کے حواس بجا ہوں گے اور حالات میں سکون پیدا ہو گا تو علیؓ اپنا وعدہ قصاص طلبی ضرور پورا کریں گے۔ لیکن مکہ پہنچ کر حضرت عائشہؓ کے ساتھ مل کر اُن کی رائے تبدیل ہوئی۔

اس طرح حضرت عائشہؓ کی وجہ سے خلافت سے ملوکیت کی طرف ایک مرحلہ اور طے ہو گیا۔ اگر عائشہؓ انہیں اس راہ پر نہ چلاتیں تو نہ جنگِ جمل ہی واقع ہوتی نہ دس ہزار مسلمان اپنی جان گنواتے۔ مولانا کے الفاظ ایک بار پھر پڑھ لیجئے:

"طلحہؓ و زبیرؓ حضرت علیؓ سے اجازت لے کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ وہاں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مل کر ان کی رائے یہ قرار پائی کہ خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لئے بصرہ اور کوفہ سے جہاں حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے بکثرت حامی موجود تھے فوجی مدد حاصل کی جائے" لہ

اور پھر مولانا نے آخر تک ہی اس خروج کے سلسلہ میں برپا ہونے والی جنگِ جمل کو عائشہؓ اور علیؓ کے درمیان جنگ ہی بیان کیا ہے۔ وہ اس جنگ میں طلحہؓ و زبیرؓ کو کسی مرحلہ پر بھی حضرت علیؓ کا فریقِ مخالف قرار نہیں دیتے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ طلحہؓ بنو امیہ میں سے نہیں تھے اور زبیرؓ بالآخر حضرت علیؓ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی ہی تھے۔ چنانچہ آگے چل کر ایک مرحلہ پر مولانا نے اپنی خاص روایات کی مدد سے حضرات طلحہؓ و زبیرؓ کو جنگ کی صفوں سے ہی باہر نکال دیا ہے اور جنگ کے فریقین کا منہ سامنے علیؓ اور عائشہؓ دکھائے ہیں۔ حالانکہ حضرات طلحہؓ و زبیرؓ دونوں ہی اس جنگ میں حضرت علیؓ کے ساتھیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ دیکھئے مولانا اپنی اور سب مسلمانوں کی ماں کا ذکر علیؓ کے فریقِ ثانی کی حیثیت سے کس اعتماد کے ساتھ کرتے ہیں۔

"..... بصرے کے باہر جب ام المومنین حضرت عائشہ اور امیر المومنین

لہ خلافت و ملوکیت صد ۱۲۸ سطر ۸ اور سطر ۱۳

حضرت علیؓ کی فوجیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں [1]

مولانا نے بڑے اعتماد سے تحریر کیا ہے کہ اس جنگ کی اصل ذمہ دار حضرت عائشہؓ ہی تھیں [2]

جبکہ حضرت علیؓ کا ارشاد یہ ہے کہ:

(اُم المومنینؓ) اس خیال سے ہی طلحہؓ و زبیرؓ کے ہمراہ گئی تھیں کہ شاید اُن کی وجہ سے مسلمانوں کا اتحاد قائم رہ سکے اور لوگ (اپنی ماں کو اپنے اندر پاکر) باہمی انتشار کو بڑھانے سے باز رہ سکیں [3]

یہی وجہ ہے کہ جنگ کے بعد جب حضرت علیؓ کو یہ خبر ملی کہ اُن کے ساتھیوں نے حضرت صدیقہ طاہرہؓ کے ہاں پہنچ کر ان سے گستاخانہ کلمات کہے ہیں تو آپ نے اُن کو ماخوذ کیا اور ان کے کپڑے اتار کر انہیں سو سو کوڑے مارے [4]

مولانا مودودی کے خاص گواہ حضرت قاضی ابوبکر ابن العربی کا ارشاد ہے:

اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ اس امید پر ہی (طلحہؓ و زبیرؓ کے ہمراہ) چلے آئے تھے کہ لوگ اپنی ماں (صدیقہ طاہرہؓ) کے پاس چلے آئیں گے اور اپنے نبی کی آبرو کا پاس کریں گے۔

صلح کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسروں کے پاس جاتے تھے .... حضرت عائشہؓ نے بھی ثواب کی امید پر اس موقع کو غنیمت سمجھا [5]

اللہ اکبر! سادہ دل بزرگ نے کتنی سادگی سے بات کہہ دی کہ اس طرح لوگ اپنے نبیؐ کی بیوی اور اپنی ماں کی آبرو کا پاس کریں گے۔ مگر انہیں

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۲۹ [2] خلافت و ملوکیت صہ ۱۳۱ سطر ۱۵-۱۶

[3] طبری جلد ۳ حصہ ۳ صہ ۱۵۶ [4] طبری جلد ۳ باب ۳ [5] العواصم من القواصم صہ ۲۵۶

کیا معلوم تھا کہ آگے چل کر عائشہ صدیقہؓ کو اُمّ المومنین کہنے والے بعض لوگ بھی اپنی سیاسی اغراض سے نہ تو اُمّ المومنینؓ کو ہی کوئی اہمیت دیں گے نہ اُن کی آبرو کو ہی ملحوظ رکھیں گے ۔ یہی نہیں بلکہ نیک دل قاضی صاحب تو حضرت علیؓ کے مقابلہ میں آنے والے حضرات طلحہؓ و زبیرؓ کو بھی اس خروج میں الزام نہیں دیتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ احتمال کمزور ہے کہ یہ حضرات (طلحہؓ و زبیرؓ) حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لینے کے لئے آئے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو اکٹھا کر کے تفرق کو متفق کرنے اور قانون کی طرف لانے کے لئے آئے ہوں تاکہ بے چینی ختم ہو اور جنگ کا احتمال نہ رہے۔ یہی بات صحیح ہے اور یہی بات ثابت ہے [۱]

پھر جہاں تک جنگ کے واقع ہونے کا تعلق ہے دنیا کی کسی بھی تاریخ سے یہ ثابت نہیں کہ اس جنگ کی ابتدا مولانا کے مبینہ مخالف علیؓ فریق حضرت عائشہؓ کی جانب سے ہوئی ہو ۔

خود مولانا کو بھی یہ بات تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہ سکا کہ (بصرہ میں فریقین) کے درمیان مصالحت کی بات چیت قریب طے ہو چکی تھی مگر ایک طرف حضرت علیؓ کی فوج میں وہ قاتلینِ عثمانؓ موجود تھے جو سمجھتے تھے کہ اگر ان (فریقین) کے درمیان مصالحت ہو گئی تو پھر ہماری خیر نہیں [۲]

اگرچہ یہاں پہنچ کر مولانا نے اپنی فکری علالت کو سہارا دینے کے لئے اپنے پُرفن راویوں سے یہ بیساکھی بھی مستعار لے لی ہے کہ شر پسند لوگ دوسری جانب بھی تھے جو فریقین کو لڑانا چاہتے تھے، مگر مولانا کے ہی معتمد مورخ حضرت طبری کا کہنا ہے کہ :

اگلی صبح معاہدہ صلح پر دستخط ہونے والے تھے کہ اس خبر سے قاتلینِ عثمانؓ پریشان ہو گئے ۔ چنانچہ اُنہوں نے مصالحت کو ناکام کرنے کے لئے اسی رات طلحہؓ و زبیرؓ

---

[۱] العواصم من القواصم صہ ۲۵۴ [۲] خلافت و ملوکیت صہ ۱۲۹

کے لشکر پر حملہ کر دیا۔

جب شور بڑھ گیا تو طلحہؓ و زبیرؓ نے پوچھا یہ شور کیسا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ لشکرِ علیؓ نے حملہ کر دیا ہے۔ پھر انہوں نے بھی جوابی کارروائی جاری کر دی۔ دوسری طرف حضرت علیؓ سے بھی یہی معاملہ گزرا۔ انہیں بھی بتایا گیا کہ طلحہؓ و زبیرؓ نے حملہ کر دیا ہے۔ چنانچہ علیؓ نے بھی جوابی کارروائی جاری کر دی [1]

اور اس کے باوجود بھی مولانا اگر آبروئے رسولؐ سے کھیلنے کو ہی اپنی انتخابی سیاست کی کامیابی کا سامان سمجھے ہوں اور دھاندلی کے ساتھ حضرت عائشہؓ کو ملوکیت کا ایک ستون ثابت کرنے پر بضد ہوں۔ تو یہاں تو شاید وہ اس کے باوجود بھی کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکیں اور اقتدار کی تمنا میں ہی اُن کی زندگی کے دن پورے ہو جائیں مگر وہاں جا کر اُنہیں ضرور مشکل پیش آئے گی جب عائشہؓ کے مقدّس شوہر اُن کے ہاتھوں اُن کی ہی کتاب تھما کر فرمائیں گے کہ اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا کہ لو پڑھو اپنی خلافت و ملوکیت، پھر خود ہی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کر کے بتاؤ۔

ملوکیّت کا پانچواں مرحلہ

حضرت معاویہؓ کی ٹھیٹھ جاہلیتِ قدیمہ

خلافتِ راشدہ کے ملوکیت کی طرف پانچویں قدم کی بات کرتے ہوئے مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں:

حضرت عثمانؓ کی شہادت (۱۸ ذوالحجہ ۳۵ ھجری) کے بعد حضرت نعمان بن بشیر اُن کا خون بھرا ہوا قمیص اور ان کی اہلیہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں

[1] طبری جلد ۳

حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق لے گئے اور انہوں نے یہ چیزیں منظرِ عام پر لٹکا دیں تاکہ اہلِ شام کے جذبات بھڑک اٹھیں۔۔۔۔

اِدھر حضرت علیؓ نے منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد جو کام سب سے پہلے کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ محرم ۳۶ھ میں حضرت معاویہؓ کو شام سے معزول کر کے حضرت سہل بن حُنَیف کو ان کی جگہ مقرر کر دیا۔

مگر ابھی یہ نئے گورنر تبوک تک ہی پہنچے تھے کہ شام کے سواروں کا ایک دستہ اُن سے آکر ملا اور اُس نے کہا:

اگر آپ حضرت عثمانؓ کی طرف سے آئے ہیں تو اہلاً و سہلاً اور اگر کسی اور کی طرف سے آئے ہیں تو واپس تشریف لے جائیے۔ یہ اس بات کا صاف نوٹس تھا کہ شام کا صوبہ نئے خلیفہ کی اطاعت کے لئے تیار نہیں۔

حضرت علیؓ نے ایک اور صاحب کو اپنے ایک خط کے ساتھ حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجا مگر انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور صفر ۳۶ھ میں اپنی طرف سے ایک لفافہ اپنے ایک پیغامبر کے ہاتھ اُن کے پاس بھیج دیا۔ حضرت علیؓ نے لفافہ کھولا تو اس میں کوئی خط نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟

اُس نے کہا میرے پیچھے دمشق میں ۶۰ ہزار آدمی خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لئے بیتاب ہیں۔ حضرت علیؓ نے پوچھا کس سے بدلہ لینا چاہتے ہیں؟ اُس نے کہا آپ کی رگِ گردن سے۔

اس کے صاف معنی یہ تھے کہ شام کا گورنر صرف اطاعت ہی سے منحرف نہیں بلکہ اپنے صوبہ کی پوری فوجی طاقت مرکزی حکومت سے لڑنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کے پیشِ نظر قاتلینِ عثمانؓ سے نہیں بلکہ خلیفۂ وقت سے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینا ہے۔

یہ سب کچھ اس بات کا نتیجہ تھا کہ حضرت معاویہؓ مسلسل ۱۶-۱۷ سال

ایک ہی صوبے اور وہ بھی جنگی نقطۂ نظر سے انتہائی اہم صوبے کی گورنری پر رکھے گئے۔ اسی وجہ سے تمام خلافتِ اسلامیہ کے ایک صوبے کی یہ نسبت ان کی ریاست زیادہ بن گیا [۱]

مورخین نے حضرت علیؓ کے حضرت معاویہؓ کو معزول کرنے کا واقعہ کچھ ایسے انداز سے بیان کیا ہے جس سے پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ (یعنی علیؓ) تدبّر سے بالکل ہی کورے تھے۔ مغیرہ بن شعبہ نے ان کو عقل کی بات بتائی تھی کہ معاویہؓ کو نہ چھیڑیں۔ مگر انہوں نے اپنی نادانی سے یہ رائے نہ مانی اور حضرت معاویہؓ کو خواہ مخواہ بھڑکا کر مصیبت مول لے لی [۲]

حالانکہ واقعات کا جو نقشہ خود انہی مورخین کی لکھی ہوئی تاریخوں سے ہمارے سامنے آتا ہے اسے دیکھ کر کوئی سیاسی بصیرت رکھنے والا آدمی یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت علیؓ اگر حضرت معاویہؓ کی معزولی کا حکم صادر کرنے میں تاخیر کرتے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوتی [۳]

---

[۱] مولانا مودودی اپنے ان الفاظ میں حضرت عثمانؓ پر بے تدبیری کا طعن توڑ رہے ہیں کہ وہ نہ معاویہؓ کو اتنی مہلت دیتے اور نہ معاویہؓ حضرت علیؓ کے مقابلہ پر آتے۔

[۲] آپ انہی مورخین کی امداد سے ہی تو حضرت عثمانؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاص کے خلاف ملوکیت کے مرحلوں پر مرحلے تخلیق فرماتے آ رہے ہیں۔ انہوں نے ذرا سا اگر آپ کی خواہش کے خلاف کہہ دیا تو آپ ان پر طعن توڑنے اور تعریض کرنے لگے۔

[۳] اللہ کا شکر ہے کہ مولانا کا اندازہ درست نکلا حضرت علیؓ نے غلطی نہ کی معاویہؓ کو معزول کر دیا اور ملک کشت و خون سے بچ گیا۔ اگر علیؓ معاویہؓ کو معزول نہ کرتے اور مغیرہ بن شعبہ کی بات پر عمل کرتے تو کون جانتے کہ ملک کس خلفشار کا شکار ہو جاتا، کتنا خون بہتا اور کتنے مسلمانوں کی گردنیں (باقی اگلے صفحہ پر)

اُن کے اس اقدام سے ابتداء ہی میں یہ بات کُھل گئی کہ حضرت معاویہؓ
کس مقام پر کھڑے ہیں۔ زیادہ دیر تک اُن کے موقف پر پردہ پڑا رہتا
تو دھوکے کا پردہ ہوتا جو زیادہ خطرناک ہے۔
حضرت علیؓ نے اس کے بعد شام پر چڑھائی کی تیاری شروع کر دی

مسلمانوں کی تلواروں سے ہی تن سے جدا ہو جاتیں۔ مولانا کی سوچ کتنی الہامی
ہے کہ حضرت علیؓ کے حکم کو سُنتے ہی جب معاویہؓ بھیگی بلی بن کر دبک گئے تو
مسلمان چین کی نیند سونے اور چین کی جاگ جاگنے لگے ورنہ کیا خبر کیا ہوتا۔
یہاں بڑے بڑے معاویہؓ دشمن مورخ گزرے ہیں مگر اپنی تمام تر معاویہؓ دشمنی
کے باوجود اُنہوں نے حضرت علیؓ کے اس اقدام سے اتفاق نہیں کیا اور مغیرہ بن
شعبہ کی عقل کی بات کو ہی عقل کی بات سمجھا ہے۔ اور یہی قرار دیا ہے کہ حضرت
علیؓ کو اس مرحلہ پر حوصلہ مندی سے ہی کام لینا چاہیئے تھا۔ یہ ایک مولانا مودودی
ہیں جو اسلام کی پندرہ سو برس کی تاریخ میں پہلی بار یہ نکتہ پیدا کر سکے کہ اگر علیؓ
ایسا نہ کرتے اور معاویہؓ کو اپنی جگہ موجود رہنے دیتے تو بہت بڑی غلطی ہوتی
اچھا ہوا کہ حضرت علیؓ نے یہ غلطی نہ کی اور مسلمانوں کا اتحاد قائم رہا۔ ورنہ
مغیرہ بن شعبہ تو لے ہی ڈوبے تھے۔
اور یہ مغیرہ بن شعبہ تو خیر اندر سے علیؓ کے نادان دوستوں کے بقول علیؓ
کے بد خواہ ہی تھے۔ اس مرحلہ پر حضرت علیؓ کے اپنے عم زاد حضرت عبداللہ
بن عباسؓ بھی حضرت علیؓ کو یہی مشورہ دے رہے تھے کہ معاویہؓ کو ابھی ان کی
جگہ رہنے دیں۔ آپ کی خلافت ذرا استحکام پکڑ لے تو معاویہؓ کو اس کے عہدے
سے الگ کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے عم زاد
کی بات بھی مسترد کر دی اور کھُلے الفاظ میں کہا۔ تم ایک معاویہؓ کی بات کرتے
ہو میں عثمانؓ کا مقرر کردہ کوئی ایک عامل اور افسر بھی اپنی جگہ نہیں رہنے دوں گا۔
اور معاویہؓ کے لئے تو میرے پاس بجز تلوار کے اور کوئی شے ہے ہی نہیں۔

..... لیکن عین اس وقت ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ رضی اللہ عنہم کے اس اقدام نے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں حالات کا نقشہ یکسر بدل گیا اور حضرت علیؓ کو شام کی طرف بڑھنے کے بجائے ربیع الثانی ۳۶ھ میں بصرے کا رخ کرنا پڑا۔ جنگ جمل (جمادی الاخریٰ ۳۶ھ) سے فارغ ہو کر حضرت علیؓ نے پھر شام کے معاملے کی طرف توجہ کی اور حضرت جریر بن عبداللہ البجلی کو حضرت معاویہؓ کے پاس ایک خط دے کر بھیجا۔ جس میں انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ امت جس خلافت پر جمع ہو چکی ہے اس کی اطاعت قبول کر لیں اور جماعت سے الگ ہو کر تفرقہ نہ ڈالیں۔ مگر حضرت معاویہؓ نے ایک مدت تک حضرت جریر کو ہاں یا ناں کا کوئی جواب نہ دیا اور انہیں برابر ٹالتے رہے۔

پھر حضرت عمروؓ بن العاص کے مشورہ سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت علیؓ کو خونِ عثمانؓ کا ذمہ دار قرار دے کر اُن سے جنگ کی جائے۔

..... اس دوران میں جبکہ حضرت معاویہؓ ٹال مٹول کر رہے تھے حضرت جریر بن عبداللہ نے دمشق میں شام کے بااثر لوگوں سے ملاقاتیں کر کے ان کو یقین دلایا کہ خونِ عثمانؓ کی ذمہ داری سے حضرت علیؓ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت معاویہؓ کو اس سے تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے ایک صاحب کو اس کام پر مامور کیا کہ کچھ گواہ ایسے تیار کریں جو اہل شام کے سامنے یہ شہادت دیں کہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے قتل کے ذمہ دار ہیں چنانچہ وہ صاحب پانچ گواہ تیار کر کے لے آئے اور انہوں نے لوگوں کے سامنے یہ شہادت دی کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا ہے

..... اس کے بعد حضرت علیؓ عراق سے اور حضرت معاویہؓ شام سے جنگ کی تیاریاں کر کے ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ اور صفین کے مقام پر جو فرات کے مغربی جانب الرقہ کے قریب واقع ہے فریقین کا آمنا سامنا ہوا ..... جنگ شروع کرنے سے پہلے حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے پاس اتمام حجت کے لئے ایک وفد بھیجا

مگر اُن کا جواب یہ تھا کہ میرے پاس سے چلے جاؤ۔ میرے اور تمہارے درمیان تلوار کے سوا کچھ نہیں ہے۔

محرم گزرنے کے بعد صفر ۳۷ھ سے اصل فیصلہ کُن جنگ شروع ہوئی۔۔۔ اس جنگ کے دوران میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے نص صریح سے یہ بات کھول دی کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمار بن یاسر جو حضرت علیؓ کی فوج میں شامل تھے حضرت معاویہؓ کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت عمار کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحابہ میں مشہور و معروف تھا اور بہت سے صحابیوں نے اس کو حضورؐ کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ (تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا)

متعدد صحابہ اور تابعین نے جو حضرت علیؓ اور معاویہؓ کی جنگ میں مذبذب تھے، حضرت عمار کی شہادت کو یہ معلوم کرنے کے لئے ایک علامت قرار دے لیا تھا کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون (مگر یہاں مولانا نے ان متعدد صحابہ اور تابعین میں سے کسی کا نام ذکر نہیں کیا)

جنگِ جمل سے حضرت زبیرؓ کے ہٹ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد تھا اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ کے لشکر میں حضرت عمار بن یاسر موجود ہیں۔۔۔

حضرت عمار کی شہادت کے دوسرے روز ۱۰ صفر کو سخت معرکہ برپا ہوا جس میں حضرت معاویہؓ کی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی، اس وقت حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت معاویہؓ کو یہ مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اٹھالے اور کہے کہ ھذا حکمٌ بیننا و بینکم (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے) اس کی مصلحت حضرت عمروؓ نے خود یہ بتائی کہ اس سے علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی۔۔۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ ایک

جنگی چال تھی، قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود ہی نہ تھا۔

اس مشورے کے مطابق لشکرِ معاویہؓ میں قرآن نیزوں پر اٹھایا گیا اور اس کا وہی نتیجہ ہوا جس کی حضرت عمروؓ بن العاص کو امید تھی۔

حضرت علیؓ نے عراق کے لوگوں کو لاکھ سمجھایا کہ اس چال میں نہ آؤ اور جنگ کو آخری فیصلے تک پہنچ جانے دو۔ مگر ان میں پھوٹ پڑ کر ہی رہی۔ آخر کار حضرت علیؓ مجبور ہو گئے کہ جنگ بندی کر کے حضرت معاویہؓ سے تحکیم کا معاہدہ کر لیں لے

مولانا نے اس تحریر میں جو متضاد باتیں کہی ہیں، جو مغالطے کھائے اور دیئے ہیں، جتنی زیادتیاں اور جتنے تجاوز کئے ہیں، اصحابِ رسولؐ کو جس طرح سب وشتم کا نشانہ بنایا ہے اس کا حاصل مختصراً یہ ہے:

- خلافت حاصل کرتے ہی حضرت علیؓ کا پہلا کام یہی تھا کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کو معزول کیا۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو سخت غلطی کرتے اور اس کا نتیجہ خطرناک ہوتا۔
- معاویہؓ کو منانے کے لئے علیؓ نے بہت جتن کئے، خط لکھے، وفد بھیجے مگر معاویہؓ کا ایک ہی جواب تھا کہ تمہارے لئے میرے پاس تلوار کے سوا کچھ نہیں۔
- عمروؓ بن العاص اور معاویہؓ نے سازش کر کے حضرت علیؓ پر عثمانؓ کے قتل کا جھوٹا الزام عاید کیا اور قاتلینِ عثمانؓ کے بجائے قتل کا بدلہ علیؓ سے لینا چاہا۔
- معاویہؓ نے عثمانؓ کے قتل کا حضرت علیؓ پر جھوٹ الزام دینے کے بعد اپنے اس جھوٹ کو سچ بنائے رکھنے کے لئے پانچ جھوٹے گواہ پیدا کئے۔ اور پانچوں جھوٹوں سے شامیوں کے سامنے جھوٹی گواہیاں دلوائیں۔

لے خلافت وملوکیت ملخص از صہ ۱۳۲ تا ۱۴۰

- علیؓ عراق سے اور معاویہؓ شام سے جنگی تیاریاں کر کے ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔
- عمروؓ بن العاص کے مشورہ سے حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ کے سامنے قرآن کو بلند کر کے قرآن کو منصف ماننے کا نعرہ ایک جھوٹ اور فریب تھا اور اس سے مقصود قرآن کو منصف ماننا نہیں تھا بلکہ مقصد صرف علیؓ کی فوجوں میں پھوٹ ڈالنا تھا۔
- علیؓ نے اپنے لشکر کو لاکھ کہا کہ یہ فریب ہے جنگ کو اس کے فیصلہ تک جاری رکھو مگر علیؓ کے لشکر نے ان کی بات مسترد کر کے قرآن کے فیصلہ پر اپنے ہتھیار رکھ دیئے جس کی وجہ سے بامر مجبوری حضرت علیؓ کو یہ جنگ ختم کرنا پڑی۔
- حضرت عمار بن یاسر کا علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے معاویہؓ کے لشکر کے ہاتھوں قتل ہونا بنص حدیث علیؓ کے برسرِ حق اور معاویہؓ کے باطل پر ہونے کی کھلی دلیل ہے کیونکہ حدیث میں آچکا ہے کہ عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔

صاحبدلان خدارا

حضرت عمارؓ بن یاسر کے بارے میں حدیثِ رسولؐ اور حضرت عمارؓ کے قتل پر ہم اپنی گزارشات مناسب تفصیل سے پیش کر آئے ہیں۔ یہاں دوسرے امور کے سلسلہ میں ہم اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں:

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ مولانا اصحابِ رسولؐ کے خلاف تو خوارج اور روافض تک کی روایات سے بھی استفادہ کر لیتے ہیں وہ ابن ابی الحدید کو شیعہ قرار دے کر بھی اُن کی روایت سے بے نیاز نہیں رہتے۔ مسعودی کو معتزلی بھی مانتے ہیں اور اس کے اندر تشیع کے بھی قائل ہیں مگر اُن کی اُس سے بھی یاد اللہ ہے۔ ابن قتیبہ کی ذات علمائے اسلام میں متنازعہ فیہ ہے وہ اس سے بھی لے لیتے ہیں مگر ذخائرِ صحابہ کی مہم میں وہ ابوبکر ابن العربی، امام ابن تیمیہ اور شاہ

عبدالعزیز محدث دہلویؒ کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے۔ تاہم وہ اُن سے ایسی روایت قبول کر لیتے ہیں جو انہیں مفید مطلب ہو۔ طبری خود لکھتے ہیں کہ میری بیان کردہ روایات جس حال میں بھی مجھ تک پہنچی ہیں میں نے ان کو ترتیب دے دیا۔ ان کے صدق و کذب کی ذمہ داری میں قبول نہیں کرتا مگر مولانا ان کی اور ان کے دوسرے ہم پیشہ بزرگوں ابن سعد، ابن الاثیر اور ابن کثیر کی ان روایات کو جو ان کو مفید مطلب ہیں یوں پیش کرتے ہیں جیسے وہ قرآن کی آیات ہوں اور انہی کی وہ روایات جو اُن کے طے کردہ موقف کے منافی ہوں ان کو وہ اپنے ممدوح کی ذات سے ہموار نہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں، کہنے کو وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ :

"میں صحابہ کرام اور خصوصًا خلفائے راشدین کے معاملہ میں اپنا یہ مستقل مسلک پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ ان کا کوئی قول یا فعل بظاہر غلط محسوس ہوتا ہو تو اُن کے اپنے کسی بیان یا اُس وقت کے ماحول یا اُن کے مجموعی طرزِ عمل میں اس کا صحیح محمل تلاش کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔ اور اس کے حق میں ہر وہ معقول تاویل کی جائے جو بے جا اور بھونڈی وکالت کی حد تک نہ پہنچتی ہو" [۱]

مگر اس قاعدہ پر عمل وہ صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سلسلہ میں ہی کرتے ہیں۔ دوسروں کو (بالخصوص جن کو وہ حضرت علیؓ کے خلاف قرار دے بیٹھے ہیں) وہ یہ حق نہیں دیتے کہ انہیں رعایت دی جا سکے۔ اور اگر وہ ایسا کوئی تکلف کرتے بھی ہیں تو اس تکلف سے بھی عثمانؓ، معاویہؓ اور اُن کے مبینہ رفقاء کو الگ رکھ لیتے ہیں اور ان کے لئے خصوصًا وہی روایات تاریخ کی کتابوں سے انتخاب کرتے ہیں جو اُن کے تشخص کو مجروح اور اُن کی عظمت کو داغدار کرتی ہوں۔

انہیں اگر کوئی یہ کہہ دیتا ہے کہ "حضرت عثمانؓ کی طرح حضرت علیؓ

---

[۱] خلافت و ملوکیت ص ۳۴۷

نے بھی تو اپنے عہدِ خلافت میں اپنے اقرباء کو بڑے بڑے عہدے دیئے تھے
تو وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ:
(یہ بحث چھیڑنے والے) اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ میری اس کتاب کا موضوع کیا ہے۔ میں اس کتاب میں تاریخ نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اس سوال پر بحث کر رہا ہوں کہ وہ کیا واقعات تھے جو آغازِ فتنہ کا سبب بنے ظاہر ہے کہ اس مسئلہ پہ کلام کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دَور ہی زیرِ بحث آئے گا نہ کہ حضرت علیؓ کا دَور۔
انہوں نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا اُسے آغازِ فتنہ کے اسباب میں شمار نہیں کیا سکتا ہے[1] یعنی وہ ملوکیت کی کڑیاں شمار کرتے۔ عثمانؓ کے دَور کو معاویہؓ کے دَور سے تو جوڑ دیتے ہیں اور جو آغازِ عثمانؓ نے کیا تھا اسے وہ اپنی تکمیل کے لئے معاویہؓ کے دَور تک تو پورے اعتماد سے لے جاتے ہیں اور اس میں انہیں کوئی بات رکاوٹ نہیں بنتی۔ مگر علیؓ کا دورِ حکومت جو عثمانؓ اور معاویہؓ کے درمیان میں پڑتا ہے اس کو اس دورِ فتنہ کی ایک کڑی شمار کرنے میں انہیں تاریخ کی عدم تسوید کی دلیل روک بن جاتی ہے اور وہ سیدنا علیؓ کی اقربا نوازی اور خویش پروری کو وقت کی ضرورت کی دلیل سے درست قرار دیتے ہیں مگر اس فعل کا تعلق جب عثمانؓ سے کرتے ہیں تو اس کو ان کی خود غرضی اور فرض ناشناسی قرار دے کر ان کا جرم بنا دیتے ہیں کیا خوب ہے

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں ہے

اس مرحلہ پر مولانا کی یہ دلیل بھی اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی کہ:
یہ تاریخ کہیں چھپی ہوئی نہیں پڑی تھی جسے میں یکایک نکال کر منظرِ عام پر لے آیا ہوں۔ یہ تو صدیوں سے دنیا میں پھیل رہی ہے اور طباعت و اشاعت

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۳۴۴ سطر ۹ تا ۱۳

کے جدید انتظامات نے اسے لاکھوں کروڑوں انسانوں تک پہنچا دیا ہے لہ

اب مولانا سے کون کہے کہ دنیا میں تو بہت سی چیزیں موجود ہیں، ان میں کچھ بہت اچھی بھی ہیں اور بہت سی چیزیں سخت بری بھی ہیں۔ مگر کسی چیز کے بہت دیر سے موجود ہونے کا یہ مطلب کہاں ہے کہ اُن میں ہر نالائق اور غلط بات کو اس دلیل سے قبول کر لیا جائے کہ وہ بہت دیر سے موجود ہے۔ ویسے بھی ہر مقالے را مقام کے بموجب ہر چیز اپنے ٹھکانے پر ہی موزوں ہوتی ہے اور اُسے اپنے ٹھکانے پر ہی رہنا چاہیئے۔ گھر اگرچہ کتنا بھی صاف ستھرا ہو، بڑا خوب صورت ہو وہاں گلاب کے پھول کھلے ہوں، چنبیلی مسکرا رہی ہو، اس کا منظر بڑا نظر افروز ہو، اس میں دل کی مسرت کا ہر سامان موجود ہو اور وہ ٹھیک ٹھیک ایسا ہو کہ اس پر قرآن کے بیان کردہ گھر کی شمال صادق آتی ہو کہ وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا۔ مگر معلوم رہے اس انتہائی صاف ستھرے گھر کے ایک گوشے میں بیت الخلاء بھی موجود ہوتا ہے۔ اب جس طرح گھر کی ہر شے کے لئے ایک ٹھکانہ ہے ایسے ہی بیت الخلاء کے مواد کے لئے بھی ایک ٹھکانہ اور جگہ مقرر ہے۔ یہ بیت الخلاء اپنی جگہ ہی رہے گا اور بیت الخلاء کے اندر کا اثاثہ بیت الخلاء میں ہی رکھا جائے گا۔ آپ بیت الخلاء کے مواد کو کسی طرح بھی کھانے کی میز پر نہیں پھیلا سکتے اس کو بیت الخلاء میں ہی رہنا چاہیئے۔ باورچی خانے اور پاخانے میں بہت فرق ہے اور یہ فرق ہمیشہ قائم رکھا جائے گا۔ اگر کوئی شخص باورچی خانہ اور پاخانہ کی چیزوں کو اس دلیل سے ایک میز پر جمع کرے گا کہ میں یہ سامان کہیں باہر سے نہیں لے آیا بلکہ یہ سب کچھ اس گھر کا ہی مال ہے اور اسی گھر کا سامان ہے تو نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا کا جواب کیا ہوگا؟

ایسے ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا تحقق اور ان کے دشمنوں کی

لہ خلافت و ملوکیت صـ۲۹۹

خباست بالکل الگ الگ چیزیں ہیں اور دشمنوں کی اڑائی ہوئی گندگی کو رسول اللہ کے دوستوں کے کپڑوں پر ڈالنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بلاشبہ یہاں انبیاء کے علاوہ کوئی شخص بھی معصوم نہیں ہے اور عصمت صرف انبیاء کا ہی خاصہ ہے۔

اور یہاں ہر شخص سے ہی غلطی کا صدور ممکن ہے کوئی بڑے سے بڑا اور نیک سے نیک تر شخص بھی غلطی سے پاک نہیں ہے مگر غلطی کی نشاندہی کرنے کے لئے بھی آداب مقرر ہیں۔ جن میں حفظِ مراتب پہلا ادب ہے اور خاص طور پر اصحابِ رسول پر بات کرتے ہوئے تو بڑی ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اونچی بات کہنے سے اعمالِ حسنہ تک ضائع ہو سکتے ہیں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں کا معاملہ بھی اس کے قریب قریب ہی ہے۔ اُن کے حضور گستاخی بھی سخت قسم کی معصیت ہی ہے، خود مولانا مودودی صاحب بھی مانتے ہیں۔

(صحابی کی غلطی پر) رائے زنی کرنے والے کو لازماً یہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ غلط کو صرف غلط سمجھنے اور کہنے پر ہی اکتفا کرے۔ اس سے آگے بڑھ کر صحابی کی ذات کو بحیثیتِ مجموعی مطعون نہ کرنے لگے لہ

اور معاف کیجئے گا مولانا کا اصحابِ رسول کو حق سے تجاوز کرنے والا، بے انصاف، خائن، فریب کار، دھوکہ باز، کاذب، جھوٹے گواہ پیدا کرنے والا راشی، مرتشی، چالباز اور سباب کہنا، سمجھنا اور مشتہر کرنا کسی طرح بھی غلطی کو غلطی سمجھنے اور کہنے کی حدود کا حامل نہیں ہے اور کسی صحابی کو ایسے گھناؤنے خطابات سے نوازتے ہوئے اُسے محض رضی اللہ کہنے سے جرم کی تلافی نہیں ہو جاتی بلکہ یہ بجائے خود ایک استہزا ہے۔

لہ خلافت و ملوکیت صہ ۲۴۳

واقعات کی کہانی

جہاں تک اُن واقعات کا تعلق ہے جن کو مولانا نے اپنے اس پانچویں مرحلہ کی دلیل بنایا ہے ان کی حقیقت بھی کوئی پوشیدہ نہیں۔ وہ کھلے دن اور کھلی آنکھوں سب کے سامنے گزرے ہیں لیکن اگر کوئی سیدھی باتوں میں بھی کجی داخل کر کے اُنہیں کچھ سے کچھ بنا دے تو اس میں واقعات کا کیا قصور ہے؟

مولانا کا کہنا ہے کہ حضرت علیؓ نے خلافت کو سنبھالتے ہی پہلا کام حضرت معاویہؓ کو معزول کرنے کا کیا اور مولانا کے نزدیک سیدنا علیؓ اگر معاویہؓ کو معزول کرنے میں ذرا بھی کوتاہی کرتے تو یہ بڑی غلطی ہوتی اور اس کا انجام بہت خطرناک ہوتا۔

بلاشبہ ان کا یہ ارشاد تو درست ہے کہ سیدنا علیؓ نے جو کام پہلے کئے اُن میں سر فہرست حضرت معاویہؓ کی معزولی ہی تھا مگر مولانا کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اگر علیؓ ایسا نہ کرتے تو یہ خطرناک بات ہوتی۔ کیونکہ مولانا کی متوقع خطرناکی حضرت علیؓ کے اس اقدام سے رُک نہیں گئی تھی بلکہ حقیقت یہی ہے کہ علیؓ اگر یہ کام نہ کرتے اور اس باب میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بیان کردہ مصالح کو پیش نظر رکھتے تو صحیح راہ عمل یہی تھی۔

اگرچہ مولانا نے اپنی ضرب کے ہدف کے انتخاب میں ضروری احتیاط کر لی ہے اور حضرت علیؓ کو معاویہؓ کے عزل سے روکنے کے لئے جو لوگ آگے بڑھے اُن میں مولانا نے صرف مغیرہؓ بن شعبہ کا ہی نام لیا ہے تاکہ اپنے ہدف پر تیر برساتے کسی احتیاط کی ضرورت نہ پڑے۔ ورنہ انہیں معلوم تھا کہ حضرت علیؓ کو اس اقدام سے روکنے کے لئے زیادہ مزاحمت حضرت علیؓ کے اپنے چچا زاد

بھائی حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ہی کی تھی۔

اور جہاں تک حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا تعلق ہے اس غریب نے تو درخواست کے انداز میں ہی حضرت علیؓ کو اس اقدام کے بُرے نتائج سے خبردار کیا تھا مگر حضرت ابن عباسؓ کی مزاحمت تو نہایت سخت اور سنگین قسم کی مزاحمت تھی۔ انہوں نے کہا:

امیرالمومنین آپ بے شک بہت بہادر انسان ہیں مگر آپ کو سیاست کا شعور نہیں ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ معاویہؓ کو ابھی اس کی جگہ قائم رہنے دیں [1]

مگر حضرت ابن عباسؓ خوش نصیب تھے کہ سیدنا علیؓ کے بھائی ہونے کی وجہ سے وہ مولانا کی تیرافگنی سے بچ گئے اور مولانا نے اپنا سارا غصہ حضرت مغیرہؓ پر نکال لیا۔ جبکہ بات وہی پیش آئی جو مغیرہؓ یا ابن عباسؓ نے کہی تھی اور خطرناک اُن کا مشورہ نہ ماننے کے نتیجہ میں ہی پیش آئی جبکہ مولانا کی رائے نہ صرف غلط ہے بلکہ اس سطح ارض پر ایسی غلط رائے مولانا کے سوا کسی بھی صحیح الفکر اہل علم نے اختیار نہیں کی۔

مولانا کو حضرت معاویہؓ پر بڑا غصہ ہے کہ اُنہوں نے حضرت عثمانؓ کے خون آلود قمیص اور حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی نمائش کی۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں جعلی نہیں تھیں۔ اُن میں سے سیدنا عثمانؓ کے کرتے کا عثمانؓ کا کُرتہ ہونے اور سیدہ نائلہ کی انگلیوں کا نائلہ کی انگلیاں ہونے میں کچھ بھی جھوٹ نہیں تھا۔ اور تعجب ہے کہ مولانا کو معاویہؓ کی طرف سے یہ دردناک لوگوں تک پہنچانے پر تو بڑا رنج ہے حالانکہ وہ ایک امر واقعہ تھا جبکہ خود مولانا نے معاویہؓ اور اُن کے رفقاء کے خلاف جھوٹی اور جعلی روایات کی مدد سے ایک کتاب لکھ ڈالی ہے وہ معاویہؓ پر غصہ نکالنے کے لئے بے بنیاد بات کو

---

[1] طبری جلد ۳

بھی بنیاد بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ سیدنا علیؓ نے جب معاویہؓ کی معزولی کا پروانہ اپنے مقرر کردہ گورنر حضرت سہل بن حنیف کو دے کر شام کی طرف روانہ کیا تو جب تبوک کے مقام پر اُنہیں سرِ راہ چند شامی سوار ملے اور دریافتِ حال پر اُنہیں معاویہؓ کی معزولی اور حامل رقعہ کی تقرری کا پتہ چلا تو اُنہوں نے کہا اگر آپ عثمانؓ کی طرف سے آئے ہیں تو اہلاً و سہلاً و مرحبا، لیکن اگر کسی اور کی طرف سے آئے ہیں تو یہیں سے واپس تشریف لے جائیے آپ کو اگلے سفر کی کوفت اٹھانے کی حاجت نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اہل شام کو ابھی تک حضرت عثمانؓ کی شہادت کا علم نہیں تھا ورنہ وہ سوار یہ کیوں کہتے کہ اگر آپ عثمانؓ کی طرف سے آئے ہیں تو خیر ورنہ واپس تشریف لے جائیے۔ اُنہوں نے سرِ راہ ایک خبر سُنی اور معاویہؓ سے شامیوں کی محبت اور مرکز میں عثمانؓ کی خلافت کے احترام میں انہوں نے ایک مُنہ آئی بات کہہ دی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُن کی بات صرف اُنہی کی بات تھی۔ اُنہوں نے کھڑے کھڑے لاسلکی کے ذریعہ معاویہؓ کا مشورہ نہیں طلب کر لیا تھا۔ مگر مولانا ان سواروں کی بات کو بہانہ بنا کر بلا جواز اور معاویہؓ کے کسی گناہ کے بغیر ہی اُن پر جھپٹ پڑے ہیں کہ:

> یہ اس بات کا صاف نوٹس تھا کہ شام کا صوبہ نئے خلیفہ کی اطاعت کے لئے تیار نہیں ہے۔[1]

حالانکہ یہ نوٹس وونٹس کوئی نہیں تھا بلکہ یہ حضرت ابن عباسؓ کی اُسی دُور اندیشی اور بصیرت کا ایک طبعی مظہر تھا جس کا اظہار اُنہوں نے نئے گورنر کو شام کی طرف بھیجنے سے پہلے حضرت علیؓ سے کر دیا تھا۔

اور جہاں تک مولانا کی طرف سے اُن روایات کو جمع کر کے درج کرنے کا تعلق ہے جن سے حضرت علیؓ کی طرف سے معاویہؓ کو خطوط لکھنے اور وفود بھیجنے کا اظہار

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۳۲

ہوتا ہے تو ان روایتوں کا جھوٹ اس امر سے ہی ظاہر ہے کہ جب دراصل خط لکھنے کا کوئی مقصد یا وزن ہو سکتا تھا اُسی وقت تو سیدنا علیؓ نے حضرت ابن عباسؓ کے بار بار درخواست کرنے کے باوجود معاویہؓ کو خط لکھنے سے انکار کیا۔ اس کے بعد جب فریقین کی چپقلش نے مسلح فوجوں کے ساتھ میدان میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اب حضرت علیؓ کی طرف سے کسی خط لکھنے کی کیا تُک تھی اور کونسا موقع تھا اور ایسے کسی خط کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ کو جب حضرت علیؓ نے شام کا گورنر مقرر کرکے بھیجنا چاہا تو انہوں نے یہ اعزاز بعض معقول وجوہ سے قبول کرنے سے انکار کیا پھر حضرت علیؓ کے زور دینے پر وہ آمادہ ہو گئے مگر ساتھ ہی عرض کیا کہ معاویہؓ کے نام مجھے اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھ دیجئے تاکہ وہ میرے لئے معاویہؓ سے بات کرنے کا ذریعہ بن سکے۔ مگر حضرت علیؓ نے معاویہؓ سے کسی قسم کا تحریری خطاب پسند نہ کیا اور کہا کہ نہیں میں معاویہؓ کو خط بھی نہیں لکھوں گا اور ظاہر ہے کہ یہ خط لکھنے کا بہترین وقت، موقع اور محل بھی تھا۔ تو جب آپ نے ایک قانونی ضرورت سے بھی معاویہؓ کو خطاب کرنا پسند نہ کیا تھا تو اب آپ کی طرف کسی خط کا منسوب کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ اُس مرحلہ پر سیدنا علیؓ نے فرمایا تھا کہ میرے پاس معاویہؓ کے لئے سوائے تلوار کے اور کوئی شے نہیں ہے۔ تو اب جب آپ تلوار لے کر سچ مچ ہی معاویہؓ پر چڑھ آئے تھے تو خط کیسا اور خطاب کیسا! اس مرحلہ پر مولانا نے ایک اور نہایت درجہ غلط اور غیر تاریخی بات بھی کہی ہے کہ: حضرت علیؓ عراق سے اور حضرت معاویہؓ شام سے جنگ کی تیاریاں کرکے ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔

جبکہ یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ حضرت علیؓ عراق سے معاویہؓ کے خلاف ایک حملہ آور کی حیثیت سے آئے تھے اور معاویہؓ کو جب حضرت علیؓ کے سرحدِ شام تک پہنچ جانے کی خبر ملی تو انہوں نے بامرِ مجبوری حضرت علیؓ کی

راہ روکنے کی کوشش کی اور اپنے دفاع کی غرض سے جوابی خروج کے لئے مجبور ہوئے۔

اور مولانا کا یہ ارشاد بھی بے بنیاد، غلط اور خلافِ واقعہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص کے مشورے سے یہ طے کیا کہ حضرت علیؓ پر عثمانؓ کے قتل کی ذمہ داری ڈال کر اُن سے جنگ کی جائے۔

اور مولانا کے راوی کا یہ جھوٹ اُس پس منظر سے بے خبری کا نتیجہ ہے جس پس منظر میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد عمروؓ اور معاویہؓ میں ملاقات کی راہ ہموار ہوتی تھی۔

یاد رہے حضرت عمروؓ بن العاص نہ حضرت معاویہؓ کے دوست تھے نہ حضرت عثمانؓ سے ہی محبت کے رشتہ میں بندھے تھے۔ بلکہ حضرت عثمانؓ نے انہیں جب سے مصر کی گورنری کے عہدہ سے معزول کیا تھا وہ اس وقت سے حضرت عثمانؓ سے ناراض چلے آ رہے تھے اور معاویہؓ سے اُنہیں سرے سے ہی کوئی تعلق خاطر نہیں تھا۔

حضرت عثمانؓ کو جب باغیوں نے محصور کر لیا تو حضرت عمروؓ ان دنوں مدینہ میں ہی مقیم تھے۔ تاہم حضرت عثمانؓ سے ناراضگی کے باوجود وہ یہ خیال کرتے تھے کہ مدینہ میں موجود لوگ اگر حضرت عثمانؓ کی مدد نہ کر سکے اور انہیں کوئی حادثہ پیش آ گیا تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ضرور ذلیل کرے گا۔ اور چونکہ مدینہ کے حالات میں وہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتے تھے کہ حالات کو زیادہ بگڑ جانے سے بچا سکیں اس لئے انہوں نے مدینہ سے چلے جانے کا فیصلہ کیا اور مدینہ کی سکونت ترک کر کے فلسطین میں جا ٹھہرے[1]
پھر جب اُنہوں نے حضرت عثمانؓ کی دردناک اور مظلومانہ شہادت کی خبر سُنی تو اُن کی ناراضگی پر حق کی حمایت کا جذبہ غالب آیا۔ اُنہیں اس ظلم کی

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۰

شنید سے اپنے سارے دُکھ بھول گئے، سینہ میں ایک ہُوک سی اُٹھی اور اس خون بے گناہی کا قصاص لینے کے عزم سے بے چین ہو گئے جذبات اندر سے اُچھل کر لبوں پر آئے اور الفاظ میں ڈھل کر دوسروں کے کانوں تک پہنچے فرمایا:

"میں ابو عبید اللہ ہوں، اور میں ہر اس شخص سے جنگ کروں گا، جس نے عثمانؓ کو سوئی بھی چبھوئی ہو گی، اللہ ان پر رحمت کرے، اتنا کہا اور جذبات سے مغلوب ہو کر بلک بلک کر رونے لگے، پھر اسی حال میں اُٹھے اور قصاص کے حصول کو آسان بنانے کے لئے عثمانؓ کے مؤثر اور طاقتور وارث (معاویہؓ) تک پہنچنے کے لئے دمشق کی راہ لی۔ اور پھر جب وہ دمشق پہنچے تو ابھی تک انہیں صدمہ کی شدت سے بدحالی دامنگیر تھی[۱]

یہ وہ مرحلہ تھا جب عثمانؓ کی مظلومیت پورے عالم اسلام کو خون کے آنسو رُلا رہی تھی۔ حجاز میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا اور شام میں جذبات کی شدت سے آگ جل رہی تھی، اہل ملک تقسیم ہو گئے تھے، کچھ لوگ عثمانؓ کے قتل کی ذمہ داری علیؓ پر ڈال رہے تھے، کچھ علیؓ کی حمایت میں سرگرم کار تھے، کچھ لوگ غیر جانبدار تھے اور اصلاح کی مساعی میں مصروف تھے اور کچھ لوگ اس صورتِ حال کو فتنہ قرار دے کر گوشہ نشین ہو گئے تھے اور جس نے جو کہنا تھا وہ کہہ رہا تھا اور اب عمروؓ بن العاص کے کسی پلان کی گنجائش موجود نہیں رہ سکی تھی، نہ وہ کوئی پلان لے کر ہی نکلے تھے، وہ درد میں ڈوب کر نکلے تھے اور درد میں ڈوبے ہی معاویہؓ تک پہنچے تھے، انہیں کسی تصنیف کی ضرورت نہیں تھی وہ ایک فیصلہ کر چکے تھے اور یہ فیصلہ عثمانؓ کے خون کا قصاص حاصل کرنے کا تھا اقاتل سب کے

---

[۱] طبری جلد ۳ باب ۱۰

سامنے تھے۔ اس لئے عمروؓ بن العاص کو نئے قاتل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان حالات میں جس راوی نے عمروؓ بن العاص کے ذمے یہ بلان لگایا ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کو عثمانؓ کا خون علیؓ کے نام لگانے کا مشورہ دیا، وہ کوئی پھوہڑ اور بھونڈے مزاج کا مفتری ہے جسے افترار کے لئے حسبِ حال ماحول کی تخلیق کا بھی شعور حاصل نہیں ہے اور پھر یہ افترار اُس وقت نہایت درجہ احمقانہ بھی بن جاتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنی پوری زندگی علیؓ کو عثمانؓ کا قاتل نہیں کہا۔ بلکہ جب بھی بات چلی معاویہؓ نے یہی کہا کہ علیؓ قاتلوں سے خود قصاص لیں یا انہیں ہمارے حوالے کر دیں۔ خود مولانا مودودی صاحب بھی جنہوں نے بڑی تلاش سے عمروؓ بن العاص پر اتہام کی یہ روایت دریافت کی ہے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ:

(حضرت معاویہؓ نے) مطالبہ یہ نہیں کیا کہ حضرت علیؓ قاتلینِ عثمانؓ پر مقدمہ چلا کر اُن کو سزا دیں بلکہ یہ کیا کہ وہ قاتلینِ عثمانؓ کو اُن کے حوالے کر دیں تاکہ وہ خود انہیں قتل کریں (خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۲۵) پھر ابوبکر ابن العربی کے حوالے سے ارشاد ہے:

شام کے لوگوں نے ان (یعنی علیؓ) کی بیعت قبول کرنے کے لئے یہ شرط لگائی کہ پہلے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو گرفتار کر کے اُن سے قصاص لیا جائے [1]

علاوہ ازیں معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ کو عثمانؓ کا قاتل قرار دینے کی بات اس لئے بھی نہایت درجہ احمقانہ ہے کہ حضرت معاویہؓ تو حضرت علیؓ کی طرف سے یہ شرط پوری کرنے پر ان کی خلافت پر بھی راضی تھے اور ان کی بیعت کرنے پر بھی کھلے دل آمادہ تھے [2]

ان حالات میں مولانا کا ایک ایسی روایت کا اپنے ہاں قبول کرنا جس میں مذکور ہے

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۲۶ [2] طبری جلد ۳

کہ عمرؓ اور معاویہؓ کی اس سازش کے تاروں کو جب حضرت جریر بن عبداللہ البجلی نے شامی اکابر سے ملاقاتیں کر کے توڑ پھوڑ دیا تو حضرت معاویہؓ نے پانچ جھوٹے گواہ پیدا کر کے اہلِ شام کے سامنے جھوٹ گواہی دلائی کہ عثمانؓ کے قاتل علیؓ ہی ہیں ایسے دردی اور بے انصافی کی انتہا ہے۔

قرآن برداری

خلافت و ملوکیت کے مصنف تحریر کرتے ہیں :

۱۰ر صفر کو سخت معرکہ برپا ہوا جس میں حضرت معاویہؓ کی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی ۔ اس وقت عمروؓ بن العاص نے حضرت معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اٹھالے اور کہے ھٰذا حکم بیننا و بینکم (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حُکم ہے)

اس کی مصلحت حضرت عمروؓ بن العاص نے خود یہ بتائی کہ اس سے علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی ..... (اس پر مولانا گرہ لگاتے ہیں کہ) اس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ یہ اُن کی ایک جنگی چال تھی، قرآن کو حَکم بنانا سرے سے مقصود ہی نہیں تھا[1]

مولانا کی یہ عبارت اگرچہ کوئی نئی نہیں کہ وہ اصحابِ رسولؐ کی طرف فریب اور دھوکہ کو منسوب کریں اور بات کے معنیٰ وہ کریں جو اس میں خود اُن کی طرف سے یا اُن جیسے کسی بزرگوار کی طرف سے داخل کئے گئے ہوں۔ اور رسول اللہؐ کے کسی صحابی پر حملہ کرتے اُس معیار کو بھول جاتے ہیں جو اُنہوں نے اصحابِ رسولؐ کے لئے مقرر کر رکھا ہے یا جس پر وہ سیّدنا علیؓ کو ہمیشہ اُتارتے ہیں۔

بے شک مولانا کے کذّاب راوی نے یہ لقمہ مولانا کو دے رکھا ہے مگر

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۱۳۹

جب وہ خود یہ معیار مقرر کر چکے ہیں کہ میں صحابی کے حق میں ہر لغو اور بے ہودہ بات کو مان ہی نہیں لیتا بلکہ اس کی حتی الامکان تاویل کر کے صحابی کے تشخص کو بچانے کی کوشش کرتا ہوں تو پھر معاویہؓ اور عمروؓ کے سلسلہ میں اپنی اس چاہت سے کیوں کنارہ کش ہو جاتے ہیں، جب یہ لوگ بھی اصحابِ رسولؐ ہی ہیں۔

عمروؓ بن العاص اونچے درجہ کے صحابی ہیں، ان کی تاریخ بڑی روشن ہے۔ وہ ایمان لائے تو پھر زندگی بھر اسلام کی خدمت کے لئے کمر بستہ رہے، مصر کا ملک اُنہی کی تیغ زنی کی یادگار رہے۔ اُن پر ہمیشہ اعتماد کیا گیا ہے، اور وہ کبھی پچھلی صفوں میں نہیں رہے۔ وہ اور حضرت خالدؓ بن ولید ایک ہی وقت میں ایمان لائے تھے۔ دونوں اکٹھے مکہ سے چلے، اکٹھے مدینہ پہنچے اور اکٹھے ہی ایمان کی دولت سے سرفراز ہوئے۔ جب وہ ایمان لا چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مکہ نے اپنے دل کے ٹکڑے مدینہ کو بخش دیئے ہیں۔ حضورؐ نے حضرت عمروؓ بن العاص کے ایمان لانے پر ایک ایسا سنہری جملہ ارشاد فرمایا جو عمروؓ کی زندگی پر سب سے بہتر تبصرہ ہے اور اس تبصرہ کی روشنی میں ان کی پوری زندگی کے خطوط متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

اَسْلَمَ النَّاسُ وَاٰمَنَ عَمْرُو بن العاص [1]

کہ لوگ اسلام لائے ہیں مگر عمروؓ ایمان لائے ہیں

تو کیا ایسے فضائل کا امین صحابی بھی اس لائق نہیں کہ مولانا مودودی اُسے اپنے اُس معیار پر کس کر دیکھتے جو اُنہوں نے صحابہ کے متعلق مقرر فرما رکھا ہے کیونکہ عمروؓ کی مجموعی زندگی یقیناً اس بات کی متقاضی ہے کہ مولانا

---

[1] ترمذی

اُنہیں اپنی دی ہوئی رعائت سے نوازیں۔ مگر یہ بدقسمتی ہی ہے کہ وہ اپنے شیعہ راویوں ابو مخنف وغیرہ کو اپنے ساتھ ہموار پاکر اُنہیں عمروؓ کی صحابیت پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔

اب جہاں تک حضرت علیؓ کی فتح کے قریب آجانے کا تعلق ہے یہ بات امکان سے بعید نہیں ہے۔ علیؓ کی فوج فتحیابی کے قریب بھی ہو سکتی تھی اور فتح اُن سے دور بھی رہ سکتی تھی، جنگ میں ایسے مراحل آتے ہی رہتے ہیں کہ ترازو کا پلڑا کبھی ایک جانب جھک گیا کبھی دوسری جانب اس لئے یہ بات کوئی ناقابلِ فہم نہیں ہے کہ علیؓ کی فتح قریب تھی، ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو مگر حضرت عمروؓ بن العاص کی تحریک قرآن برداری کو ان کی بدنیتی پر محمول کرنا خود بھی کسی حسنِ نیت کا مظہر نہیں ہے۔

بے شک کذاب اور مفتری راوی نے حضرت عمروؓ کے بارے میں اپنی فکر کی خساست بلکہ خباثت اپنے قلم کے منہ میں دے دی ہے مگر یہ راوی کی افترا پردازی ہے۔ عمروؓ کو وہی بات لبس کرتی تھی جسے انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو بچانے کے لئے سوچا تھا اور ان کی تدبیر کا رُخ کسی فریب کی بجائے حسنِ نیت کی طرف قبول کرنا زیادہ اقرب الی الصواب ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت ہی محبوب، نہایت درجہ جانثار اور ایک عظیم صحابی پر حسنِ ظن کی بنا پر ہمارا ایمان یہ ہے کہ سیدنا عمروؓ بن العاص نے جس مرحلہ پر سیدنا علیؓ اور اُن کے لشکروں کو قرآنِ کریم پر جمع ہونے اور اس سے فیصلہ طلب کرنے کی درخواست کی اس سے اُنہیں نہ حضرت علیؓ کے لشکروں کو فریب دینا مقصود تھا نہ ان میں پھوٹ ڈالنا اور نہ ہی ان کے سامنے اس مرحلہ پر کسی کی فتح یا شکست کا ہی سوال تھا۔

بلکہ جس وقت حضرت عمروؓ بن العاص نے قرآن کو نیزے پر بلند کرکے اس کو حکم بنانے کی دعوت دی۔ بلاشبہ یہ اس جنگ کا نہایت درجہ نازک مرحلہ تھا۔

جنگ میں اس مرحلہ پر اتنی خوفناکی پیدا ہو گئی تھی کہ فریقین جنگ میں سے ہر فریق اپنے مخالف فریق کو ملیامیٹ کر دینے پر تُل چکا تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی نعشیں اس تیزی سے گرنے لگی تھیں کہ اگر یہ جنگ اسی طرح مزید ایک دو روز تک جاری رہتی تو صفین کا پورا علاقہ مسلمانوں کا قبرستان بن جاتا، وہاں سوائے نعشوں کے اور کچھ موجود نہ ہوتا، وہاں صرف موت کا ہی پہرہ ہوتا، زندگی کا کوئی نشان ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا۔ یہاں دفن ہونے والے تو ہر طرف بکھرے ہوتے مگر اُن کو دفن کرنے والا کوئی موجود نہ ہوتا۔

عمروؓ اس صورتِ حال کو دیکھ کر چیخ اُٹھے اور اللہ تعالیٰ نے عین بروقت ان کی رہنمائی فرمائی اور اُنہوں نے مسلمانوں کو اچانک ہی وہ شئے پیش کر دی جسے وہ بعض سیاسی وجوہ سے بھول چکے تھے مگر وہ اُن کی سب سے زیادہ بیش قیمت شئے تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کے اخلاص میں برکت ڈالی اور وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، مسلمان ہلاک ہونے سے بچ گئے، اسلام کی آبرو محفوظ رہی، اور جو لوگ چند گھنٹے قبل ایک دوسرے کے خون میں نہا رہے تھے بے چین ہو کر ایک دوسرے کی طرف بڑھے، سلام اور مصافحوں کے تبادلے ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بات معانقوں تک جا پہنچی۔

اب رہا کسی راوی کا یہ کہنا کہ اس قرآن برداری کا مقصد علیؓ کے لشکروں میں پھوٹ ڈالنا تھا تو ایسے بیوقوف راوی کو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ عمروؓ کے اس اقدام سے نہ صرف علیؓ کے لشکر کی باہمی پھوٹ دُور ہو گئی بلکہ اس سے علیؓ اور معاویہؓ دونوں کے لشکروں میں اتحاد کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ پس اس روایت کا راوی جھوٹا ہے، کذاب ہے، مفتری ہے، کیونکہ اس تدبیر کا نتیجہ خیر کی صورت میں برآمد ہوا تھا، یہ تدبیر شر پر منتج نہیں ہوئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس روایت کا متعصب راوی حضرت عمروؓ کے اس فعل کو حضرت علیؓ کے ایک ایسے ہی فعل سے مماثل پاکر یہ برداشت نہیں کر سکا کہ جس نیکی کو سیدنا علیؓ نے جمل کے میدان میں اپنے نامۂ اعمال کی زینت بنا لیا تھا وہ صفین کے میدان میں عمروؓ کا حصہ بن جائے۔ ورنہ عمروؓ کا یہ فعل وہی فعل تھا جسے علیؓ جنگِ جمل میں حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کی فوجوں کو قرآن پر جمع کرنے کے لئے انجام دے چکے تھے۔

کسی کی شکست و فتح کا سوال نہ وہاں موجود تھا نہ یہاں، وہاں بھی نیزوں کی یہ قرآن برداری مسلمانوں کی جانوں کے تحفظ کے لئے ہی کی گئی تھی اور یہاں بھی اس کا مقصد یہی تھا۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو فعل جنگِ جمل میں فریب اور دھوکے کا مظہر نہیں تھا وہ صفین میں عین فریب اور مکاری کا مظہر بن جائے۔

اور مفتری راوی کی اس خباثت کی وجہ محض یہ ہے کہ جمل میں سیدنا علیؓ کی یہ نیک اندیشی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی تھی مگر صفین میں عمروؓ کا بخت زیادہ رسا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نیکی کو شرفِ قبولیت بخشا اور جس بات کو متحاربین جمل کے میدان میں سمجھنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکے تھے صفین میں وہ بات اُن کے ذہن میں اُتر گئی اور انہوں نے تحریک کے اُچھلتے ہی اس کو منظور کر لیا اور ہتھیار رکھ دیئے۔ اس طرح مسلمانوں کے جس تصادم نے جمل میں دس ہزار اور صفین میں نوّے ہزار مسلمانوں کی جانیں لے لی تھیں وہ اچانک رُک گیا۔ اور حضرت عمروؓ بن العاص کی قرآن برداری مسلمانوں کے اتلافِ جان کی راہ میں سدِ سکندری بن کر حائل ہوگئی۔ اور اب اس روایت کے راوی کا مقصد صرف عمروؓ کے اس شرف کو بے وقر کرنے کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مولانا بھی یہی چاہتے ہیں۔ مولانا کی پسند کردہ روایت کے راوی نے یہ کہہ کر حضرت علیؓ سے سخت بے انصافی کی ہے کہ:

اُنہوں نے اپنے لشکروں کو لاکھ سمجھایا کہ جنگ جاری رکھو اور بات کو فیصلے تک پہنچ جانے دو۔ فریق ثانی کا قرآن کی طرف دعوت دینا محض دھوکہ ہے۔ مگر علیؓ کے لشکری نہ مانے اور اُنہوں نے ہتھیار رکھ دیئے۔

یعنی مولانا مودودی کے راوی کے نزدیک علیؓ نے ایک تاویل کے ساتھ قرآن کی طرف دعوت کو مسترد کر دیا ہے اور نہ صرف خود قرآن کو حَکم بنانے سے انکار کیا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی یہی تلقین کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

چلیئے ایک منٹ کے لئے یہی مان لیجئے کہ عمروؓ کی دعوت الی القرآن فریب ہی تھی اور ان کا مقصد وہی تھا جس پر مولانا اپنے راوی کے کہنے پر ایمان رکھتے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ حضرت علیؓ نے قرآنِ پاک کی اُس ہدایت کو بھی نظر انداز دیا جو ایسے مراحل پر قرآن کا امتیازی وصف ہے کہ صلح کی پیشکش کفار کی طرف سے بھی ہو تو مسترد نہ کرو قرآنِ پاک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے کہ:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۖ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (الانفال)

کہ صلح کی طرف اگر کافر بھی مائل ہوں تو ہرگز انکار نہ کیجئے اور صلح کے لئے فوراً آمادہ ہو جایئے۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ اگر وہ آپ سے غداری کریں گے تو فکر نہ کیجئے اللہ آپ کے لئے بالکل کافی ہے (وہ آپ کو ان کے مقابلہ میں ہر قسم کا تحفظ مہیا کرے گا)

افسوس ہے کہ مولانا نے اپنی قلمکاری میں صرف حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص کو ہی سامنے رکھا ہے اور اگر وہ حضرت علیؓ کا بھی خیال رکھ لیتے تو ان کا فیصلہ دوسرا ہوتا۔ اور وہ راوی کی اس جسارت اور گستاخی پر اس کا منہ نوچ ڈالتے۔ جب اُس نے اپنے لشکر کے سامنے حضرت علیؓ کی یہ تقریر نقل کی کہ

اللہ کے بندو! اپنے حق و صداقت اور اپنے دشمنوں کے مقابلہ پر ڈٹے رہو اور جنگ جاری رکھو ..... انہوں نے نیزوں پر وہ چیز اٹھائی ہے جسے یہ کسی وقت بھی ہاتھ نہیں لگاتے اور پتہ تک نہیں جانتے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ انہوں نے صرف تمہیں دھوکہ دینے کے لئے اور فریب میں مبتلا کرنے کے لئے قرآن اٹھایا ہے[1]

اور پھر گستاخ راوی کے نزدیک حضرت علیؓ کے مقابلہ میں شیعانِ علیؓ زیادہ بہتر مسلمان ثابت ہوئے جنہوں نے برملا کہا:

علیؓ! یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم خدا کی کتاب کو قبول کرنے کی دعوت کو رد کر دیں۔ حضرت علیؓ نے پھر اصرار کیا کہ یہ بدعہد لوگ ہیں اس لئے تم جنگ جاری رکھو۔ انہوں نے جواب دیا۔ اے علیؓ! کتاب اللہ کی دعوت کو قبول کرو ورنہ ہم تجھے اور تیرے خاص ساتھیوں کو بھی انہیں لوگوں کے سپرد کر دیں گے جنہوں نے عثمانؓ کو قتل کیا تھا۔

ہمیں شامیوں کی یہ دعوت قبول ہے اور خدا کی قسم تجھے بھی اس کو قبول کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم تیرا حشر بھی عثمان سا ہی کریں گے۔ پس اشتر کو فوراً میدان سے واپس بلا لو اور اسے جنگ بند کرنے کا حکم دو۔ اس پر علیؓ نے اشتر کو بلا بھیجا مگر اس نے آنے سے انکار کیا۔ اس پر شیعانِ علیؓ نے پھر کہا خدا کی قسم ہمیں یقین ہے کہ تم نے خود اشتر کو ایسا کرنے کے لئے کہا ہے۔

علیؓ نے بہت عذر کئے کہ میں نے تمہارے سامنے اس کو واپسی کا پیغام بھیجا ہے مگر شیعانِ علیؓ نے علیؓ کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ اور زور دیا کہ اسے جلد واپس بلاؤ ورنہ ہم تجھے معزول کر دیں گے[2]

اس روایت کو بھی مولانا نے صحیح مان کر خود طبری سے ہی اس کا پہلا

---

[1] طبری جلد ۳ حصہ ۲ صفحہ ۲۶۲ [2] طبری حوالہ مذکور

حصہ اپنے ہاں نقل کیا ہے۔ جس کا تعلق حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ کے دین اور دیانت میں کیڑے ڈالنے سے تھا۔ اور جس حصہ سے شیعان علیؓ کا حضرت علیؓ پر غصہ ظاہر تھا اور جس سے حضرت علیؓ کا اپنے شیعوں میں اعتماد مجروح ہوتا تھا اُسے بڑی خوبصورتی سے ترک کر دیا ہے۔

سبحان اللہ! ع

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

کیا علیؓ کی فتح بالکل قریب تھی؟

ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت عمروؓ بن العاص کی قرآن برداری کا مقصد نہ تو کسی کو شکست سے ہی بچانا تھا اور نہ ہی ان کا مقصد کسی کے گھر میں پھوٹ ڈالنا تھا بلکہ اُن کا اس تدبیر سے صرف یہ ایک ہی مقصد تھا کہ جیسے بھی ہو مسلمان تباہی کے گھاٹ اتر جانے سے محفوظ رہ سکیں۔ مگر چونکہ ہمارے مولانا مودودی صاحب نے بڑے اعتماد سے یہ بات اٹھائی ہے کہ:

۱۰۔ صفر کو سخت معرکہ برپا ہوا جس میں حضرت معاویہؓ کی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ ہماری فوج نیزوں پر قرآن اُٹھالے اور کہے ھٰذَا حَکم بیننا وبینکم (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے)

اس کی مصلحت حضرت عمروؓ نے خود یہ بتائی کہ اس سے علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی، .... ہم مجتمع رہیں گے، اُن کے ہاں تفرقہ برپا ہو جائے گا..... اس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ یہ محض ایک جنگی چال تھی قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود ہی نہیں تھا[1]

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ ۱۳۹

یعنی مولانا کے نزدیک عمروؓ اگر یہ چال نہ چلتے اور سیدنا علیؓ کا لشکر اُن کے قریب میں نہ آجاتا تو علیؓ کی فتح بس اب ایک آدھ گھڑی کی ہی بات تھی، علیؓ جیتنے ہی والے تھے اور معاویہؓ کی شکست بالکل سر پر کھڑی تھی۔

علی رضی اللہ عنہ کی بہادری ضرب المثل ہے، وہ جس لشکر کی کمان کر رہے ہوں اس کی فتح کی توقع غلط نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ جنگ اگر جاری رہتی تو اس کا نتیجہ حضرت علیؓ کے حق میں ہی برآمد ہوتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ حضرت عمروؓ نے جس وقت قرآن کو نیزوں پہ بلند کر کے علیؓ کے لشکر کو قرآن کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی، کیا واقعی حضرت علیؓ کا لشکر جیتنے ہی والا تھا؟

آئیے چلتے چلتے مولانا کے اس زعم کا بھی جائزہ لیتے چلیں اور تجسس کر کے دیکھیں کہ جنگ کے اس مرحلہ پر جنگ کی حالت کیا تھی؛ ہمارے قارئین اس حقیقت سے خوب ہی آگاہ ہیں کہ مشاجراتِ صحابہؓ کے باب میں ہم نے دوسرے تمام ہی مورخین کے مقابلہ میں علامہ ابن جریر طبری کی تصنیف سے زیادہ استفادہ کیا ہے اور اس کی خاص وجہ ان کے بارے میں مولانا مودودی کا یہ اعتقاد ہے کہ:

ابن جریر طبری کی جلالت قدر بحیثیت محدث، مفسر، فقیہہ اور مورخ مسلّم ہے۔ علم و تقویٰ دونوں کے لحاظ سے ان کا رتبہ نہایت بلند ہے۔ .... وہ تاریخ نگاری میں سب سے زیادہ بھروسے کے لائق ہیں.... تاریخ میں کون ہے جس نے اُن پر اعتماد نہیں کیا۔ خصوصیت کے ساتھ دورِ فتنہ کی تاریخ کے معاملہ میں تو محققین اُن کی آراء پر زیادہ تر بھروسہ کرتے ہیں[۱]

---

[۱] خلافت و ملوکیت صہ ۳۱۲

تو آیئے ہم مولانا کے انہی معتمد علیہ مورخ سے ہی دریافت کرتے ہیں اور انہی کی رہنمائی میں اپنے قارئین کو صفین کے میدانِ جنگ کی سیر کراتے ہیں۔ سنیے طبری لکھتے ہیں:

حضرت علیؓ کے ایک کمانڈار ابن بدیل نے اپنے میمنہ کے ساتھ شامیوں (یعنی حضرت معاویہؓ کے لشکر) پر انتہائی سخت قسم کا حملہ کیا اور اس جانبازی کے ساتھ جنگ کی کہ شامی لشکر پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ پیچھے ہٹتا ہٹتا معاویہؓ کے خیمہ تک پہنچ گیا۔

جنگ کی اس نازک صورتِ حال میں وہ لوگ جنہوں نے معاویہؓ کے ہاتھ پر موت کی بیعت لے رکھی تھی معاویہؓ کے خیمے کی جانب دوڑے معاویہؓ نے ان کو حکم دیا کہ ابن بدیل کے میمنہ کو چھید ڈالو، ساتھ ہی حبیب بن مسلمہ کو کہلا بھیجا کہ تم بھی اپنے میسرہ کے ساتھ پوری قوت سے آگے بڑھو۔

حبیب نے اس ہدایت کو پا کر اپنے ساتھیوں کو لے کر علیؓ کے میمنہ پر زبردست حملہ کیا اور سخت لڑائی کے بعد اُن کو شکست سے دوچار کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید اور خوفناک تھا کہ عراقی (یعنی حضرت علیؓ کی) فوج میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی یہاں تک کہ عبداللہ بن بدیل کے پاس دو تین سو آدمی ہی باقی رہ گئے۔ یہ اکثر قراء تھے جنہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی پشت ملا رکھی تھی، باقی لوگ ان کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر حضرت علیؓ نے سہل بن حنیف کو حملہ کا حکم دیا۔ سہل کا دستہ اہلِ مدینہ پر مشتمل تھا۔ وہ اپنا دستہ لے کر حملہ کرتے ہوئے آگے بڑھے اور اگرچہ وہ بڑی سختی سے لڑے مگر شامی لشکر کے ہاتھوں سخت شکست کھا کر پسپا ہوئے یہاں تک کہ یہ لوگ بھی بھاگنے لگے اور اُن

لوگوں سے جا ملے جو میمنہ سے بھاگ کر اپنی جانوں کو بچانے کی فکر میں تھے۔
میمنہ کے قریب ہی قلب لشکر میں حضرت علیؓ بطور کمانڈر اعلیٰ کھڑے تھے جہاں ان کے ساتھ اہل یمن موجود تھے۔ جب میمنہ اور سہل بن حنیف کے دستے بھاگ کھڑے ہوئے تو علیؓ قلب کو چھوڑ کر میسرہ کی جانب بڑھے لیکن میسرہ جو قبیلہ مضر پر مشتمل تھا علیؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ نکلا[1]
ابو مخنف (شیعہ راوی) نے فضل ابن خدیج الکندی کے ذریعہ اشتر نخعی کے غلام کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ:
جب عراقی میمنہ (حضرت علیؓ کی فوج کے دائیں بازو) کو شکست ہو گئی اور حضرت علیؓ میسرہ کی جانب بڑھے تو سامنے سے اشتر کا گزر ہوا جو گھبراہٹ میں میمنہ کی جانب بڑھ رہا تھا حضرت علیؓ نے اُسے آواز دی اور کہا کہ ان بھگوڑوں کے پاس جاؤ اور انہیں کہو کہ کیا تم اُس موت سے ڈرتے ہو جسے تم اپنے سے ہٹا نہیں سکتے اور اس زندگی کی طرف جاگتے ہو جو ہمیشہ تمہارے پاس نہیں رہے گی۔
اشتر تیزی سے اُن لوگوں تک پہنچا اور انہیں حضرت علیؓ کا پیغام دیا اور چیخ چیخ کر اُن سے کہا کہ لوگو! میں اشتر ہوں، میرے پاس آؤ، پھر بھگوڑوں کی ایک جماعت تو اُس کے پاس چلی آئی مگر دوسرے لوگ اُس کے سامنے سے بھاگتے ہوئے گزر گئے۔
اس نے پھر آواز دی کہ لوگو! آج تم نے اپنے باپ دادا کو رُسوا کر دیا آج تم نے نہایت بُری روایت چھوڑی ہے[2]
اشتر نے اس مرحلہ پر ایک پُرجوش تقریر میں ان لوگوں کو غیرت دلائی اور ان کے باپ دادوں کے واسطے دیئے اس پر کچھ مزید لوگ متاثر ہو کر آگے بڑھے مگر سب کے سب قتل ہو گئے۔

---

[1] طبری جلد ۳ حصہ دوم صفحہ ۲۱۴ - ۲۱۵ [2] طبری جلد ۳ حصہ دوم صفحہ ۲۱۶ - ۲۱۷

پھر وہب بن کریب نے علم اٹھایا اور آگے بڑھنے کا ارادہ کیا تو اس کی قوم میں سے ایک شخص نے اسے آواز دی کہ اللہ تم پر رحم کرے یہ جھنڈا لے کر واپس لوٹ جاؤ (یعنی میدان کا رُخ نہ کرو) کیونکہ تمہاری قوم کے بہت سے شرفاء اس جھنڈے کے گرد ختم ہو چکے ہیں اب تو اپنے آپ کو اور اپنی باقی ماندہ قوم کو ختم کر دینے کی کوشش سے رُک جا۔ اس پر یہ لوگ بھی سب کے سب واپس لوٹ گئے[1]۔

عراقی فوج کے بھاگ اُٹھنے اور اہل یمن کے میدان کو چھوڑ دینے پر علیؓ میسرہ کی جانب بڑھے۔ آپ کے ساتھ آپ کے بیٹے اور صرف ایک قبیلہ ربیعہ تھا، آپ کی گردن اور شانوں پر سے تیر گزر رہے تھے۔ اس مرحلہ پر آپ کے بیٹے بھی اپنی جانیں بچا رہے تھے۔ حضرت علیؓ کو ان کا یہ فعل سخت ناگوار ہوا[2]۔

ان حالات میں بھی اگر ہمارے مولانا مودودی صاحب کا یہی ایمان ہے کہ حضرت علیؓ کی فتح اور حضرت معاویہؓ کی شکست سر پر کھڑی تھی تو ہم اُن کی خدمت میں کیا عرض کر سکتے ہیں۔

ملوکیت کا چھٹا مرحلہ

جسے دومۃ الجندل میں حکمین کی بے سمجھی نے تخلیق بخشی

پانچویں مرحلے کی طرح ملوکیت کا یہ چھٹا مرحلہ بھی مولانا مودودی صاحب کے نزدیک حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاص کی دسیسہ کاریوں کا ہی رہین منت ہے۔

صفین کی جنگ جب ختم ہو گئی تو فریقین نے اپنے قضیہ کے مستقل حل

---

[1] طبری جلد ۳ حصہ دوم صہ ۳۱۹ [2] طبری جلد ۳ حصہ دوم صہ ۳۶۵

کی غرض سے قرآنِ پاک سے فیصلہ طلب کرنے کی یہ سبیل کی کہ فریقین نے اپنی اپنی طرف سے ایک ایک فرد کو حکم تجویز کیا جو قرآن پاک کی روشنی میں متنازعہ امور کا فیصلہ کریں۔

حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو اپنا حکم تجویز کیا گیا اور حضرت معاویہؓ نے اپنی طرف سے حضرت عمروؓ بن العاص کا نام تجویز کیا دونوں حکمین کو فیصلہ کے لئے چھ ماہ کی مہلت دی گئی اور قرار پایا کہ فیصلہ سناتے وقت ہر فریق کی طرف سے حکمین کے علاوہ چار چار سو کی تعداد میں نمائندے موجود ہوں گے اور حکمین انہی آٹھ سو آدمیوں کی موجودگی میں اپنے فیصلے کا اعلان کریں گے۔ یہ آٹھ سو آدمی پوری ملّتِ اسلامیہ کے نمائندے سمجھے جائیں گے اور ان کا منظور کردہ فیصلہ پوری ملّت کا ہی فیصلہ قرار پائے گا۔ فیصلہ کرنے والی اس مجلس کے انعقاد کے لئے دومۃ الجندل کا مقام طے ہوا جو دمشق اور کوفہ کے عین درمیان واقع ہوا ہے۔ مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں:

اب خلافت کو ملوکیت کی طرف جانے سے بچانے کا آخری موقع باقی رہ گیا تھا وہ یہ کہ دونوں حکم ٹھیک ٹھیک اُس معاہدہ کے مطابق اپنا فیصلہ دیں جس کی رُو سے ان کو فیصلے کا اختیار سونپا گیا تھا۔ معاہدے کی جو عبارت مورخین نے نقل کی ہے اس میں تحکیم کی بنیاد یہ تھی:

دونوں حکم جو کچھ کتاب اللہ میں پائیں اس پر عمل کریں اور جو کچھ کتاب اللہ میں نہ پائیں اس کے بارے میں سنّتِ عادلہ جامعہ غیر مُفرِّقہ پر عمل کریں۔

معاہدہ کی اس دوسطری عبارت کو مختلف تواریخ کے حوالہ سے نقل کرنے کے بعد مولانا نے حکمین کے کسی فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے اپنا فیصلہ یوں سنایا ہے:

لیکن دومۃ الجندل میں جب دونوں حکم مل کر بیٹھے تو سرے سے یہ امر

زیرِ بحث ہی نہ آیا کہ قرآن و سنت کی رُو سے اس قضیہ کا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے[له]

حکمین پر مولانا کا غصہ بے جا نہیں ہے کیونکہ حضرت مولانا کی خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ حکمین صرف اُنہی خطوط پر سوچیں جو مولانا اُن کے لئے تجویز کریں اور قرآن و سنت کا فیصلہ صرف اُسی کو قرار دیں جو مولانا کو منظور ہو مگر ان لوگوں نے ایسا نہیں کیا۔ بنابریں جو مولانا اُن پر آتش زیر پا ہیں تو یہ غلط بات نہیں ہے۔ ہم مولانا کو اسی حال میں چھوڑ کر اپنے قارئین کے لئے پہلے اس معاہدے کا متن پیش کرتے ہیں جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں منعقد ہوا تھا۔ تاکہ بات سمجھنے میں آسانی ہو اور پتہ چل سکے کہ مولانا اپنے غصہ میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔

یہ معاہدہ تاریخ کی تقریباً تمام ہی چھوٹی بڑی کتابوں میں درج ہے مگر اس کو ہم یہاں اردو کی عام مل سکنے والی کتاب تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی سے نقل کرتے ہیں تاکہ ہمارے قارئین تاریخ اسلامی کے اس اہم ترین موڑ پر اس اہم ترین دستاویز کا اگر تجسس چاہیں تو انہیں آسانی مہیا ہے۔ مورخ نجیب آبادی لکھتے ہیں۔

یہ اقرار نامہ علیؓ ابن ابی طالب اور معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے درمیان ہے علی ابن ابی طالب نے اہل کوفہ اور اُن تمام لوگوں کی طرف سے جو اُن کے ساتھ ہیں ایک منصف یا پنچ مقرر کیا ہے۔

اسی طرح معاویہؓ بن ابی سفیانؓ نے اہل شام اور اُن تمام لوگوں کی طرف سے جو اُن کے ساتھ ہیں پنچ مقرر کر دیا ہے۔

ہم خدا تعالیٰ کی کتاب اور اس کے حکم کو قاضی قرار دے کر اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ حکم خدا اور کتابِ خدا کے سوا دوسرے کو دخل نہ دیں گے۔

له خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۴۰

ہم اَلحمد سے لے کر والناس تک تمام قرآن شریف کو مانتے ہیں اور مستعد کرتے ہیں کہ قرآن شریف جن کاموں کے کرنے کا حکم دے گا اُس کی تعمیل کریں گے اور جن سے منع کرے گا اُس سے رُک جائیں گے۔

دونوں پنچ جو مقرر ہوئے ہیں ابو موسیٰ عبد اللہ بن قیس اشعری (منجانب علیؓ) اور عمروؓ بن العاص (منجانب معاویہؓ) ہیں۔ یہ دونوں جو کچھ کتاب اللہ میں پائیں گے اس کے موافق فیصلہ کریں گے اور اگر کتاب اللہ میں نہ پائیں گے تو سنّتِ عادلہ جامعہ غیر مختلف فیہا پر عمل کریں گے [1]

اس اقرار نامہ کی عبارت سے دو باتیں بالکل ظاہر ہیں:

اوّل، یہ کہ اس معاہدہ کے دو فریق ہیں اور دونوں ہی بالکل برابر کے دو فریقوں کی حیثیت سے ایک اقرار کر رہے ہیں۔

دوم، یہ کہ فریقین نے قضیۂ زیرِ بحث کے فیصلہ کے لئے حکمین کو ایک بنیاد مہیا کر دی ہے کہ فیصلہ بہر حال کتاب و سنّت کی روشنی میں ہوگا۔

اب چونکہ بات کوئی پُر اسرار نہیں تھی، قضیہ کوئی رازِ پنہاں نہیں تھا، جھگڑے کا سبب کوئی امرِ مستور نہیں تھا اور سارے ہی لوگ جانتے تھے کہ یہ لڑائی کیوں جاری ہوئی تھی، کس وجہ سے ہوئی تھی، کس سبب کی بنیاد پر برپا ہوئی تھی۔

فریقین جنگ کا موقف بھی سب کے سامنے تھا اور بار بار آچکا تھا۔ اپنے اپنے حق میں فریقین کے دلائل سے بھی سب لوگ آگاہ تھے۔ اس لئے فریقین نزاع نے حکمین کو فیصلے کی بنیاد تو مہیا کر دی مگر قضیہ سے تعلق رکھنے والی دوسری تفصیلات اور پیش آمدہ حالات میں ابھرے اُچھلے، بہت سے مسائل پر بحث و مذاکرہ حکمین کی فراست، ان کی بصیرت اور ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ یعنی فریقین نزاع نے حکمین کے لئے نہ تو بحث کے خطوط ہی متعین کئے نہ فکر و نظر

---

[1] تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی حصہ اوّل صد ۵۲۵ — ۵۳۶

اور نقد و بصر کے دائروں کی ہی نشاندہی کی بلکہ انہیں پوری آزادی تھی کہ وہ حسب ضرورت نکاتِ بحث اور حدودِ بحث کی تعیین خود کر سکتے ہیں۔

پابندی صرف ایک ہی تھی کہ حکمین بہرحال کتاب و سنّت کی حدود میں رہیں اور اس سے باہر نہ نکلیں۔

مگر یہ بات عجیب ہی ہے کہ حکمین کے لئے اجلاس کا ایجنڈا مولانا مرتب کر رہے ہیں اور بضد ہیں کہ بحث انہی خطوط پر ہو اور فیصلہ انہی کی منشاء کے مطابق کیا جائے ورنہ ان کی سوچ بھی غلط ہوگی اور فیصلہ بھی قرآن و سنّت کے منافی سمجھا جائے گا۔

ذرا دیکھئے مولانا مقرر کردہ ثالثوں کو کس طرح لقمے دیتے ہیں ان کو رگیدتے بھی ہیں، ان کے فکر و نظر پر اُنگلی بھی رکھتے ہیں، ان کی عقل کا مذاق بھی اُڑاتے ہیں اور اپنی چاہت اور اپنے جمع کردہ مواد پر دستخط بھی کروا لینا چاہتے ہیں۔ مولانا کی سوچ اور ان کی طرف سے خلط مبحث کی مہم کو کامیاب بنانے کی پوری کہانی کا علم حاصل کرنے کے لئے ہم بات کو وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے مولانا نے بات اٹھائی تھی۔ مولانا لکھتے ہیں:

لیکن دومۃ الجندل میں جب دونوں حَکَم مل کر بیٹھے تو سرے سے یہ امر زیرِ بحث ہی نہ آیا کہ قرآن و سنّت کی رُو سے اس قضیہ کا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے۔

قرآن میں صاف حُکم موجود تھا کہ مسلمانوں کے دو گروہ اگر آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان اصلاح کی صحیح صورت طائفۂ باغیہ کو راہِ راست پر آنے کے لئے مجبور کرنا ہے۔

یہاں پہنچ کر مولانا پھر حکمین کے سامنے باغی گروہ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ حضرت عمارؓ کی شہادت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نص صریح نے

متعین کر دیا تھا کہ اس قضیے میں طائفہ باغیہ کونسا ہے [1]

اور یہی بات تھی جس کی نہ حضرت علیؓ کو خبر تھی اور نہ حضرت علیؓ کا کوئی ساتھی ہی جانتا تھا۔ مگر الحمد للہ کہ مولانا نے رہنمائی کر دی۔ پر اب وقت ہی گزر چکا تھا اور وقت کے بعد کا ہتھیار کس کام کا ہے تعجب ہے کہ بروقت کسی اللہ کے بندے کو یہ دلیل نہ سوجھی ورنہ حکمین کے تقرر کا موقع ہی نہ آتا۔

اور یہیں سے اس دلیل کے باطل ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے کیونکہ یہ واقعہ جن لوگوں کے سامنے گزرا تھا اور جن کے ساتھ گزرا تھا۔ جنہوں نے حضور علیہ السلام کی زبان سے یہ خبر سن رکھی تھی کہ عمارؓ کو قتل کرنے والا گروہ باغی ہوگا ان میں سے کسی ایک نے بھی اس دلیل سے استدلال کر کے یہ نہ بتایا کہ اللہ کے بندو! اس ثالثی کی مجلس کے انعقاد سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہو۔ معاویہؓ اور معاویہ کے گروہ کا باغی ہونا تو حدیث کی نص سے ثابت ہے۔

اور یہی بات اس یقین کے لیے کفایت کرتی ہے کہ اصحاب رسولؐ اس حدیث کا وہ مطلب نہیں لیتے تھے جو مولانا نے اخذ کیا ہے ورنہ وہ ضرور یہ بات اس کے اصل موقع پر کرتے۔

یا پھر بات وہی تھی جو ہم عرض کر آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا عین حق تھا اور وہ حق ہی ثابت ہوا، عمارؓ کو قتل کرنے والے لوگ ضرور باغی تھے، انہیں یقیناً باغیوں نے ہی قتل کیا تھا مگر وہ باغی حضرت علیؓ کے مقابلہ پہ نہیں تھے بلکہ حضرت علیؓ کی فوجوں کے اندر موجود تھے اور یہی وہ باغی تھے جن کو عثمانؓ کے خلاف خروج کرنے کی وجہ سے مولانا بھی باغی قرار دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انہی باغیوں کو فئۃ باغیہ قرار دیا تھا اور یہی فئۃ باغیہ تھا جس نے سازش کر کے حضرت عمارؓ کو قتل کیا، اور

[1] خلافت وملوکیت صہ ۱۴۱

یہ قتل پھر خواہ مصر سے مدینہ جاتے عمل میں آیا یا وہ صفین کے میدان میں قتل ہوئے ان کا قتل بہر حال باغیوں کے ہاتھوں ہی عمل میں آیا تھا۔

مولانا حکمین کے لیے اُن کے اجلاس کا ایجنڈا ترتیب دیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

ایک امیر کی عمارت قائم ہو جانے کے بعد اس کی اطاعت نہ کرنے والے کے بارے میں بھی واضح احادیث موجود تھیں۔ خون کے دعویٰ کا بھی شریعت میں صاف ضابطہ موجود تھا جس کی رُو سے دیکھا جا سکتا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے خونِ عثمانؓ کے متعلق اپنا دعویٰ ٹھیک طریقے سے اٹھایا ہے یا غلط طریقے سے[1]

سبحان اللہ کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔ حضرت مولانا نے گویا مولانا کے نزدیک حکمین کسی فقہی بحث کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع کئے گئے تھے ورنہ قتلِ عثمانؓ اور اس پر قصاص کی باتیں تو محض ضمنی ذیلی باتیں ہی تھیں۔ اصل بات وہی تھی جو مولانا نے حکمین کے لئے برآمد کی ہے۔ اور گویا نوّے ہزار مسلمانوں کی گردنیں اسی ایک نکتہ کے فیصلہ نہ ہونے کی وجہ سے ہی کٹی تھیں اور جنگوں کا مقصد بس یہی ایک تھا کہ آیا معاویہؓ نے اپنا دعویٰ ٹھیک طریقے سے اٹھایا ہے یا غلط طریقے سے۔ مولانا مزید لکھتے ہیں:

معاہدہ تحکیم کی رُو سے دونوں صاحبوں کے سپرد یہ کام سرے سے کیا ہی نہیں گیا تھا کہ وہ حکومت کے مسئلے کا جو فیصلہ بطور خود مناسب سمجھیں کر دیں[2]

گویا مولانا کے نزدیک حضرت علیؓ کی خلافت کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ نہیں تھی۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو علیؓ رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے والوں کی بیعت میں کیا رکاوٹ تھی۔ اگر لوگ حضرت علیؓ کی خلافت سے اختلاف نہ رکھتے تو کسی جھگڑے کا امکان ہی کیا تھا۔

حضرت علیؓ کی خلافت یقیناً اس قضیہ کا بنیادی مسئلہ تھی اور اس کو کسی بھی مجلس قضا میں بہر حال بحث میں آنا تھا۔

اگر مولانا یہ سمجھتے ہیں کہ حکمین کے سپرد خلافت کا مسئلہ کیا ہی نہیں گیا تھا تو

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۴۱ [2] ایضاً صہ ۱۴۱

واضح ہے کہ معاہدہ میں تو سرے سے کسی بھی مسئلہ کا ذکر نہیں آیا تھا خلافت کے مسئلہ کی تخصیص کا کیا سوال ہے۔

معاہدہ میں مجموعی طور پر فصل قضیہ ہی پیشِ نظر تھا اور جھگڑے کے کسی خاص پہلو کو فیصلہ کے لئے خاص نہیں کیا گیا تھا اس لئے بحث کے وقت نزاع کا ہر پہلو اور اس کے اسباب پر ہر رُخ سے ہی بحث ہو سکتی تھی اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

یہ بات مولانا کے علم سے خارج نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے ایک مرحلہ پر حضرت علیؓ سے مطالبہ کیا تھا کہ جھگڑا مٹانے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ آپ عثمانؓ کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دیں اور پھر آپ خلافت سے دستبردار ہو جائیں تاکہ مسلمان آپس کے مشورے سے جس پر اتفاق کریں اُسے خلیفہ بنا لیں [1]

طبری میں ہے:

صفین کے میدان میں عارضی جنگ بندی کے دوران میں فریقین میں وفود کا تبادلہ بھی ہوا۔ حضرت علیؓ کا جو وفد حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اُس نے جب معاویہؓ کو اطاعتِ امیر اور جماعت میں شمولیت کی دعوت دی تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا تم مجھے اطاعتِ امیر اور جماعت کی طرف دعوت دیتے ہو تو جہاں تک جماعت کا تعلق ہے وہ تو میرے ساتھ بھی ہے اور جہاں تک تمہارے امیر کا تعلق ہے تو ہم اسے امیر تسلیم نہیں کرتے (طبری جلد ۳ حصہ ۲ باب ۱ صفحہ ۳۹۴)

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت بھی مسلمانوں کے اندر ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہی تھی اور مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اُن کو خلیفہ نہیں سمجھتی تھی۔ پس اگر حکمین نے اس سوال کو اولیت دی تو یہ سوچ غلط نہیں تھی اور اُن کا خیال یقیناً یہی ہوگا کہ اس بنیادی مسئلہ کے حل میں ہی سارے مسائل کا

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۴۳

حل پوشیدہ ہے۔ پس حکمین نے اس مسئلہ کو در پیش قضیہ کا سب سے بڑا اور اہم بنیادی رُکن سمجھ کر اس کو اولیت دی۔ جیسا کہ مولانا خود بھی مانتے ہیں کہ حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے پوچھا۔ آپ کے نزدیک اس معاملہ میں کیا صورت مناسب ہوگی؟ اُنہوں نے کہا۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم ان دونوں حضرات (علیؓ و معاویہؓ) کو الگ کر کے خلافت کے مسئلے کو مسلمانوں کے باہمی مشورے پر چھوڑ دیں تاکہ وہ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔ حضرت عمروؓ نے کہا ٹھیک بات یہی ہے جو آپ نے سوچی ہے [1]

اور ظاہر ہے کہ دونوں جماعتوں کے سربراہوں کو معزول کرنے کی تجویز خود حضرت علیؓ کے مقرر کردہ حکم نے ہی پیش کی تھی اور عمروؓ بیچارہ تو حضرت ابو موسیٰ کی تجویز کی تائید کا ہی گنہگار ہے۔ ورنہ یہ تجویز عمروؓ کی نہیں تھی کہ اس بات کو اس کی علیؓ دشمنی پر محمول کیا جا سکتا۔ مگر چونکہ حکمین کے فیصلے کو حضرت علیؓ نے یہ فرماتے ہوئے مسترد کر دیا تھا کہ:

یہ دونوں صاحب جنہیں تم نے حکم مقرر کیا تھا اُنہوں نے قرآن کے حکم کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور خدا کی ہدایت کے بغیر ان میں سے ہر ایک نے اپنے خیالات کی پیروی کی اور ایسا فیصلہ دیا جو کسی واضح حجت اور سنّتِ ماضیہ پر مبنی نہیں ہے [2]

اس لئے حضرت مولانا مودودی صاحب کا خیال بھی یہی ہوا کہ:

اس بحث سے قطع نظر کہ دونوں حکموں میں سے ایک نے کیا کیا اور دوسرے نے کیا۔ بجائے خود یہ پوری کارروائی جو دومۃ الجندل میں ہوئی معاہدہ تحکیم کے بالکل خلاف اور اس کے حدود سے قطعی متجاوز تھی [3]

مولانا کی جمع و ترتیب اپنی جگہ مگر مولانا جیسے ذہین و فطین آدمی کے لئے

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۴۱ [2] ایضاً صہ ۱۴۲ [3] ایضاً صہ ۱۴۳

یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ حضرت علیؓ نے تحکیم کو قبول کر کے اپنے موقف کو فی الواقع ہی کمزور بنا لیا تھا اور یہ بات غلط نہیں کہ ثالثی کا فیصلہ طلب کرنے کے معاہدہ پر دستخط کر کے وہ اپنے آپ کو ذہن سے کا گئے تھے جہاں وہ خلافت حاصل کرنے سے پہلے کھڑے تھے اور ایسے ہی خلافت کے مسئلہ پر بحث کرنا حکمین کے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں تھا۔

پس اگر مولانا کا ترتیب دیا ہوا یہ مرحلہ خلافت سے ملوکیت کی طرف کوئی مرحلہ ہی ہے تو اس کا انتساب مولانا کی مبینہ معتبر روایات کے بموجب حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ کے بجائے حضرت علیؓ کی طرف زیادہ مضبوط دلائل کے ساتھ ہوتا ہے جنہوں نے پہلے ایک فیصلہ چاہا اور اُسے اپنے خلافِ منشاء پا کر مسترد کر دیا حالانکہ اس فیصلہ کی عمارت اُنہی کے مقرر کردہ حکم کی تجویز پر استوار ہوئی تھی اور وہ حسبِ قرارداد حکمین کے فیصلہ کو مسترد نہیں کر سکتے تھے۔ بالخصوص جبکہ وہ فیصلے کی غلطی کی ذمہ داری صرف معاویہؓ کے مقرر کردہ حکم پر ہی نہیں ڈالتے بلکہ دونوں حکمین کو ہی برابر کا قصوروار سمجھتے ہیں اور اس کے معنیٰ تو یہ بھی ہیں کہ اس باب میں خوارج کا موقف حضرت علیؓ کے مقابلہ میں زیادہ اقرب الی الصواب تھا۔

فصل دوم

آخری مرحلہ

یزید کی جانشینی

خلافت سے ملوکیت کی طرف چھ مرحلوں کو ایک ایک کر کے شمار کر چکنے کے بعد ساتواں مرحلہ ذکر کرنے کے بجائے مولانا نے ایک اور مرحلہ "آخری مرحلہ" کے عنوان سے مزید ذکر کیا ہے اور وہ مولانا کے الفاظ میں یوں ہے:

حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں اختیارات کا آنا خلافت سے ملوکیت کی طرف اسلامی ریاست کے انتقال کا عبوری مرحلہ تھا۔

بصیرت رکھنے والے لوگ اسی مرحلے میں یہ سمجھ گئے تھے کہ اب ہمیں بادشاہی سے سابقہ درپیش ہے۔ چنانچہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص جب حضرت معاویہؓ کی بیعت ہو جانے کے بعد ان سے ملے تو اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا الْمَلِكُ! کہہ کر خطاب کیا .... حضرت معاویہؓ خود بھی اس حقیقت کو سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے خود کہا تھا۔ اَنَا اَوَّلُ الْمُلُوك میں مسلمانوں میں پہلا بادشاہ ہوں ..... اب خلافت علی منہاج النبوۃ کے بحال ہونے کی آخری صورت صرف یہ رہ گئی تھی کہ حضرت معاویہؓ یا تو اپنے بعد اس منصب پر کسی شخص کے تقرر کا معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ پر چھوڑ دیتے یا اگر قطع نزاع کے لئے اپنی زندگی ہی میں جانشینی کا معاملہ طے کرنا ضروری سمجھتے تھے تو مسلمانوں کے اہل علم اور اہل خیر کو جمع کر کے انہیں آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ

کرنے دیتے کہ ولی عہدی کے لئے اُمّت میں موزوں تر آدمی کون ہے؟
لیکن اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لئے خوف و طمع کے ذرائع سے
بیعت لے کر انہوں نے اس امکان کا بھی خاتمہ کر دیا۔[1]

اس تحریر میں جناب مولانا نے جو حضرت معاویہؓ کی بے چوری پکڑلی ہے کہ
اُنہوں نے ایک موقع پر اپنے آپ کو خود بھی انا اوّل الملوك کہہ کر اپنی
بادشاہی کا اعتراف کر لیا تھا اور اس بات کو ان کی ملوکیت کی دلیل بنایا ہے
اس کا ذکر تو اپنی جگہ آگے چل کر آئے گا لیکن جہاں تک ان کے بیٹے
یزید کی جانشینی کا تعلق ہے اس تحریر کی روشنی میں ہمیں تین نکات پر
بحث کرنا ہے:

اوّل، کیا اسلام کے نظامِ حاکمیت میں اُمّت کے سربراہ کے بعد اس کا حقیقی
بیٹا اس کا جانشین بن سکتا ہے یا نہیں؟ اور کیا یزید کی جانشینی سے
قبل اسلام کی تاریخ میں ایسی جانشینی کی کوئی مثال موجود تھی یا نہیں؟

دوم، کیا امیر المومنین معاویہؓ نے یزید کے لئے بیعت حاصل کرنے کی غرض سے
دھونس و دھاندلی اور سودے بازی سے کام لیا تھا، جیسا کہ مولانا مودودی صاحب
کا کہنا ہے کہ اُنہوں نے خوف و طمع کے ذرائع سے کام لے کر اپنے بیٹے
کو اپنا جانشین منوایا تھا؟

سوم، یزید کو جن حالات میں حضرت معاویہؓ کی جانشینی کا اہل سمجھا گیا کیا اُن
حالات میں یزید کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ایسا موجود تھا جو یزید سے
بہتر جانشین ثابت ہو سکتا اور جس کی سربراہی پر یزید سے بڑھ کر
اتفاق ممکن تھا؟

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۴۷-۱۴۸

باپ کے بعد بیٹا

جہاں تک کسی سربراہِ مملکت کا اپنی زندگی میں اپنے جانشین کو مقرر کرنے کا تعلق ہے یہ مسئلہ نہ صرف مسلمانوں کے اندر بلکہ سطحِ ارضی پر موجود کسی بھی معاشرہ میں، کسی بھی زمانہ میں کبھی مابہ النزاع مسئلہ نہیں رہا۔ اور تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سربراہانِ مملکت اکثر ہی اپنے بعد قطع نزاع کے لئے اپنی زندگی میں ہی اپنے جانشین کے لئے فکرمند رہے ہیں اور اور اس باب میں بھی کبھی نزاع نہیں چلی کہ سربراہِ مملکت اپنی مملکت کی بہتری کے لئے کس شخص کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہے۔

تاریخ ہمیں جانشینوں کی فہرست میں بھائیوں کا بھی پتہ دیتی ہے، بیٹوں کی بھی خبر دیتی ہے، ایسے بھی جانشین مقرر ہوتے رہے ہیں جو سربراہ مملکت سے کوئی دور کا رشتہ بھی نہیں رکھتے تھے اور قریب یا دور کے رشتہ دار بھی اس فہرست میں آجاتے رہے ہیں۔

باپ کے بعد بیٹے کی جانشینی کا مسئلہ بھی کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ سربراہ مملکت جسے اپنی مملکت کے لئے مفید سمجھتا ہے اپنی یا اپنے مشیروں کی رائے سے اس کو منتخب کر لیتا ہے اس سے زیادہ تاریخ عالم میں کوئی اہتمام کبھی نہیں ہوا۔

قرآنِ کریم نے بھی اس باب میں کوئی قدغن نہیں لگائی کہ خبردار باپ کے بعد بیٹے کو سربراہی کا کوئی حق نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایسی کوئی بات ثابت نہیں کہ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی خاص ہدایات جاری فرمائی ہوں۔

باپ کے بعد بیٹے کی سربراہی کے سلسلہ کی ساری بحثیں دراصل حضرت معاویہؓ سے دل میلا رکھنے والے بعض لوگوں نے ہی جاری کی ہیں ورنہ اس سے پہلے اس

باب میں کوئی بحث موجود نہیں تھی۔ یہی نہیں بلکہ بیٹے کو دوسروں کے مقابلہ میں اپنے باپ کے بعد ملکی مفاد کا زیادہ بہتر یا سدار سمجھنا کوئی غیر منطقی بات بھی نہیں ہے بشرطیکہ وہ اُن صلاحیتوں سے بہرہ مند ہو جن کی سلطنت کے نظام کو چلانے کے لئے ضرورت ہے۔

اسلام صرف نالائق اور لائق کی تمیز کرتا ہے اگر بیٹا لائق ہو تو وہ اُسے مسترد نہیں کرتا ہے۔ اگر بیٹے سے زیادہ کوئی دوسرا شخص متعلقہ صلاحیتوں کا حامل ہو تو وہ اُسے مقدم رکھتا ہے۔ اسلام کو کسی فرد کا نہیں بلکہ ملک اور ملّت کا مفاد پیشِ نظر ہے اور اس مفاد کے سوا اُس کے نزدیک دوسری کوئی صلاحیت قابلِ قبول نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کبھی کسی سلطنت کے لئے طالوت کو اس لئے پسند کر لیا جاتا ہے کہ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ اور کبھی داؤد علیہ السلام کی سلطنت کو سنبھالنے کے لئے اُن کے حقیقی بیٹے سلیمان علیہ السّلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ اور یہ سلطنت خواہ روحانی ہو یا مادی سب میں ہی یہ دستور مشترک ہے ابراہیم علیہ السلام اپنے وارث کے بطور بیٹا ہی مانگتے تھے، پھر اُنہیں یہ نعمت دے دی گئی۔ زکریاؑ جب اپنے عزیزوں کو اپنی وراثت کے نالائق پاتے ہیں تو وہ بھی بیٹے کے لئے ہی درخواست کرتے ہیں کہ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ اور ظاہر ہے کہ یعقوبؑ کی آل میں سلطنت روحانی بھی چلتی تھی اور مادی بھی۔

پس تاریخ خواہ مادی سلطنتوں کی ہو یا روحانی کی کسی بھی سلطنت کے لئے بیٹوں کو مسترد کم کیا گیا ہے اور پسند زیادہ کیا گیا ہے۔ انبیاء کے ہاں بھی بیٹے کی طلب میں ایک ہی اصول کارفرما تھا کہ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ اس کے علاوہ دوسری کوئی شرط درمیان میں نہیں لائی گئی۔ یہ قدغن حضرت مولانا مودودی صاحب اور اُن کے بعض ہم خیال پیشرو بزرگوں کی ہی ایجاد

ہے کہ باپ کے بعد بیٹا محروم ہونا چاہیئے اور اس ایجاد گردی کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ معاویہؓ نے اپنے بیٹے کو اپنی زندگی میں اپنا ولیعہد مقرر کر دیا تھا۔ اگر معاویہؓ ایسا نہ کرتے تو مولانا بھی ان کے خلاف اتنی محنت نہ کرتے کیونکہ حضرت کی یہ بحث کوئی اصولی بحث نہیں ہے بلکہ انہیں صرف معاویہؓ اور ان کے بیٹے پر غصہ ہے۔

اسلام صرف حقدار کو ہی جانتا ہے اور وہ صرف حقدار کے حق کی ہی حفاظت کرتا ہے۔ اُسے اس بات کوئی بحث نہیں کہ حقدار کسی سربراہ مملکت کا بیٹا ہے یا پوتا یا بھائی ہے یا کوئی اور رشتہ دار، اس کا کوئی ملنے والا ہے یا غیر۔ اس کے نزدیک صرف حقدار ہونا ہی شرط ہے۔ یہ شرط جہاں بھی پائی جائے گی اسلام اسی کے حق میں فیصلہ دے دے گا۔

قرآنِ پاک میں ارشاد ہے: تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا کہ امانتیں اُن کے اصل مالکوں کی طرف لوٹا دو۔ اور بس حضرت معاویہؓ پر اعتراض تو اس لئے بھی غیر معقول ہے کہ سربراہِ سلطنت سے رشتہ کی بنیاد پر حقِ حکومت کا مطالبہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور مولانا نے اس کو کبھی غلط نہیں کہا۔

بلا شبہ شریعتِ اسلامیہ کسی باپ کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنے بعد اپنے بیٹے کو اپنے بیٹے کی حیثیت سے اپنا جانشین مقرر کرے۔ مگر وہ ایسے یہ حکم بھی نہیں دیتی کہ اگرچہ ملک اور ملت کی ضرورت سے اس کا بیٹا دوسرے سب لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہو پھر بھی وہ اُسے محض اس لئے مسترد کر دے کہ وہ اس کا بیٹا ہے اور اس کے حق کو اس لئے ساقط ہو جانا چاہیئے کہ وہ سربراہِ مملکتِ اسلامی کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید کی بطور جانشین تقرری سے قبل مسلمانوں کے اندر اس بدعی ذہن کا کوئی وجود نہیں تھا مگر یزید کی نامزدگی پر بعض اہلِ سیاست نے اس مسئلہ کو بطور ایک سیاسی حربہ کے اپنایا

اور پھر وہ اس کو بطور ایک سیاسی حربہ کے ہی استعمال کرتے رہے اور پھر اس میں زیادہ زور پیدا کرنے کے لئے اس کو اسلام کے مزاج کے خلاف قرار دے لیا۔

حالانکہ حضرت معاویہؓ کے جانشین جیسی جانشینی پہلے بھی عمل میں آ چکی تھی۔ مگر اس پر کوئی اعتراض نہیں اٹھایا گیا تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ شریعتِ حقہٴ اسلامیہ میں مملکت کی سربراہی کے لئے صلاحیت کار کے سوائے اور کوئی شرط نہیں تھی مگر یزید بن معاویہؓ کے معاملہ میں سیاسی ضرورتوں نے اس مسئلہ کو پیدا کیا اور پھر اس کو اتنا اچھالا گیا کہ لوگ فی الواقع ہی اس کو اسلام کے مزاج کے منافی سمجھنے لگے۔

کوئی شخص بھی جس نے تاریخ اسلام کے اُن واقعات پر تھوڑا بھی غور کیا ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے حضرت عثمانؓ کے انتخاب تک گزرے جن کا تعلق مملکتِ اسلامی کے سربراہوں کے انتخاب اور مملکت میں سیادت وقیادت کی تبدیلی سے ہے اور اسے اس باب میں حضرت علیؓ کے اُن جذبات وخیالات کا علم ہو جو مولانا مودودی صاحب کی ہی مسلمہ اور معتبر تواریخ کے راویوں کی زبان سے ہم تک پہنچے ہیں تو وہ بڑی آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ باپ کے بعد بہرحال بیٹے کو محروم کر دینے کا بدعی ذہن اصحابِ رسول میں کہیں موجود نہیں تھا۔ نہ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہی اہل بیت رسولؐ سے باہر اس لئے ہوا تھا کہ اہل بیت شرعاً اس منصب سے محروم تھے اس لئے بیت الرسولؐ سے باہر کا ہی کوئی شخص خلافت کا مستحق ہے اور نہ عمرؓ ہی اس لئے خلیفہ منتخب کئے گئے تھے کہ ان کا اولادِ رسولؐ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ بالآخر عثمانؓ کا انتخاب ہی اس ذہن کی پیداوار تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو مولانا مودودی کے مسلمہ مورخین کے بقول حضرت علیؓ قیادت کی تبدیلی کے ہر مرحلہ پہ

ہی اپنی محرومی کو اپنے ساتھ زیادتی کیوں سمجھتے۔ حضرت علیؓ یقیناً مولانا مودودی صاحب اور اُن کے ہمنواؤں کے مقابلہ میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ مزاج شناس تھے۔ اگر یہ بدعت اسلام کا حصہ ہوتی یا اسلام کے مزاج کے منافی ہوتی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کوئی اثر موجود ہوتا تو حضرت علیؓ کبھی یہ جسارت نہ کرتے کہ وہ دنیا کے لئے اپنے دین کو بازی پر لگا دیں اور امت کی سربراہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء اور اسلام کے مزاج پر ترجیح دیں۔

مولانا مودودی صاحب کو تسلیم ہے کہ علیؓ بلاشبہ اپنے آپ کو دوسرے سب لوگوں سے ہی خلافت کے لئے احق (زیادہ حقدار) سمجھتے تھے [1]

تو کیا کوئی شخص حضرت علیؓ کے کسی قول یا اثر سے یہ بتا سکتا ہے کہ وہ اپنے احق ہونے کے لئے اس کے علاوہ بھی کوئی دلیل اپنے پاس رکھتے تھے کہ وہ رسول اللہ کے پروردہ ہیں، اُن کے داماد ہیں اور اُن کے عم زاد ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اُنہیں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے نہ کوئی رقابت تھی، نہ دشمنی اور وہ اُن تینوں کے شرف کا بھی انکار نہیں کرتے تھے لیکن جب اصحابِ رسولؐ نے تینوں بار ہی حضرت علیؓ کی خواہش سے واقف ہونے کے باوجود انہیں مؤخر کیا تو اس کی وجہ بھی یہ نہیں تھی کہ وہ اُنہیں اس لئے محروم کرتے ہیں کہ وہ ابنِ رسولؐ یا دامادِ رسولؐ ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین نہیں بن سکتے بلکہ اصحاب رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ تینوں بزرگ ہی اپنی صلاحیت کار، اپنی بزرگی اور اپنے شرف کی وجہ سے حضرت علیؓ پر مقدم تھے اس لئے علی رضی اللہ عنہ کی خواہش کے باوجود اُن کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کو ان سے پہلے قبول کر لیا گیا۔ پھر جب حالات نے یہ شرف حضرت علیؓ کی طرف لوٹا دیا تو اپنے وقت پر وہ امت

---

[1] خلافت وملوکیت صد ۱۵۸ سطر ۸

کے خلیفہ قرار پائے۔

تاہم حضرت علیؓ کی طرف سے اپنے احق ہونے کے اظہار سے ہی ظاہر ہے کہ وہ مولانا مودودی صاحب اور اُن کے بعض اہل قلم ساتھیوں کی طرح باپ کے بعد بیٹے کی محرومی کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ اگر اصحاب رسولؐ ان کو ابوبکرؓ سے زیادہ باصلاحیت اور زیادہ شرف کا حامل جانتے تو رسول اللہؐ کی وفات کے بعد علیؓ ہی خلیفہ اوّل بنتے اور ان کے لئے اُن کا دامادِ رسولؐ، پروردۂ رسولؐ یا عمزادِ رسولؐ ہونا کچھ بھی رکاوٹ نہ بنتا۔

تعجب ہے کہ مولانا مودودی صاحب کو حضرت معاویہؓ کے خلاف جمع و ترتیب کرتے یہ بھی یاد نہ رہ سکا کہ حضرت علیؓ نے نہ صرف یہ کہ سربراہی کی ہر تبدیلی پر اپنے آپ کو سربراہی اور خلافت کا احق جانا بلکہ اپنی وفات کے موقع پر اپنے بعد اپنے حقیقی بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کیا اور اس غرض سے انہوں نے کوئی صحیح یا غیر صحیح مجلس مشاورت بھی طلب نہیں فرمائی تھی۔ جبکہ حضرت معاویہؓ نے اس مرحلہ پر استصواب عام منعقد کیا تھا۔

مولانا مودودی صاحب بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقعہ پر اُن کے رفقاء نے اُن پر زور دیا تھا کہ آپ اپنی زندگی میں ہی اپنے جانشین کے بطور اپنے بڑے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو نامزد کر دیں۔ مولانا لوگوں کے اس دباؤ کو اپنے الفاظ میں یوں لکھتے ہیں:

حضرت علیؓ کی وفات کے وقت لوگوں نے پوچھا کہ ہم آپ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟ [1]

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ سب لوگ ہی جو حضرت علیؓ سے حسنؓ کی بیعت کے لئے اجازت مانگتے تھے، اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ باپ کے

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۶۸

بعد بیٹے کی جانشینی کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت علیؓ کی وفات ایک مہلک قاتلانہ حملہ کا نتیجہ تھی اور ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کے اس وقت آخر میں اُن کے پاس بہت سے اصحاب رسولؐ بھی موجود ہوں گے اور اس سوال میں وہ بھی شامل ہوں گے اور دیکھئے حاضرین نے بڑے واضح الفاظ میں حضرت علیؓ سے اُن کے بعد اُن کے بیٹے کے لئے بیعت چاہی مگر موقع ومحل کے باوجود کسی نے اس بات کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا کہ یہ کیسی اجازت طلبی ہے کہ آپ لوگ جانتے بوجھتے حضرت کو ایک امرِ حرام کی ترغیب دے رہے ہیں! تعجب ہے کہ بقول مولانا مودودی اسلام کے مزاج کے ہی صریح خلاف ایک امر سامنے آیا ہے مگر مزاج شناسانِ اسلام اور متبعینِ رسولؐ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی ہم مولانا مودودی صاحب سے ہی یہاں نقل کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

(حضرت علیؓ نے حاضرین کے اس سوال کے جواب میں فرمایا) میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ منع کرتا ہوں۔ تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو[1]

اب اس حال میں کیا خیال ہے مولانا مودودی صاحب اور اُن کے ہمنواؤں کا کہ ایسا فرما کر کیا حضرت علیؓ نے کتمانِ حق کیا ہے؟ یا اپنے ذاتی مفاد کو اُمت کے مفاد پر مقدم رکھنے کی سعی فرمائی ہے؟ یا پھر کیا حضرت علیؓ بھی اس مسئلہ سے بے خبر تھے جو مولانا مودودی صاحب کو معلوم ہو گیا۔

آخر حضرت علیؓ نے ایسا ملت دشمن اور خلافِ اسلام بیان کیوں دیا جبکہ حضرت علیؓ کو چاہیئے تھا کہ وہ حاضرین کو اُن کے اس خلافِ اسلام سوال پر سختی سے جھڑک دیتے۔ مسئلہ کو بیان کرنے کا موقع اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا۔

وہ حاضرین کو سخت تعجب بھری نگاہ سے دیکھتے، حیرت بھرے انداز سے

[1] خلافت وملوکیت صفحہ ۱۴۸ سطر ۸-۹

بچتے اور انہیں ڈانٹ پلاتے، خدا کا خوف دلاتے کہ زندگی کے اس نازک مرحلے پر جب میں اپنے اللہ کے حضور پیش ہونے والا ہوں تم مجھے یہ کس راہ پر ڈال رہے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ باپ کے بعد بیٹے کی سربراہی کا دستور اسلام کا نہیں بلکہ کفر کا شعار ہے۔ قیصر و کسریٰ کی سنت ہے اور اسلام کے اندر اس کے لئے کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا انہوں نے حاضرین کے سوال کے جواب میں جو کچھ فرمایا اور جسے ہم ابھی ابھی خود مودودی صاحب سے ہی نقل کر آئے ہیں اس میں آپ نے اپنے بعد اپنے بیٹے کی جانشینی کے لئے پوری گنجائش موجود رکھی ہے اور انہوں نے بڑے ہی واضح الفاظ میں اپنے اصحاب سے کہہ دیا ہے کہ تم اگر میرے بعد میرے بیٹے حسنؓ کو میرا جانشین بنانا چاہو تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور پھر آپ کے رجحان کے احترام در احترام میں اصحابِ علیؓ نے حضرت حسنؓ کو اپنا خلیفہ بنا لیا۔ پھر نہ کسی نے اس فعل کو کفر قرار دیا نہ قیصر و کسریٰ کی سنت ہی کہا۔

اس کام کو کفر اور قیصر و کسریٰ کی سنت اُس وقت بنایا گیا ہے جب حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے امیر یزید کے لئے اپنے جانشین کے بطور لوگوں سے بیعت حاصل کی یعنی یہ فتویٰ دراصل مولانا مودودی صاحب اور ان کے بعض ہم پیشہ لوگوں کی سیاسی ضرورت ہے یہ کوئی دین کا مسئلہ نہیں ہے۔

مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو کافری ثابت کرنے کے لئے بڑی محنت کی ہے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ع "تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ"۔

حضرت معاویہؓ کے رب نے مولانا سے خود اپنے ہی دہانِ قلم سے ایک ایسی روایت اگلوا دی جس نے مولانا کے ایوان سخن سازی کی پوری عمارت ہی مسمار کر ڈالی ہے۔

یہ کوئی قسمت کا ہی پھیر ہے کہ انہوں نے اپنے مفادات اور موقف کے صریحاً خلاف یہ روایت اپنے ہاں قبول کر لی ہے اور تعجب یہ ہے کہ انہیں اپنے گھر دا اپنی ہی منتقد ہے

جال کا یہ حلقہ کسنے کیلئے مشہور شیعہ مورخ المسعودی کا بالخصوص ممنونِ احسان بننا پڑا ہے لہ
شیعہ مورخ سے استعانت کے باوجود یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ
وہ حضرت علیؓ کے اس قول کو کس تاویل سے اپنے موقف سے ہموار کر سکتے ہیں کہ۔
میں نہ تم کو اس (بات کا یعنی اپنی جگہ حسنؓ کو خلیفہ بنا لینے) کا حکم دیتا ہوں اور
نہ تم کو انہیں اپنا خلیفہ بنا لینے سے) منع کرتا ہوں۔
مگر تاویل کی بھلی پوچھئے، یہاں ہر بات ممکن ہے بقول علامہ اقبالؒ سے

زما بر صوفی و مُلّا سلامے — کہ پیغام خدا دادند مارا
ولے تاویل شان در حیرت انداخت — خدا و جبرئیلؑ و مصطفیٰؐ را

ہم یہاں ایک ایسی روایت نقل کرتے ہیں جس میں حضرت علیؓ کی طرف
سے حضرت حسنؓ کو صاف الفاظ میں اپنا جانشین مقرر کرنے کا ذکر موجود ہے
یہ روایت مولانا مودودی کے علم و خبر سے باہر نہیں صرف ان کی مصلحت کے
خلاف ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:
حضرت مرتضیٰ نزدیک استخلافِ امام حسنؓ فرمود اِنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِالنَّاسِ خَیْرًا
فَسَیَجْمَعُھُمْ بَعْدِیْ عَلٰی خَیْرِھِمْ ٢ہ
حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کی خلافت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: (اگرچہ میں
حسنؓ کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں لیکن) اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی بھلائی چاہے گا۔

لہ المسعودی کا شیعہ ہونا ایک مسلّمہ امر ہے "تاہم مولانا نے اس کو معتزلی تو مانا
ہے مگر اس کی شیعیت کا اقرار کرتے وہ خاصے پریشان نظر آتے ہیں وہ اُسے
بہت سی رعایت دیتے ہیں اور اپنے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ یہ
کہنا صحیح نہیں کہ وہ خالی شیعہ تھا (خلافت و ملوکیت صد ۳۱) لیکن چونکہ مولانا کو
خود بھی معلوم ہے کہ وہ بہرحال شیعہ ہی تھا اس لئے یہ مانے بغیر چارہ نہیں رہ سکا کہ
تاہم تشیع اس میں تھا (خلافت و ملوکیت صد ۳۱)
٢ہ ازالۃ الخفا مقصد اوّل فصل دوم لوازم خلافت خاصہ بحوالہ الحاکم

تو سب لوگوں کو اُس شخص پر جمع کر دے گا جو اُن میں سے بہترین آدمی ہو گا،
خطاب کے الفاظ سے بالکل واضح ہے کہ حضرت علیؓ خوب جانتے تھے کہ حضرت حسنؓ کو چونکہ
اُمت کے اندر مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہے اس لئے لوگ ان کی ذات پر جمع نہیں
ہو سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حسنؓ کو نامزد کرنے کے باوجود بھی
حقیقتِ حال کی طرف اشارہ کر دیا۔ پھر اُن کا یہ ارشاد حقیقت ہی ثابت ہوا اور اُمت
کا اجماع حضرت حسنؓ پر فی الواقع ہی نہ ہو سکا اور بالآخر یہ اجماع حضرت
معاویہؓ کے ہی دامانِ بخت کی دولت بنا۔ مگر یہاں ہمیں اس بات سے
کوئی بحث نہیں ہے کہ اُمت نے کیا چاہا اور کیا فیصلہ کیا۔ بحث یہ ہے کہ
حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں مولانا مودودی صاحب کے اس موقف کو
کسی درجہ میں بھی پذیرائی کا شرف حاصل نہیں ہے کہ باپ کے بعد بیٹے کی
سربراہی اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ اور حضرت علیؓ کسی ایسے خیال کا
اظہار بھی کیونکر فرما سکتے تھے جب خود ان کا اپنا موقف بھی ہمیشہ یہی رہا تھا کہ
آلِ رسولؐ ہونے کی وجہ سے خلافت ہمارا حق ہے [1]

فاروقِ اعظمؓ کے ہاں

حضرت فاروقِ اعظمؓ کی زندگی کے آخری لمحات میں بھی ضمناً یہ مسئلہ
سامنے آیا تھا اور اگر کسی کو حق کی تلاش ہو تو اس واقعہ میں اُس کے لئے
رہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔ فاروق اعظمؓ نے اپنی رحلت سے قبل اپنی
جانشینی کے لئے اُمت کے چھ بہترین افراد میں سے ایک کو اپنے بعد اُمت
کا سربراہ بنانے کی ہدایت کی حضرت نے فرمایا:

میں عشرہ مبشرہ میں سے چھ آدمیوں کی ایک جماعت بنا رہا ہوں۔ یہ

[1] طبری جلد ۳

لوگ اپنے میں سے کسی ایک شخص کا انتخاب کرلیں ..... وہ چھ آدمی مندرجہ ذیل ہیں: علیؓ، عثمانؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، زبیرؓ بن العوام اور طلحہؓ بن عبیداللہ۔

عبداللہ بن عمرؓ کو اس جماعت میں بطور مشیر شریک کیا جائے۔ انتخاب میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے [1]

اس مرحلہ پر آپ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں بھی ایک تحریک آپ کے سامنے آئی اور کسی بزرگ نے آپ سے انہیں ولی عہد مقرر کرنے کی درخواست کی۔ حضرت عمرؓ کو یہ بات سن کر سخت رنج ہوا اور آپ نے یہ تحریک کرنے والے بزرگ کو جواب دیا۔

خدا تجھے غارت کرے خلافت کی تو خود میں نے کبھی آرزو نہیں کی تھی اپنی اولاد کے لئے یہ خواہش کیسے کروں گا۔

مجھے تمہاری سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر یہ خلافت کوئی اچھی چیز ہے تو یہ ہمیں حاصل ہو چکی اور اگر بری ہے تو یہی کافی ہے کہ اس کے نتیجہ میں صرف میں ہی محسوب ہوں اور امتِ محمدیہ کے امور کی جواب طلبی صرف مجھ تک ہی محدود ہے، میں اپنے خاندان کو اس مصیبت میں پھنسانا نہیں چاہتا [2]

روایت بڑی واضح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے درخواست پیش کی گئی کہ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنی جگہ اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کو اپنا جانشین بناتے جایئے کہ وہ اس کا اہل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ یقیناً اُن تمام صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے جو کسی سربراہ کو درکار ہیں۔ یہاں اب سوال عبداللہ بن عمرؓ کی سربراہی کا نہیں ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ یہ درخواست جس مجلس میں پیش کی گئی اصحابِ رسولؐ کا

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۶ [2] طبری جلد ۳ باب ۱۶

ایک ہجوم وہاں موجود تھا۔

اور اگر مولانا مودودی صاحب کا موقف صحیح ہے کہ باپ کی سربراہی کے بعد بیٹے کی جانشینی ہر لحاظ سے اور ہر اعتبار سے ہی بدترین قسم کی دھاندلی اور اسلام کے مزاج کے ہی منافی ہے تو مان لینا چاہیئے کہ اس مسئلہ کا اصحابِ رسولؐ میں سے کسی کو بھی علم نہیں تھا۔

نہ محرک بزرگ اس شعور کے امین تھے نہ اصحابِ رسولؐ میں سے ہی کسی کو اس مسئلہ سے آگاہی تھی نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی اس کے بارے میں کسی قسم کا علم رکھتے تھے ورنہ اس درخواست پر سب چیخ اٹھتے کہ یہ تم نے کیا سوچا ہے یہ تو قیصر اور کسریٰ کی سنّت ہے اس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ سے کیا تعلق ہے!

مگر اصحابِ رسولؐ کی جماعت میں سے کسی نے یہ بات نہیں اٹھائی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کی جانشینی کی بات سب کے دل کی ہی بات تھی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اگر نامزد کر دیا جاتا تو کسی کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ تاہم حضرت عمرؓ نے یہ رائے یا درخواست ماننے سے سختی کے ساتھ انکار کیا مگر اُن کے انکار کی وجہ وہ نہیں تھی جسے اسلام کا مزاج قرار دینے کا شرف مولانا مودودی صاحب کو حاصل ہے۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ کی سیرت کا یہ رُخ بڑا نمایاں ہے کہ وہ دینِ حق کے معاملہ میں نہ مصلحت کے قائل تھے نہ کسی رعایت کے حق میں تھے اور ان کی غیرت کا یہ اسلوب اپنے پیچھے آسمان کی تائید کو بھی موجود رکھتا تھا۔ بدر کے اسیروں کے بارے میں اصحابِ رسولؐ میں جو بحث تھی اُس بحث میں آسمان سے اترنے والی وحی نے حضرت فاروقِ اعظمؓ کی رائے کو ہی پسند کیا تھا جنہوں نے فرمایا تھا کہ یہ لوگ معافی کے قابل نہیں ہیں ان کو قتل کر دینا چاہیئے۔ جبکہ دوسرے اصحاب نے اُن کے بارے میں عمرؓ سے اختلاف کیا۔

مگر جب اوپر سے فیصلہ اُترا تو وہ عمرؓ کے حق میں تھا۔

عمرؓ آج بھی وہی تھے اور یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ اُن کے سامنے کوئی شخص دینِ حق کے خلاف کوئی بات کہتا اور وہ اپنا ہاتھ اپنے دُرّے کی جانب نہ بڑھاتے۔ مگر اُنہوں نے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین نامزد کرنے کے مشورہ کو دینِ حق کے خلاف ہونے کی وجہ سے مسترد نہیں کیا تھا بلکہ اس استرداد کے لئے اُنہوں نے یہ دلیل دی کہ بہت بڑا بوجھ اور بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں یہ ذمہ داری اپنے بعد اپنے خاندان کے کسی فرد پر نہیں ڈالنا چاہتا۔ اور اگر یہ شرف ہی ہے تو یہ شرف مجھے مل چکا اور ہمارے لئے یہی کافی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اگر تم عبداللہ کو خلافت کی صلاحیتوں سے بہرہ ور پاتے ہو تو مجھے بھی اس کی صلاحیتوں سے انکار نہیں ہے اور میں اس کی خلافت میں کوئی شرعی روک بھی نہیں پاتا۔ مگر میں اُسے خلیفہ بنانے کو اپنی مصلحت سے پسند نہیں کرتا البتہ تم اُسے انتخابی مجلس میں بطور مشیر کے شامل کر سکتے ہو۔

اب اگر اتنی صاف بات بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تو یہ شاید سمجھ کا قصور نہیں کوئی دوسری رکاوٹ ہے۔

کیا یزید کیلئے بیعت میں دھاندلی کی گئی تھی؟

مولانا مودودی صاحب کے بیان میں یزید کی بیعت کے سلسلہ میں دوسری بنیاد یہ ذکر ہوئی ہے۔ وہ اگر قطع نزاع کے لئے اپنی زندگی ہی میں جانشینی کا معاملہ طے کر جانا ضروری سمجھتے تو مسلمانوں کے اہل علم و اہل خیر کو جمع کر کے انہیں آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے دیتے کہ ولی عہدی کے لئے اُمت میں موزوں تر آدمی کون ہے۔ لیکن اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لئے خوف و طمع

کے ذرائع سے بیعت لے کر انہوں نے (ملوکیت کی راہ روکنے کے) اس امکان کا بھی خاتمہ کر دیا[1]

اور حضرت معاویہؓ پر اپنے پلان کا پورا ملبہ گرانے کے لئے وہ اس بیان کی ابتدا میں ہی یہ تمہید اٹھا چکے ہیں کہ:

حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں اختیارات کا آنا خلافت سے ملوکیت کی طرف اسلامی ریاست کے انتقال کا عبوری مرحلہ تھا۔ بصیرت رکھنے والے لوگ اس مرحلہ میں ہی سمجھ گئے تھے کہ اب ہمیں بادشاہی سے سابقہ در پیش ہے[2]

مولانا کے ہاں یزید کی جانشینی کا فیصلہ حضرت معاویہؓ کی کوئی معمولی درجہ کی مجرمانہ کاروائی نہیں تھی بلکہ وہ اپنے معتبر ذرائع سے حضرت معاویہؓ کے دامن سے جن چار ہلاکتوں کو وابستہ کر چکے ہیں اُن میں ایک بڑی کاروائی یزید کی جانشینی کا فیصلہ بھی ہے اور انہوں نے اپنے خاص راویوں کے ذریعہ حضرت حسن بصریؒ سے یہ بات منسوب کی ہے کہ:

حضرت معاویہؓ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی ارتکاب کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو[3]

اور ان کاروائیوں میں سے ان کی ایک بڑی مہلک کاروائی جس نے حضرت معاویہؓ کو ہلاکتوں کے سپرد کر رکھا ہے اُن کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا ہے۔ حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا۔ ریشم پہنتا اور طنبورے بجاتا تھا[4]

بنا بریں مولانا کا خیال ہے کہ:

یزید بجائے خود اس مرتبے کا آدمی نہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے قطع نظر کرتے ہوئے کوئی شخص یہ رائے قائم کرتا کہ حضرت معاویہؓ کے بعد اُمت کی سربراہی کے لئے وہ موزوں ترین آدمی ہے[5]

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ۱۴۴ [2] ایضاً صـ۱۴۷ [3] ایضاً صـ۱۶۵
[4] ایضاً صـ۱۶۶ [5] ایضاً صـ۱۵۰

اور خود حضرت معاویہؓ اُمت کی سربراہی کے لئے کہاں تک موزوں تھے اس بارے میں بھی مولانا کے خیالات پردہ راز میں نہیں ہیں وہ بڑی صفائی سے فرما چکے ہیں کہ :

حضرت معاویہؓ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہیں تھی کہ مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے۔

وہ بہر حال خلیفہ ہونا چاہتے تھے، اُنہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی۔ مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہیں تھا، لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں کے لئے بیعت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا [۱]

ایسے ظالمانہ ریمارکس اور زہریلی تشریحات کے بعد بھی اگر کوئی شخص حضرت معاویہؓ کے حق میں مولانا مودودی صاحب سے کسی انصاف کی توقع کرے تو اُسے سخت قسم کا احمق ہی کہا جائے گا اور ان حالات میں مولانا کے اس ارشاد کو بھی ہرگز اُن کے دل کی آواز نہیں کہا جائے گا کہ :

حضرت معاویہؓ کے محامد و مناقب اپنی جگہ پر ہیں، اُن کا شرفِ صحابیت بھی واجب الاحترام ہے، اُن کی یہ خدمت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ اُنہوں نے پھر سے دنیائے اسلام کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا [۲]

تاہم مولانا نے یزید کی جانشینی کے سلسلہ میں اپنے ان بیانات میں دو باتیں بالخصوص ذکر کی ہیں :

اوّل، حضرت معاویہؓ نے یزید کو اپنا جانشین بنانے کے لئے سخت قسم کی دھاندلیوں سے کام لیا، لوگوں کو ڈنڈے اور دولت دونوں کے زور سے یزید کی خلافت کے لئے آمادہ و مجبور کیا۔

---

[۱] خلافت و ملوکیت صـ ۱۵۸ [۲] ایضاً صـ ۱۵۳

دوم، یزید ایک پلید فطرت اور بازاری قسم کا انسان تھا وہ فی نفسہٖ بھی اس بات کا اہل نہیں تھا کہ اُسے خلافت ایسے عظیم منصب کے لئے خاص کیا جاتا۔

دھونس اور دھاندلی کی مثال

عراق، شام اور دوسرے علاقوں سے بیعت لینے کے بعد حضرت معاویہؓ خود حجاز تشریف لے گئے کیونکہ وہاں کا معاملہ سب سے اہم تھا اور دنیائے اسلام کی وہ بااثر شخصیتیں جن سے مزاحمت کا اندیشہ تھا وہیں رہتی تھیں۔
مدینے کے باہر حضرت حسینؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ اُن سے ملے۔ حضرت معاویہؓ نے اُن سے ایسا درشت برتاؤ کیا کہ وہ شہر چھوڑ کر مکے چلے گئے۔ اس طرح مدینے کا معاملہ آسان ہو گیا۔ پھر انہوں نے مکے کا رخ کیا اور ان چاروں اصحاب کو خود شہر کے باہر بُلا کر اُن سے ملے ....
پھر تخلیے میں بلا کر انہیں یزید کی بیعت پر راضی کرنے کی کوشش کی (مگر وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہو سکے) ....

اس پر حضرت معاویہؓ نے کہا اب تک میں تم لوگوں سے درگزر کرتا رہا ہوں۔ اب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی کہا تو دوسری بات اس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی۔ تلوار اُس کے سر پہ پہلے پڑ چکی ہو گی۔ پھر اپنے باڈی گارڈ کے افسر کو بلا کر حکم دیا ان میں سے ہر ایک پر ایک ایک آدمی مقرر کر دو اور اُسے تاکید کر دو کہ ان میں سے جو بھی میری بات کی تردید یا تائید میں زبان کھولے اس کا سر قلم کر دے۔ اس کے بعد وہ ان کو لیئے ہوئے مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ یہ مسلمانوں کے سردار اور بہترین لوگ ہیں جن کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں

کیا جاتا، یزید کی ولیعہدی پر راضی ہیں اور انہوں نے بیعت کر لی ہے
لہٰذا تم لوگ بھی بیعت کر لو۔

اب لوگوں کی طرف سے انکار کا کوئی سوال ہی باقی نہ تھا۔ اہلِ مکہ نے بھی بیعت کر لی۔

اس طرح خلافتِ راشدہ کے نظام کا آخری اور قطعی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ خلافت کی جگہ شاہی خانوادوں نے لے لی اور مسلمانوں کو اس کے بعد سے آج تک پھر اپنی مرضی کی خلافت نصیب نہ ہو سکی۔[۱]

۱۔ یہ روایت کسی کذاب مگر مچھ سبائی راوی کی دھاندلی تو تھی ہی اس کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرنا خود مولانا مودودی صاحب کی بھی ایک دھاندلی ہی ہے جو مولانا صاحب نے حضرت معاویہؓ کی ایثار پیشگی، بے نفسی دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کے خوف پر مشتمل صدہا روایات اور اس زیرِ بحث مسئلہ میں بھی اُن کی خدا خوفی برسوں تک غور و فکر عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے ہزاروں میل کے سفر اور اس باب میں کسی فیصلہ تک پہنچنے کے لئے رو رو کر اپنے رب سے رہنمائی حاصل کرنے کی بے شمار روایات کو پوری حوصلہ مندی سے ترک کر کے اس ایک سبائی روایت کا ہی انتخاب کیا ہے۔ جو سخت دوڑ بھاگ اور مشقت کے بعد انہیں بالآخر ابن اثیر کے کباڑ خانہ روایات سے دستیاب ہو گئی۔ تاہم اگر مولانا چاہتے تو انہیں ابن اثیر کے ہاں بھی معاویہؓ کے لئے اچھی بھلی جاندار اور قوی و مستحکم روایات مل سکتی تھیں جو کسی بھی شخص کے لئے وجۂ فخر و ناز ہو سکتی ہیں۔
۲۔ اس روایت کے وضعی اور جھوٹ ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ بحسب حوالہ مولانا نے اس روایت کو ابن اثیر سے لیا ہے۔ اور اس روایت کے بموجب حضرت معاویہؓ نے جن چار بزرگوں سے یزید کی بیعت بزورِ شمشیر منوائی اور جنہوں نے موت کے خوف سے ایک جھوٹ بات کو اپنے نام منسوب ہونا

---

[۱] خلافت و ملوکیت صہ ۱۵۲ - ۱۵۳

پسند کر لیا۔ اُن میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ بھی شامل ہیں۔ جبکہ خود ابن اثیر کی روایت کے بموجب ہی حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ ۵۳ ہجری میں وفات پا چکے تھے اور حضرت معاویہؓ کا یہ سفر ۵۶ ہجری کا واقعہ ہے [۱]

۳۔ روایت کے باطل ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ راوی نے حضرت معاویہؓ کے ان چار معتوب بزرگوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بھی ذکر کیا ہے جبکہ بخاری شریف کی روایت کے بموجب حضرت عبداللہ بن عمرؓ مدینہ منورہ میں ہی یزید کے لئے حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ اور وہ مکہ کی طرف اس پارٹی کے سفر میں اُن کے ساتھ شامل ہی نہیں تھے! ورتاریخی روایت اگر حدیث صحیح کے معارض ہو تو مولانا کے نزدیک بھی حدیث کو قبول کیا جائے گا [۲] بنابریں خود مولانا کے اس قاعدہ کے مطابق بھی یہ روایت باطل اور جھوٹ ہے۔

۴۔ مولانا کی ہی بیان کردہ ایک روایت کے مطابق جب مدینہ کے گورنر حضرت مروانؓ نے حضرت معاویہؓ کی ہدایت پر یزید کے لئے بیعت حاصل کرنے کا اہتمام کیا تو اُنہوں نے اہلِ مدینہ کا ایک اجتماع بلایا جس میں یہ چاروں بزرگ بھی موجود تھے۔ حضرت مروانؓ نے اس اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

امیرالمومنین (معاویہؓ) نے تمہارے لئے مناسب آدمی تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو جانشین بنایا ہے۔ یہ بہت اچھی رائے ہے جو اللہ نے ان کو سجھائی۔

اگر وہ اس کو جانشین مقرر کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی جانشین مقرر کئے تھے۔ اس پر حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ اٹھے اور اُنہوں نے کہا:

جھوٹ بولتے ہو تم اے مروانؓ! اور جھوٹ کہا معاویہؓ نے بھی تم نے ہرگز

---

[۱] ابن الاثیر جلد ۳ صہ ۲۵۰ [۲] خلافت و ملوکیت صہ ۱۵ حاشیہ

اُمتِ محمدیہ کی بھلائی نہیں سوچی ہے، تم اسے قیصریت بنانا چاہتے ہو کر جب ایک قیصر مرا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا آ گیا۔ یہ سنتِ ابوبکرؓ و عمرؓ نہیں ہے انہوں نے اپنی اولاد میں سے کسی کو جانشین نہیں بنایا تھا........

اس مجلس میں حضرت عبدالرحمٰنؓ کی طرح حضرت حسینؓ بن علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی یزید کی ولی عہدی ماننے سے انکار کر دیا[1]

روایت میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام تو محض روایت کو بوجھل بنانے کے لئے شامل کیا گیا ہے ورنہ مولانا کو بھی علم ہے کہ یہ دونوں بزرگ اس تماشہ کے کردار نہیں تھے۔ حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بلاشبہ یزید کی راہ میں مزاحم تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں بزرگ خود اس منصب کے امیدوار تھے۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے تو اپنے عزم کے خاکہ میں حقیقت کا رنگ بھر لیا مگر حسینؓ پوری کوشش کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے۔

اس مرحلہ پر یقیناً حضرت معاویہؓ کے لئے یہی مناسب تھا کہ وہ رفع نزاع کے لئے یزید کے اس درجہ سخت مخالفوں سے ملاقات کریں اور پھر وہ ان بزرگوں سے ان کے گھر جا کر ملے مگر اس طریقہ سے نہیں جو مولانا نے بتایا ہے کیونکہ اگر وہ ان کو طاقتور مخالف سمجھ کر ان سے ملنا چاہتے تھے تو مدینہ میں اُن سے اتنی سختی کیوں روا رکھی کہ وہ ڈر کے مارے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے اور اگر حضرت معاویہؓ کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی تو پھر مکہ پہنچ کر انہیں پذیرائی بخشنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا مکہ میں پہنچ کر اُن کی قوت و سطوت میں کوئی اضافہ ہو گیا تھا جو معاویہؓ ڈر گئے اور مکہ میں داخل ہونے سے بھی پہلے اُن کے بارے میں نکرمندی قبول کر لی اور بقول راوی انہیں مکہ سے باہر

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۵۰ - ۱۵۱

بلا کر بلطائف الحیل اپنے خلوص کا یقین دلایا اور پھر وہیں سے باقاعدہ شہزادے بنا کر اعلیٰ عربی النسل گھوڑوں پر سوار کر کے اپنے ہمراہ لائے۔

یہ پذیرائی اگر ان کے شخصی مقام کی وجہ سے تھی تو یہ شخصی مقام مدینہ میں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ معاویہؓ نے اُس وقت کیوں نہ سوچا کہ وہ غلطی پر ہیں اور اب اُنہوں نے پشیمانی محسوس کی اور اپنی گزشتہ گستاخی کی تلافی مناسب سمجھی۔ اور اگر فی الواقع ہی وہ ان کی شخصی عظمت اور ان کے زبردست رسُوخ کی وجہ سے ان کو ہموار کرنے کی راہ پر چلے تھے تو پھر اُنہیں ان کی شخصیت اور اُن کے رسوخ سے اُس وقت کیوں نہ خوف ہوا جب تلواریں اُن کی گردنوں پر لٹکا دی تھیں اور اُنہیں حکم دیا تھا کہ خبردار جو تم نے میری بات کے جواب میں ہاں یا ناں کی صورت میں بھی زبان کھولی۔

آخر یہ کیسی روایت ہے جو اپنے ہر پہلو سے ہی احمقانہ ہے اور اس پہ یقین کرنے کے لئے آدمی کو پہلے احمق بننا ضروری ہے۔

۵۔ یہ روایت جھوٹ کی پوٹ تو تھی ہی اس کی تخلیق میں حماقت کی بھی بہت بڑی مقدار شامل ہو گئی ہے۔ یہ بات تو بالکل قابل فہم ہے کہ معاویہؓ ان کی گردنوں پر تلوار رکھ کر کہتے کہ خبردار جو تم نے میری بات کی تردید میں زبان کو حرکت بھی دی۔ اور یقیناً بات ایسی ہی تھی کہ معاویہؓ کے لئے کسی کے منہ سے اس کی تردید قابل برداشت نہ تھی۔

آخر معاویہؓ نے بات تو یہی کہی تھی کہ مکہ والو! ان چاروں نے یزید کی بیعت کر لی ہے بس اب تم بھی بیعت کر لو اور ظاہر ہے کہ معاویہؓ اپنی اس بات کی تردید میں کوئی کلمہ برداشت نہیں کر سکتے تھے مگر راوی کی اس احمقانہ سوچ کا کیا جواب ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کی زبان سے یہ الفاظ بھی منسوب کرتا ہے کہ: خبردار جو تم نے میری بات کی تائید میں بھی کوئی حرف کہا۔ آخر اس روایت کا کونسا پہلو ہے جسے قبول کرنے پر مولانا کی ذہانت لائق داد ہے۔

اور اس کا کونسا پہلو ہے جس پر راوی کی فن کاری کی تحسین کی جائے۔

۶۔ آخر میں ایک خاص بات خاص توجہ کے ہی لائق ہے کہ حضرت مولانا مودودی صاحب نے جن بزرگوں کے کندھے پر بندوق رکھ کر حضرت معاویہؓ پر چلائی ہے انہوں نے ان کا بھی کچھ نہیں چھوڑا۔

بظاہر تو مولانا نے اس روایت کا انتخاب فرما کر معاویہؓ کو ظالم، بے انصاف اور دھاندلی باز ظاہر کرنے کا تاثر دیا ہے مگر وہ جن بزرگوں کو "دنیائے اسلام کی با اثر شخصیتیں" قرار دے کر حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہ کرنے والے بیس اصحابِ رسولؐ سے بھی زیادہ بھاری بھر کم بناتے ہیں کیونکہ ان بیس اصحاب کے علیؓ کی بیعت نہ کرنے کے باوجود علیؓ کی خلافت منعقد ہو گئی تھی۔ مگر ان اصحاب کے بیٹوں میں سے صرف دو نوجوانوں یعنی حسینؓ ابن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے جب یزید کی بیعت سے انکار کر دیا تو یزید کی خلافت کا بنا بنایا کام چوپٹ ہو گیا۔ علیؓ بیس اصحابِ رسولؐ کے انکار کے باوجود خلیفہ بن گئے مگر یزید صرف اپنے دو حریفوں کے انکار سے ولیعہد تک نہ بن سکا۔

تو یہ مدینہ منورہ کی بڑی شخصیتیں جو سارے عالمِ اسلام پر بھاری تھیں اور جن کی وجہ سے مدینۂ رسولؐ کی عظمت قائم تھی جب ان کا معاویہؓ سے معاملہ پڑا تو اُن کی عظمت، اُن کی جلالتِ قدر اور اُن کی قوتِ ایمانی کوئی چیز بھی انہیں اپنے مقام کا احساس نہ دلا سکی۔ جب حضرت معاویہؓ نے انہیں کہا کہ:

اگر تم میں سے کسی نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی کہا تو دوسری بات اس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی تلوار اس کی گردن پر پہلے پڑ چکی ہو گی۔

یہاں تک تو خبر تھی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ معاویہؓ کوئی کلمۂ حق اپنی زبان سے نکالیں اور ظاہر ہے کہ کلمۂ حق کا انکار قتل کا موجب بن سکتا ہے۔ مگر جب بر سرِ مجلس

حضرت معاویہؓ نے اہلِ مکہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ چاروں بزرگ (عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور حسینؓ بن علیؓ) جو آپ حضرات کے سامنے بیٹھے ہیں)، یزید کی ولیعہدی پر راضی ہیں اور انہوں نے اُس کی بیعت کر لی ہے لہ

اور پھر حضرت مولانا مودودی صاحب یہ بیان کرتے کچھ شرما ہی گئے ہیں کہ معاویہؓ کے اس جھوٹ بیان کے بعد ان بزرگوں میں سے کوئی بھی حق گوئی کی جرأت نہ کر سکا اور سب نے ہی اپنی خاموشی سے معاویہؓ کی تصدیق کی۔ اس طرح انہوں نے اگرچہ اپنی جان بچا لی مگر عالمِ اسلام کو ایک سخت ابتلا کے سپرد کر دیا، سبحان اللہ کیا سچ ہے ؏

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

تلوار محض افسانہ ہے

مولانا مودودی صاحب نے اپنی نقل کردہ روایت کے مطابق جن دو محض مفروضہ (اور دو فی الواقع موجود) بزرگوں کے سروں پر تلواریں لٹکتی دکھائی ہیں، یہ محض افسانہ ہی ہے اس کی اصلیت کچھ نہیں ہے۔

اس بات کو حضرت مولانا کی معاویہؓ نوازی ہی سمجھیے کہ وہ اُن کے لئے سخت محنت کے ساتھ ایسے ایسے عجوبے دریافت کر لیتے ہیں ورنہ اس واقعہ کو دوسرے بہت سے مورخین نے بھی بیان کیا ہے مگر اُن کی قسمت مولانا جیسی رسا نہیں ہو سکی یا پھر یوں سمجھ لیجئے کہ یہ جھوٹ اُن کے ہاں پذیرائی حاصل نہیں کر سکا۔ مورخ اکبر شاہ خاں لکھتے ہیں:

(حضرت معاویہؓ مدینہ سے فراغت پا کر) مکہ کی طرف روانہ ہوئے

لہ خلافت وملوکیت صہ ۱۵۳

وہاں مذکورہ بالا چاروں حضرات کو اپنے پاس بلایا اور یزید کی بیعت کے معاملہ میں گفتگو کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا...... تمہارے بعد جس شخص کی خلافت پر لوگ متفق ہو جائیں گے میں اسے خلیفہ تسلیم کر لوں گا...... عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا...... آپ یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح خلافت کا معاملہ مسلمانوں پر چھوڑ دیں...... یا ابوبکرؓ کی طرح ایسے شخص کو نامزد کر جائیں جو نہ آپ کی قوم کا ہو نہ آپ کے خاندان کا...... یا سنت فاروقی کے مطابق چھ آدمیوں کو نامزد کر جائیں جو نہ آپ کے قبیلہ کے ہوں نہ ان میں آپ کا بیٹا ہو...... باقی سب نے بھی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی باتوں کی تائید کی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے حج سے فارغ ہو کر مذکورہ حضرات کے سوا تمام اہل مکہ سے یزید کی ولیعہدی کے متعلق بیعت لی [۱]

مزید لکھتے ہیں:

۵۶ ہجری میں یزید کی ولیعہدی کے لئے تمام عالم اسلام میں عاملوں کی معرفت بیعت عام لی گئی صرف تین چار اشخاص یعنی عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ وغیرہ نے بیعت نہیں کی۔ ان لوگوں کو حضرت معاویہؓ نے ان کے حال پر چھوڑ دیا [۲]

اب دیکھئے کتنی صاف ستھری اور نہائی نکھری بات ہے، نہ کوئی ہنگامہ نہ دھکم پیل، نہ جبر و استبداد، نہ درشتی و گرمی، نہ جلادوں کا اجتماع نہ تلواروں کی نمائش، از اوّل "تا آخر بڑی سیدھی بات ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ بن علیؓ (اور بقول مولانا کے راویوں کے دو اور بزرگوں) سے یزید کی بیعت کے لئے کہا مگر انہوں نے اس کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور بات اسی پر ختم ہو گئی حضرت

---

[۱] تاریخ اسلام اکبر شاہ خان جلد ۲ صد ۴۱ [۲] ایضاً جلد ۲ صد ۴۳

معاویہؓ نے بھی بات کو آگے بڑھانا پسند نہ کیا، اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر دوسرے سب لوگوں سے بیعت حاصل کرلی اور پھر دوبارہ ان بزرگوں سے رابطہ پیدا کرنا بھی مناسب نہ سمجھا اور معاملہ اللہ کے سپرد کردیا۔ مگر مولانا ہیں کہ انہیں اس روایت میں کوئی مزہ نہیں آیا۔ انہوں نے اپنی معاویہؓ آزاری کی تسکین کے لئے ایسی روایت تلاش کی ہے جو انہیں پس مرگ بھی مسرور رکھے۔ حضرت علامہ جلال الدین سیوطیؒ کو بھی حضرت معاویہؓ سے وہی تعلق خاطر ہے جو حضرت مولانا مودودی کو ہے بلکہ وہ اس باب میں مولانا سے چار قدم آگے ہی ہیں اور تعجب ہے کہ انہیں بھی حضرت معاویہؓ کی یہ دھاندلی تاریخ کے ذخیرہ میں کہیں دریافت نہیں ہوسکی۔

حضرت سیوطی کا بیان مولانا کے بیان سے بالکل اُلٹ ہے۔ سیوطی کی روایت کے مطابق ان بزرگوں نے دورانِ گفتگو حضرت معاویہؓ کے ساتھ بہت سختی کی اور سخت سست کلمات کہے جبکہ حضرت معاویہؓ معاملہ کو اپنی حوصلہ مندی سے ٹالتے رہے، سیوطی لکھتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا "معاویہؓ! پہلے خلیفوں کے بھی بیٹے موجود تھے، تمہارا بیٹا اُن کے بیٹوں سے بہتر نہیں ہے۔ اُنہوں نے اپنے بیٹوں کو ولیعہد نہیں بنایا تھا۔۔۔۔ یہ کہہ کر ابن عمرؓ اُٹھ کر چلے گئے۔

پھر حضرت معاویہؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کو بلا کر یزید کی بیعت کے لئے کہا تو اُنہوں نے کہا تم سمجھتے ہو گے کہ ہم نے اس معاملہ میں تمہیں اپنا وکیل بنا لیا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ہم شوریٰ کا فیصلہ چاہتے ہیں کسی دھوکہ میں نہیں پڑنا چاہتے اور یہ بات کر کے آپ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر حضرت معاویہؓ نے اُن سے کہا سختی اور درشتی سے کام نہ لو ذرا نرمی روا رکھو، مجھے خوف ہے کہ تمہاری باتیں سُن کر اہل شام

کچھ کر نہ بیٹھیں۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو بلایا اور اُن سے عرض مطلب کیا۔ انہوں نے جواب دیا اگر آپ خلافت سے ایسے ہی بیزار ہو گئے تو اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے، ایسی ہی چند سخت سُست باتیں کہہ کر آپ بھی اُٹھ بیٹھے اور بات ختم کر دی۔

اس کے بعد حضرت معاویہؓ منبر پر بیٹھے اور حمد و نعت کے بعد فرمایا میں نے بعض کج رو لوگوں کی باتوں کو سُنا ہے وہ کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ، ابن ابوبکرؓ اور ابن زبیرؓ یزید کی بیعت کبھی نہیں کریں گے۔ حالانکہ انہوں نے بیعت کر لی ہے۔ اس پر اہل شام نے کہا جب تک وہ ہمارے سامنے بیعت نہیں کریں گے ہم نہیں مانیں گے۔ مزید کہا کہ اگر انہوں نے سب کے سامنے بیعت نہ کی تو ہم ان تینوں کی گردن اُڑا دیں گے۔ اس پر معاویہؓ نے (سخت غصہ اور رنجیدگی سے) فرمایا۔ سبحان اللہ! قریش کی شان میں ایسی گستاخی! واللہ! آج کے بعد میں تمہارے منہ سے کبھی ایسی بات نہ سُنوں [1]

ہمارے قارئین حضرت سیوطی کے اُس ڈنک پر دھیان نہ دیں جو اُنہوں نے اپنے راوی کے ذریعہ حضرت معاویہؓ کو جھوٹ سے ملوث کرنے کی صورت میں چلایا ہے۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ اہل شام نے معاویہؓ کے سامنے ابن عمرؓ، ابن ابی بکرؓ اور ابن زبیرؓ کی شان میں کچھ بے ادبی کے کلمات کہے تو وہ جوشِ غضب سے بے تاب ہو گئے اور انہوں نے اہل شام کو اس پر سخت انتباہ کیا۔ پھر کوئی بتائے کہ جو شخص اُن کے بارے میں دوسروں کے نازیبا کلمات کو برداشت نہیں کرتا وہ خود اُن کی تذلیل اور توہین پر کیونکر آمادہ ہو گا!

---

[1] تاریخ الخلفاء، سیوطی مُلخّص صہ ۲۱۵ – ۲۱۷

اصل دھاندلی یہ ہے

مولانا مودودی صاحب کو حضرت معاویہؓ کی ہر ہر سانس میں ایک دھاندلی چھپی نظر آتی ہے مگر شاید ان کی توجہ اپنی اس عظیم دھاندلی کی طرف کبھی نہیں جا سکی جو انہوں نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی ایک نہایت درجہ نیک اندیشی کو ان کی سخت ترمجرمانہ کارروائی بنا کر ان کی ذات سے روا رکھی۔ مولانا لکھتے ہیں:

(یزید کو ولیعہد بنانے کی) اس تجویز کی ابتداء حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی طرف سے ہوئی۔ حضرت معاویہؓ انہیں کوفہ کی گورنری سے معزول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، انہیں اس کی خبر مل گئی فوراً کوفہ سے دمشق پہنچے اور یزید سے مل کر کہا کہ صحابہ کے اکابر اور قریش کے بڑے لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر المومنین تمہارے لئے بیعت لے لینے میں تامل کیوں کر رہے ہیں[1]

مولانا اس روایت کو نقل کر کے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

یزید کی ولیعہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہؓ) نے اپنے ذاتی مفاد (یعنی اپنی گورنری کو بچانے) کے لئے دوسرے بزرگ (حضرت معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں بزرگوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس طرح امت محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں[2]

حالانکہ مولانا نے جس روایت کی بنیاد پر حضرت مغیرہؓ کو مفاد پرست اور خود غرض بنا کر پیش کیا ہے اسی روایت کے بموجب حضرت مغیرہ کی اس تحریک یا تجویز کی مصلحت وہ خود اپنے قلم سے ہی بتا چکے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے جب حضرت مغیرہؓ سے اس تحریک کا سبب پوچھا تو حضرت مغیرہؓ نے فرمایا:

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۴۸ [2] ایضاً صفحہ ۱۵۰

امیر المومنین! آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتلِ عثمانؓ کے بعد کیسے کیسے اختلافات اور خون خرابے ہوئے۔ اب بہتر یہ ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کر کے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف برپا نہ ہو۔[۱]

اس پر بھی اگر حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی یہ تحریک ان کے ذاتی مفاد کا ہی حصہ ہے تو اسے پھر مولانا کی بزرگی کے کھاتے میں ہی شمار کر لینے کی مجبوری ہے۔

یہاں ایک مولانا مودودی پر ہی کیا منحصر ہے بات کے اس مرحلہ پر بہت سے لوگوں نے مغیرہ آزاری کا ثواب حاصل کیا ہے اور ثواب حاصل کرنے کی اس مہم میں ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ ایک تیکھی سی روایت آپ بھی سن لیجئے۔

حضرت امیر معاویہؓ نے مغیرہؓ بن شعبہ حاکم کوفہ کو لکھا کہ تم میرا یہ خط پڑھتے ہی اپنے آپ کو معزول سمجھو۔ مگر یہ خط جب مغیرہؓ کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس کی تعمیل میں دیر کر دی تو پھر (کچھ عرصہ بعد) جب وہ امیر معاویہؓ کے پاس گئے تو انہوں نے تعمیلِ حکم میں دیر کرنے کی وجہ دریافت کی۔ مغیرہؓ نے کہا دیر کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک خاص کام کی تیاری میں مصروف تھا۔ امیر معاویہؓ نے پوچھا وہ کام کیا تھا؟ مغیرہؓ نے کہا میں لوگوں سے تمہارے بیٹے یزید کی آئندہ خلافت کے لئے بیعت لے رہا تھا۔

امیر معاویہؓ یہ سن کر خوش ہو گئے اور انہوں نے مغیرہ کو پھر بحال کر کے کوفہ کی طرف روانہ کر دیا۔ جب وہ دمشق سے کوفہ واپس آئے تو کوفہ والوں نے پوچھا، کہئے وہاں جا کر کیا گزری؟

انہوں نے جواب دیا میں معاویہؓ کو ایسی دلدل میں پھنسا آیا ہوں کہ وہ اس سے قیامت تک نہیں نکل سکتا۔[۲]

اب جہاں تک حضرت مغیرہؓ پر مولانا کی اس نوازش کا تعلق ہے کہ انہوں نے

---

[۱] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۴۹ [۲] تاریخ اسلام اکبر شاہ خان جلد ۲ صفحہ ۳۶، تاریخ الخلفا سیوطی صفحہ ۲۰۴

یزید کی ولی عہدی کی تحریک کسی نیک جذبے سے شروع نہیں کی تھی۔
تو یہ معاملہ اب اللہ کے سپرد ہے۔ نیتوں کا جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی
ہے۔ اگر حضرت مغیرہؓ کا یہ اظہار بھی مولانا کے لئے کافی نہیں ہے جو انہوں نے
یزید کی ولیعہدی کی تجویز پیش کرتے حضرت معاویہؓ کے حضور پیش کیا کہ:
میں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے دردناک حادثہ سے لے کر اب تک
کے خونیں واقعات کو اپنی آنکھوں دیکھا ہے اور خدانہ کردہ اگر آپ کے بعد
بھی مسلمانوں میں اختلاف نے راہ پائی تو ملت ایک بار پھر دردناکیوں میں ڈوب
جائے گی اور خدا جانے پھر اس کا انجام کیا ہو۔ اس لئے آپ اپنی زندگی میں
ہی اپنے بعد آنے والے خلیفہ کے بارے میں فیصلہ کر جائیں۔

اور پھر اس باب میں حضرت مغیرہؓ نے متنقبل کے خلیفہ کے لئے جناب
یزید کا نام پیش کیا کیونکہ ان کے نزدیک ملک کے سیاسی حالات میں معاویہؓ کے
بعد یزید کی جانشینی ہی اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید تھی اور اگر مولانا کے نزدیک
یہ ساری کہانی حضرت مغیرہؓ کی خود غرضی کے گرد ہی گھومتی ہے تو وہ اپنے اِس
موقف کے صحیح یا غلط ہونے کے فیصلہ کے لئے تھوڑا انتظار کر لیں۔ بقول شاعر ؎

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

لیکن جہاں تک مولانا کے اس حاصلِ مطالعہ کا تعلق ہے کہ حضرت معاویہؓ نے
کسی وجہ سے کوفہ کی گورنری سے حضرت مغیرہؓ کو معزول کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
مغیرہؓ کو حضرت معاویہؓ کے اس ارادہ کی اطلاع ہو گئی تو انہوں نے اپنی گورنری
کو بچانے کے لئے یہ چال چلی اور حضرت معاویہؓ کو خوش کر کے اپنی نوکری بچا
لی تو مولانا کے راوی کی اس غلط بیانی کے سلسلہ میں ہم مشہور مورخ حضرت
ابن خلدون کو واقعہ کی صراحت کے لئے زحمت دیتے ہیں۔ ابن خلدون لکھتے ہیں:
طبری نے بسند صحیح تحریر کیا ہے کہ مغیرہؓ بن شعبہ حضرت امیر معاویہؓ کی

خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی علالت اور جسمانی نقاہت کے عذر سے اپنی منصبی خدمات کو جاری رکھ سکنے سے معذرت پیش کی۔ مغیرہ نے اپنی سبکدوشی کی درخواست کرتے ہوئے اپنے منصب سے استعفےٰ حضرت معاویہؓ کے حضور پیش کیا۔ جسے اگرچہ حضرت مغیرہؓ کی خواہش کے مطابق قبول کر لیا گیا اور حضرت معاویہؓ نے ان کی جگہ حضرت سعیدؓ بن العاص کے تقرر کا فیصلہ بھی کر لیا تاہم وہ حضرت مغیرہؓ پر اپنا استعفےٰ واپس لینے پر زور دیتے رہے مگر حضرت مغیرہؓ مزید عرصہ کے لئے خدمت سے انکار کرتے رہے۔

آخر ایک مصلحت سے حضرت مغیرہؓ کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ اتفاق سے (بعض لوگوں کی شرارت سے) یہ بات شہرت پا گئی کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کو معزول کر دیا ہے اس پر احباب کے توجہ دلانے سے حضرت مغیرہؓ نے لوگوں کے اس تاثر کو دُور کرنے کے لئے استعفےٰ واپس لے لیا اور اپنے عہدہ پر واپس کوفہ تشریف لے گئے [1]

بنا بریں مولانا کا راوی جھوٹا ہے، کذاب ہے، مفتری ہے۔ نہ معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کو معزول کیا، نہ اُس کو کوئی ایسا خطرہ درپیش تھا، وہ ایک خدمت پر مامور تھے اور اس کی سرانجام دہی کرتے تھے، وہ منصب کے لئے حریص بھی نہیں تھے اور نہ ان کی تجویز کا پس منظر ہی یہ تھا جسے کذاب راویوں نے تصنیف کر کے مولانا کے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ انہوں نے پورے اخلاص سے ایک تجویز کو ملک و ملّت اور اسلام کے لئے مفید سمجھا اور اُسے پیش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص میں برکت دی اور وہ مستقبل میں تشکیل پانے والے جمل اور صفین کے میدانوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ باقی رہی مولانا اور ان کے دوسرے ہمنواؤں کی یہ دریافت کہ مغیرہؓ جب کوفہ واپس پہنچے تو لوگوں نے پوچھا سناؤ وہاں کیسے گزری تو حضرت

---

[1] ابن خلدون جلد دوم صـ۵۲

مغیرہؓ نے فرمایا میں معاویہؓ کو ایک ایسی دلدل میں پھنسا آیا ہوں جس سے وہ قیامت تک نہیں نکل سکتا۔

تو یہ کہانی اپنے جھوٹ ہونے کا اپنی زبان سے ہی اعلان کر رہی ہے۔ اس کہانی کو بنانے والا تو احمق ہے ہی اس کو صحیح سمجھنے والا اس سے بڑھ کر احمق ہے۔ کیونکہ مغیرہ جو صرف معاویہؓ کے اس عزم کی خبر پا کر ہی لرزہ براندام تھے کہ معاویہؓ انہیں معزول کرنے والے ہیں اور پھر انہوں نے معاویہؓ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لئے طرح طرح کے حیلوں سے کام نکالا اور بمشکل تمام اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ وہ سر دربار یہ بات کیونکر کہہ سکتے تھے کہ میں معاویہؓ کو ایک دلدل کے سپرد کر آیا ہوں۔

فاروق اعظمؓ کے بعد معاویہؓ واحد حکمران تھے جو اپنی حکومت کے ہر گوشہ سے باخبر رہتے تھے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ مملکت کے اندر کہیں کوئی پتہ بھی گرے مگر معاویہؓ تک وہ خبر نہ پہنچے، کسی کے لبوں پر کوئی کلمہ اُچھلے اور وہ معاویہؓ کے کانوں تک نہ پہنچے۔ ایسے میں مغیرہؓ جو ایک مشکل سے بمشکل بچ سکے تھے اپنی ہلاکت کا سامان بھلا کیوں کرتے، حضرت مغیرہؓ اُن عقلاء میں داخل تھے جن کی عقل ضرب المثل تھی [1]

تو یہ بھلا عقل کی کونسی بات تھی جو بے عقل راوی نے اُن سے منسوب کی ہے۔

دھن کی دھونس

یزید کی ولیعہدی کی بیعت کے سلسلہ میں مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کی چند دھاندلیوں کا ذکر کیا ہے ان میں ایک دھاندلی حضرت معاویہؓ کی رشوت ستانی کا معمول بھی ہے، اور اس بات کے ثبوت

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی

میں اُنہوں نے ابن اثیر وغیرہ سے ایک روایت بھی نقل کی ہے، لکھتے ہیں:

زیاد کی وفات (۵۳ھ) کے بعد حضرت معاویہؓ نے یزید کو ولیعہد بنانے کا فیصلہ کر لیا اور با اثر لوگوں کی رائے ہموار کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس سلسلے میں انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ایک لاکھ درہم بھیجے[1]

یزید کی بیعت کے لئے مولانا نے حضرت معاویہؓ کی سنگین کارروائیوں کا ذکر بڑے زوردار الفاظ میں کیا تھا جب فرمایا:

"اپنے بیٹے کی ولیعہدی کے لئے خوف و طمع کے ذرائع سے انہوں نے اس (یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی طرف لوٹ سکنے) کے امکان کا بھی خاتمہ کر دیا"

لیکن جب انہوں نے اپنے اس سنگین الزام کا ثبوت پیش کیا تو بات کچھ ایسی ہی نکلی کہ:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

مولانا نے اس باب میں جس روایت کا سہارا لیا ہے وہ اس لئے جھوٹ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ یزید کی بیعت یا اس کی خلافت کے سلسلہ میں نہ کوئی روک تھے نہ رکاوٹ، نہ مزاحم تھے نہ مخالف۔ اس لئے انہیں ہموار کرنے کے لئے کسی رقم کے بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بیعت کا واقعہ تو بڑی وضاحت سے حدیث میں آچکا ہے اس باب میں تو ہمیں کسی تاریخی روایت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حضرت معاویہؓ جب یزید کی بیعت کے سلسلہ میں مدینہ منورہ پہنچے اور لوگوں سے یزید کی ولیعہدی کی بیعت کے لئے اپیل کی تو جن لوگوں نے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر یزید کے لئے اپنی بیعت پیش کی ان میں

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۵۰

عبداللہ بن عمرؓ بھی شامل تھے اور انہوں نے روایت کے مطابق سب کے سامنے مسجد نبویؐ میں سرِعام حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر یزید کے لئے بیعت کی۔[۱]

اب جہاں تک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو کسی رقم کے بھیجنے کا تعلق ہے اُسے رشوت بنا کر عبداللہؓ کے اس رقم کو قبول کرنے سے انکار کی کہانی حدیث کے مقابلہ میں کیونکر قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو معاویہؓ کا کوئی رقم بھیجنا بھی کوئی امر مستبعد نہیں۔ معاویہؓ اُمت کے تمام ہی علماء و صلحا کے نام رقوم بھیجتے تھے اور وہ اُمت کے ان بہترین افراد کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے تھے اور ایک عبداللہ بن عمرؓ پر ہی کیا موقوف ہے۔ معاویہؓ کے خزانہ سے تو عبداللہ بن عباسؓ بھی وظیفہ پاتے تھے، حضرت حسنؓ بھی اُن سے ہر ماہ رقم حاصل کرتے تھے، حضرت حسینؓ بھی انہی سے لے کر کھاتے تھے، حضرت جعفر طیار کی ساری اولاد اُن کے خزانہ سے کھاتی تھی، حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی عقیل ان کے دسترخوان پر پلتے تھے، عبداللہ بن عمرؓ کے نام بھیجی گئی رقم تو حضرت مولانا مودودی کو رشوت بن کر نظر آ گئی ہے، دوسروں کے نام رقوم کے ہجوم مولانا کو رشوت کیوں نہیں معلوم ہوئے اور عبداللہؓ کی رقم کو بیعتِ یزید کی رشوت سے جوڑنے کی مصلحت تو بالکل ظاہر ہے مگر یہ بنائے باطل علی الباطل کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

یزید اور اُس کا کردار

بات کے شروع میں ہم نے مولانا مودودی صاحب کے بیانات میں دو قابلِ جواب باتوں کی نشاندہی کی تھی:

[۱] بخاری شریف کتاب الفتن

پہلی بات یزید کو ولیعہد بنانے میں حضرت معاویہؓ کی ناروا اور طمع بھری دھاندلیوں کے ذکر پر مشتمل تھی اور اس سلسلہ کی گزارشات ہم گزشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔

دوسری بات یزید کی بدکردار زندگی کے ذکر پر مشتمل تھی۔ جس کی وجہ سے وہ مولانا کے نزدیک اس لائق نہیں تھا کہ اُسے اُمّت کی سربراہی کے لئے منتخب کیا جاتا اور پیشِ نظر سطور میں ہماری گزارشات کا محور یہی امر ہے۔

یزید کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کا موقف ہم ایک بار پھر نہایت اختصار کے ساتھ اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دینا چاہتے ہیں تاکہ بات کو قریب سے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ مولانا مودودی کا کہنا ہے کہ:

یزید بجائے خود اس مرتبے کا آدمی کا نہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کا بیٹا ہونے سے قطع نظر کوئی شخص یہ رائے قائم کرتا کہ حضرت معاویہؓ کے بعد اُمّت کی سربراہی کے لئے وہ موزوں ترین آدمی ہے[1]

حضرت معاویہؓ اور اُن کی اس کاروائی کی مذمت کے لئے مولانا کا یہی ارشاد کفایت کرتا تھا کہ اُنہوں نے اپنے نالائق بیٹے کو نہایت درجہ نالائق سوچ کے ساتھ اُمّت پر مسلط کر دیا۔ مگر مولانا اتنے پر مطمئن نہیں ہیں اس لئے رہی سہی کسر نکالنے کے لئے اُنہوں نے سبائیت کے کارخانہ میں ڈھلی ہوئی ایک روایت حضرت حسن بصری کے نام سے نقل کرنا پسند کی کہ:

حضرت معاویہؓ کو ہلاک کرنے والی باتوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنایا' حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا ریشم پہنتا تھا اور طنبورے بجاتا تھا[2]

حضرت معاویہؓ کی دھاندلی اور یزید کی بدکرداریوں کی روایات کو

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ۱۵۰ [2] ایضاً صـ۱۶۶

مزید معتبر بنانے کے لئے مولانا کی یزید دشمنی نے یہاں ایک اور کروٹ لی ہے جب اُنہوں نے یہ فرما کر اپنی صاف دلی کا ثبوت مہیا کرنے کی سعی کی کہ مورخین کا بیان ہے کہ اس کے بعد یزید نے اپنے بہت سے اُن اعمال کی اصلاح کر لی جو قابلِ اعتراض تھے [۱]

مگر مولانا کی یہ انصاف پسندی بھی دراصل یزید کو ہمیشہ گناہوں میں ملوث اور شراب میں دھت ثابت کرنے کی ہی ایک کڑی ہے کیونکہ مولانا کے نزدیک یزید کی یہ احتیاط لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے تھی ورنہ وہ خود وہی کچھ تھا جو اُسے مولانا مودودی سمجھتے ہیں۔ ہماری یہ گزارش محض قیاس یا محض مولانا کے رجحان کا قرینہ ہی نہیں ہے بلکہ مولانا نے پوری صفائی سے ہی اپنے اس اعتراف کا پس منظر خود بیان کر رکھا ہے جب مولانا نے خبر دی کہ:

حضرت معاویہؓ نے بصرے کے گورنر زیاد کو لکھا کہ (میں یزید کو ولیعہد مقرر کر رہا ہوں) اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے اُس نے عبید بن کعب النُّمَیْرِی کو بلا کر کہا کہ امیر المومنین نے مجھے اس معاملہ میں لکھا ہے اور میرے نزدیک یزید میں یہ کمزوریاں ہیں ۔۔۔۔۔ عبید نے کہا آپ حضرت معاویہؓ کی رائے خراب کرنے کی کوشش نہ کیجیے، میں جا کر یزید سے کہتا ہوں کہ امیر المومنین نے (تمہاری جانشینی) کے معاملہ میں امیر زیاد کا مشورہ طلب کیا ہے اور اُن کا خیال ہے کہ لوگ اس تجویز کی مخالفت کریں گے۔ کیونکہ تمہارے بعض طور طریقے لوگوں کو ناپسند ہیں اس لئے امیر زیاد تم کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم ان چیزوں کی اصلاح کر لو تاکہ معاملہ ٹھیک بن جائے [۲]

---

[۱] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۵۱ سطر اوّل

[۲] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۴۹

ایک اور جھوٹ کہانی

جناب یزید کی کردار کشی کرتے مولانا نے ایک اور نہایت درجہ جھوٹ اور لغو کہانی بیان کی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مجلس میں ایک مرتبہ ایک شخص نے یزید کا ذکر کرتے ہوئے امیرالمومنین یزید کے الفاظ استعمال کئے تو سخت ناراض ہو کر اُنہوں نے فرمایا۔ تو یزید کو امیرالمومنین کہتا ہے! اور اُسے بیس کوڑے لگوائے[۱]

غریب یزید تو پہلے ہی بہت بدنام ہے اور اس پر جہاں مولانا نے اور بہت سی عنایات فرما رکھی ہیں وہاں ایک جھوٹ یہ بھی سہی۔ اس کی طرف سے تو مولانا کی محبت کے جواب میں یہی کہہ دینا کافی ہو گا کہ ؎

تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جاں یہ جگر کس کا ہے

مگر یزید کے خلاف اپنے دل کا غبار ہلکا کر کے مولانا نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی سیرت کا جو بھیانک رُخ پیش کیا ہے اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی روح ضرور تڑپ گئی ہو گی۔ اللہ اکبر ؎

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

عمر بن عبدالعزیزؒ کی روح بھی مولانا سے کہتی ہو گی ؎

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

---

[۱] خلافت و ملوکیت صـ ۱۸۳ حاشیہ

اب قارئین ہی فرمائیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جیسے معقول انسان، صاحبِ فکر و نظر مومن فاتن سے یہ حقیقت کیونکر پوشیدہ ہو سکتی تھی کہ یزید کو امیر بنانے والے لوگوں میں ایک بڑی تعداد اصحابِ رسولؐ کی بھی تھی اور دو ایک خلافت کے دعویداروں کے سوائے یزید کی امارت پر پوری مملکتِ اسلامیہ میں کسی ایک مسلمان کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ پھر جسے سب مسلمان اپنا امیر بنائیں وہ امیر المومنین نہیں تو اور کون ہے؟

عمر بن عبد العزیزؒ ایسی بے سمجھی کی بات کیونکر کر سکتے تھے! اس پر مستزاد یہ کہ مولانا کے راوی نے اُنہیں اتنا جلد باز، بے حوصلہ اور چھچھورا بھی ظاہر کیا ہے کہ اُنہوں نے چھوٹتے ہی یزید کے لئے امیر المومنین کے الفاظ کہنے والے کو بیس کوڑوں کی سزا بھی دے ڈالی۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ جبکہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی حوصلہ مندی، ان کی بُردباری، ان کی متانت اور ان کی باریک بینی کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

پھر مولانا کے راوی نے اُنہیں دین اور اس کے ضوابط سے اس درجہ بے خبر ظاہر کیا کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کوڑوں کی سزا بھی اپنے لئے کسی شرعی دلیل کی متقاضی ہے جبکہ اس شخص کا یہ جرم ایسا نہ تھا کہ کوڑوں کی مار سے اس کی کھال اُدھیڑ دی جاتی۔

مولانا کو یزید کے لئے ایک گالی تصنیف کرنا تھی بہانہ پا یا اور اُسے گالی دیدی۔ عمر بن عبد العزیزؒ کا کچھ رہے یا نہ رہے مولانا کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولانا نے یہ کہانی حضرت ابن حجرؒ کی "تہذیب" کے حوالہ سے نقل کی ہے اور یہ بات قابلِ تسلیم نہیں کہ مولانا یہ نہ جانتے ہوں کہ ابن حجرؒ نے یزید اور عمر بن عبد العزیزؒ کے تعلقات کے بارے میں کیا شہادت دے رکھی ہے کیونکہ آل ابی سفیان کو بدنام کرنے کے باب میں مولانا نے جتنی محنت

کی ہے شاید اتنی محنت انہوں نے اپنی تفسیر کو ترتیب دینے میں بھی نہ کی ہو۔ ابن حجرؒ نے یہ روایت نقل کرتے اس کے راویوں میں یحییٰ بن عبدالملک اور نوفل بن ابی عقرب دو ایسے راویوں کا ذکر کیا ہے جو مجہول الحال ہیں اور کوئی نہیں جانتا یہ کون لوگ ہیں اور یہاں کیسے گھس آئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مجہول الحال راویوں کی موجودگی ہی اس کہانی کے جھوٹ ہونے کے لئے کافی ہے۔ جبکہ حضرت ابن حجرؒ نے ایک نہایت ہی ثقہ راوی[1] جناب ابو عبدالرحمٰن بن عبداللہ شوذب خراسانی کے حوالہ سے جناب یزید کے حق میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے یہ خبر دی ہے کہ:

قال ابن شوذب سمعت ابراھیم عن ابی عبد یقول سمعت عمر بن عبدالعزیز یترحم علی یزید بن معاویہ۔ یعنی میں نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو یزید کے لئے رحمۃ اللہ علیہ کہتے سنا ہے[2]

پس ہم مولانا کی اس دریافت کو اُن کی یزید دشمنی ہی کہہ سکتے ہیں اس کے سوائے اس کہانی کا کوئی مصرف نہیں ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

مولانا مودودی، اُن کے ہمنواؤں اور اُن کے خاص راویوں کو اُن کے حال پر چھوڑ کر یہاں ہم دوسرے ذرائع سے یزید کی شخصیت، اس کی سیرت اور اس کی زندگی کے لیل و نہار کا جائزہ پیش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے قارئین یزید کی تصویر کے دوسرے رُخ سے بھی متعارف ہو جائیں تاکہ انہیں کسی صحیح فیصلہ پر پہنچنے میں آسانی ہو۔

---

[1] ابن حبان، نسائی [2] لسان المیزان ابن حجر جلد ۶ صفحہ ۲۹۴

یزید بن معاویہؓ نگاہِ رسالتؐ میں

بخاری شریف کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز دوپہر کو اپنی رضاعی خالہ اُمِ حرام کے ہاں استراحت فرما تھے کہ آپ نے مستقبل میں اسلام اور مسلمانوں کی جلالتِ قدر کے زیرِ عنوان تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دو نہایت خوبصورت اور ایمان افروز خواب دیکھے۔

حضرت اُمِ حرام فرماتی ہیں کہ آپ سوتے سوتے اچانک بیدار ہوئے اور میں نے دیکھا کہ آپ فرطِ مسرت سے مسکرا رہے تھے۔ میں نے اس مسرت کا سبب دریافت کیا تو فرمایا:

میں نے اپنی اُمت کے کچھ لوگوں کو سمندر کی موجوں پر یوں سوار دیکھا ہے جیسے بادشاہ تختوں پر بیٹھے ہوں۔ یہ لوگ جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے نکلے ہیں اور فرمایا کہ قَدْ اَوْجَبُوْا کہ اللہ نے اُن پر جنت واجب کردی۔

اس کے بعد آپ پھر سو گئے اور چند لمحوں کے بعد پھر پہلے کی طرح ہی مسکراتے اُٹھے۔ اُمِ حرام کہتی ہیں کہ میں نے پھر پوچھا کہ اس دوسری مسرت کا کیا سبب ہے فرمایا:

اَوَّلُ جَیْشٍ مِّنْ اُمَّتِیْ یَغْزُوْنَ مَدِیْنَۃَ قَیْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَّھُمْ[1]

یعنی اس بار آپ نے قیصر روم کے دار السلطنت پر مسلمانوں کے بحری لشکر کو حملہ کرتے پایا اور فرمایا کہ یہ پہلا بحری لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ آور ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کا پہلے ہی فیصلہ کردیا ہے۔ اور اس لشکر میں شامل ہونے والے سب لوگ ہی جنتی ہیں۔

واضح رہے کہ دشمنانِ اسلام پر بحری راستوں سے حملے اور جہاد حضرت

---

[1] بخاری شریف جلد ۲ پ ۱۱ کتاب الجہاد باب ما قیل فی قتال الروم حدیث نمبر ۱۸۵

امیر المومنین معاویہؓ کے اہتمام میں اور انہی کے حکم سے جاری ہوئے ہیں چنانچہ حضرت امام بخاریؒ مندرجہ صدر احادیث کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فَرَكِبَتِ الْبَحْرَ فِي زَمَانِ مُعَاوِيَةَ ابْنِ اَبِي سُفْيَانَ ؎

کہ سمندر کی موجوں پر مجاہدینِ اسلام کے سوار ہونے کی مہمات حضرت معاویہؓ کے عہد کا کارنامہ ہے۔

قیصر کے شہر قسطنطنیہ پر مسلمانوں کی بحری راستہ سے یلغار ۵۲ھ کا واقعہ ہے جبکہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے اس حملہ کے اعلان کے ساتھ پوری مملکت میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانوں کے سینوں میں ایمان کی شمعیں روشن ہوگئیں۔ قیصر کے شہر پر حملہ آور لشکر کی پیشگی مغفرت کی خبر سب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُن رکھی تھی اور اب جب جنت کے باب پر دستک دینے کا موقع آیا تو جس نے بھی سنا دمشق کی طرف اُٹھ دوڑا کہ آج جنت کے ٹکٹ شام کے دارالسلطنت دمشق میں مملکت کے حاکم اور مسلمانوں کے خلیفہ حضرت معاویہؓ کے دستخطوں سے جاری ہو رہے تھے۔

جنت کی طلب میں یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میزبانِ ہجرت حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی دمشق جا پہنچے۔ جن کی عمر اسّی برس تک پہنچ چکی تھی اور وہ اب اپنی عمر کے اعتبار سے جہاد کے مکلف بھی نہیں تھے مگر جنت سامنے نظر آئی تو بڑھاپا بھی اُن کی راہ نہ روک سکا۔ اپنے زمانہ کے سرِفہرست فقیہہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی دوڑے آئے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی آ پہنچے، حضرت زبیرؓ کے فرزند عبداللہؓ بھی آئے اور حضرت علیؓ کے فرزند حضرت حسینؓ بھی پیچھے نہ رہے۔ جس نے جس حال میں قیصر کے شہر پر حملے کی خبر سنی اُس نے رختِ سفر باندھا اور دمشق پہنچ کر ہی دم لیا اور ہمارے قارئین یہ خبر سُن کر حیران ہوں گے کہ یہ مغفور لشکر یہ بخشے ہوئے

؎ بخاری کتاب الجهاد

لوگ، یہ جنت کے وارث جس مقدس لشکر میں جنت کی طلب میں بھاگ بھاگ کر شامل ہوئے تھے۔ اس لشکر کا قائد، اس فوج کا کمانڈر اور اس جماعت کا سردار حضرت معاویہؓ کا گرامی قدر فرزند یزید تھا۔

قارئین سے ایک سوال

ہم ایک سوال یہاں اپنے قارئین سے بھی کرتے ہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ ایمان افروز واقعہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کا ضامن قرار دیا تھا۔ جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی زبان سے اس واقعہ کے وقوع سے بھی پینتالیس چھیالیس برس قبل اُمت کو دے رکھی تھی۔

اور وہ مقدس لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے قیصر کے شہر پر حملہ کرنے کے لئے چُنا تھا، وہ پاکباز لوگ جن کے ذکر سے بھی ایمان کے باغ میں بہار آ جاتی ہے، جن کی یاد سے دل لذت پاتے ہیں اور زبانیں رضی اللہ عنہم پکارنے لگتی ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے زمین پر بسنے والے ان خاک نژاد فرشتوں کی سرداری کے لئے ایک فاجر و فاسق، شراب و شاہد کے متوالے اور طبلہ و سارنگی کے ساتھ رقص کرنے والے شخص کو ہی منتخب کر رکھا تھا؟ آہ! ؏

حیف گر در پسِ امروز بود فردائے

یزید اور اصحابِ رسولؐ

تاریخ کا یہ فیصلہ ناقابلِ تردید ہے کہ یزید کی امارت اور خلافت پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

حضرت حسینؓ بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے علاوہ کسی قابلِ ذکر صحابی کا ذکر تاریخ میں موجود نہیں جس نے جناب یزید کی بیعت خلافت سے انکار کیا ہو اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اصحابِ رسولؐ غیر متقی پر جمع نہیں ہو سکتے تھے۔

اصحابِ رسولؐ کو عدول مانا گیا ہے الصحابۃ کلھم عدول اور حق یہی ہے کہ عدول کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتے۔

علامہ ابن اثیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی زبان سے نقل کرتے ہیں کہ۔ حسن بن علیؓ کی وفات کے بعد مجھے حضرت معاویہؓ کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا تو یزید میرے پاس آیا اور حسنؓ کی وفات پر مجھ سے تعزیت کی میں نے انتہائی حیرت سے اُسے علم وفضل میں یکتا پایا۔ اس کی گفتگو اتنی علمی تھی کہ میرا خیال ہوا کہ بنو اُمیہ ختم ہو گئے تو علم بھی اُن کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا[1]

یزید اور بزرگانِ اُمت

ابن علیؓ محمد بن حنفیہ

یزید کے بارے میں خواہ کوئی اپنے جلے دل کے کتنے بھی پھپھولے پھوڑتا رہے اور اس کے شرابی ہونے اور رقص وسرود سے دلچسپی رکھنے

---

[1] العواصم من القواصم بحوالہ ابن کثیر جلد ۸ صد ۲۲۸

کے خواہ کتنے بھی افسانے تصنیف کرے مگر جن لوگوں نے یزید کو قریب سے دیکھا ہے ان کی رائے بالکل دوسری ہے۔

سیدنا حضرت علیؓ کے حقیقی فرزند اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے بھائی حضرت محمد بن الحنفیہ یزید کے ہاں اکثر آتے جاتے تھے۔ آپ نے جنگِ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت معاویہؓ کے خلاف بھرپور حصہ لیا تھا مگر پھر حضرت حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری کے بعد اپنے دوسرے اہلِ خاندان کے ساتھ آپ نے بھی حضرت معاویہؓ کی بیعت کر لی۔ پھر جب جناب یزید سامنے آئے تو آپ نے ان کی بیعت بھی کی اور پورے خلوص سے یزید کا ساتھ دیا۔ جب ایک بار آپ نے یزید کی بیعت کی تو پھر پوری جرأت اور پوری دیانت سے اپنے قول و قرار کی پاسداری کی اور سخت تر حالات میں بھی پوری بہادری سے اُسے نبھایا۔

یزید کے دورِ حکومت میں جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اُن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تحریک کا مرکز مدینہ منورہ ہی تھا۔ حضرت ابنِ زبیرؓ کے کارندے ان کے حق میں اور یزید کے خلاف بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے اور لوگوں تک پہنچ پہنچ کر انہیں یزید کی بیعت کو توڑ دینے کے لئے اُکساتے اور مجبور کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ایک نہایت قریبی ساتھی اور لوگوں کو بغاوت کے لئے اکسانے والے ایک بزرگ عبداللہ بن مطیع مدینہ منورہ میں حضرت محمد بن حنفیہ ابن علیؓ کے پاس پہنچے اور اُن پر زور دیا کہ وہ بھی یزید کی بیعت ترک کر دیں کیونکہ وہ بہت بُرا شخص ہے، شراب پیتا ہے، احکامِ قرآن کی کُھلے بندوں خلاف ورزی کرتا ہے، اس کی زندگی کا چلن از سرتا پا سُنت کے منافی ہے۔

بات ختم ہوئی تو حضرت ابنِ علیؓ نے فرمایا، تم نے جو کچھ کہا ہے یہ سب کا

سب جھوٹ اور خلافِ واقعہ ہے، میں امیر المومنین یزید کے پاس اکثر مقیم رہا ہوں، میں نے اس کے اندر کوئی خلافِ شرع بات نہیں پائی، وہ پکا نمازی ہے متبع سنت، اور قرآن کریم کے احکام کے موافق زندگی بسر کرتا ہے اور فقہ (قرآن) پر پورا پورا عامل ہے۔ ابن مطیع کہنے لگے وہ صرف آپ کے دکھانے کے لئے آپ کے سامنے نماز پڑھنے لگ جاتا ہے ورنہ اسے نماز سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حضرت ابن علیؓ نے جواب دیا اُسے بھلا مجھ سے کیا خوف ہے جو وہ ایسا تکلف اختیار کرے۔

مزید فرمایا کہ کیا تم نے اُسے اپنی آنکھوں سے شراب پیتے دیکھا ہے؟ اگر نہیں دیکھا تو یہ بہتان ہے۔ اگر دیکھا ہے یا اُس نے خود بتایا ہے تو تم خود اُس کے گناہ میں شامل ہو کیونکہ تم نے اُس کو اس سے منع نہیں کیا۔

حضرت محمد بن حنفیہ ابن علیؓ کی یہ باتیں سُن کر ابن مطیع اور اس کے ساتھی سخت مایوس ہوئے اور کہنے لگے اگر آپ یہ پسند نہیں کرتے کہ یزید کو خلافت سے الگ کر دیا جائے اور ابن زبیرؓ اس کی جگہ لیں تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو خلیفہ بنا لیا جائے، اور اگر ایسا ہی ہے تو کھلے الفاظ میں فرما دیجئے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر لیتے ہیں۔

اُنہوں نے جواب دیا میرے بھائیو! تم جس بات کے لئے مجھے کہہ رہے ہو، میں اس امر کو سرے سے ہی ناجائز سمجھتا ہوں، میں غداری پر آمادہ نہیں ہوں اور امیر المومنین سے کسی طرح بھی جنگ پر آمادہ نہیں، خواہ یہ جنگ آگے لگ کر ہو یا پیچھے رہ کر۔

ابن مطیع کہنے لگے آپ اپنے باپ علیؓ کے ہمراہ تو یزید کے باپ سے بھی لڑتے رہے ہیں اب کیا رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے؟ فرمایا تم میرے باپ جیسا آدمی لے آؤ تو میں اُس معاملہ میں جنگ پر آمادہ ہو جاؤں گا جس معاملہ میں میرے باپ نے جنگ کی تھی۔ ابن مطیع اور اس کے ساتھی کہنے لگے کہ

چلیے آپ خود بیٹھے رہیے مگر اپنے بیٹوں کو ہی ہمارے ہمراہ بھیج دیجیے کہ وہ یزید کے خلاف جنگ میں حصہ لیں۔ فرمایا تم نے یہ کیسی بات کہی ہے بیٹوں کو بھیجنے کے معنیٰ تو صاف یہی ہیں کہ میں خود یہ جنگ کر رہا ہوں۔

وہ کہنے لگے کہ اچھا آپ لڑائی کے لیے نہ جائیے مگر اتنا تو کیجیے کہ یزید کے خلاف لوگوں کی لڑائی کی ترغیب دیجیے۔ فرمایا عزیزو! چلے جاؤ میں جس بات کو خود جائز نہیں سمجھتا دوسروں کو بھی نہیں کہوں گا۔

وہ لوگ اب ذرا تلخ ہوئے اور پیشانی پر بل لا کر کہنے لگے کہ اس کا مطلب یہ ہوا ہمیں آپ کو زبردستی اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔

فرمایا ہاں، تم اس بات کی یقیناً طاقت رکھتے ہو مجھے اٹھا لے جاؤ۔ میں لوگوں کو تلقین کروں گا کہ:

لوگو! خدا سے ڈرو اور بندوں کو راضی کرنے کے لیے خدا کی ناراضگی کا سامان نہ پیدا کرو، اس کے بعد صورتِ حال کو خراب پا کر حضرت محمد بن حنفیہ مدینہ سے نکل کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہ لوگ اپنے کام میں مصروف رہے [1]

حضرت علیؓ بن حسینؓ (زین العابدینؒ)

طبقات ابن سعد کے مطابق جب مدینہ منورہ کی بغاوت پر قابو حاصل کر لیا گیا تو باغیوں کی سرکوبی کرنے والے لشکر کے کماندار جناب مُسلم بن عقبہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فرزند عزیز حضرت علی زین العابدین کو اپنے پاس بلایا۔ حسینؓ کے یہ فرزند بھی اپنے خاندان کے دوسرے سب لوگوں کی طرح یزید کی بیعت کر چکے ہوئے تھے۔ اور بغاوت کے ایام میں یزید کی حکومت

---

[1] البدایہ والنہایہ لابن کثیر جلد ۸ صہ ۲۳۳

کے استحکام کی دعاؤں میں مصروف تھے۔

وہ تشریف لائے تو مسلم نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ احترام واکرام سے اپنے پاس جگہ دی اور بتایا کہ امیرالمومنین یزید نے مجھے آپ سے حسن سلوک کی تاکید کی تھی اور خواہش کی تھی کہ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمادیں۔ حضرت نے خیر سگالی کے ان جذبات کے جواب میں یہ کلمہ کہا:

صلی اللہ امیرالمومنین (یزید) واحسن الجزا لہ

کہ امیرالمومنین یزید پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔

حضرت امام احمدؒ بن حنبل

قاضی ابوبکر ابن عربی مصنف العواصم من القواصم حضرت امام احمدؒ بن حنبل سے نقل کرتے ہیں کہ:

یزید اپنے خطبات میں کہا کرتا تھا کہ جو شخص بیمار رہا پھر لب مرگ پہنچ کر اللہ کی رحمت کا محل بن گیا اور شفا پائی اُسے سوچنا چاہئیے کہ اس کا بہترین عمل کونسا تھا جس کی وجہ سے اللہ کی رحمت نے اس کی دستگیری کی اور اُسے شفا کی دولت سے نوازا پھر اس عمل کو اپنا معمول بنالے۔ اور پھر سوچے کہ اس کی زندگی کا بدترین عمل کونسا ہے (جو اس کی گرفت کا موجب بن جاتا ہے) اس سے کنارہ کرے۔

حضرت احمدؒ بن حنبل مزید فرماتے ہیں کہ:

یزید اُن زاہد اور اصحاب اتقاء میں سے ہے جن کے قول کی پیروی کی جاتی ہے اور جن کے وعظ کو سن کر لوگ گناہ ترک کر دیتے ہیں۔ ؎2

لہ الامامۃ والسیاسۃ جلد ا صہ ۱۴۲ ؎2 العواصم من القواصم صہ ۲۲۷ بحوالہ الزہد احمد بن حنبل۔

حضرت امام ابن تیمیہؒ

یزید نے اپنے باپ حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا اور اکابر اصحابِ رسولؐ کی قیادت کی، یہ مسلمانوں کی سب سے پہلی بحری فوج تھی جس کے ہر فرد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت کی بشارت مل چکی تھی [1]

علامہ قسطلانیؒ

حدیثِ رسول علیہ السلام کے مطابق وہ لشکر جس کو قیصر کے شہر پر حملہ کرنے کے صلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی وہ یزید بن معاویہؓ کی کمان میں قسطنطنیہ (شہرِ قیصر) پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس لشکر کے شرکار کے متعلق حضورؐ کی زبان سے مَغْفُوْرٌ لَّھُمْ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ یہ سب لوگ اللہ کے ہاں مغفرت پا چکے ہیں۔

اس حدیث سے حضرت معاویہؓ اور اُن کے فرزند جناب یزید بن معاویہؓ کی فضیلت بالکل واضح ہے [2]

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ

یزید بن معاویہؓ صحیح الاسلام تھا اور یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اُس نے حضرت کو قتل کیا یا قتل کا حکم دیا یا اُن کے قتل پر خوش ہوا۔

پس جب حضرت حسینؓ کا قتل ہی یزید کے حکم یا اس کے علم سے وقوع میں نہیں آیا تو ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں بدگمانی صریحاً حرام ہے۔ مسلمانوں کو لازم ہے کہ بلا ثبوت یزید پر بدگمانی نہ کریں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

---

[1] المنتقیٰ [2] قسطلانی شرح صحیح بخاری کتاب الجہاد

بدگمانی کے مقابلہ میں اُس کے بارے میں حسنِ ظن کے قرائن زیادہ موجود ہیں۔

یزید پر یقیناً رحمۃ اللہ علیہ کا کلمہ دعائیہ کہنا لازم ہے اور اس لحاظ سے یزید ہماری ہر نماز میں ہماری اس دعا میں شامل ہے۔ جب ہم کہتے ہیں

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

کیونکہ یزید ایک مومن شخص تھا اور ہم مومنوں کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں [1]

الحاصل جناب یزید کی زندگی بلاشبہ ایک پاکباز انسان کی زندگی ہی تھی اور اس عنوان سے ہمارے پاس اُمت کے صلحاء و اتقیاء کی شہادات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جسے پورے کا پورا یہاں نقل کرسکنا ممکن نہیں ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی شخص جو بالکل غیرجانبداری سے اور تعصب سے الگ رہ کر جناب یزید کی زندگی کا جائزہ لے گا تو وہ تاریخ کے انہی یزید آزار دفاتر میں ہی یزید کے بارے میں ایسا مواد بھی موجود پائے گا جو کسی بھی شخص کی تابناک اور بے داغ زندگی کے ثبوت کے لئے کفایت کرتا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ ایمان رکھتا ہو کہ انصاف کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو تفحص حال سے وہ یزید کے بارے میں اُن خیالات پر قائم نہیں رہ سکتا۔ جن کا تعلق واقعات کے بجائے نسبی یا گروہی جذبات سے ہے اور جو نسل در نسل کی سُنی سنائی باتوں کے اثر سے دماغوں میں راسخ اور دلوں میں جگہ پاگئے ہیں اور اب وہ مولانا مودودی جیسے اہل سیاست کی سیاسی اور انتخابی ضرورتوں کے لئے سند کا کام دیتے ہیں۔ چند برس قبل لاہور کے ایک بزرگ جناب محمد دین بٹ نے اپنی ایک کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں ملک بھر کے مشہور علماء سے ایک سوال کے ذریعہ دریافتِ حال کی سعی کی تو

---

[1] وفیات الاعیان لابن خلکان جلد ا صـ ۴۶۵

اُنہیں بہت سے علماء کے خطوط موصول ہوئے جن میں جناب یزید کے خلاف ان کے گروہی مخالفین کے جمع کردہ واقعات کی تغلیط اور یزید کی پاکبازی اور اس کے جنّتی ہونے کی تصدیق حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں کی گئی تھی۔

جناب محمد دین نے یہ خطوط شائع کر دیئے تھے۔ان جواب دینے والے علماء میں سے اُنہوں نے ملک کے اہم اور قابلِ ذکر چھبیس اہلِ علم کی فہرست شائع کی ہے جن میں مسلمانوں کے تمام ہی مکاتبِ فکر یعنی اہلحدیث، دیوبندی حنفی اور بریلوی حنفی ہر مسلک کے علماء پائے جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ ان خطوط میں جناب مولانا مودودی صاحب کا بھی ایک خط موجود ہے۔ اُنہوں نے تحریر کیا ہے کہ یزید کے لئے دعائے مغفرت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور یہ شاید ان دلوں کی بات ہے جب مولانا کی سیاسی ضرورتوں نے انہیں ابھی خلافت و ملوکیت کی تسوید پر متوجہ نہیں کیا تھا۔

یزید خود اپنی سوچ کے آئینہ میں

جناب یزید کے بارے میں مسلمانوں کے کچھ متعصب گروہی کینہ ور اور کینہ توز راویوں اور مورخین نے اپنی نسل در نسل اور نقل در نقل جھوٹ روایات کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ تاثر دے رکھا ہے کہ یزید ایک جابر و مستبد حکمران تھا، جو ظلم سے حکومت کرتا تھا اور جبر سے کام نکالتا تھا۔ اُسے نہ خدا کا خوف تھا نہ محاسبہ کا ڈر، وہ ایک لااُبالی شخص تھا اور من آئی کرتا تھا۔

یہاں ہم عام مسلمانوں کے اس غلط تاثر کے ازالہ کے لئے امام شہاب الدینؒ

سے جناب یزید کا ایک خطبہ نقل کرتے ہیں جس کو پڑھ کر ہمارے قارئین یزید کی سیرت اور اس کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر خاصی گہری واقفیت حاصل کر سکیں گے اور انہیں یہ اندازہ کرنے میں بہت آسانی ہو گی کہ آیا یہ اسی شخص کے خیالات ہیں جس کے بارے میں ہمیں مولانا مودودی صاحب نے بڑی محنت سے یہ روایت مہیا کر کے دی ہے کہ وہ ایک شرابی، نشہ باز اور طنبورے بجانے والا شخص تھا۔ یزید جب امیرالمومنین بن چکے تو انہوں نے اپنے ملک کے عوام و خواص اور حکام و عمالِ حکومت سے کھلا خطاب فرمایا، آپ بھی سنیئے:

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہِ الکریم - امابعد

حاضرین!

میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہوں، اسی سے مدد طلب کرتا ہوں، اسی پر ایمان رکھتا ہوں، اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور نفس کی شرارتوں اور اعمالِ بد سے اسی کی ذات سے پناہ چاہتا ہوں۔

عزیزو! یاد رکھو جسے اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راہ پر نہیں لا سکتا اور جسے وہ ہدایت بخشے اُسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ لاشریک ہے، اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسولؐ ہیں، اور انہیں اللہ تعالیٰ نے وحیٔ رسالت سے افتخار بخشا ہے اور انہیں اپنی رسالت کے لئے منتخب کیا ہے، اُن کی امداد فرمائی ہے اور انہیں اعزاز و اکرام سے نوازا ہے۔ ان کی حفاظت کی اور انہیں قرآن عطا فرمایا، جس میں حلال و حرام کی حدیں مقرر کی ہیں، انہیں شریعت دی اور اس کی تفصیل کو متعین کیا تاکہ کسی کو رسولؐ کے ساتھ کوئی جھگڑا باقی نہ رہ سکے۔

لوگو! میں تمہیں اس خدائے بزرگ و برتر سے ڈرنے اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں جس کی طرف بالآخر ہم کو لوٹ کر جانا ہے۔ میں تمہیں دنیا کو اختیار کر لینے سے ڈراتا ہوں، یہ دیکھنے میں بے حد حسین اور دلفریب ہے، اس کا مزہ بے حد شیریں ہے مگر خواہشوں سے بھری ہے تھوڑے پر قناعت نہیں کرتی، فانی سے محبت کرتی ہے اور باقی سے الگ رہتی ہے۔

اس کو ایک حال پر قرار نہیں ہے اور یہ کسی سے ہمیشہ راضی نہیں رہی آتی ہے اور جلد رُوٹھ جاتی ہے۔

قرآنِ پاک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے زندگی کی مثال اس کھیتی سے دی ہے جو بارش سے اُگتی ہے، پلتی ہے، پکتی ہے اور پھر چورہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں اپنے رب سے دُعا کرتا ہوں کہ الٰہی! ہمیں دنیا کی ذلّت سے بچالے اور عقبیٰ کی وحشت سے امن عطا فرما۔

لوگو! بہترین نصیحت اللہ کی کتاب ہے۔ اس کو پڑھو، سنو اور اس پر عمل کرو تاکہ تم اللہ کی رحمت کا محل بن سکو۔ والسلام! [1]

موزوں اور غیر موزوں کی بات

مولانا لکھتے ہیں:

(حضرت معاویہؓ) اگر قطع نزاع کے لئے اپنی زندگی میں ہی جانشینی کا معاملہ طے کرجانا ضروری سمجھتے تو مسلمانوں کے اہل علم و اہل خیر کو جمع کر کے انہیں آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے دیتے کہ ولیعہدی کے لئے اُمت میں موزوں تر آدمی کون ہے [2]

---

[1] عقد الفرید امام شہاب الدینؒ [2] خلافت و ملوکیت ص ۱۴۸

بحث کو کھینچ تان کر اور اپنی مصلحتوں اور سیاسی ضرورتوں سے آدمی بات کو جدھر چاہے لے جائے اور جو چاہے جمع و ترتیب کرے اور من مانے نتائج کے استخراج میں جان کھپاتا رہے مگر غور طلب بات صرف یہی ایک ہے کہ آیا جن حالات میں یزید کو ولیعہد بنایا گیا تھا اس وقت اور ان حالات میں یزید سے بڑھ کر بھی کوئی دوسرا شخص اس منصب کے لئے موزوں تھا۔

اور جن مصالح اور جن مملکتی اور ملّی مفادات سے یزید کی جانشینی ناگزیر ہوگئی تھی کیا کوئی دوسرا شخص مُلک و ملّت اور مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت یزید سے بڑھ کر کر سکنے کی پوزیشن میں تھا؟ ابن خلدون لکھتے ہیں:

امامت اور خلافت کے معنی اصل میں اُمّت کے دینی و دنیوی مصالح اور مفادات کی حفاظت ہے۔

امام لوگوں کے مصالح کا امین اور ان کی بہتری کا ذمہ دار ہوتا ہے اور جب وہ اپنی زندگی میں اُمّت کی بہتری کے مصالح کو پیشِ نظر رکھنے کا مکلّف ہے تو قدرتی طور پر اس کی یہ خواہش بھی قابلِ فہم ہے کہ وہ اپنی موت کے بعد کے لئے بھی لوگوں کی بھلائی کے لئے فکرمند ہو۔ اور وہ اپنی موت سے قبل کسی ایسے آدمی کو اپنا جانشین مقرر کر دے جو بالکل اُس کی طرح ہی معاملات کی نگرانی پر قادر ہو اور لوگ بھی اُس سے مطمئن رہیں۔ جیسے خود اس کی ذات سے مطمئن تھے۔

اور یہ صورت شرعًا جائز تھی اور اُمّت کے لئے کسی ایسے سربراہ کی تقرری کے جواز پر اجماعِ اُمّت موجود ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اسی قاعدہ کے ماتحت اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور اصحابِ رسولؐ نے بلا اختلاف اس صورتِ حال کو جواز کی سند دی اور حضرت عمرؓ کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی۔

بعد ازاں حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے اپنا بوجھ عشرۂ مبشرہ کے چھ باقی ماندہ اصحابِ رسولؐ کی طرف منتقل کر دیا کہ وہ باہمی مشورہ سے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں ...... چنانچہ حضرت عثمانؓ کی خلافت منعقد ہو گئی۔ اور سب اصحابِ رسولؐ نے بلا خلاف اُن کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی۔ ان دونوں مواقع پر اصحابِ رسولؐ کافی تعداد میں موجود تھے مگر کسی ایک نے بھی اس طریقِ کار سے اختلاف نہیں کیا جس سے واضح ہے کہ اصحابِ رسولؐ ولیعہدی کے جواز پر متفق تھے اور یہی اجماعِ اُمت ہے۔ اور جیسا کہ سب ہی مانتے ہیں کہ اجماعِ اُمت حجتِ شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔

پس اس معاملہ میں جب اُمت کی بہتری پیشِ نظر ہو تو امام کو اس بات پر متہم نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے اپنے بعد جانشین کس کو مقرر کیا ہے۔ کیونکہ جب ولیعہدی جائز ٹھہری تو امام کو اختیار ہے کہ وہ بدلائل اگر اُمت کی بہتری اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کرنے میں ہو یا اُمت کی بہتری اُس کے باپ کے ساتھ وابستہ ہو تو حسبِ حالات وہ اپنے بیٹے یا اپنے باپ کو جانشین مقرر کر سکتا ہے۔

کیونکہ جب امام پر اس کی زندگی میں اُمت کے لئے اس کی خیر اندیشی پر اعتماد موجود ہے تو یہ اعتماد اس کی موت کے بعد قائم رکھنا بھی غلط بات نہیں ہے۔ اس لئے ایسے کسی درپیش موقع پر امام پر الزام رکھنا ہرگز درست نہیں ہے۔ بلاشبہ بعض لوگوں کے نزدیک بیٹے یا باپ کی جانشینی کی صورت میں امام کی نیت پر شبہ کیا گیا ہے اور بعض لوگ صرف بیٹے کی جانشینی کی صورت میں ہی امام کی نیت پر شبہ کی انگلی رکھتے ہیں مگر میری رائے میں یہ اندازِ فکر بالکل غلط ہے اور امام اپنے بعد حسبِ حالات و دلائل خواہ اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کرے یا باپ کو دونوں صورتوں میں شبہے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

بالخصوص ایسے مواقع پر تو امام پر شبہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں جب امام ایسا کوئی قدم کسی مصلحت کے تحفظ یا کسی مفسدہ کے ازالہ کے پیشِ نظر کرے جیسے حضرت امیر معاویہؓ کا اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کرنے میں بہت سی مصلحتیں اور بہت سے مفاسد سے اُمت کا تحفظ پیشِ نظر تھا۔

اول، حضرت امیر معاویہؓ کی یہ کارروائی لوگوں کے عمومی اتفاق سے عمل میں آئی تھی۔

دوم: معاویہؓ کو اس لئے بھی متہم نہیں کیا جا سکتا کہ یزید کو ترجیح دینے میں اُن کے پیشِ نظر بجز اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ اُمت میں اتفاق و اتحاد قائم رہ سکے اور چونکہ اس غرض سے یہ بات بہت ضروری ہے کہ اُمت کے ارباب فکر و عمل کی تائید بھی ایسے فیصلوں کو حاصل ہو اور ظاہر ہے کہ اس مرحلہ پہ ایسے تمام لوگ کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلہ میں یزید کی ولیعہدی پر ہی جمع ہو سکتے تھے کیونکہ وہ لوگ عموماً بنو اُمیہ میں سے تھے اور انہیں بنو اُمیہ سے باہر کسی کی بھی خلافت قابلِ قبول نہیں تھی۔

بنو اُمیہ اس وقت قریش کے اندر دوسرے سب ہی لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور تھے اور وہ یہ بات بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے میں سے باہر کے کسی شخص کو اپنی قسمت کا مالک بنائیں۔ پس اگر حضرت معاویہؓ یزید کو ولیعہد بنانے کے بجائے کسی دوسرے کو یہ اعزاز بخشتے تو پورے عرب میں فساد برپا ہو جاتا [1]

---

[1] یہ ایک اصولی بات ہے اور مولانا مودودی صاحب خود بھی اس اصول کے قائل ہیں۔ وہ اس اصول کو صرف حضرت معاویہؓ کے سلسلہ میں ہی اصول نہیں مانتے ورنہ فی الحقیقت اُنہیں اس بات کے صحیح ہونے میں اختلاف نہیں ہے، وہ حدیث الائمۃ من قریش کے ضمن میں حضرت امام ابو حنیفہؒ سے نقل کرتے ہیں۔

دوسرے مسئلے کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ تھی کہ خلیفہ قریش ہی میں سے ہونا چاہیئے اور یہ صرف اُنہی کی نہیں بلکہ تمام اہل سنت کی متفق علیہ رائے تھی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اسلامی خلافت ازروئے شریعت صرف ایک قبیلے کا دستوری حق تھی بلکہ اس کی اصل وجہ اس وقت کے حالات تھے جن میں مسلمانوں کو مجتمع رکھنے کے لئے خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری تھا۔ ابن خلدون نے یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے کہ اس وقت اسلامی ریاست کے اصل پشت پناہ عرب تھے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

انہی مصالح کے پیش نظر حضرت امیر معاویہؓ نے دوسرے تمام قابل ذکر لوگوں کے مقابلہ میں یزید کو ترجیح دی اور ملک و ملت اور قوم کی ضرورت سے افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا لہ

یزید کو مقرر کرنے سے حضرت معاویہؓ کے سامنے بڑی مصلحت یہی تھی کہ امت میں اتفاق و اتحاد قائم رہ سکے جس کی شارع کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت ہے ....

اور عربوں کا زیادہ سے زیادہ اتفاق اگر ممکن تھا تو قریش ہی کی خلافت پر دوسرے کسی گروہ کا آدمی لینے کی صورت میں "تنازع اور افتراق کے امکانات اتنے زیادہ تھے کہ خلافت کے نظام کو اس خطرے میں ڈالنا مناسب نہ تھا اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی تھی کہ امام قریش میں سے ہوں۔ (خلافت و ملوکیت ص۲۵۵)

لہ یزید کی ولیعہدی کے مخالف ان کی ولیعہدی پر جس بات سے زیادہ خار کھاتے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے فرزند گرامی حضرت حسینؓ کی موجودگی میں یزید کا انتخاب موزوں کو چھوڑ کر غیر موزوں کو اختیار کرنا ہے۔ ہمیں حضرت حسینؓ کی عظمت سے انکار نہیں مگر یزید کے مقابلہ میں ان کو زیادہ موزوں شخص سمجھنے والے لوگ اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اسلامی مملکت میں اس دور میں حضرت حسینؓ کو کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ اگر معاویہؓ کی جانشینی کے لئے یزید کے بجائے حسینؓ کو اختیار کیا جاتا تو ملک اسی خلفشار کا شکار ہو جاتا جس کا خطرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی غیر قریشی کو خلیفہ مقرر کرنے کے نتیجہ میں متوقع تھا۔ بہر وہاں تو لوگ حضرت حسینؓ کے باپ حضرت علیؓ پر جمع نہیں ہو سکے تھے، حسینؓ کے برادر بزرگ حضرت حسنؓ پر جمع نہیں ہو سکے تھے اور یہ دونوں ہی حسینؓ سے بہر حال افضل تھے، ایسے میں لوگوں کا حسینؓ پر جمع ہونا کیونکر ممکن تھا۔

پھر اس فیصلہ کے وقت صدہا اصحابِ رسولؐ کی موجودگی اور اس فیصلہ پر کسی قابلِ ذکر مزاحمت کا عدم وجود بلکہ اصحابِ رسولؐ کا اس فیصلہ پر سکوت اختیار کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اصحابِ رسولؐ کے نزدیک حضرت معاویہؓ کی نیک نیتی مشکوک نہیں تھی ورنہ یہ لوگ کبھی خاموش نہ رہتے۔

کیونکہ یہ لوگ راہِ حق میں کسی طرح کی مداہنت کے روادار نہیں تھے اور نہ حضرت معاویہؓ ہی ایسے شخص تھے کہ وہ اصحابِ رسولؐ کے اعتراض پر قبولِ حق میں تامل کرتے اور حق کو قبول کرنے میں انہیں اپنا وقار مزاحم ہوتا۔

خوب یاد رکھو کہ یہ سب لوگ ایسی کمزوریوں سے ماورٰی اور بلند تھے اور ان سب کی عدالت غیر مشتبہ تھی [۱]

ابن خلدون کے اس طویل محاکمہ میں ان سارے ہی اعتراضات کا جواب بڑی خوبی سے موجود ہے جو یزید کی ولیعہدی کے سلسلہ میں وارد ہوتے ہیں۔ وارد کئے گئے ہیں یا وارد کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے پاس کسی شخص کی "میں نہ مانوں" کا کوئی جواب موجود نہیں ہے۔ اور ہم اپنی اس فکری کوتاہی کا کھلا اعتراف کرتے ہیں۔ اب اگر امیر یزید کی نیکی، نیک دلی، نیک اندیشی، نیک اطواری اور نیکوکاری ان کی عدالت، امانت، دیانت اور تقویٰ و طہارت کے ثبوت میں اس درجہ عظیم شہادات کے باوجود وہ مولانا کو لاابالی ہی نظر آتا ہے، آوارہ ہی دکھائی دیتا ہے، اگر وہ انہیں حدیث پاک کی عینک سے خوفناک سمندر کی خونخوار موجوں سے لڑتا بھڑتا، قسطنطنیہ کی جانب رواں دواں نظر نہیں آتا، وہ اسے قیصر کی بے پناہ قوت کے خلاف قسطنطنیہ کی دیواروں کے سایہ میں مصروفِ جہاد فی سبیل اللہ نہیں دیکھ پاتے۔ وہ اگر انہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی گواہی کی روشنی میں علماء و فقہاء کی کسی مجلس میں بھی مصروفِ بحث و نظر نہیں دیکھ سکے۔ اگر وہ انہیں محمد بن حنفیہ کی شہادت کے مطابق کسی مسجد میں سجدۂ عبودیت میں پڑا اپنے اللہ کے حضور روتا

---

[۱] : ابن خلدون صہ ۱۷۵ - ۱۷۶

دکھائی نہیں دیتا۔ اگر ان کے کان حضرت زین العابدین کی زبان سے اس کے حق میں صلی اللہ امیر المومنین یزید کا محبوب کلمہ نہیں سُن پاتے اگر اُس کے بارے میں انہیں صلحائے اُمت کی شہادتیں موثر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ جب بھی نگاہ اٹھاتے ہیں معاویہؓ کا بیٹا انہیں رنڈی کی مجلس میں ریشمی لباس پہنے، شراب میں وحت سارنگی بجاتا اور ناچتا تھرکتا ہی نظر آتا ہے تو اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔

امیر یزیدؒ کی بیعت

امیر المومنین حضرت معاویہؓ کے جانشین جناب یزید کی بیعت پر پوری اُمت کا اجماع ایک ایسی حقیقت نفس الامری ہے جس سے انکار اپنی عقل و خرد اور علم و خبر سے دستبردار ہونے کے ہی مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ امیر یزید کو امیر المومنین یزید نہیں بھی مانتے وہ بھی یہ نہیں بتا سکے کہ پوری مملکت میں یزید کی بیعت کی راہ میں کوئی مزاحمت پیش آئی ہو، کسی کو بیعت نہ کرنے پر کوڑے لگائے گئے ہوں، کسی کو شکنجے میں کسا گیا ہو کسی کو جیل کے سپرد کیا گیا ہو، کسی کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ ملک کے اندر اس مسئلہ سے اختلاف کی بنیاد پر کہیں کوئی ہنگامہ ہوا ہو۔ کہیں کوئی احتجاج ہوا ہو، اور پوری مملکت میں حضرت حسینؓ بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے سوا حضرت علیؓ کے گھرانہ سمیت کوئی ایک بھی قابلِ ذکر شخص ایسا موجود ہو جس نے یزید کی بیعت اختیار نہ کی ہو۔ مولانا مودودی صاحب نے انتہائی کرید کے بعد صرف چار نام دریافت کئے ہیں جن کے متعلق اُنہی کا کہنا ہے کہ انہوں نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ وہ چار بزرگ یہ ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابو بکرؓ، حضرت عبداللہ

بن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ بن علیؓ۔

مگر جیسا کہ ہم عرض کر آئے ہیں یزید کی بیعت ۵۶ ہجری کا واقعہ ہے جبکہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ ۵۳ ہجری میں وفات پا گئے تھے[1] ۵۱ ہجری میں جب پہلے پہل یزید کی بیعت کی بات چلی تھی اُس وقت یہ بزرگ زندہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں یزید پر اختلاف ہوا ہو لیکن جب بیعت لی گئی اس وقت یہ موجود نہیں تھے مگر تعجب ہے کہ مولانا مودودی صاحب کو وہ ۵۶ ہجری میں بھی حضرت معاویہؓ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مصروفِ بحث نظر آتے ہیں۔ اور جہاں تک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا تعلق ہے ان کو ہر بحث میں گھسیٹنا اور ہر محاذ پر موجود رکھنا مولانا مودودی صاحب کی اپنی ضرورت ہے اور مولانا جان بوجھ کر کتمانِ حق کرتے ہیں ورنہ اُنہیں علم ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نہ صرف یزید کی بیعت میں مزاحمت پیدا نہیں کی بلکہ اُنہوں نے بخاری شریف کی روایت کے مطابق مسجد نبویؐ کے صحن میں سب اہل مدینہ کے سامنے اور اہل مدینہ کے ساتھ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر یزید کے لئے بیعت کر لی تھی۔

یہی نہیں بلکہ جب یزید کی حکومت کے خلاف حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی بغاوت سامنے آئی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نہ صرف اس بغاوت کی حمایت نہیں کی بلکہ اپنے پورے خاندان کو جمع کر کے تاکید کی کہ یزید کی بیعت ہو چکی ہے اب اُسے ترک کرنا غداری ہے اور ہم اس غداری پر کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ بلاشبہ یزید کی بیعت سے انکار کرتے تھے، مگر ان کا انکار بھی اس لئے نہیں تھا کہ وہ یزید کو امیرالمومنین بن سکنے کے

---

[1] ابن الاثیر جلد ۳، المعارف ابن قتیبہ صـ۲۶، مستدرک جلد ۲ صـ۴۷۵، تہذیب التہذیب ابن حجر جلد ۶ صـ۱۴۷، البدایہ والنہایہ ابن کثیر جلد ۸ صـ۸۹

لائق نہیں سمجھتے اگر ایسا ہوتا تو یہ دونوں بزرگ قسطنطنیہ کی بحری مہم میں جناب یزید کی قیادت میں روانہ ہونے والے لشکر میں کیوں شامل ہوتے اور یزید کی اطاعت پر کیوں راضی ہوتے۔

ان کے انکار کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ دونوں ہی خود خلافت پر دعوٰے رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ خلافتِ معاویہؓ کے بعد ان کا حق ہے اور پھر کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنے اس دعوٰی کی صحت کو عملاً بھی ثابت کیا اور اپنے زعم کے مطابق خلافت حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی جبکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے مگر حضرت حسینؓ اپنی مہم میں ناکام رہے۔ پس ان دو بزرگوں کی مخالفت کو یزید کی خلافت کے ناحق ہونے کی دلیل قرار دینا حقیقت پسندی نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کی بیعتِ خلافت کے موقع پر جب بہت سے اصحابِ رسولؐ نے انکار کیا اور اس کاروائی کو ناجائز قرار دیا۔ ان اصحابِ رسولؐ کی گنتی ۱۷ سے ۲۰ تک تو مولانا بھی مانتے ہیں۔

مگر مولانا کے نزدیک اصحابِ رسولؐ کے انکار کے باوجود حضرت علیؓ کی خلافت صحیح طور پر منعقد ہو گئی تھی، مولانا فرماتے ہیں:

اگر حضرت سعدؓ بن عبادہ کے بیعت نہ کرنے سے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت مشتبہ نہیں ہوتی تو ۱۷ یا ۲۰ صحابہ کے بیعت نہ کرنے سے حضرت علیؓ کی خلافت کیسے مشتبہ قرار پا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ان چند اصحاب کا بیعت نہ کرنا تو محض ایک منفی فعل تھا جس سے خلافت کے معاملہ کی آئینی پوزیشن پر کوئی اثر نہیں پڑتا[1]

اور اب اس منطق کو مولانا مودودی سے زیادہ کون جانے گا کہ اگر حضرت علیؓ کی خلافت ۱۷ یا ۲۰ صحابہ کے بیعت نہ کرنے سے مشتبہ نہیں ہوتی تو

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۱۲۲

صرف دو بزرگوں کے انکار سے جناب یزید کی بیعت کیونکر مشتبہ ہو جائے گی۔ اور بقول مولانا مودودی ، ہی ان دونوں بزرگوں کا بیعت نہ کرنا ایک منفی فعل ، ہی ہے جس سے خلافت کے معاملہ کی آئینی پوزیشن پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ پس اگر یزید کی خلافت خواہ صحیح روایات کے مطابق پوری مملکت میں لوگوں کی رضامندی سے ہی منعقد ہوئی ہو یا بقول مولانا مودودی یہ بیعت زور و جبر ، دھن اور دھاندلی سے حاصل کی گئی ہو ، بہر حال صحیح خلافت ہے اور اس خلافت کے حامل شخص کو امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین کہنا بالکل درست ہے ۔ اور یہاں جو ہم نے بیعت کے انعقاد میں دھاندلی کو بھی غیر موثر کہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مولانا کے نزدیک بھی بیعت اگرچہ زور و جبر سے ہوئی ہو اس کو غیر قانونی نہیں کہا جائے گا ۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے لئے جبری بیعت حاصل کرنے کے واقعات پر صفائی پیش کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

ایسی روایات بھی بلاشبہ موجود ہیں کہ جب حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا تو ان (یعنی حضرت عثمانؓ کے قاتلوں اور باغیوں) نے بعض حضرات کو زبردستی بھی بیعت کے لئے مجبور کیا [1]

لیکن امیر یزید کی بیعت کے مرحلہ پر ایسا کوئی ایک واقعہ بھی رونما نہیں ہوا اور کسی ایک شخص کو بھی یزید کی بیعت کے لئے مجبور نہیں کیا گیا اور جیسا کہ ہم عرض کر آئے ہیں حضرت معاویہؓ نے یزید کی بیعت سے انکار کرنے پر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ کو بھی کچھ نہیں کہا تھا بلکہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا [2]

لیکن اگر مولانا کو اصرار ہی ہو کہ یزید کی بیعت میں دھاندلی کا ضرور دخل ہے تو یہ بات بھی بقول مولانا بیعت خلافت کے انعقاد میں ہرگز مانع نہیں ہے ۔ نہ ماننے کی بات الگ ہے ۔ ورنہ یزید کی بیعت ان

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۳۲۵ [2] تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں جلد ۲ ص ۳۴

مقدمین نے بھی کررکھی تھی جن سے احکامِ دین پر مشتمل ہزاروں روایات حدیث کی کتابوں میں درج ہیں اور جن کے کہنے سے بعد کے لوگوں نے قرآن کو قرآن جانا اور حدیث کو حدیث مانا۔

جو قطعی اصحابِ عدل ہیں اور جن کی عدالت اُن کی زندگی کے ہر رُخ سے ہی غیر مشتبہ ہے مثلاً:

حضرت عبداللہ رضؓ بن عمر رضؓ

فاروقِ اعظم رضؓ کے فرزند ہیں، اونچے درجہ کے فقیہہ ہیں، اور اُمت کے اعلیٰ اصحابِ فکر و نظر میں داخل ہیں۔

ان بزرگوار سے کتبِ احادیث میں ۲۶۳۰ روایات وارد ہوئی ہیں۔ جن میں سے ۲۷۰ روایات صحیح بخاری شریف میں درج ہیں۔

حضرت عبداللہ رضؓ بن عباس رضؓ

حضرت علی رضؓ کے عم زاد ہیں، ان کے معتمد مشیر اور سو فادار ساتھی ہیں۔ حضرت علی رضؓ کی پوری زندگی ان کے دست و بازو بنے رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں فہمِ قرآن عطا کئے جانے کی دعا فرمائی تھی۔ ان کی زبان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۱۶۶۰ حدیثیں وارد ہوئی ہیں جن میں سے ۲۱۷ روایات بخاری شریف میں موجود ہیں۔

حضرت انس رضؓ بن مالک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضر و سفر کے رفیق اور نہایت قریبی صحابی ہیں۔ ان کی زبان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۲۸۶ احادیث آئی ہیں جن میں سے ۲۷۰ روایات امام بخاری نے اپنی صحیح میں درج کی ہیں۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری

ان بزرگ صحابی سے ۱۵۴۰ روایات کتبِ حدیث میں درج ہوئی ہیں جن میں سے ۹۰ روایات امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں درج کی ہیں۔

حضرت ابوسعید خدریؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخص اصحاب میں داخل ہیں ان سے ۱۱۷۰ روایات کتب حدیث میں درج ہیں۔

ایسے ہی بہت سے دوسرے اصحابِ رسولؐ جن سے متعدد احادیث رسولؐ وارد ہوئی ہیں جیسے:

حضرت نعمانؓ بن بشیر انصاری، حضرت سعیدؓ بن عثمانؓ، حضرت عبداللہؓ بن عثمانؓ، حضرت سہلؓ بن سعد ساعدی، حضرت زیدؓ بن ارقم وغیرہم رضی اللہ عنہم یہ سارے کے سارے بزرگ جناب یزید کے مبائعین میں داخل تھے اور انہوں نے یزید کی بیعت کر کے ان کی اور ان کی خلافت کی انعقاد کی تصدیق کی۔ ان حالات میں مولانا مودودی صاحب کا یزید کی بیعتِ خلافت کو ناجائز کہنا اور ان کی خلافت کو دھاندلی قرار دینے کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ یزید حضرت معاویہؓ کا فرزند ہونے کا گنہگار ہے! اور مودودی صاحب کو نہ حضرت معاویہؓ پسند ہیں نہ ان کا فرزند۔

اللہ کی شان ہے کہ ایک زمانہ میں مولانا مودودی جناب یزید کے حق میں دعائے مغفرت کے بھی قائل تھے، جس کا اظہار انہوں نے جناب محمد دین بٹ لاہوری کے نام اپنے ایک خط میں کیا ہے [1]

اور پھر جب ان کی سیاسی ضرورت نے اُن کی سوچ کی راہیں تبدیل کر دیں تو اب وہ یزید کے حق میں اصحابِ رسولؐ تک کی گواہی بھی قبول نہیں کرتے۔

---

[1] رشید ابن رشید محمد دین بٹ لاہوری صفحہ ۳۷۰

اب خواہ خود حضرت علیؓ کے فرزند گرامی حضرت محمد بن حنفیہؒ یزید کی پاکبازی کی شہادت دیں یا حضرت حسینؓ بن علیؓ کے فرزند حضرت زین العابدینؒ یزید کو صلی اللہ امیر المومنین کے دعائیہ کلمہ سے یاد کریں۔ مولانا پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

مودودی صاحب کے بیان کی روشنی میں

یزید کی ولیعہدی کو ناحق ثابت کرنے کے سلسلے میں مولانا مودودی صاحب کا مؤقف یہ ہے کہ :

(حضرت معاویہؓ) اگر قطع نزاع کے لئے اپنی زندگی میں ہی جانشینی کا معاملہ طے کر جانا ضروری سمجھتے تھے تو مسلمانوں کے اہلِ علم و اہلِ خیر کو جمع کر کے انہیں آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے دیتے کہ ولیعہدی کے لئے اُمت میں موزوں تر آدمی کون ہے؟ اور ظاہر ہے کہ یہ ایک معقول بات ہی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اہلِ علم اور اہلِ خیر سے مراد اُمت کے اہلِ علم اور اہلِ خیر ہی تو اُن سب سے تو اس بارے میں استصواب ہو چکا تھا۔ پھر اُمت کے اندر مولانا کے نزدیک وہ خاص اہلِ علم و اہلِ خیر کون سے تھے جو اس استصواب سے باہر رہ گئے تھے اور جن کی رائے دریافت نہیں کی گئی تھی جن کی وجہ سے مولانا کو شکایت پیدا ہوئی۔ جب مولانا خود تسلیم کرتے ہیں کہ :

(مغیرہ بن شعبہ کی تجویز و تحریک سے جب کوفہ کے لوگ یزید کی ولیعہدی کے بارے میں اپنی رضامندی پیش کر چکے تو) پھر حضرت معاویہؓ نے بصرے کے گورنر کو لکھا کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے [۱]

پھر حضرت معاویہؓ نے مدینے کے گورنر مروان بن الحکم کو لکھا کہ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں ہی کسی کو جانشین مقرر کر دوں۔ لوگوں سے پوچھو کہ جانشین مقرر ...... کرنے کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں [۲]

---

[۱] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۴۹ [۲] ایضاً صفحہ ۱۵۰

اسی زمانہ میں حضرت معاویہؓ نے مختلف علاقوں سے وفود بھی طلب کئے اور یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا ؎۱

عراق، شام اور دوسرے علاقوں سے بیعت لینے کے بعد حضرت معاویہؓ خود حجاز تشریف لے گئے۔ کیونکہ وہاں کا معاملہ سب سے اہم تھا اور دنیائے اسلام کی وہ با اثر شخصیتیں (جن سے مزاحمت کا اندیشہ تھا) وہیں رہتی تھیں ؎۲

ہم پوچھتے ہیں کہ اہل علم وخبیر سے ان کی آزاد رائے دریافت کرنے کی اور کیا صورت ممکن تھی جس پر عمل نہیں کیا گیا تھا۔

یزید کی ولیعہدی کی تجویز سامنے آئی تو ظاہر ہے کہ یہ ایک توجہ طلب معاملہ ہی تھا اور اس کی مصلحت حضرت مغیرہ نے تجویز کے ساتھ ہی بڑی تفصیل سے بتادی تھی پھر بیٹے کی ولیعہدی کا معاملہ بھی کوئی غیر شرعی بات نہیں تھی ورنہ حضرت علیؓ یہ راستہ اختیار نہ کرتے۔ تاہم حضرت معاویہؓ حضرت مغیرہؓ کی تجویز پر مطمئن نہیں تھے کیونکہ اُن کے نزدیک اس اہم اقدام کے جواز کے لئے صرف اہل کوفہ کی خواہش ہرگز کافی نہیں تھی پس انہوں نے اس تجویز پر استصواب عام کا اہتمام کیا۔

کہیں حکام کے زیر اہتمام مجالس مشاورت طلب کیں، عام اجلاس منعقد ہوئے اور لوگوں نے آزادی سے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا، کہیں سے وفود طلب کئے اور اس کے علاقوں کے بارے میں اپنی تسلی چاہی، کہیں بنفس نفیس خود تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے اندر ایک تاریخ ساز اجتماع ہوا جس میں خود معاویہؓ بھی موجود تھے۔ پورے اہل مدینہ نے جن میں صدہا اصحاب رسولؐ بھی تھے اور ہزاروں تابعین تھے سب نے بلا اختلاف رضا و رغبت حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر اُن کے فرزند کی ولیعہدی کی بیعت کی۔ ان بیعت کرنے والوں میں خانوادۂ نبوت کے لوگ بھی شامل تھے۔

؎۱ خلافت و ملوکیت صہ ۱۵۱ ؎۲ ایضاً صہ ۱۵۲

اُن میں علیؓ کے بیٹے محمد بن حنفیہ تھے، پوتے زین العابدین بھی تھے۔ دوسرے اکابر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے لوگ موجود تھے اور یہ سب لوگ ہی بیعت ہوئے۔

مکہ میں پہنچ کر البتہ حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بیعت کرنے سے انکار کیا ورنہ پوری مملکت میں ہی ان دو کے سوائے کسی شخص نے اختلاف ظاہر نہیں کیا۔

اس کے بعد پوری مملکت یزید کی ولیعہدی پر جمع ہو گئی اور ان دو بزرگوں یعنی ابنِ زبیرؓ اور ابن علیؓ کے سوائے پوری مملکت میں کوئی ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں تھا جس نے اس باب میں ابن زبیرؓ اور ابن علیؓ کا ساتھ دیا ہو۔ پھر معلوم نہیں کہ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک استصواب عام کی کونسی شرط پوری نہیں ہو سکی تھی اور کونسے اہل علم وخیر باقی رہ گئے تھے جن تک معاویہؓ خود نہیں پہنچے یا اُنہیں اپنے ہاں نہیں بلایا تھا۔

اصحابؓ رسولؐ کا استخفاف

اصحابِ رسولؐ نے جس حُسن و خوبی اور جس درجہ رضامندی سے امیر یزید کی خلافت پر بیعت کی تھی اور جس درجہ تپاک سے وہ ان کی خلافت پر جمع ہو گئے تھے وہ تاریخ کا ایک حیرتناک واقعہ ہے۔

یہ نظارہ ایک بڑا ہی ایمان افروز نظارہ تھا کہ پوری مملکت میں صرف دو بزرگوں کے سوا کسی ایک صحابی یا کسی ایک تابعی نے بھی ان کی بیعت سے انکار نہیں کیا۔

ابن معاویہؓ کی بیعت کے لئے اس درجہ کی گرمجوشی اور شوق و رغبت کو دیکھ کر طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یزید اگر کوئی فاسق و فاجر انسان

تھا، شراب و شاہد کا رسیا، رقص و سُرور کا عاشق اور فسق و فجور سے دلچسپی رکھنے والا لاابالی شخص ہی تھا۔ جس طرح کی گواہیاں اس کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے فراہم کر رکھی ہیں تو اصحابِ رسولؐ نے اس کی بیعت پر یوں کھُلی رضامندی کیوں ظاہر کر دی تھی۔

ظاہر ہے کہ ان کلھم عدولؓ کے مصداق پاکباز، متقی اور خدا سے ڈرنے والے لوگوں کا ایک فاسق کی اطاعت میں یوں برضا و رغبت جمع ہو جانا یقیناً ان کی پاک نفسی، پاک اندیشی اور ایمان و ایقان بداماں زندگی کے صریحاً منافی ہے۔

اور مولانا مودودی صاحب نے اس سوال کے جواب میں اصحابِ رسولؐ کی جو حالت بیان کی ہے وہ محض افسوسناک اور عبرت آموز ہی نہیں اصحابِ رسول کے شرفِ صحابیت کے بھی صریحاً منافی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا کی اس دریافت نے ان کے ضمیر کی کھٹک کو کچھ سہارا مہیا کر دیا ہو مگر اُن کی یہ دریافت اصحابِ رسولؐ کی زندگی سے ہموار نہیں ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

(جب یزید کی بیعت کے مطالبہ پر عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ، عبداللہؓ بن عمرؓ، عبداللہؓ بن زبیرؓ اور حسینؓ بن علیؓ نے حضرت معاویہؓ کو مایوس کر دیا تو) حضرت معاویہؓ نے کہا اب تک میں تم لوگوں سے درگزر کرتا رہا ہوں اب بھی خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی کہا تو دوسری بات اس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی تلوار اس کے سر پر پہلے پڑ چکی ہوگی۔

پھر آپ نے اپنے باڈی گارڈ کے افسر کو بلا کر حکم دیا کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک ایک آدمی مقرر کر دو اور اُسے تاکید کر دو کہ ان میں سے جو بھی میری بات کی تردید یا تائید میں زبان کھولے اس کا سر قلم کر دے۔

اس کے بعد وہ انہیں لئے ہوئے مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ یہ
.....لوگ ..... یزید کی ولیعہدی پر راضی ہیں اور انہوں نے بیعت
کرلی ہے لہٰذا تم لوگ بھی بیعت کرلو۔ اب لوگوں کی طرف سے انکار کا
کوئی سوال ہی باقی نہ تھا، اہل مکہؓ نے بھی بیعت کرلی [1]

اس تحریر میں حضرت مولانا نے جن بزرگوں کو بزدلی اور عافیت کے
شرف سے نوازا ہے ان میں سے ہر ایک کے بازو ہی خیبری کے امین اور
سینے اسد اللّٰہی کے خزینے تھے اور جیسا کہ ہم عرض کر آئے ہیں اس عبارت
میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے اسمائے گرامی
مولانا نے محض بات کا وزن بڑھانے کے لئے ہی قائم رکھے ہیں۔ تاہم حضرت
عبداللہؓ بن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ بن علیؓ نے یزید کی بیعت سے ضرور
انکار کیا تھا۔ ان میں حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کی حوصلہ مندی کا یہ
عالم تھا کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی موت سے تین ہی برس بعد ان کے
جانشین جناب امیر یزید کی حکومت کے خلاف بغاوت بھی کی اور یزید کی
خلافت کے مقابلہ میں خود اپنی خلافت کا اعلان بھی کیا اور یزید کی
فوجوں سے مسلح جنگ بھی کی اور ایک معقول علاقہ اپنے قبضہ میں کرلیا،
جہاں وہ ۶۴ھ سے ۷۳ھ تک حکمرانی کرتے رہے۔ ایسے اولی العزم انسان کی سیرت
کا وہ شرمناک رُخ جسے مولانا نے محض اپنی معاویہؓ دشمنی کی تسکین کے
زیر اثر پیش کیا ہے کسی بھی معقول آدمی کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔
اور حضرت حسینؓ بن علیؓ جن کو حضرت مولانا نے معاویہؓ کے حضور یوں
دست بستہ گردن جھکائے، موت سے دامن بچائے، حق کو چھپاتے اور
باطل کو چمکاتے دکھایا ہے۔ اس کو حضرت حسینؓ اور ان کے خانوادہ سے
مولانا کی نادان دوستی کا ہی ایک رُخ کہنا چاہیئے۔ اور مولانا کی یہ نادان دوستی

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ ۱۵۳

ٹھیک ایسے ہی ہے جس طرح بعض شیعہ مصنفین نے محض شیخین کو ظالم ثابت کرنے کے لئے شیرِ خدا حضرت علیؓ کو ابو بکرؓ کی بیعت کروانے کے لئے حضرت عمرؓ کے ہاتھوں گریبان پکڑے، مدینہ کی گلیوں اور بازاروں میں گھسیٹتے لئے چلے جاتے دکھایا ہے۔ جہاں تک حضرت حسینؓ کا تعلق ہے خود مولانا کے نزدیک بھی تھوڑا آگے چل کر ان کی جرأت کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے اپنے مشن کی تکمیل میں اپنی جان سمیت اپنے ساتھیوں اور اپنے بچوں تک کی جانیں قربان کر دیں۔

مولانا حسینؓ اور یزید کی اس کشمکش کو حق اور باطل کی جنگ کا نام دیتے ہیں۔ حسینؓ کو حق یا برسرِ حق قرار دیتے ہیں۔ یزید اور اس کے پیروکاروں کے ناحق اور برسرِ باطل ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حسینؓ نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کی جان قربان کر کے اسلام کو جان بخشی، خود مر مٹے مگر اسلام کو زندہ کر گئے۔ وہ نہ مرتے تو اسلام مر جاتا مگر انہوں نے خود مرنا قبول کیا لیکن اسلام کو نہ مرنے دیا۔

مگر یہ کیا تماشا ہے کہ وہی حسینؓ جو کربلا کے میدان میں ہزاروں مخالفوں کے سامنے اپنے طے کردہ حق کی خاطر اپنی پوری نسل کو قربان کر دینے پر آمادہ ہیں۔ مکہ میں معاویہؓ کی تلوار کو دیکھ کر اُن کے ایمان پر مردنی چھا گئی ہے۔ اور ان کی حق پسندی، حق کوشی اور حق پذیری موت کے خوف سے یوں پگھل گئی ہے جیسے سورج کی تیز شعاعوں سے برف کے تودے پگھل جاتے ہیں۔ سبحان اللہ، بات پھر وہیں آ کر ٹکی کہ ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

ہم یہ عرض کر آئے ہیں کہ یزید کی بیعت کے مسئلہ پر ان دونوں بزرگوں کا حضرت معاویہؓ سے اختلاف بھی یزید کے خلافت کے لئے نااہل ہونے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یزید پر اپنی تفضیلت کا ادعا تھا۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ خلافت کے سوال پر یہ دونوں بزرگ آپس میں
بھی ایک دوسرے سے کوئی اخلاص نہیں رکھتے تھے اور اپنی اپنی جگہ
خلافت حاصل کرنے کے لئے اپنے اپنے الگ الگ پلان رکھتے تھے۔
حسین یہ منصب اپنے لئے حاصل کر لینا چاہتے تھے اور ابن زبیر
کی مساعی اپنی خلافت کے لئے تھیں۔ چنانچہ بقول علامہ جلال الدین
سیوطی حضرت حسین جب اپنے تمام بہی خواہوں کے مشوروں کو مسترد کر کے
اپنے خاص پلان سے اہلِ کوفہ کے خطوط کی دلیل پر مکّہ سے نکل گئے
تو ان کے چچا حضرت عبداللہ بن عباس نے روتے ہوئے حضرت عبداللہ
بن زبیر کو مخاطب کر کے کہا۔

ابن زبیر! تم جو چاہتے تھے وہ ہو گیا۔ لو یہ حسین نکلے جاتے ہیں
اور تمہیں اور حجاز کو چھوڑے جاتے ہیں۔

پھر انہوں نے انہیں خطاب کرتے ہوئے ایک شعر پڑھا۔ جس کا
ترجمہ یہ ہے:

اے قنبیرہ جانور! اب میدان خالی ہے تو جس جگہ چاہے کھا اور
چر اور جہاں چاہے انڈہ دے۔[1]

مگر ان کے جو بھی جھگڑے تھے، ان کے داخلی معاملات جیسے بھی
تھے، ان کی سوچ کی راہیں خواہ جیسی بھی ہوں۔ یہ بات اپنی جگہ ہے
مگر ان بزرگوں کی اخلاقی حالت کے جس ناپسندیدہ رُخ کی مولانا نے
تشہیر فرمائی ہے اور محض معاویہؓ آزاری کے شوق میں جس طرح ان
کی آبرو کو رسوا کیا ہے یہ ایک ناروا جسارت ہی ہے۔ انہیں ان بزرگوں
کی عزتِ نفس کے لئے ہی اس جھوٹ کی پوٹ روایت کو ترک کر
دینا چاہیئے تھا۔

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی صد ۲۲۸ - ۲۲۹

کوئی بھی قابلِ معافی نہیں

مولانا کی یہ عبارت اپنے پلان کی تکمیل میں صرف ان دو بزرگوں یا مولانا کی اپنی مصلحت سے چار بزرگوں کی آبرو سے کھیلنے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ اپنے مقصد کو سیدھا رکھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی بھی صحابی کو معاف نہیں کرتے بلکہ اس زمانہ میں جس شخص سے بھی مولانا کے خلافِ منشا وقوع میں آیا ہے۔ مولانا نے ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہے۔ ارشاد ہے:

(معاویہؓ) بہرحال خلیفہ ہونا چاہتے تھے، انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی، مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا، لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا وہ اپنے زور سے خلیفہ بنے۔

اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں کے لئے بیعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس وقت اگر ان سے بیعت نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے بلکہ اس کے معنی خونریزی و بدنظمی تھے۔ [1]

اس مختصر سی عبارت میں مولانا نے حضرت معاویہؓ پر جو گولہ باری فرمائی ہے اور جس زہر میں ڈوبے قلم سے ان کے بارے میں اپنے کینے کا اظہار کیا ہے۔ ہم اپنے قارئین کو اس کی طرف توجہ نہیں دلا رہے، کیونکہ معاویہؓ کے بارے میں مولانا کا یہ معمول ہے اور معاویہؓ پہ زہر بھرے تیر سہنے کے عادی ہیں۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ مولانا نے اس عبارت میں معاویہؓ کے مقابلہ میں اصحابِ رسولؐ کو جس طرح بے بس اور دم بخود ظاہر

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۱۵۸

کیا ہے وہ اصحابِ رسول کی تاریخ کی کھلی توہین و تنقیص ہے۔ مولانا کے اس ارشاد میں معاویہؓ کی جابرانہ روش ترویات کا ایک بڑا ہی صاف رُخ ہے اس میں اصحابِ رسولؐ اور تابعین کی بے بسی اور بزدلی کا تذکرہ جس زیادتی کے ساتھ درج ہوا ہے وہ ایک تاریخی دردناکی ہے۔

مولانا نے معاویہؓ کی بیعت کے لئے جن لوگوں کو مجبور و بے بس ظاہر کیا ہے، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے قیصر و کسریٰ کی شوکتوں کی ناک میں نکیل ڈال دی تھی مگر آج وہ معاویہؓ کے سامنے بے بس ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اسلام کی خلافت کفر کے سانچے میں ڈھل رہی ہے اور معاویہؓ ابوبکرؓ اور عمرؓ کی سنت کو اختیار کرنے کے بجائے قیصر و کسریٰ کی سنت پر عمل کر رہے ہیں مگر اصحابِ رسولؐ کی ایمانی غیرت کروٹ تک نہیں بدلتی۔ ایک اقتباس مزید ملاحظہ ہو:

یہ نئی صورتِ حال پیدا ہوتے ہی مسلمانوں کی قیادت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ سیاسی قیادت کا تھا جسے طاقت سے بادشاہوں نے حاصل کر لیا تھا اور چونکہ اُسے نہ طاقت کے بغیر ہٹایا جا سکتا تھا نہ سیاسی قیادت بلا طاقت ممکن ہی تھی۔ اس لئے اُمت نے بادلِ ناخواستہ اُسے قبول کر لیا۔ یہ قیادت کافر نہ تھی کہ اُسے رد کر دینے کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ اس کے چلانے والے مسلمان تھے جو اسلام اور اُس کے قانون کو مانتے تھے۔ ... صرف ان کی سیاست دین کے تابع نہ تھی اور اس کی خاطر وہ اسلام کے اصولِ حکمرانی سے ہٹ گئے تھے۔ اس لئے اُمت نے ان کی سیاسی قیادت اس حد تک قبول کر لی کہ ان کے تحت مملکت کا انتظام چلتا رہے...... ان مقاصد کے لئے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین نے اگر اس قیادت کی بیعت کی تو وہ اس معنی میں نہ تھی کہ وہ انہی بادشاہوں کو امام برحق اور ان کی خلافت کو خلافتِ راشدہ اور مرشدہ مانتے تھے۔ بلکہ وہ صرف اس معنی میں تھی کہ وہ اس امرِ واقعی کو تسلیم کرتے تھے کہ اب اُمت کی سیاسی قیادت کے مالک یہی لوگ ہیں [1]

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۲۰۲

آہ کیا سچ ہے! ؎

نیش عقرب نہ از پئے کین ست
مقتضائے طبیعتش این ست

اب یہ بات تو اللہ ہی جانتا ہے کہ معاویہؓ آزاری کے اس شوق میں مولانا کی ناوک افگنی غالب رہتی ہے یا معاویہؓ کی حوصلہ مندی اور بُردباری جس کے پائے استقامت میں دریدہ دہن اور دیدہ چاک "جاریہ" کی نیش زنی سے بھی تزلزل پیدا نہ ہو سکا تھا۔

یہاں دیکھنے والی بات اصحابِ رسولؐ اور اصحاب سے مستفاد تابعین حضرات کے آتشِ ایمان کی وہ بدحالی ہے جو محض مولانا کی سیاسی ضرورتوں سے ہی یخ بستہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ان شیرانِ وغا کی وہ ایمانی حرارت جو کافری کے خرمن کفر و نخوت پر برقِ تپاں بن کر گرا کرتی تھی آج یہ نہ صرف ایک مسلمان اور مومن شخص کے بگاڑ کی اصلاح پر قادر نہیں بلکہ اس سے آنکھیں ملانے کی ہمت سے بھی بہرہ ور نہیں رہ سکی۔ یہ ایک المیہ ہی ہے کہ مولانا نے پہلے تو حضرت معاویہؓ کی دھاندلیوں کے ثبوت میں اصحابِ رسولؐ اور تابعین کے دب گھٹ کر رہ جانے کی صورت میں ان کے ضعفِ ایمان کا ایک مہیب منظر پیش کیا ہے۔ پھر مسلمان عوام کے سامنے اپنا بوجھ ہلکا رکھنے کی غرض سے اُن کے ضعفِ ایمانی کو اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کے پردہ میں لپیٹ دیا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ اصحابِ رسول معاویہؓ کی اطاعت یہ سمجھ کر کرتے تھے کہ چلو ان کی حکومت جیسی کچھ بھی ہے ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ:

ان کے تحت ملک کا انتظام چلتا رہے اور امن و امان قائم رہے، سرحدوں کی حفاظت ہوتی رہے، جمعہ و جماعت اور حج قائم ہوتا رہے وغیرہ[1]

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۲۰۲

کوئی پوچھے کہ یہ مراعات تو یہاں مسلمانوں کو انگریز کی حکومت میں بھی حاصل تھیں، نماز آزاد تھی، حج آزاد تھا، جمعہ جماعت قائم تھی۔ اگر کوئی چاہے تو معاملات کو شریعت کے مطابق طے کرانے کے لئے محمڈن لاء موجود تھا۔ پھر اگر اسلام پوری طرح آزاد نہیں تو بقول مولانا مودودی بھی۔

اسلامی حکومت کا کام محض مملکت کا نظم و نسق چلانا اور فوجیں لڑانا نہ تھا بلکہ اللہ کے پورے دین کو مجموعی طور پر قائم کرنا تھا۔[1]

اور اگر کوئی اسلامی حکومت یہ کام نہیں کرتی تو اس حکومت اور کافر حکومت میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے اہل حق کو ان دونوں حکومتوں کے خلاف خروج کرنے کی ضرورت ہے اور ان کا بدل ڈالنا شریعت کا عین تقاضا ہے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ یہاں کے غلام مسلمان تو انگریز کے ماتحت اس صورتِ حال پر قانع نہیں تھے اور اسے بدلنے کے لئے بار بار جمع ہوتے تھے، تحریکیں چلاتے تھے، قیدیں کاٹتے تھے، گولیاں کھاتے تھے، تشدد کا نشانہ بنتے تھے مگر حضرت اقبال اس پر بھی شاکی تھے کہ

مسلم کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

لیکن اسلام کی حکومت میں اپنی سہل گیری کو اسلام کی مصلحت بناکر مولانا اصحابِ رسولؐ کو متہم کر رہے ہیں کہ انہوں نے اسلام کی مصلحت سے ہی اسلام کو ذبح ہوتے دیکھنا گوارہ کر رکھا تھا۔

یعنی اگرچہ مولانا عام مسلمانوں کے خوف سے انہیں بزدل اور ایمانی غیرت سے خالی کہنے سے تو جھجک محسوس کرتے ہیں مگر الفاظ کے ہیر پھیر سے بات وہی کہی ہے جو انہیں کہنا مقصود تھی۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۲۰۱

جس مصلحت کو مولانا اصحابِ رسولؐ کے نام لگا رہے ہیں اگر یہ مصلحت ایمان باللہ کے حضور کسی درجہ میں بھی پذیرائی رکھتی ہے تو وہ یزید کے خلاف حسینؓ بن علیؓ کے خروج کو کیوں اس مصلحت کے منافی نہیں سمجھتے۔ حسینؓ کے خروج کو تو وہ باطل کے خلاف جنگ قرار دے کر اس کو حسینؓ کا ایمان افروز کارنامہ قرار دیتے ہیں مگر یہ ایمان افروز کارنامہ اصحابِ رسولؐ کے لئے وہ کیوں پسند نہیں کرتے۔ اور اگر اصحابِ رسولؐ نے معاویہؓ کے خلاف اس لئے خروج نہیں کیا تھا کہ وہ بہرحال مسلمان حکومت ہے تو حسینؓ نے یزید کو یہ رعایت کیوں نہ دی۔ اور اگر حسینؓ کا خروج عین حق ہے تو اس حق کے لئے اصحابِ رسولؐ کی غیرت کیوں بے تاب نہ ہوئی۔

اگر معاویہؓ کی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت سمجھ کر رعائت دی جا سکتی ہے تو اس رعایت کا یزید بھی حق دار تھا۔

آخر یزید اور معاویہؓ کی حکومت میں کیا فرق ہے۔ معاویہؓ بھی مولانا مودودی صاحب کے نزدیک زور و جبر سے اور لڑ بھڑ کر خلیفہ بنے تھے۔ انہیں مسلمانوں نے خلیفہ نہیں بنایا تھا بلکہ وہ اپنے زور سے خلیفہ بن گئے تھے۔ یہی صورت مولانا کے نزدیک یزید کی بھی تھی، معاویہؓ کی حکومت بھی معاویہؓ کی دھاندلیوں کا نتیجہ تھی اور یزید کی خلافت بھی دھاندلی اور دھونس سے ہی قائم کی گئی تھی۔ بڑی عجیب بات ہے کہ جو بات مولانا مودودی معاویہؓ کے لئے جائز سمجھتے ہیں یزید کے لئے جائز نہیں سمجھتے۔

صحابہ کو تو مولانا نے ان کی بے حسی پر یہ کہہ کر رعایت دی ہے کہ طاقت کو طاقت سے ہی ہٹایا جا سکتا ہے۔ مگر وہاں طاقت کی میسرگی ممکن نہیں تھی، لیکن حسینؓ نے تو بے طاقت جمع کئے ہی حکومت کے خلاف خروج کر دیا تھا اور مولانا کے نزدیک یہ عین امرِ حق تھا۔ اگر یہاں بے طاقت خروج امرِ حق ہے تو اس حق کو معاویہؓ کے خلاف بھی مصروفِ عمل ہونا چاہئے تھا۔

پھر مولانا اگر اصحابِ رسولؐ کے لئے یہ معذرت پیدا کر کے ان کی بے حسی پر شاہد بنتے ہیں کہ معاویہؓ کی حکومت بہر حال اسلامی حکومت تھی۔ حالانکہ جہاں اسلام پوری طرح آزاد اور نافذ نہ ہو اسے اسلامی حکومت کہنا صحیح نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی مسلمان کے سربراہِ مملکت بننے سے وہ حکومت اسلامی کہلا سکتی ہے تو انہی معنوں میں یہاں پاکستان کے اندر بھی سکندر مرزا، ایوب خاں، یحییٰ خاں اور بھٹو کی حکومتیں اسلامی حکومتیں ہی تھیں۔ مگر مولانا نے ان سب کو چیلنج دے رکھا تھا۔ انہوں نے انگریز کی کافر حکومت کے خلاف تو بلا واسطہ کبھی کوئی کاروائی نہیں کی تھی۔ مگر ان مسلمان حکومتوں کے خلاف ہمیشہ سرگرمِ عمل رہے۔ تو کیا اصحابِ رسولؐ اس فلسفہ سے واقف نہیں تھے جسے مولانا نے حاصل کر رکھا تھا۔ یا کیا وہ مولانا سے بھی گئے گزرے تھے کہ آنکھوں دیکھ کر زہر کھاتے رہے۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا جب معاویہؓ کے زیر سایہ اصحابِ رسولؐ کی صفائی میں یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی تنظیم کے نہ ہونے کی وجہ سے خاموش تھے اور انہوں نے بامرِ مجبوری معاویہؓ کی اطاعت کر رکھی تھی تو اس سے مقصود مولانا کو دراصل اصحابِ رسولؐ کی صفائی پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس پہلو سے بھی مولانا کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ معاویہؓ ظالم تھے سخت گیر تھے، دھاندلی باز تھے اور انہوں نے جبر و زور سے لوگوں کے قول و فعل پر قبضہ کر رکھا تھا، ان کی زبانیں کاٹ رکھی تھیں اور ان کی آزادی چھین لی تھی۔

افسوس ہے کہ مولانا نے ایک غلط راہ اختیار کرلی ہے اور شاید اب یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ معاویہؓ اللہ تعالےٰ کے محبوب رسولؐ کے محبوب صحابی تھے۔ بہ دعائے رسولؐ وہ ہادی و مہدی بھی تھے۔ اللہ کے رسولؐ اُن سے ہمیشہ خوش رہے اور خوش ہی دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہی ایک ارشد خلیفہ تھے جس طرح

حضرت علیؓ اور ان سے پہلے بزرگ حضورؐ کے ارشد خلفاء تھے۔ رسول اللہؐ کا ہر صحابی حدیثِ رسولؐ کے ماتحت ایک روشن ستارہ اور ہدایت کا منبع ہے۔ اور اگر وہ خلافت تک پہنچے تو ارشد خلیفہ ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزاروں اصحاب تھے جنہوں نے معاویہؓ اور یزید دونوں کی بیعت کی ہے اور یقیناً اصحابِ رسولؐ کسی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتے۔ پس معاویہؓ یقیناً ارشد خلیفہ تھے۔ ان کے جانشین اُن کے جائز اور درست جانشین تھے۔ اصحابِ رسولؐ نے صحیح سوچ کر، صحیح دیکھ کر ان کی بیعت کی تھی۔ وہ ان کے خلاف اس لئے خاموش نہیں تھے کہ طاقت سے محروم تھے بلکہ اس لئے ان کی بھی اطاعت کرتے تھے کہ اُن کے نزدیک یہ سب کچھ صحیح تھا اور بسمتِ صحیح واقع ہوا تھا۔ اگر مولانا بھی اصحاب رسولؐ کو مجبور بنا کر رکھنے اور ان کی بیعت کو اکراہ بنا کر پیش کرنے کے بجائے یہ قرار دے لیتے کہ اصحابِ رسولؐ نے اس آیہ کریمہ پر عمل کر رکھا تھا جس میں مومنوں کو حکم ہوا ہے کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ تو کوئی الجھن باقی نہ رہتی۔ نہ اصحابِ رسولؐ کے لئے بزدلی اور مجبوری کے مفروضے قائم کرنے پڑتے۔ نہ ایک غلطی کو صحیح بنانے کے لئے کئی غلطیاں کرنا پڑتیں، نہ ایک گمراہی کو صراطِ مستقیم ثابت کرنے کے لئے کئی گمراہیوں کے ارتکاب کی ضرورت پڑتی اور اگر مولانا ایسا کرتے تو ان کا اپنا اُخروی مستقبل بھی کسی خطرے میں نہ پڑتا یقیناً یہ ایک صحیح راستہ ہی تھا اور یہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کا بہترین سبیل تھی۔

مگر افسوس ہے کہ صحابہ پر تنقید کا جو طریقہ مولانا نے اختیار کیا ہے یہ اپنے ہر پہلو سے ہی اصحابِ رسولؐ کے لئے تباغض و تنافر کے ضمن میں ہی آتا ہے۔

طعن و تنقیص اور طنز و تعریض کی اس مہم کو تحقیق کہنا کوئی اچھا شغل نہیں ہے۔

بلاشبہ ہر شخص ایک مفاد رکھتا ہے اور یہ مفاد اُسے عزیز بھی ہوتا ہے جیسے فرمایا وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۔ مگر مولانا کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی مفاد کو اصحابِ رسولؐ کی رِدائے آبرو کی قیمت پر حاصل کرنے لگیں کہ اصحابِ رسولؐ سے یہ تباغض و تنافر حدیثِ پاک کے بموجب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات سے تباغض و تنافر کے ذیل میں آتا ہے بس سے

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بین و کارِ آساں کن

باب چہارم

امیر المومنین معاویہؓ پر مولانا مودودی کے آٹھ سخت و شدید حملے

فصل اوّل

پہلا حملہ

تقررِ خلیفہ کے دستور میں تبدیلی

مولانا اپنی بات اٹھاتے ہوئے رقمطراز ہیں:

مسلمانوں کا خلافتِ راشدہ جیسے بے نظیر مثالی نظامِ نعمت سے محروم ہو جانا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا جو اچانک، بلا سبب رونما ہو گیا ہو۔ بلکہ اس کے کچھ اسباب تھے اور وہ بتدریج امت کو دھکیلتے ہوئے خلافت سے ملوکیت کی طرف لے گئے[1]

اس کے بعد مولانا وہ اسباب بیان کرتے ہیں جو اس تبدیلی کا باعث بنے۔ ارشاد ہے:

اوّلین بنیادی تبدیلی اس دستوری قاعدے میں ہوئی جس کے مطابق کسی شخص کو امت کا سربراہ بنایا جاتا تھا۔

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۵۷ سطر ۳ تا ۵

خلافتِ راشدہ میں وہ قاعدہ یہ تھا کہ کوئی شخص خود خلافت حاصل کرنے کے لئے نہ اٹھے اور اپنی سعی و تدبیر سے برسرِ اقتدار نہ آئے، بلکہ لوگ جس کو اُمت کی سربراہی کے لئے موزوں سمجھیں اپنے مشورے سے اقتدار اُس کے سپرد کر دیں۔ بیعت اقتدار کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا سبب ہو بیعت حاصل ہونے میں آدمی کی اپنی کسی کوشش یا سازش کا قطعاً کوئی دخل نہ ہو۔ لوگ بیعت کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں پوری طرح آزاد ہوں اور جب تک کسی کو لوگوں کی آزادانہ رضامندی سے بیعت حاصل نہ ہو جائے، وہ برسرِ اقتدار نہ آئے۔

خلفائے راشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدہ کے مطابق برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اُن میں سے کسی نے بھی خود خلافت لینے کی، برائے نام بھی کوشش نہ کی تھی، بلکہ جب خلافت اُن کو دی گئی تب اُنہوں نے اس کو لیا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لئے احق سمجھتے تھے۔ لیکن کسی قابلِ اعتبار تاریخی روایت سے ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اُنہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔ لہٰذا اُن کا محض اپنے آپ کو احق سمجھنا اس قاعدے کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔[1]

---

[1] ضمیر کے خلاف کرنے میں بڑی خرابی یہی ہے کہ آدمی کو بعض اوقات خود اپنے ضمیر سے پیچھا چھڑانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اب اگر امر واقعہ یہی تھا کہ (خلفائے راشدین میں سے) "کسی نے بھی خود خلافت لینے کی برائے نام بھی کوشش نہ کی تھی"۔

تو سیدنا علیؓ بھی اُن خلفاء میں شامل تھے۔ پھر اُن کے بارے میں یہ الگ صفائی بیان کرنے کی کیا حاجت تھی! مولانا کا یہ صفائی پیش کرنا ہی ظاہر کرتا ہے کہ یہاں دال میں کچھ کالا ہے اور مولانا کا وہ تکلف کسی ضرورت سے بے حقیقتِ حال کا اظہار نہیں ہے۔

درحقیقت چاروں خلفاء اس معاملے میں بالکل یکساں تھے کہ ان کی خلافت دی ہوئی خلافت تھی نہ کہ لی ہوئی خلافت۔

ملوکیت کا آغاز اسی قاعدے کی تبدیلی سے ہوا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہ تھی کہ مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے۔

وہ بہرحال خلیفہ ہونا چاہتے تھے، انہوں نے لڑکر خلافت حاصل کی مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا۔ لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے۔ اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں کے لئے بیعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس وقت اگر ان سے بیعت نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے بلکہ اس کے معنی خونریزی و بدنظمی کے تھے جسے امن اور نظم پر ترجیح نہیں دی جا سکتی تھی۔

اسی لئے امام حسن رضی اللہ عنہ کی دستبرداری (ربیع الاول ۴۱ ہجری) کے بعد تمام صحابہ و تابعین اور صلحائے اُمت نے ان کی بیعت پر اتفاق کیا۔ اور اس کو "عام الجماعۃ" اس بنا پر قرار دیا کہ کم از کم خانہ جنگی تو ختم ہوئی[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حضور مولانا مودودی صاحب کی اس شعلہ بداماں اور زہر میں ڈوبی تقریر کو سننے کے لئے حضرت معاویہؓ کی سی حوصلہ مندی ہی درکار ہے۔ مگر یہ معاویہؓ کا ہی حصہ تھا اور ان کے بعد یہ دولت اتنی فراوانی سے کسی کو کم ہی ملی ہے۔

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ۔

(حٰم سجدہ) کہ یہ دولت کسی بڑے ہی حوصلہ مند اور بڑے ہی خوش نصیب

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ ۱۵۷ - ۱۵۸

شخص کا حصہ ہے۔ ؏

ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

ہم مولانا کے اس اسلوبِ نگارش پر اظہارِ افسوس نہیں کرتے اور اُن کے بہت مشکور ہیں کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی خلافت کے خلاف کوئی دلیل پیش کرنے سے قبل اپنا دل پیش کیا ہے اور ہم مولانا کے اس تحفے کو ان کی عاقبت کا توشہ سمجھ کر ان سے بعد احترام وصول کر کے اُن کے اور حضرت معاویہؓ کے خدا کے حضور آخری فیصلہ کے لئے پیش کرتے ہیں ؎

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اللہ اکبر! شاعر نے کتنی برمحل بات کہی ہے کہ ؎

الٰہی! کس بے گناہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کُشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اُس کے شورِ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ہے

مولانا کی اس تحریر کے تین بنیادی اجزا ہیں:

۱۔ خلافتِ راشدہ میں (سربراہِ اُمت کے انتخاب کا) قاعدہ یہ تھا کہ کوئی شخص خود خلافت حاصل کرنے کے لئے نہ اُٹھے اور اپنی سعی و تدبیر سے برسرِ اقتدار نہ آئے بلکہ لوگ جس کو اُمت کی سربراہی کے لئے موزوں سمجھیں اپنے مشورے سے اقتدار اُس کے سپرد کر دیں۔

بیعت اقتدار کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا سبب ہو، بیعت حاصل کرنے میں آدمی کی اپنی کسی کوشش کا قطعاً کوئی دخل نہ ہو، لوگ بیعت کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں پوری طرح آزاد ہوں۔

۲۔ خلفائے راشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدے کے مطابق برسرِ اقتدار آیا تھا اور اُن میں سے کسی نے بھی خود خلافت لینے کی برائے نام بھی کوشش نہیں کی تھی۔ سیدنا علیؓ کے متعلق اگر کوئی شخص زیادہ سے

زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لئے احق (سب سے زیادہ حقدار) گھتے تھے۔ لیکن کسی قابلِ اعتماد تاریخی روایت سے ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔

۲۔ حضرت معاویہؓ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہ تھی کہ مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں۔ اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے۔

وہ بہر حال خلیفہ ہونا چاہتے تھے۔ انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی۔ مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا۔ لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے۔

اگر اس وقت اُن سے بیعت نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے بلکہ اس کے معنی خونریزی اور بدنظمی کے تھے جسے امن اور نظم پر ترجیح نہیں دی جا سکتی تھی۔ اسی لئے امام حسن رضی اللہ عنہ کی دستبرداری (ربیع الاوّل ۴۱ھ) کے بعد تمام صحابہ و تابعین اور صلحائے امت نے اُن کی بیعت پر اتفاق کیا اور اس کو "عام الجماعۃ" اس بنا پر قرار دیا کہ کم از کم خانہ جنگی تو ختم ہوئی۔

جزو اوّل مولانا کی تحریر کے جزو اوّل سے ہمیں از اوّل تا آخر سرِ مُو بھی اختلاف نہیں ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ خلافتِ راشدہ کی ٹھیک یہی بنیاد ہے اور جس خلافت کی بنیاد میں یہ اصول کارفرما نہ ہوں گے اُسے قانونی خلافت تو کہا جا سکتا ہے مگر وہ خلافتِ راشدہ نہیں کہلا سکتی۔

یقیناً بیعت کو اقتدار کا نتیجہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اقتدار کو ہی بیعت کا نتیجہ بننا چاہیئے۔

بلاشبہ خلافت جو اللہ کے بندوں میں اللہ کی نیابت کا درجہ رکھتی ہے۔ اُسے ان تمام دینی اور اخلاقی خساستوں سے پاک ہونا چاہیئے۔ جو دینِ حق کی ضد ہیں اور اخلاق کے حسن کو گہناتی ہیں۔

زور و جبر سے کسی کو غلام بنا رکھنا ایک انتہائی غیر انسانی حرکت ہے اور آدمی کی رائے پر جبر کی حکومت اخلاق کے کسی بھی قاعدہ کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی آدمی کو اس کی رائے کے خلاف خود اپنی اطاعت اور اپنے نازل کردہ دین کو قبول کرنے کے لئے بھی مجبور نہیں کیا ہے۔ تو وہ دوسروں کو یہ اجازت کیونکر دے سکتا ہے کہ وہ اُسے زور و جبر سے اپنا پابند بنالیں اور اس کی رائے اپنی طاقت سے اپنے حق میں حاصل کریں۔ اس قسم کی کوئی غیر اخلاقی حرکت تو عام خلافت میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔ پھر خلافتِ راشدہ کے اندر اس کی گنجائش کیونکر ممکن ہے۔

اور جہاں تک خلافت حاصل کرنے کے لئے کسی سعی و تدبیر اور کسی سازش و سرگوشی کا تعلق ہے اس سلسلہ میں بھی مولانا کی رائے صحیح ہے کیونکہ اقتدار کے لئے سعی و سازش اہل غرض جاہ پرست اور طالع آزما قسم کے لوگوں کا شیوہ ہے۔ جو اقتدار کو اپنی اغراض مشئومہ کی تکمیل اور اپنے نفس کی تسکین کا ذریعہ بناتے ہیں۔

خلافت ایک عظیم ذمہ داری ہے۔ اور خلیفہ اگر سچا مومن ہے تو اُسے اپنے رب کے حضور جوابدہی کا یقین ہوتا ہے اور اپنے اللہ کے ہاں جوابدہی کے تصور سے ہی اس کی روح کانپ جاتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ ذمہ داری اس کی زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے جس کے ذریعہ اسے سخت آزمائش کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

اب جو شخص اپنی زندگی کی اس سخت تر آزمائش کو اپنے دامن کی

دولت بنانے کے لئے بھاگ دوڑ کرے گا اور رائس کو حاصل کرنے کے لئے سازشوں کے جال بُنے گا۔ یقیناً اس کے دل میں خدمت کرنے کے بجائے خدمت لینے کا جذبہ ہی کام کر رہا ہے۔

یقیناً وہ اپنی خلافت کے لئے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے بجائے خلافت کی طاقت سے دوسروں سے خود فائدہ اٹھانے کا عزم رکھتا ہے۔ وہ اقتدار کو عدالت کا نہیں جلبِ منفعت کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے ورنہ کس کا حوصلہ ہے کہ وہ بیٹھے بٹھائے یہ دردِ سر مول لے اور اپنی اُنگلی بچھو کے بل میں جا داخل کرے۔

جُزوِ ثانی

مولانا کی تحریر کے جُزوِ ثانی کے دو حصے ہیں :

ا- خلفاءِ راشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدے کے مطابق برسرِ اقتدار آیا تھا اور ان میں سے کسی نے بھی خود خلافت لینے کی برائے نام بھی کوشش نہیں کی تھی۔

۲- سیدنا علیؓ کے متعلق اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لئے احق سمجھتے تھے لیکن کسی قابلِ اعتبار تاریخی روایت سے اُن کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اُنہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔

مولانا کی تحریر کے بظاہر یہ دو حصے ہی ہیں مگر دراصل یہ دونوں حصے آپس میں لازم و ملزوم ہی ہیں اور ایک کو دوسرے سے بنیادی قسم کی گہری وابستگی اور شدید تعلق ہے۔ پہلا حصہ اپنے اندر عمومیت کا رنگ رکھتا ہے، اور دوسرے کا تعلق خاص طور پر سیدنا علیؓ کی ذات سے ہے۔ مگر اس آخرالذکر حصّہ کا مضمون بھی حصہ اوّل کے ساتھ مل کر ہی بامعنی بنتا ہے۔

ہم نے مولانا کی تحریر کے جُزوِ اوّل پر بات کرتے ہوئے مولانا کے تجزیہ و تخریج

سے ازاوّل "تا آخر حرف بحرف اتفاق کا اظہار کیا ہے۔ مگر ہمیں مولانا کی تحریر کے اس جزوِ ثانی کے دونوں حصوں سے ہی اسی سطح کا بھرپور اختلاف ہے جس سطح کا جزو اوّل سے بھرپور اتفاق تھا۔ کیونکہ جہاں تک اس جزوِ ثانی کے حصہ اوّل کا تعلق ہے مولانا کا یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ خلفائے راشدین میں سے ہر ایک ہی اسی قاعدہ کے مطابق برسراقتدار آیا تھا جو خلافتِ راشدہ کا دستور تھا۔ کیونکہ جن تواریخ کو مولانا بھی معتبر مانتے تھے اگر مولانا کی بیان کردہ ان معتبر تواریخ کی معتبر روایات کا اعتبار کیا جائے تو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافتوں تک تو بلاشبہ وہی دستورِ انتخاب قائم رہا ہے جسے مولانا نے بھی خلافتِ راشدہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔

ان تینوں خلفاء کے انتخاب کی صورت بلاشبہ یہی تھی کہ نہ خلیفہ کو خلافت کی خواہش تھی، نہ اُس نے کوئی کوشش کی نہ کسی سازش کا مرتکب ہوا، نہ بیعت کے لئے ہی کوئی زور وجبر کام میں لایا گیا مگر حضرت علیؓ کی خلافت کے مرحلہ پہ حضرت علیؓ کی خلافت کا انعقاد مولانا مودودی صاحب کی مسلّمہ معتبر کتب کی معتبر روایات کے مطابق اُس قاعدہ اور دستور کے مطابق عمل میں نہیں آسکا تھا جسے مولانا نے خلافتِ راشدہ کی شرط قرار دیا ہے اور اس باب میں مولانا کا یہ بیان غلط اور خلافِ واقعہ ہے کہ:

"کسی قابلِ اعتبار تاریخی روایت سے اُن (یعنی سیّدنا علیؓ) کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔"

کیونکہ خود مولانا کی بیان کردہ معتبر کتب کی معتبر تاریخی روایات کی روشنی میں بھی سیّدنا علیؓ کی خلافت نہ اتفاقِ عامہ سے ہی منعقد ہوئی تھی اور نہ رائے دہندگان کو ہی رائے دینے کی آزادی تھی کہ وہ اپنی رائے کو اپنی مرضی

کے مطابق استعمال کرتے۔

سیدنا علیؓ کی خلافت کا انعقاد جن حالات میں اور جس مرحلہ پر عمل میں آیا۔ مدینہ منورہ کے حالات نہایت درجہ سنگین تھے۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ حرم مدینہ میں قتل ہوئے پڑے تھے۔ قاتل اور بلوائی نہ ان کی نعش کو اٹھانے کی اجازت دے رہے تھے نہ دفن کرنے کی۔ شہر میں ہر طرف جارحیت اور درندگی کا دَور دَورہ تھا۔

سیدنا عثمانؓ کے قاتل، بلوائی اور باغی تلواریں گھماتے آدم بو آدم بو پکارتے مدینہ کی گلیوں اور بازاروں میں للکارے اُڑاتے گھوم پھر رہے تھے۔ اصحاب رسولؐ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ گھر سے باہر صرف وہی محفوظ تھا جو قاتلوں اور بلوائیوں کا ساتھی یا حامی تھا۔

زندگی پر پہرے بیٹھے تھے انسانی حیات بلاؤں میں محصور تھی، باغی اور بلوائی جو چاہتے تھے کرتے تھے اور جو وہ نہیں چاہتے تھے وہ نہیں ہوسکتا تھا۔

ان حالات میں حضرت علیؓ کا انتخاب انہی قاتلوں، باغیوں اور بلوائیوں کی زیرِ نگرانی اور انہی کے اہتمام سے عمل میں آیا۔ خود مولانا مودودی صاحب ہی لکھتے ہیں:

"ان لوگوں نے ۴۰ روز تک ایک ہنگامہ عظیم برپا کئے رکھا جس کے دوران میں ایسی ایسی حرکات اُن سے سرزد ہوئیں جو مدینۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھیں۔

حتیٰ کہ انہوں نے اُمّ المومنین اُمِ حبیبہؓ کی توہین کی اور حضرت عائشہ یہ کہہ کر مدینہ سے مکّہ چلی گئیں کہ اس طوفانِ بدتمیزی میں کیا میں بھی اپنی توہین کراؤں!

آخرکار ان لوگوں نے ہجوم کرکے سخت ظلم کے ساتھ حضرت عثمانؓ کو شہید کردیا۔ تین دن تک اُن کا جسدِ مبارک تدفین سے محروم رہا اور قتل کرنے کے بعد ظالموں نے اُن کا گھر بھی لوٹ لیا۔ [۱]

---

[۱] خلافت و ملوکیت صـ ۱۲۹

اُنہوں نے اہم ناکوں پر قبضہ کر کے اہلِ شہر کو بے بس کر دیا تھا[1]

ان خطرناک مخدوش دہشت اثر غیر یقینی اور مشکوک حالات میں جب سیدنا علی رضؓ کو خلافت کی خلعت پہنائی گئی تو خلیفہ کے اس انتخاب کی جو کیفیت تھی وہ بھی مولانا مودودی صاحب کی زبانِ قلم سے سُن لیجیے۔

"حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے والوں میں اُن لوگوں کی شرکت (کھلے طور پر موجود تھی) جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کرنے کے لئے باہر سے آئے ہوئے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے بالفعل جرم قتل کا ارتکاب کیا تھا اور وہ بھی جو قتل کے محرک تھے اور اس میں اعانت کے مرتکب ہوئے تھے[2]

بعض اکابر صحابہ کا حضرت علیؓ کی بیعت سے الگ رہنا (ایک الگ مسئلہ بن چکا تھا) وہ بہرحال اُمت کے با اثر لوگ تھے، اُن میں سے ہر ایک ایسا تھا کہ جس پر ہزاروں مسلمانوں کو اعتماد تھا۔ اُن کی علیحدگی نے دلوں میں شک ڈال دیئے[3]

اور پھر اس انتخاب میں جو جو حربے استعمال کئے گئے وہ ٹھیک ایسے ہی تھے جن کو ہم یہاں اپنی مسلمان کہلانے والی بعض حکومتوں کے ہاتھوں اپنی آنکھوں دیکھتے ہیں۔ مولانا مودودی رقمطراز ہیں:

ایسی روایات بھی بلاشبہ موجود ہیں کہ جب حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا تو اُن لوگوں (یعنی بلوائیوں اور قاتلینِ عثمانؓ) نے بعض حضرات کو زبردستی بھی بیعت پر مجبور کیا[4]

مولانا کے قلم نے جس احتیاط سے سنگین روایات کا خلاصہ اپنے پہنچے تولے الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ہم اُس کو بھی مولانا کا احسان ہی سمجھتے ہیں اور

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۱۹ سطر ۱۲-۱۳ [2] ایضاً صہ ۱۲۳ سطر ۷ تا ۹
[3] ایضاً صہ ۱۲۴ [4] ایضاً صہ ۳۲۵ سطر ۱۸-۱۹

اگر قاری اپنی فکر کو ساتھ ملالے تو وہ مولانا کی اس مختصر سی خبر میں بھی واقعات کی تفصیل پنہاں پائے گا۔

تاہم مولانا نے اپنی جن مسلّمہ معتبر کُتب تواریخ کے حوالہ سے اشارۃً ایک خبر دی ہے ہم اپنے قاری کی واقفیت کے لئے یہ پوری خبر پیش کئے دیتے ہیں تاکہ اُن حالات کی ٹھیک ٹھیک عکاسی ہو سکے جن حالات میں سیدنا علیؓ کی خلافت منعقد ہوئی تھی۔ مولانا کے مسلّمہ معتبر مورخ علامہ طبری لکھتے ہیں:

- جب لوگوں نے حضرت علیؓ کی بیعت کی تو اُنہوں نے طلحہؓ و زبیرؓ کو بلوایا۔ طلحہؓ نے بیعت سے پس و پیش کیا۔ مالک اشتر نخعی (حضرت عثمانؓ کے قاتلین کا سردار) تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا اور بولا:

  طلحہؓ! بیعت کر لے ورنہ خدا کی قسم میں یہ تلوار تیری پیشانی میں بھونک دوں گا۔ اس پر طلحہؓ نے حضرت علیؓ کی بیعت کر لی [1]
- جب لوگوں نے علیؓ کی بیعت کی تو اشتر طلحہؓ کو پکڑ لایا۔ طلحہؓ کہنے لگے مجھے یہ تو معلوم کر لینے دو کہ لوگ کیا ارادہ رکھتے ہیں مگر اشتر نے انہیں مہلت دینے سے انکار کر دیا اور انہیں گریبان سے پکڑتا ہوا گھسیٹ کر لایا اور لا کر منبر پر چڑھا دیا۔ پھر اُنہوں نے علیؓ کی بیعت کی [2]
- حکیم بن جبلہ جا کر زبیرؓ کو پکڑ لایا اور اُنہیں علیؓ کی بیعت کے لئے مجبور کیا۔

حضرت زبیرؓ کہا کرتے تھے کہ میرے پاس بنی عبدالقیس کے چوروں میں سے ایک چور (حکیم بن جبلہ) آیا تھا اس لئے میں نے مجبوراً بیعت کر لی تھی

- انصار کے کچھ لوگوں نے آپ کی بیعت سے گریز کیا۔ طلحہؓ کہا کرتے تھے کہ ہمارے لئے اس بیعت کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں جیسے ایک کتا

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۳ [2] طبری جلد ۳ باب ۳ [3] طبری جلد ۳ باب ۳

مجبوراً زمین پر ناک رگڑ رہا ہو۔[1]

- جبر و زیادتی کے خوف سے مسلمانوں کی ایک جماعت مدینہ سے شام کی طرف بھاگ گئی۔[2]
- حضرت علیؓ کی بیعت سب سے پہلے (حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کے سردار) اشتر نخعی نے کی تھی۔[3]

مدینہ میں جبری بیعت کے ان واقعات کی شہرت جب باہر کے مسلمانوں تک پہنچی تو طبعاً انہیں اس سے بہت تکلیف ہوئی۔ بصرہ میں جب علیؓ کی بیعت قبول کرنے یا قبول نہ کرنے کی بحث چلی تو علیؓ کے مخالفین کی طرف سے بڑی دلیل کے بطور حضرت علیؓ اور اُن کے رفقا کی طرف سے اس جبر و زیادتی کو ہی پیش کیا گیا۔ حضرت علیؓ کے حامی اس کو مخالفانہ پروپیگنڈہ کہتے تھے اور جبر کے ان واقعات کی سچائی سے انکار کرتے تھے۔ دوسری طرف خود طلحہؓ اور زبیرؓ جو وہاں پہنچ چکے تھے اپنے حق میں اس جبر کی کہانی کو باصرار اور حلفاً پیش کرتے تھے۔ چنانچہ اصل صورت کی وضاحت کے لئے بصرہ کے حاکم عثمان بن حنیف نے ایک وفد مدینہ منورہ روانہ کیا اور خود حضرت علیؓ سے ہی صورتِ حال کی وضاحت چاہی۔ اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے حضرت عثمان بن حنیف کو جو خط لکھا اس میں انہوں نے اس جبر اور زیادتی کو ایک عذر کے ساتھ بالفاظ ذیل تسلیم کیا۔ سیدنا علیؓ نے لکھا:

> خدا کی قسم ان دونوں (طلحہؓ و زبیرؓ) کو کسی فرقہ بندی پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ جماعت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے اُن پر دباؤ ڈالا گیا۔ اور ایک نیک کام کی خاطر ہی اُن سے زبردستی کی گئی تھی۔[4]

اور پھر اگر اپنی مسلمہ معتبر تاریخ کی ان معتبر روایات کی موجودگی میں بھی

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۲ [2] طبری ایضاً [3] طبری ایضاً [4] طبری جلد ۳ باب دوم

مولانا مودودی صاحب پورے فاتحانہ انداز میں اپنی کتاب کے قارئین سے یہی دریافت کریں کہ کیا اُس وقت کے رائج اور مسلمہ اسلامی دستور کی رُو سے حضرت علیؓ جائز طور پر خلیفہ منتخب نہ ہو گئے تھے ؟ [1]

تو اس پر سوائے اس کے کیا عرض کیا جائے کہ ؎

مجھے قتل کر کے وہ بھولا سا قاتل　　لگا پوچھنے کس کا تازہ لہو ہے
کسی نے کہا جس کا وہ سر پڑا ہے　　کہا بھول جانے کی کیا میری خو ہے

اس مرحلہ پر ہمیں یہ تسلیم کرنے سے تو کچھ بھی مانع نہیں ہے کہ سیدنا علیؓ حالات کے ہاتھوں مجبور تھے اور انہیں بلوائیوں کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر بلوائیوں کو ظلم و زیادتی سے روکتے تو ضرور وہ بھی قتل کر دیئے جاتے۔ مگر حالات کے اس آئینہ میں اور مولانا مودودی صاحب کے قابلِ اعتبار مورخین کی پیش کردہ روایات کی روشنی میں اس امر کو تسلیم کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ سیدنا علیؓ کا انتخاب بھی اسی دستور کے مطابق تھا جو دستور حضرت ابو بکرؓ سے حضرت عثمانؓ تک جاری رہا تھا۔

جبکہ منتخب ہو جانے والے خلیفہ حضرت علیؓ کا اپنا حال بھی بقول مورخ طبری یہ تھا کہ :

باغی حضرت علیؓ کے ہاں گئے اور اشتر نخعی نے حضرت علیؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ خدا کی قسم اگر آپ نے اب اپنا ہاتھ چھڑایا (یعنی ہماری مرضی کے عین مطابق بیعت لینے میں کچھ پس و پیش سے کام لیا) تو آپ بہت زیادہ کوتاہ نظر ثابت ہوں گے [2]

حضرت علیؓ نے جب باغیوں اور بلوائیوں کے یہ تیور دیکھے تو پھر ان کی مرضی اور اُن کے پروگرام کے مطابق ٹھیک ایسے ہی بیعت قبول کر لی جس طرح ایسے ہی حالات میں حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ نے حضرت علیؓ کی بیعت پر صاد کر دیا تھا۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۳۶ سطر ۱-۲　[2] طبری جلد ۳

اور جہاں تک مولانا مودودی صاحب کے فاتحانہ استفسار کے جواب کا تعلق ہے تو اس باب میں ان کے سوال پر کچھ کہنے کے بجائے اُن کی بزرگی کے اکرام میں خاموش رہنا زیادہ قرین صواب ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جنگل کے قانون اور جنگل کے ضابطہ کو اسلامی دستور کہنے والے بزرگ کا جواب خاموشی کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے!

احق اور غیر احق

مولانا کے بیان کا دوسرا حصہ یہ ہے:

"سیدنا علیؓ کے متعلق اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لئے احق (یعنی دوسرے سب لوگوں سے بڑھ کر حقدار) سمجھتے تھے۔ لیکن کسی قابلِ اعتبار تاریخی روایت سے اُن کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔"

مولانا کے اس بیان کے بھی دو اجزا ہیں: اوّل، حضرت علیؓ کا اپنے آپ کو خلافت کے لئے احق سمجھنا اور دوم، مولانا کا یہ ادعا کہ حضرت علیؓ نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی نہیں کی۔ ہم پہلے اس بیان کے جزو اوّل کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ اس باب میں حضرت علیؓ کا موقف بالکل واضح اور غیر مبہم ہے اور انہوں نے اپنے اس موقف کے اظہار میں کبھی مداہنت سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ خلافت کی ہر تبدیلی کے موقع پر مولانا کی معتبر مانی ہوئی کتب تاریخ کے مطابق یہ بات برملا کہتے رہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرب، عزیز ہونے کے ناطے سے حضورؐ کی خلافت دوسرے سب لوگوں کے مقابل میں انہی کا حق ہے [۱]

بلکہ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کرتے وقت انہیں رُو در رُو کہا:

اے ابو بکرؓ، میں نے آج تک جو تمہارے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے تمہاری کسی فضیلت سے انکار ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ تم نے زبردستی ہمارا حق ہم سے چھین لیا [۲]

مزید فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل ہونے کی رشتہ سے یقیناً ہم ہی خلافت کے مستحق تھے [۳]

ایسے میں بات حضرت علیؓ کے اپنے آپ کو خلافت کے لئے احق سمجھنے کی نہیں کیونکہ یہ امر تو ایک حقیقت بیّنہ ہی ہے۔ بات تو مولانا سے پوچھنے کی ہے کہ وہ حضرت علیؓ کے اس موقف کو صحیح سمجھتے ہیں یا غلط!

حقیقت یہ ہے کہ مولانا جب یہ فرماتے ہیں کہ:

سیدنا علیؓ کے متعلق اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لئے احق سمجھتے تھے۔

تو ظاہر ہے کہ مولانا حضرت علیؓ کے موقف کو صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ یہ الفاظ حضرت علیؓ کے لئے ایک دفاعی لائن کا ہی کام دیتے ہیں اور ان سے حضرت کی صفائی کا پہلو ہی نمایاں ہے۔ تغلیط کا پہلو ان میں نہیں پایا جاتا۔ بنا بریں مولانا سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ ایسی صورت میں ان کے اور شیعہ کے موقف میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ کیونکہ شیعہ بھی حضرت علیؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد آپ کی خلافت کے لئے احق قرار دے کر ہی انہیں خلیفہ بلافصل مانتے ہیں اور احق کو ترک کرکے

---

[۱] طبری جلد ۳ [۲] طبری جلد ۳ باب ۲۰ [۳] طبری جلد ۳ باب ۱۱

غیر اہل کو خلافت سپرد کرنے پر اصحاب رسول کو ظالم اور حضرت علیؓ کو مظلوم قرار دیتے ہیں۔ پس مولانا بتائیں کہ حضرت علیؓ کے موقف کو ان کی طرف سے حق قرار دینے کا نتیجہ اس سے متغائر کیونکر ہو سکتا ہے!

خلافتی مساعی

مولانا کے ارشاد کا دوسرا حصہ اُن کے اس ادّعا پر مشتمل ہے:

"کسی بھی قابل اعتبار تاریخی روایت سے اُن (حضرت علیؓ) کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو"

ہمیں حیرت اور تعجب ہے کہ مولانا نے جانتے بوجھتے اور آنکھوں دیکھتے اتنی بڑی غلط بیانی کی جسارت کیوں کی اور تاریخ کی اصلاح کے نام پر اُسے بگاڑتے، رہنمائی کے نام پر تاریخ کے طالب علموں کو گمراہ کرتے، تصحیح کے نام پر تحریف اور تعمیر کے نام پر تخریب کرتے انہیں یہ خوف کیوں دامنگیر نہ ہوا کہ تاریخ کی عدالت میں اُن کی یہ غلط بیانی ایک لمحہ کے لئے بھی عدالتی کارروائی کی حریف نہیں بن سکتی اور پہلی پیشی پر ہی اپنی منطقی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔

مولانا کو اس بات کا علم ہے کہ احادیث صحیحہ سے لے کر مولانا کی اپنی معتبر مانی ہوئی تاریخی کتب تک ہر جگہ ہی حضرت علیؓ کی زندگی کے اس رُخ پر ایسی بہت سی معتبر روایات پائی جاتی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے انعقاد سے لے کر حضرت عثمانؓ کے خلیفہ بنائے جانے تک ہر بار اور ہر مرحلہ پر ہی اپنی حق تلفی کے عذر سے احتجاج کیا۔

چنانچہ مولانا کے ایک ہم خیال اور ہم سفر مصری مورخ عمر ابوالنصر کے بقول:

خلافت کی خواہش تو حضرت علیؓ کو بلاشبہ ہمیشہ سے ہی تھی مگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہ اپنے جذبات کا اظہار برملا نہ کر سکے ...... پھر جب حضرت عمرؓ نے شہادت پائی ...... اور خلافت حضرت عثمانؓ کی طرف منتقل ہو گئی تو حضرت علیؓ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور جو کچھ اُن کے دل میں تھا باہر آنا شروع ہو گیا [۱]

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان سُن کر تو حضرت علیؓ سمیت بنو ہاشم کا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ حضرت زبیرؓ بن العوام نے تلوار کھینچ لی اور اعلان کیا کہ جب تک ابوبکرؓ کے بجائے علیؓ کو خلیفہ نہ بنوا لوں گا، یہ تلوار میان میں نہیں جائے گی [۲] اور یہ خود حضرت علیؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ کے گھر کا ہی واقعہ ہے جبکہ تمام بنو ہاشم وہاں جمع تھے اور حضرت علیؓ کی خلافت کے بارے میں مشورے کر رہے تھے۔

مولانا کو اپنی معتبر مانی ہوئی تاریخی کتب کے توسط سے اس بات کا خوب علم ہے کہ حضرت عمرؓ کی مقرر کردہ چھ رکنی شوریٰ جو عمرؓ کے بعد نیا خلیفہ منتخب کرنے کے لئے مشورے کر رہی تھی، حضرت علیؓ نے ان کے بعض ارکان پر زور دیا تھا وہ عثمانؓ کے بجائے اُن کی حمایت کریں، کیونکہ وہ رسول اللہؐ کے سب سے زیادہ قریبی عزیز ہیں اور حسنؓ حسینؓ اُن کے بیٹے ہیں [۳]

ان حالات میں مولانا کا یہ ادّعا یقیناً تعجب انگیز ہی ہے اور اس کی مصلحت خود مولانا ہی جانتے ہوں گے۔

ہم خود بھی یہی امر محبوب رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی پوری زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا موجود نہ ہو جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ اقتدار کے حریص تھے۔ اور اس کے لئے جدوجہد کرتے رہے مگر مولانا کی اُن معتبر تواریخ کو کس کھاتے میں ڈالا جائے جن کا کہا مولانا کے نزدیک وحیِ آسمانی ہے اور وہ اُن

---

[۱] علیؓ و عائشہؓ ص ۲۰۷-۲۰۸ [۲] طبری جلد ۲ [۳] طبری جلد ۳

معتبر تواریخ کی مزخرفات کو بہانہ بنا کر نہ حضرت عثمانؓ کی آبرو کی رعایت ملحوظ
رکھتے ہیں، نہ حضرت معاویہؓ کا احترام ہی انہیں ملحوظ رہتا ہے۔

حضرت علیؓ کی زندگی کا یہ کمزور پہلو جس کے باب میں بہت سی
باتیں ان کی بشریت کا تقاضا کہی جا سکتی ہیں مولانا کی معتبر روایات میں
یقیناً موجود ہیں اور مولانا کی یہ علیؓ دوستی عجیب قسم کی علیؓ دوستی ہی ہے کہ
وہ حضرت کی زندگی کے اس پہلو پہ بحث کرنے کے لئے ساری دنیا کو چیلنج
کر رہے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہمیں مولانا کے زہر میں ڈوبے بے درد قلم کی بے درد نشتر زنی
سے اللہ کے چند نیک نفس اور پاکباز بندوں کی آبرو اور عزتِ نفس کے
تحفظ کے لئے اللہ کے ایک پاکباز اور نیک نفس بندے کی زندگی کے
چند کمزور پہلو پیش کرنے کی مجبوری لاحق ہے جس پر خود ہمیں بھی انتہائی
حزن و ملال اور سخت قلق ہے اور ہم اپنی اس مجبوری پر اللہ تعالیٰ سے
عفو کے طالب اور تمام اصحاب دوست مسلمانوں سے معذرت خواہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ دل کے بھیدوں کو جانتا ہے اسے علم ہے کہ ہم یہ تکلیف دہ
فریضہ محض اس کی رضا کے لئے انجام دے رہے ہیں اور اس میں ہماری نیت کا
خرابی کا کوئی دخل نہیں واللہ باللہ، ورنہ جیسا کہ ہم بارہا یہ عرض کر چکے
ہیں علیؓ کی محبت ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ مگر ہم اس محبت کو علیؓ
تک محدود نہیں رکھنا چاہتے بلکہ ان تمام اصحابِ رسولؐ کو بھی اس میں
شامل رکھنا چاہتے ہیں جن کی محبت کو ہمارے دلوں سے نکالنے کے لئے
مولانا نے اپنے سیاسی مصالح سے ایک مہم چلا رکھی ہے روایات کی اس
جمع و ترتیب میں ہم نے مولانا کی مسلمہ کتب سے باہر صرف ایک مصری مصنف
عمر ابو النصر کی کتاب "علیؓ و عائشہؓ" سے استفادہ کیا ہے مگر چونکہ حضرت
معاویہؓ کے بارے میں عمر ابو النصر اور مولانا مودودی صاحب کا انداز فکر بالکل

یکساں اور ایک ہی نوعیت کا ہے اس لئے مولانا کی طرف سے اُس کو نامنظور کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں ایک روز حضرت علیؓ گھر سے باہر نکلے تو لوگوں نے پوچھا ابوالحسن! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت آج کیسی ہے؟ انہوں نے فرمایا۔ الحمد للہ آج حضورؐ کافی بہتر ہیں۔

حضرت عباسؓ بھی پاس ہی تھے۔علیؓ کی یہ بات سن کر انہوں نے علیؓ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا علیؓ! تم یہ کیا کہتے ہو! خدا کی قسم آج سے تین روز بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے (یعنی تم پر بعض دوسرے لوگ غلبہ حاصل کر لیں گے)۔

حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے مزید کہا کہ کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت نظر نہیں آ رہی؟

خدا کی قسم میرا پختہ خیال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بیماری میں وفات پا جائیں گے کیونکہ میں عبدالمطلب کی اولاد کے چہروں سے موت کے آثار شناخت کر لیتا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر اس وقت وہی آثار ظاہر ہیں۔

حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ کو تحریک کی کہ چلو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چل کر دریافت کریں کہ اُن کے بعد حکومت کن لوگوں کے ہاتھ لگے گی! اگر حکومت ہمارے قبضہ میں رہتی ہے تو حضور علیہ السلام کے فرمانے سے ہمیں اس کا پتہ چل جائے گا۔ اور اگر یہ دوسروں کی طرف منتقل ہونے والی ہے تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کریں گے کہ وہ اس کی وصیت ہمارے حق میں کر دیں۔

حضرت علیؓ نے جواب دیا چچا! اگر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

اپنے لئے حکومت کی استدعا کی اور انہوں نے انکار کر دیا تو خدا کی قسم پھر لوگ ہمیں کبھی خلافت کے قریب بھی نہیں آنے دیں گے۔ اس لئے میں تو حضور علیہ السلام سے ایسا سوال کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوں [1]

حضرت علیؓ کے اس انکار کی وجہ بیان کرتے ہوئے مصری مورخ عمر ابوالنصر رقمطراز ہے:

بنو ہاشم کو یہ خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے سوال پر مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھی اُن کے مقابلہ پر آسکتا ہے...... یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؓ نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوچھنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی [2]

بخاری شریف کی یہ روایت کتنے ہی طرق سے وارد ہوئی ہے اور ہر جگہ ہی مضمون تقریباً واحد ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اس روایت کو اپنے ہاں ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

- امام احمدؒ نے بروایت ابن مبارکؒ "یونس" سے، انہوں نے "زہریؒ" سے انہوں نے عبداللہ بن کعب سے، انہوں نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ (ایک روز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں آپ کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے تو لوگوں نے پوچھا ابوالحسن! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ فرمایا بحمد اللہ اچھے ہیں۔

حضرت عباسؓ کہنے لگے علیؓ! تم کو معلوم نہیں ہے مگر میں جانتا ہوں کہ حضورؐ اس مرض میں وفات پا جائیں گے۔ کیونکہ میں عبدالمطلب کی اولاد کے چہروں سے موت کے آثار شناخت کر لیتا ہوں۔ لہٰذا آؤ ہم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلیں اور عرض کریں کہ اگر آپ کے بعد خلافت ہمارا

---

[1] بخاری شریف جلد ۳ پارہ ۲۶ کتاب الاستیذان باب معانقہ و مزاج پرسی حدیث نمبر ۱۲۶۹ [2] علیؓ و عائشہؓ صہ

حصہ ہے تو اس کا اعلان کر دیں اور اگر دوسروں کا حصہ ہے تو آپ خلافت کے لئے ہمارے حق میں سفارش کریں۔

حضرت علیؓ نے جواب دیا چچا! اگر حضورؐ نے کہہ دیا کہ خلافت تمہارا حصہ نہیں ہے بلکہ دوسروں کا حصہ ہے تو لوگ ہمیں کبھی خلافت نہیں دیں گے۔ لہٰذا میں تو اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ نہیں کہوں گا[1]

- ایک روز حضرت عباسؓ نے اولادِ عبد المطلب کو جمع کیا چونکہ حضرت عباسؓ کو حضرت علیؓ سے کمال محبت تھی اس لئے آپ نے اُن سے فرمایا مجھے تم سے ایک مشورہ مطلوب ہے تمہارے بغیر مجھے پیش آمدہ معاملہ کا فیصلہ پسند نہ ہوا۔ تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاکر عرض کرو کہ اگر آپ کے بعد خلافت ہمارا حصہ نہیں ہے تو ہم آج سے ہی اس کا خیال ترک کر دیتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے سُن کر فرمایا چچا! بیشک خلافت آپ ہی کے لئے ہے کسی کی مجال نہیں کہ وہ آپ سے آپ کا حق چھین سکے[2]

- حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام کی علالت کے دنوں میں ایک روز علیؓ ابن ابی طالب آپ کے پاس سے اُٹھ کر باہر آئے تو لوگوں نے پوچھا ابو الحسن! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت آج کیسی ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ آج تو آپ کی طبیعت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ عباسؓ بن عبد المطلب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا تم یہ کیا کہہ رہے ہو علیؓ! تمہیں کیا خبر کہ تم تین روز کے بعد ڈنڈے کے محکوم بن جاؤ گے۔ میرا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مرض میں وفات پا جائیں گے کیونکہ

---

[1] ازالۃ الخفاء مقصد اوّل فصل چہارم بحوالہ مسند امام احمد مطبوعہ کارخانہ نور محمد کراچی ص۲۹۸-۲۹۹ [2] طبقات ابن سعد بروایت ابن عباسؓ۔ تاریخ الخلفاء سیوطی

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ عبد المطلب کی اولاد کے چہرے موت کے قریب پہنچ کر کیسے ہو جاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کی کیفیت اب بالکل وہی ہے (جو موت کے قریب پہنچ کر اولادِ عبد المطلب کی ہوا کرتی ہے) لہٰذا تم ان کے پاس جاؤ اور پوچھو کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہوگا؟ تاکہ اگر امارت ہم کو ملتی ہے تو ہمیں ابھی سے معلوم ہو جائے اور اگر وہ کسی دوسرے کو چاہتے ہیں تو بھی بات کھول دیں تاکہ ہمیں حقیقتِ حال معلوم ہو سکے اور حضورؐ کے حکم کی بجا آوری کی جا سکے۔

علیؓ نے کہا خدا کی قسم چچا! میں ہرگز ہرگز یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہیں کروں گا۔ کیونکہ اگر انہوں نے خود اپنی زبان سے ہی ہمیں خلافت سے محروم کر دیا تو پھر عمر بھر لوگ ہمیں خلافت نہیں دینگے[1]

مصری مصنّف ابو النصر اس مرحلہ پر حضرت علیؓ کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں:

اگر انہوں نے خود ہی ہمیں محروم کر دیا تو اللہ کی قسم پھر قیامت تک کے لئے یہ منصب ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا، اور مسلمان کبھی ہم میں سے کسی کو خلیفہ نہیں بنائیں گے[2]

- حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب سورۃ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ نازل ہوئی تو حضرت عباسؓ حضرت علیؓ کے پاس پہنچے اور کہا کہ چلو ہم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلیں (اور آپ سے معلوم کریں) کہ اگر خلافت ان کے بعد ہمارے لئے ہے تو یقیناً (قریش اس باب میں ہم سے کوئی مناقشہ نہیں کر سکتے۔ اور اگر کسی دوسرے کے لئے ہے تو ہم حضورؐ سے سوال کریں کہ وہ ہمارے حق میں خلافت کی وصیت کریں۔ مگر

---

[1] طبری جلد ۳ ص ۱۹۲ [2] علیؓ و عائشہؓ عمر ابو النصر

حضرت علیؓ نے (ہمراہ چلنے سے) انکار کیا۔

عباسؓ کہتے ہیں کہ جب علیؓ میرے ہمراہ چلنے پر آمادہ نہ ہوئے تو میں اکیلا ہی خفیہ طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مقصد پیش کیا۔ حضور علیہ السلام نے جواباً فرمایا چچا! اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے دین پر میرا خلیفہ ابوبکرؓ کو مقرر کر رکھا ہے اور وہی وصیت کا حقدار ہے تم (میرے بعد) اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو تو ہدایت اور فلاح پاؤ گے۔ اس کی اقتدا کرو گے تو بھلائی حاصل کرو گے [1]

- معمر کہتے ہیں کہ ایک شخص نے زہری سے پوچھا کیا علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی؟

انہوں نے کہا ہاں۔ اور جب تک انہوں نے بیعت نہیں کی بنی ہاشم میں سے کسی نے بھی نہیں کی تھی۔

مگر فاطمہؓ کی وفات کے بعد جب علیؓ نے دیکھا کہ اب لوگوں کا خیال ان کی طرف سے پلٹ گیا ہے تو وہ ابوبکرؓ سے مصالحت کے لئے جھکے اور ابوبکرؓ کو کہلا بھیجا کہ آپ تنہا آکر مجھے ملیں ..... اور ابوبکرؓ آئے سب بنو ہاشم جمع ہو کر بیٹھے تھے (علیؓ نے کھڑے ہو کر کہا:

اے ابوبکرؓ! میں نے آج تک تمہارے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تو اس کی وجہ تمہاری کسی فضیلت سے انکار نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے مگر تم نے زبردستی ہم سے ہمارا حق چھین لیا [2]

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کے انکار اور بیعت پر بحث کرتے ہوئے مصری مصنف عمر ابوالنصر لکھتا ہے:

چند ہاشمیوں کے سوائے جن میں نمایاں نام حضرت علیؓ کا ہے باقی تمام

---

[1] ازالۃ الخفاء فصل ہشتم [2] طبری جلد ۳ باب ۲

مسلمانوں نے برضا و رغبت آپ (یعنی ابوبکرؓ) کی بیعت کر لی۔ حضرت علیؓ نے بھی تو بیعت کر لی مگر بہت تردد کے بعد بعض مورخین کے قول کے مطابق آپ حضرت فاطمہؓ کی وفات تک بیعت سے کنارا کش رہے۔

مگر حضرت علیؓ کی بیعت کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہوں نے اپنے حق سے دستبرداری اختیار کر لی (ایسا نہیں تھا بلکہ) انہوں نے بعض سیاسی مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا کیا تھا۔ چنانچہ:

۱۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت پر مسلمانوں کا اجماع ہو چکا تھا۔

۲۔ خلیفہ اوّل (حضرت ابوبکرؓ) کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں جو مرتبہ تھا اور اسلام کی تاریخ میں آپ کو جو بلند و بالا حیثیت حاصل تھی اُسے دیکھتے ہوئے حضرت علیؓ لوگوں کو اپنی خلافت کی دعوت دے کر بھی کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔

۳۔ حضرت علیؓ کو غالباً یہ خیال بھی ہو گا کہ ابوبکرؓ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں، وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں گے۔

۴۔ حضرت ابوبکرؓ کے قبیلہ سے اب تک بنو ہاشم کا کوئی تنازعہ نہ تھا۔

۵۔ علاوہ ازیں اگر ہم اس امر کو بھی ملحوظ رکھیں تو یہ بات امر واقعہ کے خلاف نہیں ہو گی کہ حضرت علیؓ کی عمر ابھی ۳۰ برس کے لگ بھگ تھی اور عرب سن رسیدہ بزرگوں کے مقابلہ میں کسی نوجوان کی سرداری کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔

پس انہی اسباب کی بنا پر حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنے پر مجبور ہوئے اور انہوں نے اپنی خلافت کے لئے سوال اٹھانے کو کسی اور مناسب موقع کے لئے اٹھا رکھا۔[1]

---

[1] علیؓ اور عائشہؓ عمر ابو النصر صد ۱۴-۱۵

- حضرت عمرؓ نے فرمایا : میں عشرہ مبشرہ میں سے چھ آدمیوں پر مشتمل ایک جماعت تشکیل دے رہا ہوں۔ یہ لوگ اپنے میں سے کسی کا انتخاب کر لیں اور پھر جب کسی کو خلیفہ مقرر کر لیں تو اس کی کامل اطاعت کریں۔ وہ چھ آدمی یہ ہیں: علیؓ، عثمانؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، زبیرؓ بن العوام، اور طلحہؓ بن عبید اللہ۔ اس جماعت میں عبداللہ بن عمرؓ کو بطور مشیر شامل کر لیا جائے۔ اس کا انتخاب میں حصہ نہیں ہے ....

اس مرحلہ پر حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ کو کہا کہ تم ان چھ آدمیوں کی جماعت میں شامل ہونا منظور نہ کرو۔

علیؓ کہنے لگے چچا! میں اختلاف بھی ناپسند کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں حضرت عباسؓ نے کہا۔ پھر تم وہ حالت دیکھو گے جسے تم پسند نہیں کرو گے[1] (یعنی تم خلافت حاصل نہیں کر سکو گے)

- حضرت علیؓ نے بنو ہاشم سے کہا کہ اگر میں تمہارے مشورہ پر عمل کروں تو پھر تم کبھی خلافت حاصل نہیں کر سکو گے۔ اتنے میں حضرت عباسؓ تشریف لے آئے تو حضرت علیؓ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا چچا! خلافت تو ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ بولے کیونکر؟

علیؓ نے جواب دیا کہ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ چھ آدمیوں کی جماعت میں عثمانؓ بھی شامل ہیں اور بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہر ایک کو یہ بھی تاکید کر دی ہے کہ تم اکثریت کا ساتھ دینا۔

یہ بھی ہدایت کی ہے کہ اگر انتخاب کے مرحلہ پر دو شخص ایک طرف ہوں اور دوسرے دو ایک کی حمایت کریں تو تم اس گروہ کا ساتھ دو جس میں عبدالرحمٰنؓ بن عوف شامل ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف عثمانؓ کو ہی خلیفہ مقرر کرنا چاہیں گے اور سعدؓ بن ابی وقاص اپنے عم زاد

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۴ واقعات ۲۳ھ

بھائی (عبدالرحمٰنؓ بن عوف) کا ہی ساتھ دیں گے۔ اس طرح باقی دو زبیرؓ اور طلحہؓ مجھے مل بھی جائیں تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان دو میں سے بھی مجھے صرف زبیرؓ کی ہی حمایت حاصل ہو سکے گی۔

حضرت عباسؓ نے جواب دیا میں نے جب بھی تجھے کوئی بات کہی (اور جب بھی کوئی راہ دی) تم نے میرے کہنے پر کبھی عمل نہیں کیا اور تم آخر وہی خبر لے کر آئے جو مجھے ہمیشہ ناپسند رہی ہے۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے مرحلہ پر تجھے مشورہ دیا تھا کہ حضورؐ سے دریافت کرو کہ آپ کے بعد خلافت پر کس کا حق ہے مگر تم نے میری بات نہ مانی (اور یہی قرار دے کر بیٹھے رہے کہ خلافت پر ہمارے سوا اور کس کا حق ہو سکتا ہے)

پھر حضورؐ کی وفات کے بعد بھی میں نے تجھے مشورہ دیا کہ یہ معاملہ پہلے طے کر لو (یعنی حضورؐ کو سپردِ خاک کرنے سے پہلے اپنی خلافت پر لوگوں کو جمع کر لو) مگر تم نے اس مرحلہ پر بھی میری بات ماننے سے انکار کیا (اور اپنے زعم میں رہے پھر تمہاری اس کوتاہی کی وجہ سے ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے) اس کے بعد جب عمرؓ نے چھ آدمیوں کی جماعت میں تمہارا نام شامل کیا تو میں نے پھر تمہیں زور دیا کہ اس جماعت میں شامل ہونے سے انکار کر دو مگر تم نے بدستور ہی میری رائے کو مسترد کر دیا۔

اب میری رائے پھر یہی ہے کہ یہ جماعت جو کچھ بھی طے کرے، کرتی رہے تم سوائے اپنی خلافت کے ان لوگوں کی کوئی بات تسلیم نہ کرو۔

خوب یاد رکھو، ان لوگوں سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ سب کے سب ہمیں خلافت سے دُور رکھنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہیں گے یہاں تک کہ کوئی دوسرا خلافت پر قابض ہو جائے۔

خدا کی قسم اس وقت ایسی بُرائی مسلط ہوگی کہ جس کے مقابلہ میں کوئی بھلائی

بھی سود مند نہیں ہوگی۔

علیؓ نے کہا اگر عثمانؓ رہ گئے تو میں ان کی باتیں ہمیشہ یاد دلاتا رہوں گا۔ اور اگر وہ وفات پا گئے تو لوگ خلافت کا معاملہ پھر اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ اور اگر انہوں نے ایسا ہی کیا اور پھر اپنی مرضی چلائی تو پھر وہ مجھے اپنے خلاف پائیں گے۔

علیؓ نے یہ بات کہتے پلٹ کر جو دیکھا تو ابوطلحہؓ کھڑے تھے (وہ ان کی یہ باتیں سن چکے تھے) اس پر علیؓ ذرا پریشان ہوئے مگر ابوطلحہؓ نے (انہیں پریشان پاکر تسلی کے انداز میں) کہا۔

ابوالحسن! آپ خوف نہ کریں [1] (یعنی آپ کی یہ باتیں میں کسی پر ظاہر نہیں کرونگا)۔

- حضرت علیؓ حضرت سعدؓ کو ملے (جو حضرت عمرؓ کی تشکیل کردہ چھ آدمیوں کی جماعت میں شامل تھے) علیؓ نے اُن سے کہا:

سعدؓ! میرے معاملہ میں اللہ سے ڈرو جس کے نام سے تم رشتہ داریوں کا واسطہ دیتے ہو۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے بیٹوں (حسنؓ اور حسینؓ) کی رشتہ داری اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی قرابت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تم میرے خلاف عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے مل کر عثمانؓ کی (خلافت میں) مدد نہ کرنا [2]

- علیؓ نے کہا خلافت ہمارا حق ہے اگر تم ہمیں دو گے تو ہم قبول کریں گے۔ اگر نہ دو گے تو ہم اونٹوں کی پشت پر سوار ہو کر چلے جائیں گے خواہ ہماری شب اوّل کتنی ہی طویل ہو جائے۔

حضرت علیؓ نے مزید فرمایا۔ میری یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ ممکن ہے اس اجتماع کے بعد (جس میں ہم عمرؓ کے بعد ان کی جگہ نیا خلیفہ مقرر کرنے پر بحث کر رہے ہیں) کوئی اور اجتماع منعقد نہ ہو سکے اور پھر تم دیکھو کہ

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۴ [2] طبری جلد ۳ باب ۱۴

نمازیں بے نیام ہو گئی ہیں اور امانت میں خیانت ہونے لگی ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم پھر کوئی ایسی جماعت بنا لو جس میں سے بعض لوگ گمراہوں کے سردار بن جائیں اور کچھ لوگ جاہلوں کی پیروی کرنے لگیں[1]

- عثمانؓ کے خلیفہ مقرر ہو جانے پر لوگوں کی بھیڑ لگ گئی اور لوگ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے یہاں تک کہ ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے ..... سارے ہی مسلمان بیعت کر چکے مگر حضرت علیؓ پیچھے کو بھاگے آخر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے پکار کر کہا کہ جو شخص عہد شکنی کرے گا اس کی عہد شکنی اس کی ذات کے لئے نقصان دہ ہوگی، اور جس نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا، اسے عنقریب ہی بہت ثواب ملے گا۔

اس پر حضرت علیؓ صفوں کو چیرتے ہوئے آئے اور بیعت کر لی۔ مگر ساتھ ہی فرمایا۔ دھوکہ اور فریب، اُف کس قدر فریب دیا گیا[2]

- حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ حاضرین (یعنی حضرت عمرؓ کی مقرر کردہ چھ رکنی مجلس) میں سب سے بڑھ کر خلافت کے حقدار ہیں اور اس کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ آپ کی دلیل یہ ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار ہیں، سابق الاسلام ہیں اور دینداری میں بھی (دوسروں کے مقابلہ میں) اچھی شہرت رکھتے ہیں[3] (اور علیؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کی اس بات سے انکار نہ کیا)۔

- حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو حضرت علیؓ نے فرمایا۔ یہ پہلا دن نہیں کہ تم نے ہم پر غلبہ حاصل کیا ہے اور اس پر ہمارے لئے صبر کے بجز کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم کہتے ہو اس کے مقابلہ میں اللہ سے ہی مدد حاصل کی جائے گی۔

خدا کی قسم! تم نے عثمانؓ کو اس لئے خلیفہ بنایا ہے کہ معاملہ تمہارے ہاتھ

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۲۶ [2] ایضاً [3] ایضاً

میں رہے [1]

• خلافت کی خواہش بلاشبہ علیؓ کو ہمیشہ ہی تھی، مگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہ اپنے جذبات کا اظہار برملا نہ کر سکے ۰۰۰۰۰ پھر جب حضرت عمرؓ نے شہادت پائی ۰۰۰۰۰ اور خلافت حضرت عثمانؓ کی طرف منتقل ہو گئی تو حضرت علیؓ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور جو کچھ ان کے دل میں تھا باہر آنا شروع ہو گیا [2]

• (حضرت معاویہؓ کی طرف سے مصالحت کا پیغام لے کر حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہونے والے وفد کے ایک رکن) حبیب بن مسلم الفہری نے حضرت علیؓ سے گفتگو شروع کی اور کہا ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کو آپ نے قتل کروایا ہے۔ لیکن اگر آپ کا خیال ہے کہ ہمارا یہ الزام صحیح نہیں ہے تو پھر آپ کا فرض ہے کہ ہمارے مطالبہ پر عثمانؓ کے قاتل ہمارے حوالے کر دیجئے کیونکہ وہ سب لوگ آپ کے ساتھی اور آپ کی فوج کا حصہ ہیں۔ اس طرح آپ نے ان کو تحفظ دے رکھا ہے۔

حضرت علیؓ نے حبیب کے جواب میں طویل تقریر فرمائی اور اپنے حق خلافت اور اس حق سے ہمیشہ محروم رہ جانے کے واقعات پر بحث کے دوران میں فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر لوگوں نے مجھے ترک کر کے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ چن لیا۔ پھر ابوبکرؓ جاتے ہوئے حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کر گئے۔

بلاشبہ یہ دونوں حضرات نیک سیرت تھے، انہوں نے لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لیا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں ہم پر زور و جبر سے خلیفہ بن گئے تھے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل ہونے کے رشتہ سے یقیناً ہم ہی خلافت کے مستحق تھے [3]

• حضرت مغیرہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد میں عمرؓ کے بارے میں

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۳ [2] علیؓ و عائشہؓ صفحہ ۲۷-۳۰ [3] طبری جلد ۳ باب ۱۱

حضرت علیؓ کے تاثرات معلوم کرنے کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ایسی حالت میں باہر نکلے کہ اپنے سر اور ڈاڑھی کو جھاڑ رہے تھے۔ اور ایسی پوشاک پہنے تھے کہ صریحاً یہ معلوم ہوتا تھا کہ خلافت ان کے ہی سپرد ہوگی۔[1]

- حضرت حسنؓ نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ سے کچھ تلخ و تُند باتیں کیں اور انہیں اُن کے بعض اعمال و عزائم پر ٹوکا تو حضرت علیؓ نے انہیں جواباً کہا کہ دیکھو!

تم نے جو مجھے مشورہ دیا تھا کہ جب تک سب لوگ آپ کی بیعت پر راضی نہ ہو جائیں آپ کسی کی بیعت قبول نہ کریں اور خلافت سے کوئی تعلق نہ رکھیں تو سنو!

بیعت دراصل اہلِ مدینہ ہی کی ہے دوسروں کی بیعت اُن کے تابع ہے اور پھر میں یہ بات بھی پسند نہیں کرتا کہ خلافت ہم لوگوں کے ہاتھ سے نکل جائے تمہارا یہ کہنا بھی صحیح نہیں تھا کہ میں طلحہؓ و زبیرؓ کی راہ ہموار کروں ..... میرے نزدیک اُن لوگوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے ..... اس لئے تم اپنے مشوروں سے باز رہو۔[2]

اہلِ تشیع کا موقف

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کے اس کمزور رُخ کی تشہیر جس طرح ہمیں ناپسند ہے ہم سمجھتے تھے کہ اہلِ تشیع بھی حضرت علیؓ کی دنیا طلبی پر مشتمل ان روایات کو ناپسند ہی کرتے ہونگے مگر ہمیں حیرت ہوئی کہ معاملہ اس کے بالکل اُلٹ ہے اور شیعوں نے حضرت علیؓ کی زندگی کے اس کمزور پہلو کو بڑی فراخدلی سے قبول کر رکھا ہے۔

---

[1] طبری جلد ۳ [2] ازالۃ الخفا مقصد اوّل فصل دوم لوازم خلافت خاصہ [3] طبری جلد ۳ باب ۴

اگرچہ شیعہ کے اس بیان سے مقصود تو اس بات کو ظاہر کرنا ہے کہ مسلمان ہمیشہ حضرت علیؓ کی حق تلفی کرتے رہے ہیں تاہم اس سے مولانا مودودی صاحب کے موقف کی تغلیط بالکل واضح ہے۔

اگرچہ یہ امر ایک لطیفہ ہی ہے کہ مولانا مودودی صاحب کو جس شدت کے ساتھ اپنی ضرورت سے حضرت علیؓ کی زندگی کے اس کمزور پہلو کو جو مولانا کی مسلّمہ معتبر تاریخی کتب میں بکثرت ذکر ہوا ہے دوسروں کی آنکھوں سے چھپانے کی مجبوری درپیش ہے۔ شیعہ کو اتنی ہی شدت کے ساتھ اپنی ضرورت سے حضرت کا یہ پہلو نمایاں کرنے کی مجبوری ہے۔

اور اگرچہ ہمیں اس باب میں شیعہ سے کسی استفادہ کی ہرگز ضرورت نہیں ہے مگر چونکہ مولانا اپنے موقف کو زیادہ قوی بنانے کے لئے شیعہ سے استفادہ کرتے ہیں جیسا کہ اُنھوں نے اپنی اس زیرِ بحث کتاب میں بھی ایسا کیا ہے۔ اس لئے ہم بھی مولانا سے ہی سیکھ کر خود مولانا کی ہی اختیار کردہ کتاب "نہج البلاغہ" سے جس کی شرح ابن ابی الحدید[ل] نے اُنھوں نے اپنے حق میں مواد حاصل کیا ہے۔ خود حضرت علیؓ کی اپنی زبان، اور اُن کے اپنے قلم سے شیعہ ذرائع سے میسر آمدہ گواہی پیش کرتے ہیں۔ نہج البلاغہ کے شیعہ مؤلف کا بیان ہے۔

- جنگِ جمل کے موقع پر کسی نے حضرت علیؓ سے کہا آپ اگر طلحہؓ اور زبیرؓ کا تعاقب ترک کر دیں تو یہ بہت مناسب بات ہوگی۔ آپ نے جواب دیا:

ل یہ ابن ابی الحدید جن سے مولانا نے استفادہ کیا ہے وہ بزرگ ہیں جنھوں نے نہج البلاغہ کی شرح لکھی ہے اور وہ بڑی ہی فراخدلی سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ان اصل الکذب فی الفضائل جاء من جھۃ الشیعۃ (شرح نہج البلاغہ جلد ۲ صد ۱۳۴) کہ احادیثِ فضائل میں جھوٹ روایات (رہم) شیعہ کی طرف سے داخل ہوئی ہیں۔

لَوَاللّٰہِ مَازِلْتُ مَدْفُوعًا عَنْ حَقِّیْ مُسْتَأْثَرًا عَلَیَّ مُنْذُ قَبَضَ اللّٰہُ نَبِیَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی یَوْمِ النَّاسِ ھٰذَا [۱]

اللہ کی قسم جس روز سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو وفات دی ہے میں برابر اپنے حق (خلافت) سے محروم کیا جاتا رہا ہوں اور ہمیشہ دوسروں کو ہی مجھ پر ترجیح دی جاتی رہی ہے اور آج کے دن تک یہی حال ہے (جبکہ لوگ آمادہ جنگ ہو چکے ہیں)

- حضرت علیؓ سے مزید نقل کیا گیا ہے آپ نے ایک خطاب میں فرمایا لوگو!

لَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّیْ اَحَقُّ بِھَا مِنْ غَیْرِیْ [۲]

تم جانتے ہو کہ میں دوسرے سارے ہی لوگوں کے مقابلہ میں حضور علیہ السلام کی خلافت کا زیادہ حقدار ہوں۔

- جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان ہو گیا تو آپ نے فرمایا لوگو!

تُنْتَضٰی فِیْہِ السُّیُوْفُ وَتُخَانُ فِیْہِ الْعُھُوْدُ [۳]

تم جلد ہی دیکھ لو گے کہ (خلافت کے حصول کے لئے اب) تلواریں میانوں سے نکال لی جائیں گی اور سارے عہد و پیمان توڑ دیئے جائیں گے۔

- حضرت علیؓ نے ایک مرحلہ پر اپنے خطاب میں فرمایا:

فَمَنْ ذَا اَحَقُّ بِہٖ مِنِّیْ حَیًّا وَّ مَیِّتًا [۴]

کہ حضور علیہ السلام کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد مجھ سے بڑھ کر خلافت کا حقدار کون ہو سکتا ہے۔

- کسی نے حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ آخر ہر بار ہی خلافت کی تبدیلی کے موقع پر لوگ آپ کو خلافت سے محروم کیوں کر دیتے رہے؟

فرمایا چھوڑو، اب اس لوٹ مار کے ذکر کو، وہ لوگ خود غرض تھے اور

---

[۱] نہج البلاغہ صد ۳۴۰ مطبوعہ شیعہ جنرل بک ایجنسی لاہور [۲] نہج البلاغہ صد ۲۱۱
[۳] ایضاً صد ۲۴۴ [۴] ایضاً صد ۵۹۶

اپنی دل پسند چیز کے لیئے مر مٹنے پر تیار ہو جاتے ہیں [1]

- جنگِ جمل کے دنوں کسی مخالف نے آپ سے یہ ٹیڑھی سی، بات کہی کہ آپ خلافت کے لیئے بہت حریص ہیں، آپ نے فرمایا:

حریص تم لوگ ہو حالانکہ اس کے اہل بھی نہیں ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار بھی نہیں۔ جبکہ میں خلافت کا اہل بھی ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت بھی رکھتا ہوں [2]

- حضرت علیؓ اہلِ مصر کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

خدا کی قسم، مجھے یہ کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ اہلِ عرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کو حضورؐ کے اہل بیت کے بجائے کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دیں گے یا مجھے نہیں دیں گے [3]

- صفین سے واپسی پر حضرت علیؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

حقِ ولائت و امامت کی خصوصیات صرف اہل بیت سے ہی خاص ہیں، اور انہی کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت بھی ہے اور وہی نبی کے اصل وارث ہیں اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَھْلِہٖ وَنُقِلَ اِلٰی مُنْتَقِلِہٖ [4] اور اب (حضورؐ کی وصیت کے مطابق ہی) یہ حق اپنے اہل کی طرف لوٹ آیا ہے اور اپنے صحیح وارثوں کو منتقل ہو گیا ہے (یعنی مجھے خلافت مل گئی ہے)

- حضرت ابو بکرؓ کی خلافت پر بیعت ہو چکی تو حضرت ابو سفیانؓ حضرت عباسؓ کو ہمراہ لے کر حضرت علیؓ سے ملے اور کہا ہاتھ بڑھایئے ہم آپ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتے ہیں۔ اگر کسی نے مزاحمت کی تو میں جنگی سواروں اور پیادوں سے مدینہ کو بھر دوں گا۔

حضرت علیؓ نے جواباً کہا کہ میں کیا کروں فَاِنْ اَقُلْ یَقُوْلُوْا اَحْرَصَ عَلَی الْمُلْکِ

---

[1] نہج البلاغہ صـ ۴۸۹ [2] نہج البلاغہ صـ ۵۱۲ [3] مکتوب نمبر ۶۲ مندرجہ نہج البلاغہ صـ ۷۹۵ [4] نہج البلاغہ صـ ۱۸۳

وَاِنْ اَسْكُتْ يَقُوْلُوْا جَزَعَ مِنَ الْمَوْتِ [1]

یعنی (میری مشکل یہ ہے کہ) اگر میں اس بات کو چلاؤں تو لوگ کہیں گے یہ شخص اقتدار کا حریص ہے اور اگر (اس الزام سے بچنے کے لئے) چپ رہوں تو لوگ کہیں گے یہ موت سے خائف ہے۔

بات مولانا مودودی صاحب کے اس ادّعا سے چلی تھی کہ:

"کسی قابلِ اعتبار تاریخی روایت سے اُن (یعنی حضرت علیؓ) کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔"

اب دلوں کا حال تو خدا تعالیٰ ہی جانتے ہیں مگر ہمارے نزدیک شواہد و بیّنات کی روشنی میں امرِ واقعہ یہی ہے کہ جس طرح دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں نہ تین اور نہ پانچ بلکہ وہ ہر حال میں چار ہی رہتے ہیں۔ ٹھیک ایسے ہی مولانا مودودی صاحب کو یہ دعویٰ باندھتے اس امر کا یقین تھا کہ اُن کی بات غلط ہے ان کا دعویٰ بے اصل ہے، ان کا زعم باطل ہے اور اُن کی تحدی بے بنیاد ہے۔ اُنہیں پتہ تھا کہ وہ جس بات کے ثبوت میں کسی ایک معتبر تاریخی روایت کے لئے چیلنج کر رہے ہیں، یہ معتبر روایات اُن کی اپنی ہی معتبر قرار دی گئی تاریخی کتب میں بکثرت موجود ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی ضرورتوں نے انہیں ہر اُس انجام سے بے خوف کر دیا جو بات کے کھل جانے سے خدا اور اس کی مخلوق کے سامنے متوقع تھا۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۵ صہ ۲۰۲ - اس آخر الذکر شیعی روایت میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک سخت شرمناک جھوٹ تراشا گیا ہے کہ اُنہوں نے حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے خلاف خروج کرنے کی تحریک کی۔ اس روایت کی اختراع سے شیعہ کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ حضرت علیؓ کی طرح ہی بحسبِ روایات حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ چند روایات تاریخ و سیر کے سرسری مطالعہ کا حاصل ہیں ورنہ اس عنوان سے کسی تفحص اور تجسس کے نتیجہ میں ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

ہم ان روایات میں سے اُن روایات کو مولانا کے لئے حجت قرار نہیں دیتے جو شیعی ذرائع سے ہم نے پیش کی ہیں کیونکہ وہ صرف مولانا کی اپنی

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) اور وہ بھی حضرت علی رضؓ کے لئے حضرت علیؓ کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیرؓ کی طرح ہی سخت متشدد اور سخت خطرناک عزائم کے حامل تھے جنہوں نے بنو ہاشم کے خاندان کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے جب حضرت ابو بکرؓ کے خلیفہ بنائے جانے کی خبر سنی تو تلوار سونت لی اور اعلان کیا کہ جب تک حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کو ختم اور حضرت علیؓ کی خلافت کو قائم نہیں کر لوں گا یہ تلوار میان میں نہیں جائے گی (طبری) اصحابِ رسولؐ کے حق میں شیعہ کا تجاوز ایک تاریخی حقیقت ہے اس لئے ہمیں ہرگز یہ حاجت نہیں تھی کہ اس روایت کو زیرِ بحث لا کر وقت ضائع کریں مگر چونکہ اس روایت کو ایک دوسری شکل میں مولانا مودودی صاحب نے بھی حضرت ابو سفیانؓ کے ایک قابلِ مذمت فعل کی حیثیت سے اپنے ہاں قبول کیا ہے اس لیے ہم اس جھوٹ کہانی کا تار پود بکھیرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ روایت پہلے شیعہ کے ہاں سے ہی چلی ہے اور شیعہ نے اپنی ضرورت سے اس کو جس طرح تخلیق بخشی ہے ان کے لئے وہی موافق حال تھی۔ مگر یہی شیعی روایت جب اہلِ سیاست کی ضرورت کے معمل میں ارتقاء کے مرحلے طے کرتی مولانا کے معتبر ماخذ تک پہنچی تو اس کی صورت ہی دوسری تھی آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں:

حضرت ابو سفیانؓ کو عصبیت کی ہی بنا پر اُن (یعنی ابو بکرؓ) کی خلافت ناگوار ہوتی تھی اور انہوں نے حضرت علیؓ سے جا کر کہا کہ قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے کا آدمی کیسے خلیفہ بن گیا؟" تم اٹھنے کے لئے تیار ہو تو میں وادی کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا"۔ حضرت علیؓ نے یہ جواب دیکر اُن کا منہ بند کر دیا کہ:

(باقی اگلے صفحہ پر)

تکنیک کے ایک پہلو کی ہی عکاس ہیں مگر دوسری روایات اُن معتبر کتب احادیث و تواریخ سے تعلق رکھتی ہیں جن کا مستند ہونا خود مولانا کو بھی تسلیم ہے اور ان میں سے ابنِ سعد اور علامہ طبری کو تو مولانا نے بالخصوص شمالی لوگ اور ان کی تواریخ کو مثالی معتبر تواریخ قرار دیا ہے۔

(دیکھئے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) "تمہاری یہ بات اسلام اور اہلِ اسلام کی دشمنی پر دلالت کرتی ہے میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم کوئی سوار اور پیادے لاؤ۔ مسلمان سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور آپس میں محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ خواہ اُن کے دیار اور اجسام ایک دوسرے سے کتنے ہی دُور رہیں۔ البتہ منافقین ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم ابوبکرؓ کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اہل نہ ہوتے تو ہم لوگ کبھی انہیں اس منصب پر مامور نہ ہونے دیتے (خلافت و ملوکیت صہ ۹۷)

یہ بات قارئینِ کرام کے علم میں ہے کہ یہ روایت جب پہلے پہل تخلیق پائی تھی تو اس روایت میں جیسا کہ ہم نہج البلاغہ کے حوالے سے عرض کر آئے ہیں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے خلاف بغاوت اور حضرت علیؓ کی خلافت کے قیام کی سازش میں حضرت ابوسفیانؓ کے ساتھ حضرت علیؓ کے چچا حضرت عباسؓ کا نام بھی شامل تھا اور جیسا کہ ہم عرض کر آئے ہیں شیعہ کا مقصد اتنے پر ہی پورا ہو جاتا ہے یعنی عباسؓ کے ساتھ ابوسفیانؓ کے نام کو شامل کرنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ابوبکرؓ کی خلافت سے صرف بنو ہاشم ہی ناخوش نہیں تھے بلکہ دوسرے لوگ بھی انہیں خلیفہ کے بطور پسند نہیں کرتے تھے اور انکی خلافت پر سارے مسلمان جمع نہیں ہوئے تھے۔

پھر جب علیؓ کی زبان سے اپنی بے بسی کا اظہار کروا دیا گیا تو اس سے حضرت علیؓ کی مظلومیت کا ثبوت مہیا کرنا مقصود تھا۔ اور شیعہ کا اس روایت سے مفاد بس یہیں تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ روایت کی اگلی جمع و ترتیب دوسروں کے مصالح کے ماتحت تھی اور اس کام کو پھر دوسروں نے انجام دیا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا ابنِ سعد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

محمد بن سعد جن کی روایات کو میں نے دوسری روایات پر ترجیح دی ہے ..... سِیَر و مَغازی کے معاملہ میں ان کی ثقاہت پر تمام محدثین و مفسرین نے اعتماد کیا ہے[1]۔ ابنِ جریر طبری کے متعلق تحریر کرتے ہیں ۔

ابن جریر طبری جن کی جلالت قدر بحیثیت مفسّر، محدّث، فقیہ اور مورخ مسلّم ہے ..... تاریخ میں کون ہے جس نے ان پر اعتماد نہیں کیا۔ خصوصیت کے ساتھ دورِ فتنہ کی تاریخ کے معاملہ میں تو محققین انہی کی آرا پر زیادہ تر بھروسہ کرتے ہیں[2]

اپنے ان معتبر مورخین پر اپنے کامل اعتماد کا اظہار کرنے کے بعد مولانا نے للکارنے کے اسلوب میں اپنی بات کو یوں مکمل کیا ہے :

اب غور فرمایئے یہ ہیں وہ مآخذ جن سے میں نے اپنی بحث میں سارا مواد لیا ہے۔ اب اگر یہ اُس دَور کی تاریخ کے معاملہ میں قابلِ اعتماد نہیں ہیں تو پھر اعلان کر دیجئے کہ عہدِ رسالت سے لیکر آٹھویں صدی تک کی کوئی تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے[3]

ہمارے قارئین دیکھ چکے ہیں کہ ہم نے مولانا کی بیان کردہ انہی معتبر کتابوں کی معتبر روایات تک ہی اپنی بات محدود رکھی ہے۔ ہم نے مولانا کے ادعا کے خلاف صحیح بخاری، مسند امام احمد، ازالۃ الخفا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے علاوہ تاریخ کتب میں سے زیادہ تر روایات ابنِ جریر طبری سے ہی لی ہیں ایک روایت ابن سعد کی ہے اور ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر روایت مولانا کے ادّعا کو جھٹلاتی ہے ۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ۳۱۳ [2] ایضاً صـ۳۱۲ [3] ایضاً صـ۳۱۳

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) شیعہ نے اپنی مصلحت اور اپنی ضرورت سے روایت میں ابو سفیانؓ کا نام شامل کیا تھا اور دوسرے اہلِ سیاست نے اپنی مصلحت اور اپنی

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہم یہ روایات نقل کرنے کے بعد روایات پر کسی بحث کو جاری کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ روایات اپنی جگہ بالکل واضح ہیں، بات بڑی صاف ہے اور ان روایات میں مولانا کے ادّعا کے خلاف ہر وضاحت اپنی پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے جو کسی قاری کو مطلوب ہو۔ تاہم مولانا سے یہ بات ضرور پوچھنے والی ہے کہ آپ کی تسلی کے لئے آخر خلافتِ راشدہ کے قاعدہ سے عدم توافق کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور آپ کے نزدیک قابلِ اعتبار روایت کی تعریف کیا ہے؟

ہمیں مولانا کی اس "میں نہ مانوں" کا بھی علم ہے جو انہوں نے سیدنا علیؓ کے باب میں اختیار کر رکھی ہے کہ:

مجھے وہ روایات کمزور نظر آتی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ (یعنی حضرت علیؓ) ان (یعنی ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ) میں سے ہر ایک کے خلیفہ بنائے جانے پر ناراض تھے ؎

تاہم ہم نے واقعات کی پوری تصویر قارئین کرام کے سامنے پیش کر دی ہے۔ اگر ان سطور کا کوئی بھی قاری بات کی اصلیت کو جاننا چاہے گا تو اس کی

؎ خلافت و ملوکیت صد ۳۴۴ سطر ۱۹-۲۰

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ضرورت سے عباسؓ کا نام روایت سے نکال کر سارا بوجھ حضرت ابوسفیانؓ پر ڈال دیا اور یہیں سے یہ روایت مولانا مودودی صاحب کی دلچسپی کا مرکز بنتی ہے ورنہ اس سازش میں حضرت عباسؓ کی شرکت کی حد تک مولانا کے لئے اس روایت میں کوئی دلچسپی موجود نہیں تھی۔ لیکن جب روایت مولانا کی ان دلچسپیوں سے ہموار ہوگئی جن کی تخلیق مولانا کو منظور تھی تو انہوں نے اس کو بغیر کسی ناگزیر ضرورت کے بہانے ہی بہانے اپنے ہاں نقل کر لیا۔ تاکہ ان کی ابوسفیانؓ آزاری کی لذّت کا سامان مہیا رہے۔

روایت کے بموجب حضرت ابوسفیانؓ جب حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ کے خلاف خروج کی تحریک کر چکے تو حضرت علیؓ کا جواب نقل کرتے ہوئے راوی بات کو

(باقی اگلے صفحہ پر)

راہ بڑی صاف ہے مگر ہمارے لئے شاید یہ بات ممکن نہ ہو کہ ہم مولانا کو ان کے موقف کے خلاف کسی قوی سے قوی روایت کو بھی قوی تسلیم کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ تاہم بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم مولانا کو ان کا اپنا ہی یہ ارشاد یاد دلاتے ہیں کہ:

اس ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں کہ کوئی شخص ہر اُس بات کو غلط کہے جو اس کی خواہشات کے خلاف ہو۔ خواہ وہ حدیث کی مستند کتابوں میں بیان ہوئی ہو اور ہر اُس بات کو صحیح کہے جو اُس کی خواہشات کے مطابق ہو خواہ اس کی سند اُن روایات سے بھی ضعیف تر ہو جنہیں وہ حقیقت قرار دے رہا ہے[1]

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۳۱۶ سطر ۱۰ تا ۱۳

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) یوں شروع کرتا ہے قَالَ عَلِیٌّ کہ حضرت علیؓ نے فرمایا مگر مولانا اس ترجمہ میں اپنے لئے کوئی لذت نہیں پاتے اس لئے انہوں نے قَالَ عَلِیٌّ کا ترجمہ یوں فرمایا:

حضرت علیؓ نے یہ جواب دے کر ان کا منہ بند کر دیا۔

سبحان اللہ ؎

بلا سے کوئی ادا اُن کی بدنما ہو جائے
کسی طرح سے تو ٹوٹ جائے ولولہ دل کا

یعنی "اُن کا منہ بند کر دیا" عربی کلمہ قَالَ کا ترجمہ ہے۔

یہاں تک تو خیر روایت کے اندر کی بات ہے اور جہاں تک خود روایت کا تعلق ہے تو وہ بوجوہ ذیل سراسر باطل، جھوٹ، افترا اور یکسر اختراع ہے۔

۱۔ حضرت ابو سفیانؓ کو حضرت ابو بکرؓ کو ہٹا کر کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا جبکہ انہیں حضرت ابو بکرؓ سے نہ کوئی پہلے سے نزاع در پیش تھی نہ کوئی مطالبہ، نہ وہ ابو بکرؓ کو ہٹا کر خود خلیفہ بن سکتے تھے نہ اس کا کوئی امکان تھا۔

۲۔ ابو سفیانؓ اگر کوئی سازش بھی کرتے تو اپنے بیٹوں کے لئے کرتے تاکہ اُن کا پہلے سے حاصل سیاسی تفوق اور زیادہ مستحکم ہو سکتا (باقی اگلے صفحہ پر)

جُزوِ ثالث

مولانا مودودی صاحب کے بیان کا تیسرا حصہ یہ ہے:

حضرت معاویہؓ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہیں تھی کہ وہ مسلمانوں کے بنانے سے خلیفہ بنے ہوں۔ اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے۔

وہ بہرحال خلیفہ ہونا چاہتے تھے، اُنہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی، مسلمانوں کے راضی ہونے پر اُن کی خلافت کا انحصار نہ تھا، لوگوں نے ان کو خلیفہ بنایا نہیں وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے۔ اگر اس وقت اُن سے بیعت نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے۔ بلکہ اس کے معنی خونریزی اور بدنظمی کے تھے۔ جسے امن اور نظم پر ترجیح نہیں دی جاسکتی تھی اس لئے امام حسن رضی اللہ عنہ کی دستبرداری (ربیع الاول ۴۱ھ) کے بعد تمام صحابہ و تابعین و صلحائے اُمت نے ان کی بیعت پر اتفاق کیا اور اس کو

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) اُنہیں حضرت علیؓ کے لئے پوری مملکت کو انتشار اور خلفشار کے سپرد کر دینے کی کیا حاجت تھی! جبکہ ابوبکرؓ اور ان کے خاندان سے تو اُنہیں نہ کبھی کوئی شکایت پیدا ہوئی تھی نہ کوئی تنازعہ در پیش تھا مگر حضرت علیؓ کا خاندان گزشتہ تین پشتوں سے ابوسفیانؓ کے خاندان کے خلاف برسرِ پیکار چلا آ رہا تھا۔

ان حالات میں یہ کس قسم کی عقلمندی تھی کہ وہ علیؓ کو اقتدار دلانے میں مدد کرتے اور اپنے پورے خاندان کے لئے خطرات کو دعوت دیتے۔ وہ حضرت علیؓ اور اُن کے خاندان سے تکلیف اٹھاتے رہنے کی وجہ سے ان کی خلافت کے خلاف تو سازش کر سکتے تھے مگر انہیں خلافت لے کر دینے کے لئے وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

"عامۃ الجماعۃ" اس بناء پر قرار دیا کہ کم از کم خانہ جنگی تو ختم ہوئی۔"

افسوس ہے مولانا نے حضرت معاویہؓ پر اپنی خلافت کے لئے دھاندلی کا الزام تو بڑے زور سے رکھا ہے مگر اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کوئی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جس سے ظاہر ہو کہ حضرت معاویہؓ نے اپنی خلافت

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ۳- حضرت ابوبکرؓ کا خاندان بلاشبہ قریش میں ایک چھوٹا خاندان ہی تھا مگر ابوسفیانؓ بھی جانتے تھے کہ اُمتِ محمدیہ میں خود ابوبکرؓ چھوٹے نہیں ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُمت کے اندر وہ سب سے بڑے ہیں۔ اور یہ بات مولانا مودودی کے علم میں بھی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے خلاف خروج ان کی اس مقبولیت کے سبب ہی نہیں کیا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ وہ ابوبکرؓ کی عظمت کے حریف نہیں بن سکتے۔

۴- حضرت ابوسفیان کو اگر حضرت ابوبکرؓ سے کوئی شکایت ہوتی یا اُن کے سینہ میں ابوبکرؓ کے خلاف کوئی کینہ موجود ہوتا تو وہ اپنے پورے خاندان اور بیوی بچوں سمیت حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے موت کی وادیوں میں بسیرا کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتے۔ وہ عمر کے بھی اس دور میں تھے کہ وہ جہاد بالسیف کے مکلف نہیں تھے۔ مگر انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا پورا عرصہ ایک روز بھی اپنے گھر میں قیام نہیں کیا بلکہ ہمیشہ میدانِ جنگ میں ہی رہے۔

۵- حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے حضرت ابوسفیانؓ یا اُن کے خانوادہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی جس کی وجہ سے انہیں ابوبکرؓ کے خلاف اشتعال یا خروج کی وجہ پیدا ہوتی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابوسفیانؓ کے خاندان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے جو بلند مرتبہ اپنی حکومت میں دے رکھا تھا۔ ابوبکرؓ کے دور میں اس میں اضافہ ہی ہوا تھا کمی

(باقی اگلے صفحہ پر)

کے قیام کی غرض سے دھاندلی زور و جبر یا تشدد سے کام لیا ہو۔
مولانا کو حضرت معاویہؓ کے خلاف بہت سے وسائل مہیا تھے بہت سی

(پہلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) نہیں ہوئی تھی۔

جبکہ ابو سفیانؓ جانتے تھے کہ اگر علیؓ غالب آئے تو اُن کا اور اُن کے خاندان کا پورا شرف چھن جائے گا۔ جیسا کہ بعد میں جب اقتدار حضرت علیؓ کے پاس پہنچا تو ابو سفیانؓ کے پورے خاندان سے حضرت علیؓ نے اُن کا ہر عہدہ چھین لیا، اُن پر ترقی کی راہیں ہر طرح سے بند کر دیں اور انہیں حکومت کے دائرہ سے نکال باہر کیا۔ حضرت ابو سفیانؓ ایک جہاندیدہ گرم سرد چشیدہ بزرگ تھے وہ حضرت علیؓ کے لئے اپنے پورے خاندان کے مستقبل کو کیونکر خطرات کے سپرد کر سکتے تھے۔ اگر حضرت ابو سفیانؓ نے حضرت علیؓ کے لئے ایسی کوئی سعی کی ہوتی تو ہرگز ممکن نہیں تھا کہ علیؓ اس کا ذرا بھی لحاظ نہ کرتے۔

۶۔ دنیا بھر کی ساری ہی اپنی پرائی موافق مخالف مسلمانوں کی اور غیر مسلمانوں کی تواریخ کی بھرپور گواہی موجود ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا اعلان ہو چکنے پر بنو ہاشم کئی روز تک حضرت علیؓ کے گھر جمع ہو کر حضرت ابو بکرؓ کے خلاف کارروائیوں کا سوچتے رہے۔

ابو سفیانؓ اگر ابو بکرؓ کے خلاف کوئی ارادہ رکھتے تھے تو انہیں ان مجالس میں پہنچ کر بنو ہاشم کی قوت کو بڑھانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ علیؓ کی امداد کا اصل موقع یہی تھا کہ جب ان کا پورا خاندان ان کو بر سر اقتدار لانے کے لئے مشوروں میں مصروف اور امداد کا محتاج تھا۔ حالانکہ کسی تاریخ میں اس مرحلہ پر ابو سفیانؓ کی سرگرمی کا کوئی ذکر نہیں آتا اور اگر ابو سفیانؓ اس مرحلہ پر کوئی پیشکش کرتے تو بنو ہاشم یہ پیشکش کبھی مسترد نہ کرتے۔

۷۔ یہ کہنا اور اُس کو ماننا دونوں ہی لغو امر ہیں کہ حضرت ابو سفیانؓ جیسے ذہین و فطین

(باقی اگلے صفحہ پر)

موضوعات ان کے نوٹس میں تھیں وہ یہاں ابن ابی الحدید سے بھی امداد طلب کر سکتے تھے۔ روافض اور سبائیوں کی مساعی سے جمع شدہ کذبات کے انبار اُن کے سامنے موجود تھے۔ اُنہیں چاہیئے تھا کہ وہ جیسے کیسے بھی اُن سے بن پڑتی یہ دکھاتے کہ معاویہؓ اپنی خلافت پر بیعت کے لئے کسی کو ٹکٹکی سے باندھ کر بیٹ رہے ہوں کہ مجھے خلیفہ مانو ورنہ مار مار کر مار دیئے جاؤ گے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) اور دانشمند شخص نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے خلاف دلیل پیش کی کہ وہ قریش کے ایک چھوٹے سے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ خلافت کے لئے صالح، صاحبِ تقویٰ اور صحیح الفکر مومن ہونا شرط ہے۔ اُس کے قبیلے کا لمبا چوڑا ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔

۸۔ مولانا نے جس کہانی کو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے خلاف حضرت علیؓ کے عدم خروج کو ایک بنیاد کے طور پر پیش کیا ہے اصل یہ ہے کہ اس مسئلہ میں مولانا مودودی صاحب کے دریافت کردہ کذاب راوی کے سوا دنیا کے کسی بھی قابلِ ذکر مورخ نے مولانا سے اتفاق نہیں کیا اور یہ بات کسی بھی غیر مشتبہ ذریعہ سے وارد نہیں ہوئی کہ "حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے خلاف اس لئے خروج نہیں کیا تھا کہ حضرت علیؓ اس کام کو اسلام اور اہلِ اسلام سے دشمنی کے مترادف سمجھتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ابوبکرؓ کے خلاف خروج منافقانہ کارروائی ہے یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے اس باب میں ابوسفیانؓ کی پیشکش کو سختی سے مسترد کر دیا۔ اور ایسا جواب دیا کہ ابوسفیانؓ کا منہ بند ہو گیا" (ملخص خلافت و ملوکیت ص۹۶) واقعہ یہ ہے کہ اس کہانی کو اُچھالنے سے مولانا کے پیشِ نظر تاریخ میں کسی رہنمائی کا عزم نہیں ہے بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ابوسفیانؓ کی اسلام دشمنی اور منافقت کو شہرت دینے کا سنہری موقع اُنہیں حاصل ہے۔ ورنہ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے مولانا کے عین ہم خیال بلکہ معاویہؓ اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

وہ کسی کے سر پہ تلوار لٹکائے کھڑے ہوں، کسی کو گریبان سے پکڑے اس کے گھر سے گھسیٹ کر اپنی خلافت کی چوکھٹ پر سجدہ ریزی کے لئے لا رہے ہوں، کسی کو اپنی بیعتِ خلافت سے انکار پر قتل کیا ہو، جیل میں ڈالا ہو، یا بند سلاسل کیا ہو، کوڑے لگائے ہوں، نظر بندی کا حکم جاری کیا ہو اور ملک بدر کیا ہو۔

یا کم از کم کسی ایسے شخص کا ہی نام لیتے جو اس خوف سے بھاگ گیا ہو کہ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) اُن کے خاندان کے بارے میں چار قدم آگے مصری مورخ جناب عمر ابو النصر کا کہنا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابو بکرؓ کے خلاف اس لئے خروج نہیں کیا تھا کہ:

۱۔ حضرت ابو بکرؓ صدیق کی خلافت پر مسلمانوں کا اجماع ہو چکا تھا۔

۲۔ خلیفۂ اوّل کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں جو مرتبہ تھا اور اسلام کی تاریخ میں آپ کو جو بلند و بالا حیثیت حاصل تھی، اسے دیکھتے ہوئے حضرت علیؓ لوگوں کو اپنی خلافت کی طرف دعوت دے کر بھی کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔

۳۔ حضرت علیؓ کو غالباً یہ خیال بھی ہو گا کہ ابو بکرؓ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں وہ اب زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکیں گے۔

۴۔ حضرت ابو بکرؓ کے قبیلہ کے ساتھ اب تک بنو ہاشم کا کوئی تنازعہ نہیں چلا تھا۔

۵۔ اگر ہم اس بات کو بھی ملحوظ رکھیں تو یہ بات واقعہ کے خلاف نہیں ہو گی کہ حضرت علیؓ کی عمر ابھی تیس برس کے لگ بھگ تھی اور (علیؓ جانتے تھے کہ) عرب سن رسیدہ بزرگوں کے مقابلہ میں کسی نوجوان کی سرداری کو پسند نہیں کرتے تھے۔

پس انہی اسباب کی بنا پر حضرت علیؓ (کسی تصادم کو دعوت دینے کے بجائے) حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کرنے پر مجبور ہو گئے اور اُنھوں نے اپنی خلافت کا سوال کسی مناسب موقع کے لئے اٹھا رکھا (علیؓ و عائشہؓ صہ ۱۴-۱۵)

اگر معاویہؓ کے ملک میں رہا تو وہ مجھے اپنی خلافت پر ایمان لانے کے لئے مجبور کریں گے۔ آخر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی دستار بندی کے مرحلہ پر جو ایسی کتنی ہی زور کاریاں تاریخ میں موجود ہیں اور مولانا اس کے باوجود بڑی جسارت سے کوئی ایک معتبر روایت فریق مخاطب سے طلب کرتے ہیں مگر کیا مولانا تاریخ کی کسی غیر معتبر غیر مشہور اور غیر مستند کتاب سے ہی کوئی ایک واقعہ ایسا پیش کر سکتے ہیں جس سے معاویہؓ کے دامن پر انگلی رکھنے کی گنجائش پیدا ہو سکے۔

اپنی سیاسی ضرورتوں سے حضرت معاویہؓ پر مولانا کا غصہ بجا سہی مگر اُن کے پاس اپنے اس غصہ کے جواز میں کوئی دلیل بھی تو موجود ہو۔ اگر وہ اس باب میں کوئی ایک آدھ مثال ہی کہیں سے ڈھونڈ نکالتے تو اور کچھ نہ سہی معاویہؓ کے دور کو حضرت علیؓ کے دور کی بہت سی بے احتیاطیوں کے مماثل ہی کہہ لیا جاتا اور معاویہؓ کی ایک ناکردنی حضرت علیؓ کے دور کی سو کردنیوں کے برابر مان لی جاتی مگر بغیر کسی دلیل کے تو معاویہؓ کو مجرم کہنا صحیح نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ معاویہؓ مسلمانوں کے بنانے سے خلیفہ نہیں بنے تھے۔ تو کیا مولانا اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ معاویہؓ کو جب تک مسلمانوں نے آگے بڑھ کر خلافت پیش نہیں کر دی تھی اُنہوں نے خلافت کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

کیا مولانا اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ معاویہؓ نے اپنے آپ کو ہمیشہ امیر ہی کہا اور سمجھا اور وہ عالم اسلام میں امیر معاویہؓ کی حیثیت سے ہی متعارف تھے۔ یہ امارت بھی اُنہوں نے کسی سے چھین کر حاصل نہیں کی تھی بلکہ انہیں یہ اعزاز حضرت فاروق اعظمؓ عمر بن الخطاب کے وقت سے ہی حاصل تھا۔

اور پھر جب اُن کی خلافت پر اجماع ہوا تو اُنہوں نے یہ خلافت بھی کسی سے لڑ کر نہیں لی تھی بلکہ یہ خلافت اُن کو سیدنا علیؓ کے فرزند گرامی حضرت حسنؓ نے اُن کے گھر پہنچ کر خود اپنے دستِ مبارک سے پیش کی تھی۔

حضرت معاویہؓ کو خلافت کا تاج پہناتے خلیفۂ اسلام کی حیثیت سے ان کی

پہلی بیعت حضرت حسنؓ نے ہی کی تھی اور مولانا جانتے ہیں کہ حسنؓ کو اس بات کے لئے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے خود اس کی تحریک کی، خود اُن کی طرف متوجہ ہوئے، خود اُن کی طرف رجوع کیا۔ حضرت معاویہؓ کی امارت اس وقت تک خلافت میں منتقل نہیں ہو سکی تھی جب تک جانشین علیؓ اور ابن علیؓ حضرت حسنؓ نے ان کی بیعت نہیں کر لی۔

حضرت معاویہؓ کو خلافت کی مسند پہ فائز کرنے والے حضرت حسنؓ تھے حضرت حسینؓ تھے اور اُن کے اعوان و انصار تھے۔

مولانا جو فرماتے ہیں کہ معاویہؓ کو مسلمانوں نے خلیفہ نہیں بنایا تھا تو کیا مولانا کے نزدیک حسنؓ مسلمان نہیں تھے؟

کیا حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ کے جنگی قیدی تھے جو بامر مجبوری وہ بیعت پر مجبور ہوئے۔

کیا حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے شکست کھائی تھی جو انہوں نے معاویہؓ کی بیعت کے بغیر کوئی چارہ نہ سمجھا۔ کیا حضرت حسنؓ کو گرفتار کر کے حضرت معاویہؓ کے حضور پیش کیا گیا تھا جو وہ معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کے لئے مجبور ہوئے۔ اور اگر کوئی ایسی بات وقوع پا چکی تھی تو جس طرح حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کے حلقۂ اثر سے نکل کر مجبوری کی بیعت سے انکار کر دیا تھا حضرت حسنؓ بھی ایسا کر سکتے تھے۔ مگر کیا مولانا کو معلوم نہیں کہ حضرت حسنؓ نے جب حضرت معاویہؓ سے بیعت کر لی تو پھر اپنی باقی پوری عمر حضرت معاویہؓ کی خلافت سے وابستہ ہو کر رہے۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ اور اُن کے خانوادہ کے تمام ہی قابل ذکر افراد کے وظائف مقرر کر رکھے تھے اور وہ سب کے سب ہی یہ وظائف بخوشی وصول کرتے رہے ان میں حضرت حسینؓ بھی شامل تھے اور انکے اعوان و انصار بھی۔

آخر یہ جبر کی کون سی صورت ہے جسے مولانا مودودی اصحاب رسولؐ اور صلحائے اُمت کی مجبوری بیان کر رہے ہیں؟

کیا حضرت حسنؓ کی طرف سے بیعت پیش کرنے سے قبل حضرت معاویہؓ کی زبان سے یا اُن کے حلقہ میں کسی دوسرے کی طرف سے بھی حضرت معاویہؓ کی خلافت کا کوئی ذکر موجود ہے!

جبکہ صورتِ حال یہ تھی کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ کی بیعتِ خلافت پر ہی بخوشی آمادہ اور راضی تھے۔ اگر حضرت علیؓ قاتلینِ عثمانؓ کو اُن کے سپرد کر دینے کی شرط قبول کر لیں۔ تاہم اس عرصہ میں بھی وہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں کسی متبادل خلافت کا ذکر تک اپنی زبان پر کبھی نہیں لائے تھے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ مولانا مودودی صاحب کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ حضرت معاویہؓ نے ایک مچھر کا خون بہانے کے بقدر بھی اپنی خلافت کو منوانے یا اُسے مستحکم بنانے میں کسی پر کوئی ظلم روا رکھا ہو۔

حضرت معاویہؓ بلاشبہ خلیفہ بن گئے تھے مگر مولانا کا یہ کہنا از سرتا پا غلط اور گمراہ کن ہے کہ وہ اپنے زور سے خلیفہ بنے تھے اور انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی تھی۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اُنہیں اپنی مرضی، اپنی خواہش اور اپنی خوشی سے خلیفہ بنایا تھا۔ ان کی خلافت مسلمانوں کے بنانے سے ہی بنی تھی اور مسلمانوں کی مکمل مرضی اور رضامندی سے تشکیل پائی تھی۔

بلاشبہ معاویہؓ کی خلافت مولانا کے لئے ناقابلِ برداشت ہے مگر اس میں حضرت معاویہؓ کا کوئی قصور نہیں۔ اس میں اگر کوئی قصوروار ہے تو وہ اللہ کی رحمت ہوگی جو ان پر ابرِ رحمت بن کر چھا گئی یا اس میں حضرت حسنؓ قصوروار ہیں جو خلافت کی دستار لے کر خود معاویہؓ کی خدمت میں پہنچے معاویہؓ غریب پر تو مولانا کا غصہ بالکل بے محل ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بہت سے دوسرے صلحائے

اُمت کے ایک عظیم کارِ خیر کو ان کی مجبوری کہہ کر بے وقعت بنا دیا ہے اور حضرت حسنؓ کا وہ تاریخی کارنامہ جو حضرت حسنؓ کی عظمت کی تعمیر میں ایک عظیم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ کو سید قرار دیا تھا اور اُن کے جس عمل کی تحسین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کے وقوع سے قبل وحیِ ربانی سے خبر پاکر فرمائی تھی مولانا نے اُسے حضرت حسنؓ کی مجبوری بیان کر کے ایک محبوب کہانی کی ساری شوکت برباد کر دی ہے۔

مقامِ تاسف ہے کہ مولانا نے حضرت حسنؓ اور اُن کے رفقاء کا حضرت معاویہؓ کے حق میں ہموار ہونا محض مسلمانوں کو خونریزی سے بچانے کی مصلحت قرار دیا اور لگتے ہاتھ "عامۃ الجماعۃ" کی تنقیص بھی کر ڈالی۔ لیکن اگر اُن کی سوچ سیدھی رہتی تو وہ اس ایمان افروز تاریخی واقعہ کو جس نے پورے عالمِ اسلام کو مستقل سعادتوں اور تابناکیوں کی ضمانت مہیا کر دی حضرت حسنؓ کی خُلق اور حضرت معاویہؓ کی فطری صلح پسندی اور صلح جوئی کی برکت بھی قرار دے سکتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کو خونریزی سے محفوظ رکھنے کی مصلحت تو از خود ہی حاصل تھی۔ وہ اگر حضرت معاویہؓ کو ان کے اس حسنِ کار کی برکات سے محروم ہی رکھنا چاہتے تو وہ اس واقعہ کو اُمت کی بھلائی کے لئے محض ایک آسمانی تصرف بھی کہہ سکتے تھے اور یہ خلافِ واقعہ بھی نہ ہوتا۔ مگر اُنہوں نے محض اپنے جذبات کی تسکین کے لئے ایک کارِ خیر کی عظمت کھو دی۔

کیا مولانا مودودی بتا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو خونریزی سے بچانے کا خیال جو جنگِ جمل میں تیرہ ہزار، اور جنگِ صفین میں نوّے ہزار مسلمانوں کا خون بہہ چکنے کے بعد حضرت حسنؓ کو آیا۔ اگر یہ کوئی آسمانی تصرف نہیں تھا تو حضرت علیؓ کا خیال اس طرف کیوں نہ جا سکا تھا۔ جو حضرت معاویہؓ اور حضرت حسنؓ دونوں کے

مقابلہ میں زیادہ شرف کے حامل تھے اور حضرت حسنؓ جو مسلمانوں کو خونریزی سے محفوظ رکھنے کے لیے "عام الجماعۃ" کی تخلیق کا تاریخ ساز کارنامہ انجام دے پائے۔ حضرت علیؓ کو اس طرف کیوں توجہ نہ ہو سکی جو حسنؓ سے بہرحال زیادہ مرتبہ رکھتے تھے، ان سے بڑھ کر عالم تھے، اُن سے بڑھ کر مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار تھے اور معاویہؓ اور حسنؓ دونوں سے کہیں بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ صحبت سے مستفاد تھے۔

رہا مولانا کا یہ ارشاد کہ: "اگر مسلمان حضرت معاویہؓ کی بیعت نہ کرتے، تو اس کا مطلب یہ نہ ہوتا کہ معاویہؓ اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے۔"

تو گزارش ہے کہ یہ منصب تو اُن کو بیعت کرنے والوں نے ہی بخشا تھا ہٹنے ہٹانے کا سوال یہاں کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ ہٹنے کی بات تو اس مقام سے تعلق رکھتی ہے جو کسی کو پہلے سے حاصل ہو اور معاویہؓ کے پاس تو پہلے سے خلافت موجود ہی نہیں تھی پھر وہ ہٹنے کے بارے میں کیا سوچتے!

مسلمان اُن کو کسی منصب سے ہٹانے کے لئے جمع نہیں ہوئے تھے، بلکہ انہیں ایک منصب بخشنے اور اُسے قبول کرنے کی درخواست لے کر اُن کے پاس آئے تھے اور یہ ہٹنے ہٹانے کا نہیں بلکہ پیش کرنے اور قبول کرنے کا مرحلہ تھا۔ ہٹنے یا ہٹانے کا مرحلہ حضرت معاویہؓ کو کبھی درپیش ہی نہیں ہوا اُنکی خلافت اُن کے رب کی عطا تھی وہی واپس مانگتا تو بات تھی مولانا کے کہنے اور چاہنے سے آسمانی فیصلے نہیں بدل سکتے۔

اور پھر یہ کتنی دردناک ہے کہ محض معاویہؓ دشمنی کی مصلحت سے ہی مولانا کو عام الجماعۃ کے وہ معنی ہی پسند نہیں ہیں جو پوری اُمت کے ہاں ہمیشہ سے تسلیم شدہ ہیں۔

مسلمانوں نے حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کی مصالحت کی وجہ سے اس سال کو عام الجماعۃ قرار دیا کیونکہ اس سال اُمتِ محمدیہ کا پانچسالہ باہمی

قتل و قتال اور جنگ و جدال دور ہوا اور مسلمان بطور بنیان مرصوص دوبارہ ایک جماعت کی صورت میں ایک جگہ جمع ہو گئے مگر مولانا کو یہ معنی اس لئے پسند نہیں ہیں کیونکہ ان معنوں میں بھی اگرچہ حضرت حسنؓ کی عظمت ہی ظاہر ہے۔ مگر اس عظمت میں حضرت معاویہؓ کے خلوص اور حسنِ نیت کا بھی برابر کا ہی حصہ ہے۔ اور یہ بات مولانا کو گوارا نہیں تھی اس لئے انہوں نے پوری امت کے خلاف عام الجماعۃ کے یہ معنی اکئے ہیں کہ جلو خانہ جنگی تو ختم ہوئی آہ ع

گل است سعدی و در چشم دشمناں خار ست

مولانا کی معاویہؓ دشمنی کے اس پہلو کی دردناکی اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ شیعہ حضرات جن کے لئے حضرت حسنؓ کا یہ اقدام وجۂ اذیت ہو سکتا تھا، حضرت حسنؓ کے اس اقدام میں وہ بھی بجز خیر اور بھلائی کے اور کچھ نہیں پاتے بلکہ وہ اس واقعہ کو اس کائنات میں وقوع پانے والے تمام ہی امورِ خیر پر برتری دیتے ہیں، حضرت امام باقر سے نقل کیا گیا ہے :

والذی صنعہ الحسن بن علی کان خیرًا لھذہ الامۃ مما طلعت علیہ الشمس [1]

کہ حضرت حسنؓ بن علیؓ نے یہ جو کچھ کیا امتِ محمدیہ کے لئے ہر اس امرِ خیر سے بہتر تھا جس پر سورج طلوع ہوا مگر مولانا فرماتے ہیں چلو خانہ جنگی تو ختم ہوئی، سبحان اللہ! اسے کہتے ہیں ع

ہنر بچشمِ عداوت بزرگ تر عیب ست

---

[1] بحار الانوار، شیعہ

فصلِ دوم

دُوسرا حملہ

خلفاء کے طرزِ زندگی میں تبدیلی

مولانا لکھتے ہیں :

دوسری نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ دورِ ملوکیت کے آغاز ہی سے بادشاہ قسم کے خلفاء نے قیصر و کسریٰ کا سا طرزِ زندگی اختیار کر لیا۔ اور اس طریقے کو چھوڑ دیا جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین زندگی بسر کرتے تھے۔

اُنہوں نے شاہی محلات میں رہنا شروع کر دیا، شاہی حرس (باڈی گارڈ) ان کے محلوں کی حفاظت کرنے اور ان کے جلو میں چلنے لگے۔ حاجب و دربان اُن کے اور عوام کے درمیان حائل ہو گئے۔ رعیت کا براہِ راست اُن تک پہنچنا اور اُن کا خود رعیت کے درمیان رہنا سہنا اور چلنا پھرنا بند ہو گیا۔

اپنی رعیت کے حالات معلوم کرنے کے لئے وہ اپنے ماتحت کارپردازوں کے محتاج ہو گئے جن کے ذریعہ سے کبھی کسی حکومت کو بھی صحیح صورتِ احوال کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ اور رعیت کے لئے بھی یہ ممکن نہ رہا کہ بلا توسط ان تک اپنی حاجات اور شکایات لے کر جا سکیں۔

یہ طرزِ حکومت اُس طرزِ حکومت کے بالکل برعکس تھا جس پر خلفائے راشدین حکومت کرتے تھے۔

وہ ہمیشہ عوام کے درمیان رہے جہاں ہر شخص ان سے آزادی کے ساتھ

مل سکتا تھا۔ وہ بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہر شخص ان کا دامن پکڑ سکتا تھا، وہ پانچوں وقت عوام کے ساتھ اُنہی کی صفوں میں نمازیں پڑھتے تھے۔ اور جمعہ کے خطبوں میں ذکر اللہ اور تعلیم دین کے ساتھ اپنی حکومت کی پالیسی سے بھی عوام کو آگاہ کرتے تھے اور اپنی ذات اور اپنی حکومت کے خلاف عوام کے ہر اعتراض کی جوابدہی بھی کرتے تھے۔ اس طریقے کو حضرت علیؓ نے کوفے میں اپنی جان کا خطرہ مول لے کر بھی آخر وقت تک نبھایا۔ لیکن ملوکیت کا دَور شروع ہوتے ہی اس نمونے کو چھوڑ کر رُوم و ایران کے بادشاہوں کا نمونہ اختیار کر لیا گیا۔

(اور اس کے بعد مولانا نے طیب کا بند بوں ارشاد فرمایا ہے کہ) اس تبدیلی کی ابتدا حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہی ہو چکی تھی بعد میں یہ برابر بڑھتی ہی چلی گئی[1]

افسوس ہے کہ مولانا نے اپنے اس طویل بیان میں حضرت معاویہؓ کو جن خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی خرابی اُن کے اندر موجود نہیں تھی اور جتنے محاسن آپ نے کسی صحیح خلیفہ کے شمار کئے ہیں اُن میں سے کسی ایک سے بھی حضرت معاویہؓ کا دامن خالی نہیں تھا۔ تعجب ہے کہ مولانا حضرت معاویہؓ پر اُن تمام لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی ڈال رہے ہیں جو اُن کے بہت بعد تاریخ کا حصہ بنے ہیں اور جو اپنے پیدا کردہ مفاسد کے لئے کسی دوسرے کا تلمذ حاصل کرنے کے محتاج نہیں تھے، وہ خود بہت ذہین لوگ تھے اُنہیں کسی کا احسان اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ تاہم اس طرح اگر مستقبل کے کسی شریر کی شرارت بیشگی کا رشتہ ماضی کے اپنے کسی معتوب کے دامن سے باندھنا صحیح ہے تو بلاشبہ مولانا جیسے اہل علم کے لئے تو یہ کوئی مشکل گھاٹی نہیں ہے لیکن اگر اس ستم ظریفی کو جواز کی سند حاصل ہوگئی تو کل خود مولانا مودودی بھی اس ظلم کی زد میں آسکتے ہیں۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۶۰ - ۱۶۱

اور اپنی اغراض کے لئے کتمانِ حق کرنے والا ہر شخص کسی بھی زمانہ میں مولانا کی خلافت وملوکیت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور حضرت معاویہؓ کو تو شاید بُعد زمانی کی وجہ سے اپنے دامن سے باندھے گئے شرپہروں کے باب میں کچھ رعایت بھی حاصل ہو سکے۔ مگر مولانا مودودی اس قسم کی کسی بھی رعایت سے استفادہ نہیں کر سکیں گے کیونکہ ان کی خلافت وملوکیت اس باب میں ایک دستاویزی شہادت ہے۔

مولانا مودودی صاحب نے متنقبل کے بُروں کے جو اطوار گنائے ہیں ان کی صورت کچھ یوں ہے:

- وہ قیصر وکسریٰ کی طرز کی زندگی رکھتے تھے۔
- محلات میں رہتے تھے۔
- محافظ دستے اپنے ہمراہ رکھتے تھے۔
- ان کے دروازوں پر حاجب کھڑے رہتے تھے۔
- ان کی دربانی کے لئے نوکر رکھے جاتے تھے۔
- وہ اپنی رعایا سے کٹ چکے تھے۔
- اُن کو ملنے کے لئے کسی توسط اور سفارش کی ضرورت رہتی تھی۔

اب کیا مولانا بتا سکتے ہیں کہ ان میں سے کونسی بات حضرت معاویہؓ کی زندگی میں پائی جاتی تھی؟

حضرت معاویہؓ کی ذات میں قیصر کے خلاف بھرپور جنگوں کے زمانہ میں صرف پوشاک کی حد تک وجاہت کا ذکر ملتا ہے اور ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی موجود ہے کہ وہ اُن کے ذاتی غرور و عُجب کا حصہ نہیں تھی بلکہ ایک ملّی ضرورت سے تھی تاکہ کفر اہلِ اسلام کی انتہائی سادگی کو ان کی غربت اور ان کے افلاس کی دلیل نہ بنا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ اپنی اس شوکت کے اظہار میں منفرد نہیں تھے بلکہ رُوم اور ایران کی پُرشکوہ سلطنتوں کے خلاف سردھڑ کی

بازی لگانے والے سارے ہی سربراہانِ فوج حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح، حضرت یزیدؓ بن ابو سفیانؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور اُن کے دوسرے رفقاء سب کے ہاں ہی اس کا اہتمام موجود تھا۔ ورنہ جہاں تک حضرت معاویہؓ کے معمول کا تعلق ہے آپ ہمیشہ کٹی کٹی پیوند لگا لباس پہنتے تھے۔ اور ان کی درویشی کا یہ نشان پورے ملک میں شناخت کیا جاتا تھا اور لبا اوقات لوگ بطور تبرک اُن سے یہ لباس مانگ لیتے تھے لہ

- کیا مولانا حضرت معاویہؓ کی ذات میں قیصریت اور کسرویت کے کسی ایک رُخ کی بھی نشاندہی کر سکتے ہیں؟
- کیا وہ معاویہؓ کی محلاتی زندگی کا کوئی نشان دے سکتے ہیں؟
- کیا وہ ان کی حفاظت پر مامور کسی گارڈ کا پتہ دے سکتے ہیں؟
- کیا وہ اُن کے حجاب درو بام کا کوئی سُراغ دے سکتے ہیں؟
- کیا وہ تاریخ کے حوالہ سے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش کر سکتے ہیں کہ کوئی سائل اُن سے ملاقات کرنے گیا تو مایوس واپس لوٹا؟
- کیا اس بات کا کوئی ثبوت موجود ہے کہ حضرت معاویہؓ کی ملاقات کے لئے کبھی درخواستوں، سفارشوں اور واسطوں کی ضرورت پڑی ہو؟

اس مرحلہ پر مولانا کی یہ دریافت کوئی انکشاف نہیں ہے کہ:

"اپنی رعیت کا حال معلوم کرنے کے لئے وہ اپنے ماتحت کارپردازوں کے محتاج ہو گئے ہوں"

کیونکہ رعیت کی خبریں جاننے کے لئے خلیفہ ہر جگہ خود نہیں جا سکتا بلکہ اس غرض سے اُسے اپنے ماتحت کارپردازوں کی ہی ضرورت ہوتی ہے، مولانا کا اعتراض عامیانہ ہونے کے ساتھ محض شوقِ خوردہ گیری ہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی سلطنت کا نظم اپنے کارپردازوں کے

لہ ابن عساکر

ذریعہ ہی چلاتے تھے اور آپ کو اسلامی مملکت سے دور نزدیک کی خبریں اپنے کارپردازوں کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا بھی یہی دستور تھا اور حضرت عمرؓ نے تو اس غرض سے ہر ہر شہر میں خاص پرچہ نویس مقرر کر رکھے تھے۔ جو آپ کو مملکت کی خبریں بھیجتے تھے۔ آخر ہزاروں لاکھوں میل کا رقبہ رکھنے والی سلطنتیں اپنا سارا کاروبار اپنے کارپردازوں کے ذریعہ ہی چلاتی ہیں اس میں اعتراض والی کونسی بات ہے؟

خلفاء کے محاسن

اپنی اس تحریر میں مولانا نے ارشد خلفاء کے کچھ محاسن بھی ذکر کئے ہیں۔ ارشاد ہے:

- وہ ہمیشہ عوام کے درمیان رہتے تھے اور ہر شخص انہیں آزادی سے مل سکتا تھا۔
- وہ پانچوں وقت عوام کے ساتھ انہی کی صفوں میں نماز ادا کرتے تھے۔
- وہ عوام کو اپنی حکومت کی پالیسیوں سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔
- وہ اپنی ذات اور اپنی حکومت پر لوگوں کے اعتراضات کا جواب دیا کرتے تھے۔

اس ضمن میں مولانا نے بتایا ہے کہ حضرت علیؓ نے کوفہ میں اپنی جان کا خطرہ مول لے کر بھی اس طریقہ کو اختیار کئے رکھا۔ اور مولانا کو شکایت ہے ان کے علاوہ دوسرے خلفاء نے یہ طریقہ ترک کر دیا۔

حضرت علیؓ کی سیرت کے اس پہلو پر کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ ان کی بزرگی اور ان کی بے خوفی کا بھی ہر کوئی اعتراف کرتا ہے لیکن مولانا سے پوچھنے والی تو یہ بات ہے کہ یہ سب کی سب خوبیاں کیا حضرت معاویہؓ میں نہیں پائی جاتی تھیں؟

- کیا وہ عوام کے درمیان نہیں رہتے تھے؟

- کیا وہ پانچوں وقت مسجد میں باقاعدہ حاضری نہیں دیتے تھے؟
- کیا وہ اپنے عوام کے ساتھ اُنہی کی صفوں میں نماز ادا نہیں کرتے تھے؟
- کیا وہ جمعات کے خطبات ارشاد نہیں فرمایا کرتے تھے؟
- کیا وہ لوگوں کے جنازوں میں شامل نہیں ہوتے تھے؟
- کیا لوگ اُن کی پالیسی پر اُن کی موجودگی میں بحث نہیں کرتے تھے؟
- کیا وہ جواب کے مقام پر جواب اور عذر کے مقام پر عذر پیش نہیں کرتے تھے؟
- کیا لوگ ان کی موجودگی میں ان کی ذات کو ہدفِ تنقید نہیں بنا لیا کرتے تھے؟
- کیا اُنہوں نے کبھی اپنے کسی نکتہ چیں کی زبان کاٹی؟
- کیا اُنہوں نے اپنے کسی سبّاب اور بدگو کو بھی کبھی کوئی سزا دی؟
- حضرت علیؓ نے بلاشبہ اپنی جان کا خطرہ مول لے کر اپنی ذمہ داریوں کو سرانجام دینے کی روایت چھوڑی ہے، مگر کیا حضرت معاویہؓ نے بھی عین یہی روایت نہیں چھوڑی ہے؟
- کیا مولانا کو یاد نہیں رہا کہ حضرت علیؓ پر بھی قاتلانہ حملہ فجر کی نماز کے لئے جاتے سرِ راہ ہوا تھا جس کے نتیجہ میں وہ شہادت کے مقام پر فائز ہوئے اور حضرت معاویہؓ پر بھی ویسا ہی قاتلانہ حملہ مسجد کے اندر فجر کی نماز پڑھاتے ہوا تھا

پھر جب حضرت معاویہؓ اپنی ذات میں خلفائے راشدینؓ کے نقشِ قدم پر ہی چلتے تھے وہ خود بھی خلیفہ ارشد تھے اور ان کے سارے طور طریقے ارشد خلفاء کے سے ہی تھے تو مستقبل کے خلفاء کی نالائقیوں اور ناشائستگیوں کا ذمہ دار معاویہؓ کو کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔

مولانا اہلِ قلم ہیں اگر چاہیں تو حضرات شیخین کی سیرتوں کے ڈانڈے وہ ہلاکو اور چنگیز سے بھی ملا سکتے ہیں لیکن اگر وہ خوفِ خدا سے کام لیتے تو وہ معاویہؓ کو بھی خلفاء راشدین کی سیرت کا حامل ہی پاتے۔

حقیقت یہی ہے کہ معاویہؓ جس روز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

حلقۂ غلامی سے وابستہ ہوئے ، اُنہوں نے پھر اپنی پوری زندگی اُس عہد کو ایک مومن قانت کی طرح ہی نبھایا ہے . جو اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرتے باندھا تھا۔

ایمان لانے کے بعد وہ ساری عمر کفر کے خلاف مصروفِ جہاد رہے ، انہوں نے اسلام کے دامانِ مملکت کو بے مقدار وسعتوں سے آشنا کیا۔ ہم ان کا حضرت علیؓ سے مقابلہ کرنے کے حق میں تو نہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد علیؓ کسی پیش منظر میں موجود نظر نہیں آتے جبکہ حضرت معاویہؓ نے اسلام کی جھولی کو فتوحات کی دولت سے بھر دیا۔ آپ کی پوری عمر درویشی میں گزری ہے . اور اُنہوں نے عمر بھر اپنے لئے کوئی محل نہیں بنوایا اور وہ اپنی زندگی کی آخری ہچکی تک اُسی مکان کے مکین رہے . جو اُنہیں پہلے سے حاصل تھا۔ اور یہ امر حضرت معاویہؓ سے ہی خاص نہیں بلکہ بقول حضرت ابنِ حزم بنو اُمیہ میں سے کسی خلیفہ نے بھی اپنے لئے نہ قصرِ خلافت استوار کیا ، نہ کوئی محل سرائے ہی تعمیر کی [1]

معاویہؓ اکثر مسجد میں چٹائی پر ہی عدالت کا اجلاس منعقد کرتے لوگ بے روک ٹوک اُن کے پاس آتے اور بے جھجک گفتگو کرتے۔

عصر کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنا اُن کا پوری عمر کا معمول تھا ، وہ لوگوں کی شکایات سُنتے اور اُن کا ازالہ فرماتے .

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عین حیات ان کی ہدایات کے مطابق عمل پیرا رہے . ابو بکرؓ صدیق کے دورِ خلافت میں ان سے احکام حاصل کرتے رہے فاروقِ اعظمؓ کا پورا دورِ خلافت اُنہوں نے میدانِ جہاد میں گذارا اور حضرت عثمانؓ کی پوری زندگی وہ گھوڑے سے نہ اُترے ، وہ خشکی پر بھی اسلام کے لئے لڑے اُنہوں نے سمندروں میں بھی دینِ حق کی حمایت میں جنگیں لڑیں ، اُنہوں نے نہ صرف بحر و بر

---

[1] البیان المغرب فی اخبار المغرب لابن عذاری مراکشی صہ ۶۲

دونوں کو زندگی بھر اپنا جنگی معمل بنائے رکھا بلکہ ان دونوں کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے مسخر بھی کیا۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو اسلام کی خدمت کے لئے اتنے طویل عرصہ تک وقف کئے رکھا اور اللہ تعالیٰ نے بھی اُنہیں اتنی طویل مہلت سے نوازا کہ اسلام کی تاریخ میں اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔

وہ اسلام لائے تو پورے چالیس برس تک اسلام کے لئے سرگرم رہے، اسلام کے لئے ہی جئے اور اسلام کے لئے ہی مرے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب پورے عالمِ اسلام کا امن چین رخصت ہو گیا تو وہ بھی کانٹوں پر ہی لوٹتے رہے اور عالمِ اسلام کو متحد رکھنے کے لئے اپنی حد تک ہر ممکن سعی روا رکھے رہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ وہ موقع لایا، کہ حضرت حسنؓ کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ میرا یہ بیٹا سیّد ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو متحارب گروہوں کی صلح کرا دے گا۔

تو اس صلح کے بعد معاویہؓ پھر محاذِ جنگ پر پہنچ گئے اور کفر و شیطنت کی گردن پہلے کی طرح ہی ناپنے لگے۔ وہ گھوڑے سے صرف اُس وقت ہی اُترے جب گھوڑے کی پشت پر بیٹھ سکنے کی ہمت نہ رہی۔ ایسے میں اُن کے لئے بھلا حجّاب و حَرَس کے اہتمام کا کیا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔

حضرت معاویہؓ اتنے کھلے عوامی قائد تھے کہ اُنہیں ملنے کے لئے نہ کوئی رکاوٹ قائم تھی اور نہ اُنہیں ملنے کے لئے کسی کو کوئی زحمت اٹھانی پڑتی تھی۔ ہم اگر معاویہؓ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ معاویہؓ سے ملاقات کے مقابلہ میں مولانا مودودی سے ملاقات کرنا زیادہ مشکل ہے۔ یہاں پہلے ملاقات کے لئے اجازت پایئے پھر وقت مقرر ہو گا۔ پھر انتظاریہ میں قیام فرمایئے۔ مگر وہاں تو ایسا کوئی تکلف موجود نہیں تھا۔

کثرتِ کار میں تقسیمِ کار اپنی جگہ الگ بات ہے مگر وہاں ملنے والے کو تفتیش کے مرحلہ سے نہیں گذرنا پڑتا تھا بلکہ جو آتا تھا، جب آتا تھا، اگر معاویہؓ

فارغ ہونے تو وہ ملنے میں کوئی بہانہ نہیں کرتے تھے۔

بلاشبہ معاویہؓ اپنی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے بازاروں میں ٹہلنے نہیں نکلتے تھے اور پارکوں میں تفریح کا کوئی پروگرام نہیں رکھتے تھے۔ مگر ضرورت پر بازار اور گلیاں بھی مولانا مودودی کی طرح ان کے لئے ممنوعہ رقبہ نہیں تھیں۔

اُنہیں لوگ جب چاہتے چلتے پھرتے میں بھی مل سکتے تھے۔ وہ اپنی سلطنت کے حالات سے اتنی گہری واقفیت رکھتے تھے کہ ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک وقوع پانے والا کوئی معمولی سے معمولی واقعہ بھی اُن کے علم سے باہر نہیں رہتا تھا۔ ملک کے اندر کوئی خبر نہیں پیدا ہوتی تھی۔ جو اُن کے علم میں نہ آئے۔

اُن کی اُنگلیاں ملک اور اہلِ ملک کی نبض پر رکھی تھیں اور وہ پورے اہلِ ملک کی نبض کے ضربات تک کا حساب بھی رکھتے تھے۔ اتنا باخبر اور مستعد شخص اپنے اہلِ ملک اور اپنی رعیت سے کٹ کر کیونکر رہ سکتا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں تو وہ سب کچھ موجود تھا جو چاہیئے تھا۔ اور ان باتوں میں سے کوئی بات اُن میں موجود نہیں تھی جو نہیں چاہیئے تھی۔ پھر مولانا کس کی بات کرتے ہیں!

تعجب ہے کہ مولانا نے بعد کے اموی خلفاء کی زیادتیوں کا بوجھ بھی ایک خوب صورت بہانے کے ساتھ حضرت معاویہؓ کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ لیکن اگر مولانا کا یہ اندازِ فکر درست ہے تو پھر محمد بن ابی بکر اور اشتر نخعی کی نابکاریوں کا بوجھ حضرت علیؓ کے کاندھوں کی زینت کیوں نہیں بن سکتا! اور اگر علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ان اقرب ساتھیوں اور عزیزوں کے اعمالِ حسنہ حضرت علیؓ کے بخت سے وابستہ نہیں کئے جا سکتے، جن کو حضرت علیؓ نے خود اپنے ہاتھوں پالا، پوسا، گورنریاں تک عنایت کیں تو پھیلے اور

بہت پہلے اموی خلفاء کی سیہ کاریاں حضرت معاویہؓ کے دامن سے باندھنے کا کیا جواز ہے!

اگر عباسی خلفاء کی شرمناک تاریخ، ظالمانہ کاروائیاں اور شرافت سوز کارنامے اور بداطواریاں محض خاندانی نسبت کی وجہ سے حضرت علیؓ کی قسمت کا لکھا نہیں ہیں تو اسی نسب کے رشتہ سے ستم کار اور ظالم اموی بادشاہوں کے گناہ حضرت معاویہؓ کے کھاتے میں کیونکر شمار کئے جا سکتے ہیں۔

فصلِ سوم

تیسرا حملہ

بیت المال کی حیثیت میں تبدیلی

مولانا مودودی صاحب کا کہنا ہے :

تیسری اہم تبدیلی بیت المال کے متعلق خلفاء کے طرزِ عمل میں رونما ہوئی۔ بیت المال کا اسلامی تصور یہ تھا کہ وہ خلیفہ اور اس کی حکومت کے پاس خدا اور خلق کی امانت ہے، جس میں کسی کو من مانے طریقے پر تصرف کا حق نہیں ہے۔

خلیفہ نہ اُس کے اندر قانون کے خلاف کوئی چیز داخل کر سکتا ہے، نہ قانون کے خلاف اس میں سے کچھ خرچ کر سکتا ہے۔ وہ ایک ایک پائی کی آمد اور خرچ کے لئے جوابدہ ہے اور اپنی ذات کے لئے وہ صرف اتنی تنخواہ لینے کا حقدار ہے جتنی ایک اوسط درجہ کی زندگی بسر کرنے کے لئے کافی ہو۔

دورِ ملوکیت میں بیت المال کا یہ تصوّر اِس تصوّر سے بدل گیا کہ خزانہ بادشاہ اور شاہی خاندان کی ملک ہے، رعیّت بادشاہ کی محض باجگزار ہے اور کسی کو حکومت سے حساب پوچھنے کا حق نہیں[1]

مولانا کے کہنے والی اصل بات تو اتنی ہی تھی مگر اپنی بات بنانے کے لئے اُنہوں نے اس کے بعد پورا ڈیڑھ صفحہ بنو اُمیّہ کے اگلے دَور کے گورنروں، شہزادوں اور سپہ سالاروں کے الٹوں تلّلوں کی تفصیلات قلمبند کرنے میں صرف کیا ہے اور

---

[1] خلافت وملوکیت صد۱۶۱

پھر اپنی طے کردہ پالیسی کے مطابق اُن سب جرائم کا بوجھ معاویہؓ پر ڈال دیا ہے۔

یعنی ؎ ہر پھر کے دائرہ میں ہی رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پر کار پاؤں میں

تاہم جہاں تک بیت المال سے خرچ کرنے میں اپنے اختیارات سے تجاوز کا تعلق ہے۔ یہ اعتراض کوئی نیا نہیں ہے قرآن کریم کی روایت کے مطابق ان بے انصافیوں کا الزام کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی لگا دیا تھا مگر قرآن پاک نے ایسے مفسدین کی سرکوبی دریں لگتے ہاتھ ہی کر دی اور بات پھر آگے نہ چل سکی۔

پھر اس الزام کا محل حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو بنایا گیا مگر چونکہ معترضین نے جرأت کر کے اپنے الزامات کی وضاحت کر دی تھی اور بات بحث تک پہنچ گئی اور پھر جب حضرت عثمانؓ نے جوابی وضاحت کی تو معترضین مطمئن ہو گئے۔

مگر مولانا نے یہاں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں حضرت معاویہؓ کی کسی دھاندلی، زیادتی یا کسی تجاوز کی نشاندہی ہی نہیں کی جسے محلِ غور و فکر بنایا جا سکے۔ تاہم مولانا کا مقصد یہاں بھی یہی ہے کہ ان خرابیوں کے ذمہ دار معاویہؓ ہیں حالانکہ وہ حضرت معاویہؓ کی کسی خرابی کا نشان نہیں دے سکے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ حضرت معاویہؓ نے بیت المال کی حیثیت کو تبدیل کیا ہے۔ ہاں البتہ دوسری جگہ اُنھوں نے یزید کی بیعت کے ضمن میں حضرت معاویہؓ پر یہ الزام رکھا ہے کہ:

اپنے بیٹے یزید کی ولیعہدی کے لئے خوف و طمع کے ذرائع سے بیعت لے کر اُنھوں نے اس امکان کا بھی خاتمہ کر دیا[۱] (کہ خلافتِ راشدہ آئندہ ہی کبھی قائم ہو سکے)

پھر طمع اور لالچ کے ذریعہ لوگوں کو خریدنے کے سلسلہ میں مولانا نے ایک موضوع روایت کا سہارا لیتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

حضرت معاویہؓ نے یزید کو ولیعہد بنانے کا فیصلہ کر لیا اور با اثر لوگوں کی رائے

---

[۱] خلافت و ملوکیت صـ ۱۴۸

ہموار کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ایک لاکھ درہم بھیجے اور یزید کی بیعت کے لئے راضی کرنا چاہا۔

اُنہوں نے کہا اچھا! یہ روپیہ اس مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے! پھر تو میرا دین میرے لئے بڑا ہی سستا ہو گیا' یہ کہہ کر اُنہوں نے روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔ [۱]

مولانا کی یہ بیان کردہ روایت بوجوہ ذیل صریح جھوٹ اور یکسر افتراء ہے:

- عبداللہ بن عمرؓ کے شخصی مقام اُن کی عظمت اور عزیمت سے مولانا مودودی صاحب کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ زیادہ آگاہ تھے، وہ اُنہیں زیادہ قریب سے جانتے تھے اور زیادہ بہتر طور پر سمجھتے تھے، ایسے نیک شہرت اور باعظمت شخص کو حضرت معاویہؓ جیسے ذہین و فطین بزرگ کا رشوت پیش کرنا ایک ایسی بات ہے جسے صحیح سمجھنے کے لئے آدمی کا احمق بننا ضروری ہے اور شاید یہ الزام قبول کرنے کے لئے کوئی بھی معقول آدمی آمادہ نہیں ہوگا۔
- حضرت عبداللہ بن عمرؓ یزید کے سلسلہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ کوئی اختلاف ہی موجود نہیں رکھتے تھے اس لئے اُنہیں ہموار کرنے کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔
- جب یزید کی بیعت کا مرحلہ آیا تو حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے صحیح بخاری کی روایت کے مطابق بلا طلب خود حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے ہاتھ پر بلا کراہت اور برضاء و رغبت یزید کے لئے بیعت کی تھی۔ اگر یزید کی بیعت کے سلسلہ میں اس سے پہلے اُنہیں معاویہؓ سے کوئی شکایت موجود ہوتی یا اگر حضرت معاویہؓ نے اُن کو خریدنے کی کوئی جسارت کی ہوتی تو وہ معاویہؓ سے اس کا ضرور گلہ کرتے، ضرور شکوہ کرتے۔

اور اگر اُنہوں نے کسی دباؤ سے بیعت کی ہوتی تو یزید کی حکومت کے خلاف جب حضرت ابن زبیرؓ نے بغاوت کر کے اہل مدینہ کو یزید کی بیعت فسخ کرنے کے لئے مجبور کیا تھا تو عبداللہؓ بن عمرؓ آگے بڑھ کر یہ بیعت

---

[۱] خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۵۰

فسخ کر دیتے مگر انہوں نے ابن زبیرؓ کے رفقاء کی طرف سے بیعت فسخ کرنے کے مطالبہ پر سختی سے جواب دیا کہ ہم نے سوچ سمجھ کر اور حق جان کر یزید کی بیعت کی تھی۔ اب ہم محض حالات کی تبدیلی سے غداری کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں لہ

بنا بریں صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ میں مولانا کی پیش کردہ روایت ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

اس مرحلہ پر بات کا یہ پہلو بالخصوص قابل توجہ ہے کہ اس کذب صریح کے کاذب راوی کو بھی یہ بات تسلیم ہے کہ بیت المال میں اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے معاویہؓ نے جو رقم حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ضمیر کو خریدنے کی غرض سے نکالی تھی وہ پھر واپس آ گئی تھی اور عبداللہ بن عمرؓ نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیت المال کی رقم بیت المال میں ہی رہی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت معاویہؓ کے تجاوز کو ناکام کر کے ان کے لئے عفو کی گنجائش موجود رکھ لی۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے خلاف تو تاریخ کے کسی ویرانے میں گری پڑی ایک جھوٹ روایت مولانا کو آنکھیں بند کر کے بھی نظر آ گئی مگر اسی تاریخ کے صفحات میں ان کی نگاہ اس روایت سے کیوں تجاوز کر گئی جہاں تحریر تھا کہ:

حضرت علیؓ نے جنگِ جمل ختم ہونے پر (کامیابی کی خوشی میں) بصرہ کا پورا خزانہ اپنے حمائیتیوں میں تقسیم کر دیا۔ اور مزید فرمایا کہ اگر تم آئندہ بھی یونہی سرگرم کار رہے تو ہم مزید بھی دیں گے ۲ے

اب ظاہر ہے کہ یہ رقم جو حضرت علیؓ نے تقسیم کی حضرت علیؓ کی ذاتی رقم نہیں تھی اور اس کا مصرف بھی حضرت معاویہؓ کے مبینہ مصرف سے مختلف نہیں ہے۔ مولانا تاویل کے بادشاہ ہیں وہ حضرت علیؓ کے ہر فعل کی جو ذرا تقبل نظر آئے

لہ بخاری کتاب الفتن ۲ے تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں

تاویل کر لیتے ہیں وہ فرما سکتے ہیں کہ مجاہدین بھی بیت المال کی رقم کا ایک مصرف ہیں لیکن اس تاویل سے قبل روایت کا آخری حصہ بھی پیشِ نظر رکھ لیا جائے جہاں ذکر ہے کہ یہ جہاد کا صلہ نہیں تھا بلکہ آئندہ کے لئے ایک پیش بندی تھی۔ تاہم ہمارا گمان یہی ہے کہ مولانا ان مشاجرات کو جہاد فی سبیل اللہ پر قیاس نہیں کریں گے۔ علاوہ ازیں مولانا کی مسلمہ معتبر تاریخی کتب کے مطابق لوگوں کو مال دینے دلانے کے بارے میں مولانا کی مرضی کے بالکل خلاف خود حضرت علیؓ ہی حضرت معاویہؓ کی صفائی میں گواہی دے چکے ہیں۔ جب انہوں نے اپنے ساتھیوں کی بے وفائیوں پر اپنی داد و دہش کا احسان اور معاویہؓ کے بخل کا مقابلہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

میں تمہیں دیتا رہتا ہوں مگر تم میرا ساتھ نہیں دیتے حالانکہ معاویہؓ کے ساتھی اس کی طرف سے کسی بخشش اور مالی امداد کے بغیر ہی بے غرض اس کا ساتھ دیتے ہیں[1]

حضرت علیؓ کی اپنے خلاف اور حضرت معاویہؓ کے حق میں یہ گواہی حضرت معاویہؓ کے لئے تو ایک انعام کی حیثیت ہی رکھتی ہے اور ان کی تحسین کے ذیل میں ہی شمار ہوتی ہے لیکن جہاں تک زیرِ بحث مسئلہ کا تعلق ہے حضرت معاویہؓ بیت المال کے سلسلہ میں اس درجہ حساس تھے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے اہلِ زمانہ کو ہی ہمیشہ بیت المال کی ایک ایک پائی کے حساب سے باخبر رکھا بلکہ بیت المال کی حفاظت اور اس کی نگہبانی کے سلسلہ میں خود اپنی ذمہ داری کو بھی اس خوبی سے نبھایا کہ اس باب میں بھی ان کا کردار مثالی ہے۔

وہ جو کچھ خرچ کرتے تھے اور جہاں خرچ کرتے تھے ان کی یادداشت نے بھی ان سے کبھی بے وفائی نہیں کی تھی۔ علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

حضرت معاویہؓ نے کسی شخص کے حق میں ایک لاکھ درہم دینے کے لئے تحریری ہدایت کی مگر اس شخص نے اس حکمنامہ کو راستہ میں کھول کر ایک لاکھ کے بجائے

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۹

دو لاکھ بنا لیا پھر جب کسی مرحلہ پر حضرت معاویہؓ کے سامنے بیت المال کی رقوم کی آمد و رفت کا حساب پیش ہوا تو اُنہوں نے کسی شخص کو دو لاکھ درہم دلانے سے انکار کیا اور پھر اُسی روز سے مُہر جاری کر دی [۱]

• بقول سیوطی اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ آئندہ کوئی حکمنامہ بے مُہر جاری نہ ہو اور بیت المال کے دفتر میں ہر حکمنامہ کی نقل محفوظ کی جائے تاکہ نہ تو کسی گڑبڑ کا ہی امکان رہے اور نہ ہی کوئی حسابی مشکل راہ پا سکے۔

علاوہ ازیں اس کا یہ ایک بڑا فائدہ بھی تھا کہ جب کسی آڈیٹر کو کوئی شبہ گزرے وہ اصل کو دیکھ کر حساب کو درست کر سکے۔ معاویہؓ بلاشبہ بیت المال سے کثیر رقمیں خرچ کرتے تھے اور ٹھیک اُسی طریق پر کام کرتے تھے جس پر اُن کے پیش رو خلفاء راشدین کام کرتے رہے یعنی اصحابِ رسول اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزہ و اقرباء اور دوسرے مستحقین کو حسبِ قرارداد ہمیشہ بڑی بڑی رقمیں دیتے رہے اور اُنہوں نے اُن سب کے ہی وظیفے مقرر کر رکھے تھے جن کا بیت المال میں حق بنتا تھا۔ ان وظیفہ خواروں میں آئمہ اہل بیت تک اپنے تمام اعزہ و اقرباء سمیت شامل تھے۔ اب اگر ان رقوم کو بھی مولانا حضرت معاویہؓ کی رشوت کاری کے ضمن میں ہی محسوب کریں تو اس بات کا جواب نہ طبری کے پاس ہے نہ ابن اثیر کے پاس، نہ اس مسئلہ کو ابن سعد ہی حل کر سکتے ہیں نہ ابی عبدالبرؒ اس کا حل تو بس اللہ ہی کے پاس ہے اور اس حل کے لیے محشر کا روز ہی مقرر ہے۔
لیکن اگر بات انصاف کی حد تک ہی رکھی جائے تو حقیقت یہی ہے کہ معاویہؓ حسب قاعدہ ہی دیتے تھے اور حسبِ قاعدہ ہی بانٹتے تھے۔ اور ہمیشہ فرمایا کرتے کہ یہ مال مسلمانوں کا حصّہ ہے اور اُنہی کے لئے ہے۔ جیسا کہ حضرت امام ابن تیمیہؒ سے وارد ہوا ہے: عطیہ بن قیس سے روایت ہے کہ میں نے حضرت معاویہؓ کا ایک خطبہ سنا آپ فرما رہے تھے:

---

[۱] تاریخ الخلفاء سیوطی صہ ۲۲۱

لوگو!

تنخواہیں تقسیم کرنے کے بعد جو کچھ مال بیت المال میں بچ گیا ہے اب میں وہ تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔

اور اگر آئندہ برس بھی حسبِ دستور ہی کچھ مال بچ سکا تو اُسے بھی تمہارے درمیان تقسیم کر دوں گا ورنہ مجھے معتوب نہ کرنا اس لئے کہ یہ مال میرا نہیں ہے بلکہ خدا کا مال ہے اور اُسی نے تمہیں یہ عطا فرمایا ہے [۱]

ایک پہلو یہ بھی ہے تاریخ کی تصویر کا

حضرت معاویہؓ ایک انسان ہی تھے اور انسان سے غلطی کا صدور ہر وقت ممکن ہے مگر یہاں تو حضرت معاویہؓ کی غلطی ثابت نہیں اور جیسا کہ ہماری تصریحات سے ظاہر ہے اُن کے حساب میں کوئی گڑبڑ موجود نہیں ہے، اور ان کا حساب بالکل صاف ہے۔

مگر چونکہ مولانا بڑے حساب کے ساتھ ملوکیت کے مرحلے شمار کر رہے ہیں اس لئے ملوکیت سے ملتے جلتے کاموں میں کسی مسئلہ کے حل کے لئے بھی اُنہی کی طرف رجوع مناسب ہے تاکہ بات میں اگر کوئی خلاء باقی رہ گیا ہو تو وہ بھی دُور ہو سکے۔ بالخصوص جبکہ وہ ملوکیت کے اسباب کو شمار کرتے۔ حضرت عثمانؓ کے دَور سے بات چلاتے ہیں اور راستہ سے حضرت علیؓ کے دَور کو پھلانگ کر حضرت معاویہؓ کے دَور میں جا نکلتے ہیں۔ اس پر اعتراض ہوا تو فرمایا۔

(معترضین) اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ میری کتاب کا موضوع کیا ہے میں اس کتاب میں تاریخ نہیں لکھ رہا (خلافت و ملوکیت صہ ۳۴۴) مطلب مولانا کا یہ ہے کہ میرا کام حضرت علیؓ کے دَور کی ملوکیت کی نشاندہی نہیں صرف عثمانؓ اور معاویہؓ کے دور کی ملوکیت کو ہی پیش کرنا ہے۔

---

[۱] منہاج السنۃ امام ابن تیمیہؒ

تاہم چونکہ اس کتاب کی تصنیف سے مولانا کا مقصد تاریخ کو سیدھا کرنا ہے اس لئے حضرت علیؓ کے دور کا سوال بھی انہی کو حل کرنا ہوگا۔ علامہ طبری لکھتے ہیں :

حضرت علیؓ کو بصرہ کے گورنر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں اطلاع پہنچی کہ وہ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور انہوں نے وہ مال خود ہضم کر لیا ہے جو ان کے قبضہ میں مسلمانوں کی امانت تھا۔

حضرت علیؓ نے یہ اطلاع پا کر حضرت ابن عباسؓ کو لکھا کہ میں نے تمہارے قبضہ میں مسلمانوں کی رقوم کے بارے میں بیحد افسوسناک شکایات سُنی ہیں اس سلسلہ کی پوری تفصیل مجھے لکھو۔

ابن عباسؓ نے جواب دیا آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔ میں دوسرے سب لوگوں کے مقابلہ میں اس مال کا زیادہ بہتر محافظ ہوں۔

حضرت علیؓ نے پھر لکھا کہ بہرحال تم مجھے بتاؤ کہ تم نے کتنا مال کہاں کہاں سے وصول کیا ہے اور پھر اُسے کہاں کہاں خرچ کیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے جواب لکھا کہ آپ نے ایک غلط اطلاع کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دے دی ہے اگر آپ کو ایسی ہی بے اعتباری ہے تو جسے چاہیں یہاں کی حکومت دے دیں میرا استعفیٰ حاضر ہے۔

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ :

اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے اپنے ماموؤں بنو ہلال بن عامر کو بلا بھیجا ضحاک بن عبداللہ ہلالی، عبداللہ بن رزین ابن ابی عمرو الہلالی بھی اُن کے پاس آئے، پھر اُن کی مدد کے لئے بنو قیس بھی جمع ہو گئے اور ان کی امداد سے عبداللہ بن عباسؓ نے بصرہ کا تمام خزانہ اٹھوا لیا۔

ابوزید نے ابوعبیداللہ سے نقل کیا ہے کہ خزانہ میں بڑی مقدار میں مال جمع تھا عبداللہ بن عباسؓ نے نہ صرف یہ سارا مال ہی اٹھوا لیا بلکہ وہ مالِ غنیمت کا

جمع شدہ تمام خمس بھی اٹھوا لے گئے۔

خزانہ اٹھوانے کی بات مشہور ہو گئی اور کچھ قبائل اُن کو روکنے اور سرکاری خزانہ اُن سے چھین لینے کے لئے مقابلہ پر نکل آئے۔ اس خبر سے کچھ قبائل ابن عباسؓ کی طرف سے مقابلہ پر آ گئے، بات بڑھ گئی، بھیڑ ہیں ہوئیں، نیزے بلند ہوئے، تلواریں بھی لہرائیں اور تصادم میں کچھ لوگوں کو زخم بھی پہنچے مگر بالآخر حضرت ابن عباسؓ یہ خزانہ نکال لے جانے میں کامیاب ہو گئے اور پھر بیس آدمیوں کی حفاظت میں مکہ چلے آئے (طبری جلد ۳ باب ۴۴ صفحہ ۴۹۶-۴۹۷)

ہم مولانا کو مجبور نہیں کرتے کہ وہ اس واقعہ کو بھی ملوکیت کے مرحلوں میں سے ایک مرحلہ قرار دیں مگر اُن سے اتنی درخواست ضرور ہے کہ اگر اُن کے نوٹس میں کوئی ایسی روایت آئی ہو جس میں حضرت ابن عباسؓ کے اس فعل پر حضرت علیؓ کی طرف سے کسی کارروائی کا نشان دیا گیا ہو تو ازراہِ نوازش اس سے مطلع فرمائیں۔

آخر حضرت ابن عباسؓ یہ خزانہ لے کر مملکت اسلامی کی حدود پار نہیں کر گئے تھے وہ مکہ میں گئے تھے، وہیں بستے رہے تھے۔ مکہ حضرت علیؓ کی حکومت میں شامل تھا وہ اس واقعہ کے بعد سے حضرت علیؓ کی وفات تک مکہ میں ہی قیام فرما رہے مگر حضرت علیؓ کی طرف سے اُن کے خلاف کوئی کارروائی تاریخ سے ثابت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر پھر گورنروں کی کھلی چھٹی کے ضمن میں آ جاتا ہے اور کوئی نکتہ چیں کہہ سکتا ہے کہ وہ خطوط کا تبادلہ محض تکلف ہی تھا حساب طلبی مقصد نہیں تھا۔ اور اگر غیر مناسب نہ ہو تو ایک بار اپنا وہ ارشاد آپ خود بھی پڑھ لیجئے۔

خلیفہ نہ اُس (یعنی بیت المال) کے اندر قانون کے خلاف کوئی چیز داخل کر سکتا ہے نہ قانون کے خلاف اس میں سے کچھ خرچ کر سکتا ہے۔ وہ

ایک ایک پائی کی آمد و خرچ کے لئے جواب دہ ہے۔۔۔۔۔۔ ملوکیت میں بیت المال کا یہ تصور اس تصور سے بدل گیا کہ خزانہ بادشاہ اور شاہی خاندان کی مِلک ہے۔ رعیّت بادشاہ کی محض باجگزار ہے۔ اور کسی کو حکومت سے حساب پوچھنے کا حق نہیں۔

جناب مولانا! ؎

سنبھل کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں!
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

فصلِ چہارم

چوتھا حملہ

آزادئ اظہارِ رائے کا خاتمہ

مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر جو چوتھا حملہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی حکومت نے رائے کی آزادی چھین لی تھی اور زبانوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے، کوئی زبان کھولے تو صرف مدح کے لئے کھولے ورنہ اپنا منہ بند رکھے، مولانا لکھتے ہیں:

اس دور (ملوکیت) کے تغیرات میں سے ایک اہم تغیر یہ تھا کہ مسلمانوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی سلب کر لی گئی، حالانکہ اسلام نے اُسے مسلمانوں کا صرف حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا تھا اور اسلامی معاشرہ و ریاست کا صحیح راستے پر چلنا اس پر منحصر تھا کہ قوم کا ضمیر زندہ اور اس کے افراد کی زبانیں آزاد ہوں۔ ہر غلط کام پر وہ بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں۔ اور حق بات برملا کہہ سکیں۔

خلافتِ راشدہ میں لوگوں کی یہ آزادی پوری طرح محفوظ تھی خلفائے راشدینؓ اس کی نہ صرف اجازت دیتے تھے بلکہ اس پر لوگوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

ان کے زمانے میں حق بات کہنے والے ڈانٹ اور دھمکی سے نہیں، تعریف و تحسین سے نوازے جاتے تھے اور تنقید کرنے والوں کو دبایا نہیں جاتا تھا بلکہ اُن کو معقول جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

لیکن دورِ ملوکیت میں ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور زبانیں بند کر دی گئیں، اب قاعدہ یہ ہو گیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو ورنہ چپ رہو، اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زوردار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لئے تیار ہو جاؤ۔

چنانچہ جو لوگ بھی اُس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آئے، اُن کو بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔

اس نئی پالیسی کی ابتداء حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں حضرت حُجرؓ بن عدی کے قتل (۵۱ھ ہجری) سے ہوئی جو ایک زاہد و عابد صحابی اور صلحائے اُمت میں سے ایک اونچے مرتبے کے شخص تھے۔

حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں جب منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؓ پر لعنت اور سب و شتم کا سلسلہ شروع ہوا تو عام مسلمانوں کے دل ہر جگہ ہی اس سے زخمی ہو رہے تھے مگر لوگ خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتے تھے۔

کوفہ میں حُجرؓ بن عدی سے صبر نہ ہو سکا اور اُنہوں نے جواب میں حضرت علیؓ کی تعریف اور حضرت معاویہؓ کی مذمت شروع کر دی۔ حضرت مغیرہؓ جب تک کوفہ کے گورنر رہے وہ اُن کے ساتھ رعایت برتتے رہے۔ اُن کے بعد جب زیاد کی گورنری میں بصرہ کے ساتھ کوفہ بھی شامل ہو گیا تو اُس کے اور اُن کے درمیان کشمکش برپا ہو گئی، وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا، اور یہ اُٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے۔

اسی دوران میں ایک مرتبہ اُنہوں نے نماز جمعہ میں تاخیر پر بھی اس کو ٹوکا آخراُس نے اُنہیں اور اُن کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی شہادتیں اس فردِ جرم پر لیں کہ اُنہوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے، خلیفہ کو علانیہ گالیاں دیتے ہیں، امیرالمومنین کے خلاف لڑنے کی دعوت

دیتے ہیں اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت آلِ ابی طالب کے سوا کسی کے لئے درست نہیں۔ اُنہوں نے شہر میں فساد برپا کیا اور امیرالمومنین کے عامل کو نکال باہر کیا۔ یہ ابوتراب (علیؓ) کی حمایت کرتے ہیں، اُن پر رحمت بھیجتے ہیں اور اُن کے مخالفین سے اظہارِ برأت کرتے ہیں۔۔۔۔۔

یہ ملزم حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجے گئے اور انہوں نے اُن کے قتل کا حکم دیا۔

قتل سے پہلے جلّادوں نے جو بات پیش کی وہ یہ تھی کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم علیؓ سے برأت کا اظہار کرو اور اُن پر لعنت بھیجو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کر دیا جائے۔ اُن لوگوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور حجرؒ نے کہا میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا جو رب کو ناراض کرے، آخرکار وہ اور اُن کے ساتھی قتل کر دیئے گئے [1]

اس کے بعد مولانا نے تقریباً دو صفحات کے لقدر بنوامیہ کے ان حکام و عمال اور گورنروں کی زیادتیوں کا ذکر کیا ہے جو حضرت معاویہؓ کے بعد بقول مولانا مودودی صاحب ان کی اس تحریکِ ظلم و ستم کو سنبھالے رہے اور چلاتے رہے۔

ہمیں چونکہ اپنی بات کو حضرت معاویہؓ تک ہی محدود رکھنا ہے جو مولانا کے نشترِ قلم کے اصل معمول ہیں اس لئے ہم نے حضرت معاویہؓ کی حد تک مولانا کی بات اُنہی کے الفاظ میں پوری تفصیل سے نقل کر دی ہے تاکہ ہمارے قارئین کو فہمِ مطلب میں آسانی رہے۔

جُرمِ زبان بندی

حضرت معاویہؓ رضی اللہ عنہ کے ذکر کے ساتھ ہی اُن کے بارے میں مولانا کے قلم میں جو زور سما جاتا ہے ذرا اُس کے تیور ملاحظہ ہوں:

"ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے، زبانیں بند کر دی گئیں اور اب

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۶۳ تا ۱۶۵

فاعدہ یہ ہوگیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو ورنہ چپ رہو اور اگر تمہارا ضمیر کچھ ایسا ہی زور دار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو پھر قید و قتل اور کوڑوں کی سزا کے لئے تیار رہو جاؤ۔"

اب اگر یہ واقعات درست ہیں تو ظاہر ہے کہ جس حکومت میں یہ اندھیر گردی موجود ہو اس کا حاکم یقیناً ظالم، جابر، قاتل اور سفاک ہی ہو سکتا ہے۔ جسے نہ شرافت کی قدر ہے، نہ متانت اور سنجیدگی کا پاس ہے نہ اُسے عدل سے تعلق ہے نہ انصاف سے رابطہ ہے۔ جو دھاندلی میں جیتا ہے اور درندگی میں مزہ پاتا ہے۔ جس کا کاروبارِ حکومت ظلم و بے انصافی پر استوار ہے اور جبر و غضب جس کا محبوب پیشہ ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ مولانا کے قلم سے حالات کی یہ افسانوی نقشہ کشی کسی چنگیز اور ہلاکو کی حکومت کی نہیں بلکہ اُن کی اس داستانِ الف لیلہ کا مرکزی کردار امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتِ گرامی ہے اور حیرت ہے کہ ایسے ظلم پیشہ انسان کو وہ بڑے ہی تکلف سے اور بڑے ہی اہتمام سے بار بار بلکہ ہر بار رضی اللہ عنہ بھی کہے اور لکھے جاتے ہیں۔

اللہ اکبر ؎ یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پہ یہ اختیار
شبِ موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

آخر یہ کیا تماشا ہے؟

آیئے مولانا کی شخصیت کے اس پُراسرار رُخ کو ذرا اور قریب ہو کر دیکھئے اور پھر اپنے دل میں ہی فیصلہ کیجئے کہ آخر یہ تقویٰ ہے یا تقیہ! درود و دعا ہے یا سب و شتم! تمسخر ہے یا تحسین اور طعن و تعریض ہے یا سلام و تحیۃ خیر طلبی ہے یا بدخواہی! آخر اس اجتماع ضدین کا نام کیا رکھا جائے گا ذرا دیکھئے تو:

- معاویہ بڑے ہی ظالم اور سفاک تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- وہ بڑے ہی خود غرض تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

- بے گناہوں کو قتل کر دیتے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- بڑے فن کار راشی تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- لوگوں کے ضمیر خریدا کرتے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- اُنہوں نے خلافتِ راشدہ کے نظام کو اپنی اغراض کی نذر کر دیا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- اونچے درجہ کے سازشی تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- اسلام میں ملوکیت کی لعنت انہی کی پیدا کردہ ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- اپنی اغراض سے شریعت کی حدود کو توڑتے ذرا نہیں جھجکتے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- وہ ٹھیٹھ جاہلیتِ قدیمہ کے طریقہ پر حکومت کرتے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- وہ اپنی سازش کی تکمیل کے لئے جھوٹے گواہ پیدا کر لیتے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- ایک دفعہ اُنہوں نے اپنی ضرورت سے اپنے والد ماجد کی زنا کاری کا ثبوت بھی پیدا کر لیا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- انہیں کسی کی حق گوئی بالکل گوارا نہیں تھی، رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- وہ حق گوئی کے جرم میں لوگوں کو قید کرتے، قتل کرتے اور کوڑے لگاتے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- باپ کے بعد بیٹے کی حکومت کا خود غرضانہ طریقہ انہی کی ایجاد ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- اُن کی روش ہمیشہ منافقانہ رہی ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- حضرت علیؓ کو گالیاں دیا کرتے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ

لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ

اینکہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب!

یا اللہ! یہ لوگ کس بستی کے مکین ہیں، کس سرزمین کے باشندے ہیں، کس حال میں زندہ ہیں اور کس غرض سے زندہ ہیں۔ توبہ توبہ ؎

اس زمین پر سانپ اور اژدر برسنے چاہئیں برق گرنی چاہیئے پتھر برسنے چاہئیں

عود الی المقصود

مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کی حکومت میں انسانی زبانوں پر جن چھریوں کے پہرے کا ذکر فرمایا ہے اس کی وجہ مولانا کی حضرت معاویہؓ سے کوئی یاد اللہ ہی ہے ورنہ حضرت معاویہؓ کا دورِ حکومت اسلامی حکومت کے صحیح خدوخال کی حیثیت سے ایک مثالی دورِ حکومت ہے۔ حضرت معاویہؓ کی سنجیدگی مثالی تھی، اُن کا حوصلہ مثالی تھا، اُن کا تحمّل مثالی تھا، اُن کی بُردباری مثالی تھی، اُن کا عدل و انصاف مثالی تھا اور اسلام کی شوکت کے پہلو سے دورِ حکومت کے لیل و نہار مثالی تھے اور واقعہ یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کی لڑی میں حضرت معاویہؓ کے پیشرو خلفاء کے بعد حضرت معاویہؓ کا دورِ حکومت قرآن و سنّت کے آئینہ میں اپنی مثال آپ تھا۔ جہاں تک حضرت معاویہؓ کے دَور میں مولانا کی بیان کردہ تیغِ ظلم و ستم کا تعلق ہے جو انسانوں کی زبانوں پر لٹک رہی تھی تو یہ سراسر ایک افسانہ ہی ہے اور اس سے بڑھ کر غلط بیانی اگرچہ ناممکن نہیں ہے مگر مشکل ضرور ہے۔

معاویہؓ کے عہد میں کوئی ایک زبان بھی بات کرنے کو ترستی نہیں تھی اور اللہ گواہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی بُردباری، حوصلہ مندی اور تحمّل کا یہ عالم تھا کہ زبانوں پر قدغن تو رہی ایک طرف وہاں بہت سی زبانیں خود معاویہؓ کے حضور بھی ایسی موجود تھیں جو محض معاویہؓ کی بُردباری کی وجہ سے ہی بہت دراز ہو چکی تھیں۔ اگر کوئی آمرِ مطلق ہوتا تو ان زبانوں کو کاٹ کر پھینک دیتا مگر معاویہؓ اپنے کانوں بہت سی ناگفتنی سُن کر چپ ہو رہتے اور حد یہ ہے کہ ان زبان درازی کرنے والے لوگوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو ان کے وظیفہ خوار تھے اور صبح و شام اُن کے دسترخوان سے ہی روزمرّہ کا رزق چُنتے چُگتے تھے۔ ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا حکم یہ تھا کہ اگر بولو تو میری تعریف میں بولو ورنہ چپ رہو۔ اگر اس کے خلاف کیا تو زبان کاٹ دی جائے گی، کوڑے لگیں گے، قتل کئے جاؤ گے، بجائے خود ظلم ہے، زیادتی ہے، بے انصافی ہے اور بے دردی ہے۔

جانیے ساری معتبر اور غیر معتبر تاریخیں کھنگال لیجیے آپ کو کوئی ایک واقعہ بھی

ایسا نہیں ملے گا جس سے ثابت ہو کہ حضرت معاویہؓ نے اپنی ذات کے خلاف کسی کیچڑ اچھالنے والے کو بھی کبھی سزا دی ہو، کسی کی تنقید سے بُرا منایا ہو، کسی جواب طلب امر پر کبھی چپ سادھ لی ہو، کسی سوال کے جواب سے کبھی پہلو تہی کی ہو، کسی کی بدگوئی پر اُسے جھڑک تک دی ہو۔ آخر کوئی ایک مثال بھی تو ہو، کوئی ایک واقعہ بھی تو ہو۔ اور جب ایسا نہیں ہے تو حضرت معاویہؓ کو زبانوں پر قدغن اور ضمیروں پر قفل لگانے والا کہنا اللہ کے سامنے جوابدہی سے بے خوفی کا ہی نتیجہ ہے۔

وہاں تو لوگ بیباک اور حضرت معاویہؓ کے حق میں زبان دراز ہی اس وجہ سے تھے کہ انہیں اپنی زبان درازی پر معاویہؓ سے کوئی خطرہ موجود نہیں تھا ورنہ معاویہؓ نے اگر ایک دو لمبی زبانیں فی الواقع ہی کاٹ ڈالی ہوتیں تو پھر اُن کی موجودگی میں کوئی زبان کبھی دانتوں سے باہر نہ جھانکتی اور اپنی حدود سے کبھی باہر نہ نکلتی [۱]

حُجر بن عدی

مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کی ملوکیت کاری کا یہ پورا مرحلہ صرف ایک حضرت حُجر بن عدی کے قتل کی نذر ہی کر دیا ہے اور اس باب میں حضرت معاویہؓ کے استبداد کی کہانی کو جس زور دار اور جس تفصیل سے بیان کیا ہے وہ واقعہ کی کسی اہمیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس سب کچھ کا ایک خاص پس منظر ہے۔ مولانا نے اپنے بیان میں حضرت معاویہؓ کی زیادتیوں کی جو تفصیل پیش کی ہے اس کا تعلق تاریخ سے کم ہے اور مولانا کے اپنے جذبات سے زیادہ ہے۔ حضرت حُجر کے قتل کا واقعہ کوئی ایسا اخص معاملہ نہیں تھا جسے مولانا ملوکیت کے کسی مرحلہ کی بنیاد بناتے، کیونکہ تاریخ میں حضرت حُجر بن عدی کے قتل کے مقابلہ میں بہت سے ایسے قتل بھی درج ملتے ہیں جو ظلم و استبداد کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتے، اور

---

[۱] حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کے اس محبوب اور ایمان افروز پہلو پر ہم ایک تاریخی بحث امیرالمومنینؓ حصہ اول میں اسی عنوان "تحمل و بردباری" صفحہ ۱۳۲ سے صفحہ ۱۴۴ تک مناسب تفصیل سے درج کر آئے ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے خواہشمند حضرات وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

جن کی مظلومیت کا ہر پہلو کسی کی ملوکیت کا مظہر ہے مگر مولانا نے اُن قتلوں میں سے کسی ملوکیت کا سُراغ لگانے کے بجائے ان قتلوں کو مقتولین کی اپنی ہی ملوکیت کا نتیجہ قرار دیا ہے یعنی ؎ میں نے کہا جو بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی

سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

حضرت حجر بن عدی کے قتل سے مولانا کو اس لئے رنج نہیں پہنچا کہ ایک مظلوم اور ناکردہ گناہ شخص قتل ہوا ہے کیونکہ یہ بات مولانا کے علم میں ہے کہ حکومتیں اپنے دائرہ کار میں قانون شکنوں کو کبھی برداشت نہیں کرتیں اور باغیوں اور قانون شکنوں کا قتل کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ہمارے لئے اس امر کا تعین تو بہت مشکل ہے کہ مولانا کو اُن کے قتل پر جو اتنا رنج ہے تو اس کی دراصل وجہ کیا ہے۔ مگر تاریخ کے بقول یہ صاحب اُن لوگوں میں شامل تھے جو حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو حق بجانب سمجھتے تھے اور اپنے ساتھیوں سمیت سبائیوں کی ہمنوائی میں حضرت عثمانؓ کے حق میں تبرّہ بھی کہتے تھے۔

ہمیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حجر کے واقعہ کو مولانا نے اپنے معمول کے مطابق صرف حضرت معاویہؓ کو بدنام کرنے کے لئے ہی زیادہ ہوا دے دی ہے بقول مرزا غالب ؎ ترے توسن کو صبا باندھتے ہیں

ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

جناب حجر بن عدی ایک نہایت درجہ زود رنج اشتعال پذیر مزاج کے حامل اور جذباتی بزرگ تھے اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ حضرت عثمانؓ کے قتل سے لے کر صفین کی جنگ تک حضرت علیؓ کے لشکری رہے اور ان کی طرف سے جمل میں حضرات طلحہؓ و زبیرؓ کے خلاف اور صفین میں حضرت معاویہؓ کے خلاف مصروفِ پیکار رہے۔

یہاں تک تو بات بالکل قابلِ فہم ہے۔ اپنی سوچ کے مطابق فریقینِ جنگ میں سے کسی ایک کی حمایت اُن سے خاص نہیں تھی، فریقین کے ساتھی ہر جگہ ہی

رکھتے تھے۔ مگر جناب حجر کے فکری عدم توازن کی یہ صورت بالکل ناقابلِ فہم تھی کہ اب جبکہ حالات اسلام کے حق میں ہموار ہو چکے تھے، حضرت حسنؓ خلافت سے دست برداری سے فریقین کی باہمی کشمکش ختم ہو چکی تھی، مسلمان بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کے گلے مل چکے تھے، اہلِ بیت رسولؐ سے تعلق رکھنے والے سب لوگ ہی حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ تک حضرت معاویہؓ کی اطاعت کو ایک خلیفۂ رسولؐ کی اطاعت قرار دے چکے تھے، اسلامی سلطنت کا نظام کار ٹھیک طور پر ملک اور اہلِ ملک کی ضرورتوں کے مطابق رواں دواں تھا، مگر اِن بزرگوار کا مزاج ابھی بے ٹھکانہ ہی تھا اور وہ ذرا ذرا سی بات کو بہانہ بنا کر فساد کے مواقع پیدا کر لیتے اور تلوار سونتے گھر سے باہر نکل آتے، وہ ابھی تک حالات سے ہموار نہیں تھے اور اپنے آپ کو ابھی بدستور ہی جمل اور صفین کے میدانوں میں ہی سمجھتے تھے، ہو سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ہی ہوں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں صحابیوں جیسی کوئی بات موجود نہیں تھی[۱]، گروہی تعصب نے ان کو کچھ ایسا ازخود رفتہ بنا رکھا تھا کہ وہ سلطنت اسلامی کا ایک سنجیدہ شہری بن کر رہنے کے بجائے فریق بن کر رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اُن کے عقیدہ میں بھی کچھ ایسی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی کہ ان کی صحابیت اُن کے مزاج سے شکست کھا گئی اور وہ اُنہی عقائد کی تبلیغ کرتے رہتے تھے جن کو عبداللہ بن سبا نے اُمت کے اندر فتنہ پھیلانے کے لئے اختراع کیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ خلافت پر آلِ ابی طالب کے سوائے دوسرے کسی کا حق نہیں ہے،

"نہج البلاغہ" میں اُن سے چند اشعار نقل ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ

[۱] حضرت امام بخاریؒ اور بہت سے محدثین نے ان کو تابعین میں شمار کیا ہے (محب الدین خطیب تعلیقات العواصم من القواصم صفحہ ۲۱۳ - ابن کثیر فرماتے ہیں اکثر المحدثین لا یصححون صحبتہ کہ محدثین کی بڑی تعداد ان کو صحابی نہیں مانتی (ابن سعد جلد ۶ - البدایہ والنہایہ جلد ۸)

وہ عبداللہ بن سبا کی طرح ہی سیدنا علیؓ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

یا ربنا سلّم لنا علیًّا   سلّم لنا المبارک المرضیًّا

فیو خذ کان لہٗ ولیًّا   ثم ارتضاہ بعدہٗ وصیًّا

الٰہی! علیؓ کو ہمارے لئے سلامت رکھ۔ جنکی بابرکت ذات سے تو راضی ہے۔ وہ نبیؐ کے مددگار اور ولی ہیں۔ پھر اُنہوں نے انہیں خوشی خوشی اپنا وصی بنا لیا۔

حضرت حجرؓ بن عدی کے دوسرے ساتھیوں کا بھی یہی حال ہے۔ ابن خلدون کے مطابق اُن میں سے ایک صاحب عبدالرحمٰن بن حسان سے دریافت کیا گیا کہ تمہارا علیؓ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تو اس نے کہا میں اُن کو بہت اچھا اور نہایت افضل مانتا ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے اس اظہار میں کسی مسلمان کو بھی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ علیؓ یقیناً اچھے اور نہایت درجہ افضل بزرگ ہی تھے۔ مگر جب اُسی لمحے اُس سے پوچھا گیا کہ عثمانؓ کے بارے میں تم کیا عقیدہ رکھتے ہو؟ تو اس نے چھوٹتے ہی جواب دیا۔ سب سے پہلے جس شخص نے ظلم کا دروازہ کھولا اور انصاف کا دروازہ بند کیا وہ عثمانؓ ہی تھا۔[2]

مولانا نے بات کو زیبِ داستان کے لئے بڑھا کر کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ ورنہ حجرؓ کا قتل نہ منتقمانہ تھا نہ ظالمانہ، ان کے خلاف باقاعدہ مقدمہ قائم ہوا تھا۔ عدالتی کارروائی ہوئی گواہوں نے اُن کے خلاف گواہیاں دیں اور جب ان پر مملکت کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت ہو گیا تو ان کو قتل کی سزا دے دی گئی۔ اس میں آخر کونسی بات عدل کے خلاف واقع ہوئی ہے؟

یہاں جب ہماری حکومت کسی شخص کو گرفتار کر کے بلا مقدمہ جیل کے سپرد کر دیتی ہے تو مولانا سمیت سب اہلِ ملک کا یہی مطالبہ ہوتا ہے کہ ملزم پر

---

[1] نہج البلاغہ صـ ۱۸۵ [2] ابن خلدون جلد ۲ صـ ۶۴

عدالت میں مقدمہ چلاؤ اور سب کے سامنے اس پر جرم ثابت کرو اور حضرت معاویہؓ نے بغیر کسی کی تحریک کے از خود ہی ان کے خلاف عدالتی کارروائی کا اہتمام کیا اور جرم کے ثابت ہو جانے پر جرم کی نوعیت کے مطابق اُنہیں عدالتی معمول کے مطابق سزا دیدی گئی اور بس۔

مگر آیئے ہم حالات وواقعات کی باقاعدہ چھان بین کرتے ہیں تا کہ کسی جانبداری یا انتقام کا اشتباہ نہ رہ سکے۔

ہمیں اس غرض سے کسی زیادہ تجسّس کی ضرورت بھی پیدا نہیں ہے کیونکہ اس سلسلہ کی بہت سی باتیں تو خود مولانا مودودی صاحب کے اپنے بیان سے ہی کھُل جاتی ہیں۔ مولانا اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت حجُر گورنر کے خطبہ میں برابر مداخلت کرتے رہتے تھے اور اُنہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ حضرت مغیرہؓ جیسے مرنجانِ مرنج بزرگ بھی اُن کی ان حرکات سے بہت اذیّت پاتے تھے مگر یہ ان کی حوصلہ مندی تھی کہ بات ہمیشہ آئی گئی ہو جاتی اور وہ اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتے تھے۔

خیال ہے کہ حضرت مغیرہؓ کی حد تک مولانا مودودی صاحب بھی یہ یقین نہیں رکھتے ہوں گے کہ وہ اپنے خطباتِ جمعہ میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتے ہوں پھر جب ایسا نیک دل، نیک نفس، سنجیدہ اور ٹھنڈے دل کا آدمی بھی جناب حجُر سے تکلیف پاتا تھا تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حجُر کی مداخلت فساد انگیزی تک پہنچ چکی تھی۔

حجُر کے متعلق یہ بات بقول مولانا بھی ثابت ہو چکی ہے کہ مغیرہؓ جب خطبہ جمعہ دیتے تو حجُر بلا سبب اور بلا وجہ اُٹھ کر دورانِ خطبہ میں ہی حضرت علیؓ کی تعریف اور حضرت معاویہؓ کی مذمّت کرنے لگتے تھے اور مولانا مودودی صاحب کو یہ تسلیم ہے کہ حضرت مغیرہؓ جب تک کوفہ کے گورنر رہے وہ اُن (یعنی حجُر) کے ساتھ رعایت برتتے رہے۔

ان کے بعد جب زیاد کی گورنری میں بصرہ کے ساتھ کوفہ بھی شامل ہو گیا تو (حجُر کی انہی حرکات کی وجہ سے) اُس کے اور اِن کے درمیان

کشمکش برپا ہو گئی۔

وہ خطبہ میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا۔ یہ اُٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے[1]

یعنی حُجر نہ صرف خطبہ کا احترام نہیں کرتے تھے بلکہ گورنر کی بے توقیری بھی کرتے تھے اور سینکڑوں ہزاروں سامعین کے سامنے گورنر کی بے عزتی اور تذلیل پر کمر بستہ رہتے تھے۔

مولانا مودودی حضرت عثمانؓ کے خون کا انتقام چاہنے والوں سے قدم قدم پر شریعت کے قاعدے دریافت کرتے ہیں کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ جناب حُجر نے جو روش اختیار کر رکھی تھی وہ شریعت کے کس قاعدے اور قانون کے ماتحت تھی؟

گورنر اپنے خطبہ میں اگر کسی لغویت کا ارتکاب کرتا تھا تب بھی حُجر کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ خطبہ میں مداخلت کریں اور مسجد میں فساد مچا کر خطبہ اور مسجد دونوں کی توہین کے مرتکب ہوں۔

اُنہیں آخر یہ کیوں ضد تھی کہ وہ ضرور گورنر کا خطبہ ہی سنیں گے۔ اگر گورنر کا خطبہ اُن کے خلاف منشا ہی رہتا تھا تو وہ اپنے لئے خطبہ جمعہ کا کوئی متبادل انتظام کر سکتے تھے اُنہیں مسجد میں خطبہ کے دوران میں ہی فساد آرائی کا کوئی حق نہیں تھا۔

مولانا نے حُجر کی رعایت میں بات ذرا لٹکا دی ہے کہ گورنر حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا اور یہ اُٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے مگر تکلف برطرف بات یوں سمجھئے کہ خطبہ جاری ہوتا تھا، گورنر علیؓ کو گالیاں دیتا تھا اور یہ گورنر کے جواب میں معاویہؓ کو گالیاں دیتے تھے۔

یعنی جناب حُجر کی وجہ سے مسجد روایتی بھٹیاریوں کی لڑائی کا اکھاڑہ بن جاتی تھی جہاں بھٹیاریاں ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر دادِ سخن دیتی تھیں۔

اور یہ اس بزرگ صحابی کا حال تھا جسے مولانا عابد اور زاہد صحابی فرماتے ہیں۔ جن کے ہاں خطبہ میں بولنے پر بھی اور جو بولنے والے کو منع کرے اس پر بھی وعید تھی

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ۱۶۴

اور جو خطبہ میں یوں ساکت بیٹھتے تھے جیسے اُن کے سر پر کوئی پرندہ بیٹھا ہو۔ وہ سر تک نہیں ہلاتے تھے جیسے اُنہیں پرندہ کے اُڑ جانے کا خوف ہو۔ مگر یہاں صورت یہ تھی کہ اگر کبھی خطبہ میں ذرا دیر ہوئی تو وہ صلوٰۃ صلوٰۃ پکارتے اپنی جگہ سے اُٹھتے اور مسجد میں اُودھم مچا دیتے، خطیب پر روڑے پھینکنے لگتے اور نمازیوں کی صفوں میں ابتری پیدا کر دیتے۔

اگر اس صورتِ حال کو جاری رہنے دیا جائے تو ظاہر ہے کہ حکومت پر سے لوگوں کا اعتماد اُٹھ جاتا ہے اور خواص اگر ایسی ابتری پھیلانے لگیں تو عوام بھی حکومت کے خلاف دلیر ہو جاتے ہیں۔ آخر جہاں محاسبہ کا ڈر نہیں ہوگا وہاں نظم کیونکر باقی رہ سکتا ہے۔ مگر جناب حجرؓ کی زیادتیاں کسی سیاسی قائد کا روزمرہ نہیں تھا بلکہ اُن کی یہ حرکتیں کسی آنے والے بھونچال کی خبر دیتی تھیں جو زیرِ زمین کھول رہا تھا۔ آنے والے واقعات سے ہمارے قارئین کو علم ہوگا کہ حکومت نے جناب حجرؓ کے خلاف کسی سخت کارروائی سے اس وقت تک پرہیز کیا جب تک وہ مسلح بغاوت کے عزم سے باہر نہیں نکل آئے اور انہوں نے حکومت کے خلاف تلوار نہیں سونت لی۔ اس کے باوجود ہمارے مولانا اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی گرفتاری کو ظالمانہ کارروائی فرما رہے ہیں حالانکہ ان کے خلاف یہ کارروائی اچانک نہیں ہوئی تھی، اس وقت ہوئی جب کارروائی نہ کرنا حکومت کی نالائقی اور حماقت شمار کی جاتی۔

جناب حجرؓ کو جب گرفتار کیا گیا تو مولانا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اُن کے خلاف باقاعدہ عدالتی کارروائی عمل میں آئی تھی مولانا لکھتے ہیں:

ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی شہادتیں اس جرم پر لیں کہ انہوں نے:

- ایک جتھا بنا لیا ہے (جو حکومت کے باغیوں پر مشتمل ہے)
- خلیفہ کو علانیہ گالیاں دیتے ہیں۔
- امیرالمومنین کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔
- ان کا دعویٰ ہے کہ خلافت آلِ ابی طالب کے سوا کسی کے لئے درست نہیں ہے۔

- اُنہوں نے شہر میں فساد برپا کیا۔
- امیرالمومنین کے عامل (سعید بن عاص) کو شہر سے نکال باہر کیا۔
- ابو تراب کی حمایت کرتے ہیں، ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے مخالفین سے اظہارِ برأت کرتے ہیں [1]

یہ فردِ قرار دادِ جرم ہم نے مولانا کے الفاظ میں ہی پیش کی ہے اور مقدمہ کی کاروائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی رؤس الاشہاد ان میں سے ایک الزام بھی غلط ثابت نہیں ہوا۔

مولانا کے معتبر مورخین اس مقدمہ کی کاروائی کی تفصیل بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں:

کوفہ شہر کو انتظامی سہولت کے لئے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر حصہ کے لئے ایک رئیس مقرر تھا۔

گورنر نے شہر کے ان چاروں رئیسوں کو بلایا اور ان سے حجرؓ کے بارے میں تفحص حال کیا۔ یہ چاروں رئیس مندرجہ ذیل تھے:

عمرو بن حریث، خالد بن عرفطہ، قیس بن ولید اور ابو بردہ بن ابو موسیٰ۔

ان چاروں نے اپنی گواہی میں کہا کہ حجرؓ نے اپنے پاس لوگوں کو جمع کیا اور خلیفہ کو علانیہ بُرا کہا اور امیر المومنین کے خلاف جنگ کرنے کے لئے لوگوں کو اُکسایا۔

حجرؓ کا عقیدہ ہے کہ خلافت آلِ ابی طالب کے سوائے کسی دوسرے کا حق نہیں ہے اُس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خروج کر کے شہر سے امیرالمومنین کے عامل (سعید بن عاص) کو نکال دیا۔

حجرؓ نے ابو تراب (علیؓ) کی طرف سے عذر اور ترحم کیا اور اُن کے غیر سے اظہارِ بیزاری کیا، جو لوگ حجرؓ کے ساتھ ہیں اُن کا عقیدہ بھی یہی ہے۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۱۶۴

گواہیاں ہو چکیں تو گورنر نے کہا گواہیاں قانونی ہونے کے باوجود ناکافی ہیں۔ اس لئے مزید گواہ طلب کئے جائیں۔

اس پر اکابر شہر کو جمع کیا گیا۔ جب سب لوگ آ چکے تو گورنر نے اُن سے خطاب کیا اور کہا کہ آپ لوگ حجرؓ کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں وہ بیان کریں اور اس مقدمہ میں حکومت کی امداد کے لئے سبقت کریں۔ اور حق کو دریافت کرنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

اس پر حاضرین میں سے عناق بن شرجیل تمیمی اُٹھے اور کہا۔ میرا نام اس مقدمہ کے گواہوں میں درج کر لیں۔ گورنر زیاد نے جواب دیا کہ یوں نہیں بلکہ پہلے قریش میں سے گواہوں کی فہرست ترتیب دی جائے پھر عناق کا نام درج ہو۔ گورنر نے مزید کہا کہ گواہوں میں صرف انہی لوگوں کو درج کیا جائے گا جن کی خیر خواہی اور راستبازی ہم سب کو معلوم ہو بلکہ اُن کی راستبازی کے بارے میں امیرالمومنین بھی ذاتی علم رکھتے ہوں۔

اس کے بعد اسحاق بن طلحہ، اسماعیل بن طلحہ، منذر بن زبیر، عمارہ بن عقبہ، عبدالرحمٰن بن منہاد، عمر بن سعد، عامر بن مسعود، محرز بن جاریہ اور عبیداللہ بن مسلم حضرمی نے اپنی اپنی گواہیاں لکھوائیں۔

ان کے بعد حسب ترتیب عناق بن شرجیل، وائل بن حجر حضرمی، کثیر بن شہاب حارثی اور قطن بن عبداللہ کی گواہیاں درج ہوئیں، ان کے بعد کچھ مزید گواہ بھی پیش ہوئے۔ بعض گواہوں پر جرح بھی ہوئی، ان لوگوں میں سے جو گواہ بنی ربیعہ سے تعلق رکھتے تھے اُن کی گواہیوں پر اہل ربیعہ میں سے کچھ لوگ ناراض بھی ہوئے اور وہ انہیں طعن کرتے تھے کہ تم نے اپنے دوستوں کے خلاف گواہی دے کر اچھا کام نہیں کیا۔ اس کے جواب میں اُن گواہوں نے اپنے اہل خاندان سے کہا کہ (اوّل تو بیان حق میں کسی دوستی کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیئے پھر) اُن پر تو خود ان کی قوم کے لوگوں نے گواہی دی ہے (پھر ہم پر طعن کیسا!)[1]

---

[1] طبری جلد ۵۔ البدایہ والنہایہ جلد ۸ واقعات ۵۱ھ

حُجر کے مقدمہ میں مولانا کے معتبر مورخین کے بقول ستر آدمیوں نے حُجر کے خلاف اپنے بیانات لکھوائے اور یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے جن کی گواہیاں کسی معاملہ کے لئے قولِ فیصل کا حکم رکھ سکتی ہیں۔ گورنر کوفہ زیاد نے یہ پوری رُوداد مرتب کر کے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں پیش کر دی اور اس کے ساتھ ایک خط بھی تحریر کیا جس میں لکھا۔

شہر کے شرفاء اور اخیارِ مصر اور دیندار لوگوں کو میں نے جمع کیا، اور ان سے حُجر کے بارے میں گواہیاں طلب کیں۔ پھر جو کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے مطابق اپنی گواہیاں پیش کر دیں۔ اب یہ پوری مسل امیر المومنین کی خدمت میں آخری کارروائی کے لئے پیش ہے لہ

قانونِ شہادت کے مطابق جب مقدمہ ثابت ہوا تو ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ شہادتوں کی روشنی میں نافذ ہو جائے گا، اور دنیا کے کسی قانون میں بھی بغاوت کے ثبوت کے بعد باغیوں کے لئے کوئی رعایت موجود نہیں ہے خواہ وہ قانون زمینی ہو یا آسمانی بغاوت کی سزا ہر جگہ ہی یکساں ہے۔ تاہم حضرت معاویہؓ نے حُجر اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف سزا کے نفاذ سے قبل انہیں ایک موقع اور دیا تاکہ وہ اپنے فعل پر پشیمانی کا اظہار کرنے کے بارے میں سوچ سکیں۔ چنانچہ انہیں کہا گیا۔ امیر المومنین معاویہؓ تمہارے بارے میں کسی عجلت کو پسند نہیں کرتے۔ بات سیدھی ہے کہ تمہارے اپنے ہی ہم وطنوں کی گواہیوں کی بنا پر امیر المومنین کے لئے تمہارا قتل جائز ہو چکا ہے۔ لیکن ان کے باوجود ان کا پیغام ہے کہ اگر تم خلافت کے سلسلہ میں اپنے عقیدہ سے برأت کا اظہار کر دو (کہ آلِ ابی طالب کے سوا کسی دوسرے کی خلافت درست نہیں) تو تمہیں معاف کر دیا جائے گا (کیونکہ تمہارے اس عقیدہ کا معنی یہ ہے کہ ہم حضرت حسنؓ اور معاویہؓ کی باہمی صلح، حضرت حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری اور حضرت معاویہؓ کی خلافت پر ان کی بیعت کی ساری کارروائی کو تسلیم نہیں کرتے اور معاویہؓ کی

لہ طبری جلد ۶، واقعات ۵۱ھ

خلافت کو بھی جس پر تمام عالمِ اسلام متفق ہو چکا ہے صحیح نہیں سمجھتے)۔

مگر حُجرؓ نے اپنے اس عقیدہ سے اظہارِ برأت کرنے سے انکار کیا۔ پھر اُن سے سوال کیا گیا کہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حکم میں جَور روا رکھا اور ناحق پر عمل کیا۔ اس پر پیغامبروں نے کہا کہ بیشک امیر المومنین معاویہؓ نے تمہیں خوب ہی پہچانا تھا[1]

محب الدین خطیب تحریر کرتے ہیں کہ:

زیاد جب حضرت علیؓ کی طرف سے کوفہ کا والی مقرر تھا تو حجرؓ بن عدی اس کا دوست اور مددگار تھا اور اس کی بات پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔

پھر جب زیاد دوبارہ اسی کوفہ کا والی معاویہؓ کے حکم سے بن کر آیا تو حُجرؓ بن عدی نے اس کی ہر بات پر اعتراض اپنا معمول بنا لیا۔ اور حجرؓ کا یہ سلوک صرف زیاد سے ہی خاص نہیں تھا بلکہ وہ زیاد سے قبل بھی حضرت معاویہؓ کے ہر عامل سے یہی سلوک کیا کرتا تھا پھر جب پانی سر سے گزر گیا اور معاویہؓ نے محسوس کیا کہ حجرؓ کی سرکشی اب بے قابو ہو رہی ہے اور اگر اس کو روک نہ دیا گیا تو ملک کے اندر بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھے گی تو بالآخر اُنہوں نے اس کے قتل کا حکم جاری کر دیا[2]

مگر مولانا نے اس سارے پس منظر اور تہہ منظر کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اتنا کہنا ہی پسند کیا ہے کہ:

یہ ملزم حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجے گئے اور اُنہوں نے ان کے قتل کا حکم دے دیا[3]

سبحان اللہ! یہ دورودراز کا فاصلہ مولانا نے کس خوبصورتی سے مختصر کر دیا ہے کہ ؎

میں میکدہ کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کتنا طویل تھا

---

[1] طبری جلد ۵ الکامل جلد ۳ [2] العواصم من القواصم صد ۲۴۳ حاشیہ ۳ [3] خلافت و ملوکیت صد ۱۶۵

حُجر بن عدی اپنی تاریخ کے آئینہ میں

حضرت حُجر کا قصہ تو بس اتنا ہی تھا کہ اُنہوں نے خلافت کے خلاف بغاوت کی اور گرفتار ہو گئے، ان پر مقدمہ چلا، جرم ثابت ہو گیا اور انہیں موت کی سزا سنائی گئی۔

سزا سنانے کے بعد انہیں موقع دیا گیا کہ وہ اپنے فعل پر پشیمانی کا اظہار کر دیں تو انہیں معاف کر دیا جائے گا، مگر انہوں نے اپنی ضد ترک نہ کی اور بالآخر سزا پر عمل کے بغیر چارہ نہ رہا، حضرت معاویہؓ کی حکومت کی یہ کاروائی اُس کاروائی سے بہت ہلکی اور محفوظ تھی جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت سے انکار کرنے والوں کے خلاف جمل اور صفین کے میدانوں میں اختیار کیا تھا۔

اور جسے اب ہمارے زمانہ میں مولانا مودودی صاحب کے رفیقِ خاص معتمد اور قریبی دوست جناب خمینی نے اپنے مخالفین کے خلاف ایران میں اختیار کیا ہے مگر مولانا نے اس ایک معمولی کاروائی پر جو سراسر مملکت کی سالمیت کے لئے ہی تھی بات کو اتنا طول دیا ہے کہ بات کو بتنگڑ بنانے کی مثال پوری کر دی۔

انہوں نے حُجر کے قتل کو معاویہؓ کے ایک ایسے سنگین جرم اور بہ نہایت درجہ مجرمانہ فعل کے طور پر ادا اور اس کو اس زور سے اٹھایا کہ جیسے اس کاروائی سے پوری مملکت کے در و دیوار ہل گئے ہوں، اور ملک کے اندر ہر طرف ہراس اور دہشت پھیل گئی تھی۔

انہوں نے اپنی نگارش کی رگوں میں گرم خون جاری رکھنے کے لئے اُم المومنین صدیقہ طاہرہ حضرت عائشہؓ کے ایک بیان کا بھی حوالہ دیا ہے اور اُسے بہت اہمیت دی ہے جبکہ انہی ام المومنین صدیقہ طاہرہؓ کے بیانات تو کیا ان کی ذات میں بھی مولانا کو جمل کے موقع پر کوئی کشش موجود نہیں تھی اور وہ ان کے کسی

بیان کو قابلِ احترام تو کیا قابلِ توجہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔

یہاں اُنہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے غم و رنج کا بھی ذکر کیا ہے اور بات میں زیادہ زور پیدا کرنے کے لئے حضرت معاویہؓ کے ایک عامل ربیع بن زیاد الحارثی کے بارے میں بتایا ہے کہ اُنہوں نے جب یہ خبر سُنی تو شدتِ جذبات سے بے حال ہو کر اپنی موت کی دُعا بھی کر ڈالی۔ لگے ہاتھ مولانا نے یہاں حضرت حسن بصری کے ایک قول کو بہانہ بنا کر حضرت معاویہؓ کے خلاف اپنی زہر چکانی کو دو آتشہ بھی بنا لیا ہے [۱]

حضرت حجرؓ ایک صحابیٔ رسولؐ تھے ان کے قتل کی خبر سُن کر اصحابِ رسولؐ اور دوسرے صلحائے اُمت کو بھی بجا طور پر رنج و غم ہو سکتا تھا اور یقیناً اُنہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہو گا، مگر اس غم و رنج کی وجہ یہ تھی کہ اُنہوں نے صرف حجرؓ کے قتل کی خبر سُنی تھی، حجرؓ کے جرم کی کہانی اُن کے سامنے نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں جب ایک مرحلہ پر حضرت معاویہؓ نے اُم المومنین صدیقہ طاہرہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر حجرؓ کے قتل کا پورا پس منظر پیش کیا تو اُم المومنینؓ کے دل کا بوجھ جاتا رہا تھا۔

مولانا مودودی صاحب کے علاوہ کچھ اور اہلِ علم بھی اس طرف گئے ہیں کہ حجرؓ کو قتل نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے بلا غرض بھی معاویہؓ کے اس فعل سے اختلاف کیا ہے، اور جہاں تک مولانا کا تعلق ہے اُنہوں نے تو اس واقعہ کو اسلام کی آبرو پر حملہ کی سطح پر ہی اٹھایا ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ بات کو زیادہ صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ہم حجرؓ اور حکومت کے تصادم کو اس کے پورے پس منظر سمیت اپنے قارئین کے سامنے رکھ دیں تاکہ ہر شخص خود یہ فیصلہ کر سکے کہ حضرت معاویہؓ کی حکومت کا یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط۔ بات چلانے سے قبل ہم اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے لئے ہم پر

---

[۱] خلافت و ملوکیت صد ۱۶۵

صرف اُنہی باتوں کے دفاع کی ذمہ داری ہے جو اہلِ غرض سیاست بازوں نے اپنی سیاسی ضرورتوں سے حضرت معاویہؓ کو بدنام کرنے کے لئے اُن کے کھاتے میں ڈال رکھی ہیں۔ لیکن اگر کسی مرحلہ پر حقائق اور شواہد حضرت معاویہؓ کی تائید نہ کریں تو ہم حضرت معاویہؓ کے لئے کسی قیمت پر بھی اپنی عاقبت کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ کے ہاں معاویہؓ ہمارے کام نہیں آسکیں گے۔ حضرت معاویہؓ کوئی معصوم عن الخطا اور ما فوق الفطرت مخلوق نہیں ہیں۔ ایک انسان ہیں اور انسان کی حیثیت سے وہ غلطی بھی کرسکتے ہیں، اُن سے بہت سی فروگزاشتوں کا صدور بھی ممکن ہے۔ مگر ہم نہ ان کی کسی فروگزاشت یا غلطی کی حمایت پر ہی آمادہ ہیں اور نہ اُسے کسی تاویل سے صحیح بنانے کی سعی کے حق میں ہیں۔ ہم صرف حق کی حمایت کے لئے ہی حضرت معاویہؓ پر زیادتیوں کا دفاع کر رہے ہیں اور حق کے تابع ہو کر ہی رہنے کا قصد رکھتے ہیں۔

طبری کی روایت

بات میں اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم مسئلہ زیرِ بحث پر اپنی گزارشات کی بنیاد صرف ابنِ جریر طبری کی روایات تک ہی محدود رکھیں گے کیونکہ طبری دوسرے تمام مورخین کے مقابلہ میں مولانا کے نزدیک زیادہ معتبر اور لائق اسناد و اعتماد ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

ابن جریر جن کی جلالتِ قدر بحیثیت مفسّر، محدّث، فقیہ اور مورخ مسلّم ہے علم اور تقویٰ دونوں اعتبار سے ان کا مرتبہ نہایت بلند ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تاریخ میں کون ہے جس نے اُن پر اعتماد نہیں کیا، خصوصیت کے ساتھ دورِ فتنہ کی تاریخ کے معاملہ میں تو محققین انہی کی آراء پر زیادہ تر بھروسہ کرتے ہیں [۱]

علامہ طبری لکھتے ہیں:

جب مغیرہؓ بن شعبہ (گورنر کوفہ) جب بھی اپنے خطبہ میں حضرت عثمانؓ کے لئے رحمت طلب کرتے اور اُن کے قاتلین پر لعنت کرتے تو حجرؓ بن عدی فوراً اُٹھ کھڑے ہوجاتے۔

[۱] خلافت و ملوکیت صہ ۳۱۲

اور خطبہ جمعہ کے دوران میں ہی جواب دینے لگتے اور کہتے کہ لعنت عثمانؓ کے قاتلوں کا نہیں بلکہ تمہارا حصہ ہے۔ خدا تمہارا بُرا کرے اور تم پر لعنت کرے۔ تم جن لوگوں کی مذمت کرتے ہو اور جن میں عیب نکالتے ہو وہی دراصل بزرگی کے حامل ہیں اور جن کو تم بے لوث کہتے ہو وہی مذمت کے لائق ہیں۔

اس پر مغیرہؓ انہیں ہمیشہ سمجھاتے تھے کہ حجرؓ! (میں تمہارا حاکم ہوں تجھے میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہیئے) تم محض میری نرمی کی وجہ سے دلیر ہو گئے ہو، تم پر افسوس ہے، اپنے بادشاہوں اور اپنے حکام کا احترام ملحوظ رکھا کرو اور یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ مبادا تم کسی وقت اُن کے غصہ کا شکار ہو جاؤ۔ مغیرہؓ اپنی بات ہمیشہ اس نصیحت پر ہی ختم کر دیتے تھے اور حجرؓ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتے تھے، ہمیشہ درگزر کرتے تھے اور ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیتے تھے۔

کوفہ کی مرکزی جامع میں ہمیشہ یہی کچھ ہوتا رہا، یہاں تک کہ مغیرہؓ نے اپنی امارت کے آخری زمانہ میں ایک خطبہ کے دوران میں حجرؓ کے اس سلوک اور عثمانؓ کے بارے میں اُن کی نا روائی پر اپنے رب کے حضور دُعا کی کہ:

الٰہی! عثمانؓ بن عفان پر رحم کر، اُن سے درگزر فرما، انہیں ان کے نیک اعمال کی جزا دے، انہوں نے تیری کتاب پر عمل کیا اور تیرے پیغمبرؐ کی سنّت کی اتباع کی، انہوں نے ہم لوگوں میں اتفاق و اتحاد قائم رکھا، انہوں نے ہمیں خونریزی سے بچا لیا لیکن خود ناحق قتل کر دیئے گئے۔

الٰہی! ان کے انصار پر، اُن کے دوستوں پر، اُن سے محبت رکھنے والوں پر، اُن کے خون کا قصاص طلب کرنے والوں پر رحم فرما۔ اس کے بعد انہوں نے قاتلین عثمانؓ کے لئے بد دُعا کی۔

وہ یہاں تک پہنچے تھے کہ حجرؓ جوشِ غضب سے پیچ و تاب کھاتے اُٹھے اور مغیرہؓ کی جانب رُخ کر کے اتنے زور سے نعرہ بلند کیا کہ مسجد کے اندر اور باہر بیٹھے سب لوگوں نے ان کی بات سُنی۔

پھر وہ (خطبہ کے دوران میں ہی) لوگوں سے مخاطب ہوئے اور کہا۔
لوگو! تم اس شخص کے قریب میں آ رہے ہو، تم نہیں سمجھتے کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس شخص کی عقل جاتی رہی ہے۔

پھر وہ مغیرہؓ سے مخاطب ہوئے اور کہا مغیرہؓ! ہماری تنخواہیں اور عطیے جاری کرو، تمہیں ہمارا رزق بند کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ تم سے پہلے حکام نے کبھی ایسا لالچ نہیں کیا تھا، تم نے امیر المومنین (علیؓ کے ساتھیوں) کی مذمت اور مجرمین کی ستائش کا شیوہ اختیار کر لیا ہے۔ تنخواہوں اور عطیوں کے اس ذکر پر حجرؓ کے بہت سے ساتھی بھی اٹھ کر شور مچانے لگے۔ یہ شور بڑھتا ہی گیا اور جب یہ شور مچانے والے کسی درخواست پر بھی بیٹھنے کے لئے تیار نہ ہوئے تو مغیرہؓ خطبہ کو چھوڑ کر منبر سے اترے اور اندر چلے گئے [1]

روایت کا تجزیہ

بات کو قریب الفہم بنانے میں آسانی کی غرض سے طویل روایت کا یہ مختصر حاصل پیش نظر رکھ لیجئے:

- ملک کا حاکم جمعہ کا خطبہ دے رہا ہے کیونکہ اسلام کی حکومت میں خطبہ جمعہ ملک کے حاکم کی ہی ذمہ داری ہے۔
- حاکم نے مسلمانوں کے دستور کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشد خلیفہ مظلوم مقتول حضرت عثمانؓ کے لئے مغفرت کی دعا کی اور ان کے قاتلوں پر نفرین کہی۔ حجرؓ حضرت عثمانؓ کی ستائش برداشت نہ کر سکے اور خطبہ کے دوران میں ہی اٹھ کر خطیب یعنی حاکم کوفہ پر حضرت معاویہؓ اور حضرت عثمانؓ پر لعنت کرنے لگے۔
- والیٔ کوفہ کے ساتھ حجرؓ کا یہ سلوک ان کا معمول ہی بن گیا تھا اور وہ عثمانؓ کے ذکر پر گورنر کوفہ کو کبھی معاف نہ کرتے تھے اور انہوں نے اپنی اس کارروائی میں

---

[1] طبری جلد ۴ واقعات ۵۱ھ

نہ کبھی خطیب کا لحاظ کیا، نہ خطبہ کا احترام کیا، نہ مسجد کا تقدس ہی پیشِ نظر رکھا۔

- ایک خطبہ میں گورنر مغیرہؓ، حضرت عثمانؓ اور ان کے اعوان وانصار کے لئے مغفرت کی دعا کر رہے تھے کہ حجرؓ نعرے لگانے اٹھے، گورنر کو بحالتِ خطبہ گالیاں دیں اور یہی سلوک حضرت معاویہؓ اور عثمانؓ سے بھی کیا۔
- حجرؓ کے اٹھتے ہی ان کے بہت سے ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوگئے اور انہوں نے مسجد میں اودھم مچا دیا۔
- حضرت مغیرہؓ نے حالات پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر حجرؓ اور ان کے ساتھیوں نے اپنا شور جاری رکھا، یہاں تک کہ خطبہ جاری رکھنا ناممکن ہوگیا اور بالآخر گورنر مغیرہؓ خطبہ کو چھوڑ کر منبر سے اتر آئے اور گھر کے اندر چلے گئے۔

مغیرہؓ — حوصلہ مندی کا پہاڑ

علامہ ابن جریر طبری رقمطراز ہیں: خطبہ کے دوران میں حجرؓ کے اس ناروا سلوک اور ان ناروا واقعات کے صدور پر بہت سے لوگ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔

آپ حجرؓ کا کوئی انتظام کیوں نہیں کرتے، وہ آپ کی نرمی اور بردباری کی وجہ سے وہ بہت دلیر ہوگیا ہے۔ آپ کے تحمل نے اسے آپ پر اور حکومت پر بہت دلیر کر دیا ہے۔ یقیناً آپ کی یہ بردباری اور حوصلہ مندی خود آپ کے لئے بھی اور آپ کی حکومت کے لئے بھی سخت نقصان رساں ہے۔

یہ شخص آپ کی توہین کرتا ہے، آپ کی حکومت کی توہین کرتا ہے۔ اگر امیرالمومنین معاویہؓ اس صورتِ حال سے باخبر ہوئے تو وہ آپ پر ناراضگی کا اظہار کریں گے۔

حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا۔ عزیزو! میری زندگی کا اب آخری دور ہے اور میں اس آخری دور میں اپنی حوصلہ مندی کو اپنے سے مایوس نہیں ہوتے دوں گا۔ اور

میں جب تک زندہ رہا میں حجرؓ کو معاف کرتا رہوں گا اور اس کے خلاف اس کی تمام تر زیادتیوں کے باوجود کوئی کاروائی نہیں کروں گا۔

میں اب جانے ہی والا ہوں اور یقیناً میرے بعد میری جگہ کوئی آئے گا اور اگر حجرؓ کی یہ روش اس آنے والے سے بھی یہی رہی جو اس نے مجھے روا رکھ چھوڑی ہے تو آنے والا اس سے خوب طرح سے نپٹ لے گا، وہ حجرؓ سے اس کی روش کے حسبِ حال سلوک کرے گا اور میرا یقین ہے کہ آنے والا مستقل طور پر ہی حجرؓ کے مسئلہ کو حل کر دے گا[1]

حالات میں تبدیلی

علامہ طبری لکھتے ہیں:

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اُسی برس اللہ کو پیارے ہو گئے اور ان کی جگہ بصرہ کے حاکم زیاد کو بصرہ کے ساتھ کوفہ کی ولایت بھی سپرد کر دی گئی۔

وہ اپنے عہدہ کا چارج سنبھالنے کے لئے کوفہ پہنچا، جمعہ کا دن تھا، کچھ وقت آرام کیا اور خطبہ کے لئے مسجد میں آ گیا، منبر پر بیٹھا، حمد و ثناء کے بعد کہا:

بھائیو! زمانہ ہمارا تجربہ کر چکا ہے اور ہم بھی زمانہ کو آزما چکے ہیں۔ ہم جان چکے ہیں کہ ہماری اس حکومت کے آخر میں بھی وہی کچھ مناسب ہے جو اس کے آغاز میں تھا یعنی اطاعت میں ایسی خوبی پیدا ہو جائے کہ باطن کو ظاہر سے، غائب کو حاضر سے اور دل کو زبان سے یگانگت قائم رہے (اس قسم کی بہت سی نصیحت آموز باتوں کے بعد گورنر نے حضرت عثمانؓ کا ذکر کیا اور ان کی ستائش کی اور ان کے قاتلوں پر لعنت کی۔ اس مجلس میں حجرؓ بھی موجود تھے، عثمانؓ کا ذکر آتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُنہوں نے گورنر زیاد سے بھی وہی سلوک کیا جو وہ اب تک مغیرہؓ سے روا رکھتے رہے تھے (تاہم زیاد نے بھی حوصلہ مندی سے ہی کام لیا اور حجرؓ کی جارحیت کا کوئی نوٹس نہ لیا) خطبہ ختم ہوا تو زیاد نے اپنی جگہ اپنے نائب کے طور پر عمرو بن حریث کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا اور خود

---

[1] طبری جلد ۴ باب ۴

واپس بصرہ چلا گیا۔

(بہت ممکن تھا کہ زیاد حُجر کی نازیبا حرکات کو فراموش کر دیتا) مگر اُسے کوفہ سے حُجرؓ کی ناروا روش کی خبریں لگاتار پہنچتی رہیں، یہاں تک کہ اُسے یقین ہو گیا کہ فتنہ کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اور حجر ہر آن ہی آمادۂ فساد ہیں۔

کوفہ کے گورنر کی حیثیت سے زیاد کو وقفہ وقفہ سے کوفہ کے حالات سے باخبر رکھا جاتا تھا۔ حالات جب زیادہ خراب ہونے لگے تو زیاد کو تشویش بڑھی اُسے خبر ملی کہ حجرؓ کے گھر میں اُس کے ساتھی باقاعدہ جمع ہوتے ہیں اور علی الاعلان حضرت معاویہؓ پر لعن کرتے ہیں۔

حجرؓ نے ایک روز جمعہ کے خطبہ کے اندر اتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ صورتحال بے قابو ہو گئی اور زیاد کے مقرر کردہ حاکمِ کوفہ عمرو بن حریث پر بحالتِ خطبہ جمعہ سنگباری کی گئی۔ زیاد کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ سخت برہم ہوا اور پہلی ہی فرصت میں کوفہ پہنچ گیا۔

کوفہ میں کشیدگی اب بہت زیادہ بڑھ چکی تھی اور زیاد کے اچانک پہنچ جانے سے لوگ کسی نئی خبر کا انتظار کرنے لگے۔

جمعہ کا دن آیا تو آج مسجد میں ہجوم کی بہتات سے تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، حجرؓ بھی آج اپنے بہت سے ساتھیوں کو ساتھ لے کر آئے تھے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ زیاد اپنے وقت پر باہر آیا۔ اور خطبہ کے لئے منبر پر بیٹھا، حمد و ثناء کے بعد کہنے لگا۔

بھائیو! تعدّی اور گمراہی کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا، کوفہ کے اندر مخالفانہ جذبات رکھنے والے لوگ بھی عجیب طبیعت کے واقع ہوئے ہیں۔ اگر ان سے نرمی برتی جائے تو اکڑ جاتے ہیں اور اگر انہیں میری طرف سے ذرا اطمینان ہوا تو گستاخ ہو نکلے۔

خدا کی قسم! اگر یہ لوگ سیدھی طرح نہ رہے تو پھر ان کا وہی علاج کیا جائیگا

جو اُس کے مناسبِ حال ہوا (یہاں پہنچ کر گورنر نے براہِ راست حجرؓ کی بات اُٹھائی اور کہا)

حجرؓ نے یہاں بہت مشکل صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ میں اُسے انتباہ کرتا ہوں کہ اگر اُس نے اپنی روش کو تبدیل نہ کیا تو میں اُس پر کوفہ کی زمین تنگ کر دوں گا اور اُس کے انجام کو دوسروں کے لئے موجبِ عبرت بنا دوں گا۔ پھر گورنر نے حجرؓ کو بلا واسطہ مخاطب کیا اور کہا حجرؓ! تم پر افسوس ہے تم اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو [۱]

ایک روایت مزید پیشِ خدمت ہے:

زیاد نے جمعہ کے خطبہ میں زیادہ دیر کر دی تو حجرؓ نماز نماز پکارنے لگے، مگر زیاد نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اپنا خطبہ جاری رکھا۔ وقت کچھ مزید بڑھ گیا تو حجرؓ نے زور سے زمین پر ہاتھ مارا، کنکروں کی مٹھی بھری اپنی جگہ سے اُٹھے اور نماز نماز پکارنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے دوسرے ساتھی بھی سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور مسجد میں ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ زیاد یہ صورتِ حال دیکھ کر خطبہ ختم کر کے منبر سے اُتر آیا اور نماز پڑھا دی۔

زیاد نے ایک بار پھر حوصلہ سے کام لیا اور حجرؓ کے خلاف کوئی کاروائی کرنے سے قبل امیر المومنین معاویہؓ سے رابطہ پیدا کرنا مناسب سمجھا اور سارے حالات لکھ کر امیر المومنین کی خدمت میں بھیج دیئے اور حجرؓ کے خلاف کاروائی کی اجازت طلب کی [۲]

گورنر زیاد نے اپنے خط میں حجرؓ کی سرگرمیوں کی پوری تفصیل لکھ دی تھی حجرؓ کی طرف سے خطباتِ جمعہ میں لگاتار رکاوٹ ڈالنا، تخقیب، خطبہ اور مسجد کی توہین اور خطبہ کے اندر ہی خطبہ کا جواب دینے لگنا، پھر گورنر کو، معاویہؓ کو اور

---

[۱] طبری جلد ۴ باب ۲۰ [۲] ایضاً

عثمانؓ کو نام بنام گالیاں دینا، خطیب پر روڑے پھینکنا، عمرو بن حریث پر بحالتِ خطبہ سنگباری کرنا سارے ہی واقعات لکھ بھیجے تھے۔

حضرت معاویہؓ حضرت حجرؓ کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سُن چکے تھے مگر وہ ان کی صحابیت کے رشتہ سے ان کے خلاف کارروائی سے پرہیز کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سابق گورنر کوفہ اور موجودہ گورنر جناب زیاد کو بھی اُن کے خلاف کارروائی میں یہی رشتہ مانع تھا لیکن اب جب معاملہ حد سے بڑھ گیا تو حضرت معاویہؓ کو اُن کے بارے میں سوچنا ناگزیر ہوگیا۔ مگر اب بھی اُنہوں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور گورنر کو حجرؓ کے خلاف کارروائی کی اجازت دینے کی بجائے بقول علامہ طبری انہیں صرف یہ لکھ بھیجا کہ حجرؓ کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو[1] امیرالمومنین کا خط جب کوفہ پہنچا اور اہلِ کوفہ کو اس خط کے مندرجات کا علم ہوا تو بقول علامہ طبری: حجرؓ کے حمایتی کھُلم کھُلا مرنے مارنے پر تیار ہوگئے[2]

تاہم گورنر زیاد نے امیرالمومنین کے اس خط سے لوگوں کو کوئی غلط تاثر نہیں دیا اور حجرؓ کی گرفتاری کے لئے کسی بڑی کارروائی کے ساتھ ہراس پھیلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ کشیدگی سے دامن بچانے کی پوری کوشش کی اور حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کے عزائم کا نوٹس لئے بغیر ایک اعلیٰ پولیس افسر کو حجرؓ کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں صورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلائے اور اُنہیں امیرالمومنین کے ارادہ سے مطلع کر کے اُنہیں آمادہ کرے کہ وہ اُن کی خدمت میں پیش ہو جائیں اور سمجھا بجھا کر انہیں اپنے ہمراہ لے آئے۔ پولیس افسر جب حجرؓ کے گھر پہنچا تو وہاں حجرؓ کے بہت سے ساتھی پہلے سے ہی جمع تھے۔ پولیس افسر کے ارادہ سے مطلع ہو کر بقول طبری انہوں نے سختی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے پولیس افسر کو اپنے گھر سے نکال دیا کہ چلے جاؤ۔

---

[1] طبری جلد ۴   [2] ایضاً

حُجرؓ کسی قیمت پر بھی زیاد کے پاس نہیں جائیں گے اور ہمیں زیاد کی ہرگز کوئی پرواہ نہیں ہے [1]

حجرؓ اور اصحابِ حجرؓ کی طرف سے یہ بدسلوکی پاکر بھی زیاد نے حوصلہ ترک نہیں کیا اور بقول طبری ہی اس نے پھر یہی کوشش کی کہ معاملہ پُرامن طریقے سے نمٹ جائے۔ چنانچہ اُس نے دوبارہ چند پولیس افسر ایک وفد کی صورت میں بھیجے۔ انہوں نے حجرؓ کے ہاں پہنچ کر بڑی دلسوزی کے ساتھ اُنہیں تلقین کی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کریں اور خواہ مخواہ حالات کو خراب کرنے کی سعی نہ کریں اور وہ حکومت کے افہام و تفہیم کے جذبہ کی ناقدری نہ کریں۔

مگر اصحابِ حجرؓ نے وفد کے ارکان کی بات پر توجہ دینے کے بجائے اُن کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ سختی کی اور اُنہیں دھکے دے کر اپنے ہاں سے نکال دیا [2]

علامہ طبری رقمطراز ہیں:

زیاد کو جب اس تازہ واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ سخت مشتعل ہوا۔ حجرؓ اور حکومت کی اس کشمکش میں بہت سے لوگ (اس کو ایک نیا تماشا سمجھ کر بھی) حجرؓ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے جن میں شہر کے بعض سربرآوردہ لوگوں کے عزیز بھی تھے۔ زیاد کو جب اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اُس نے سربرآوردہ اہلِ شہر کو طلب کیا اور بڑی سختی کے ساتھ اُن سے اس بات پر جواب طلبی کی کہ تم نے یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے کہ تم خود حکومت کے ساتھ ہو اور تمہارے بھائی بند اور بیٹے بھتیجے حجرؓ کے گروہ میں شامل ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ایک ہاتھ میں چھری ہے اور دوسرے میں مرہم پٹی کا سامان ہے۔ خدا کی قسم تمہاری مفسدہ پردازی اور ریاکاری بالکل واضح ہے۔ اب یا تو تم اپنی بے لوثی کا ثبوت مہیا کرو یا پھر میں مجبور ہوں گا کہ تمہارے عزیزوں کو گرفت میں لے کر ان کی ساری کج

---

[1] طبری جلد ۴ باب ۲۰ [2] ایضاً

تمہارے سامنے اپنے ہاتھوں سے دُور کردوں۔

اُنہوں نے زیاد (کے تیور بے ڈھب دیکھے تو اُن) سے مؤدب عرض کیا کہ معاذ اللہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم امیر المومنین معاویہؓ کی اطاعت سے نکل جائیں اور آپ کی مرضی کے خلاف سوچنے لگیں آپ فرمایئے کہ ہم اپنی بے لوثی کا کیا ثبوت مہیا کریں! زیاد نے کہا کہ اس کی بس ایک ہی صورت ہے کہ ابھی جاؤ اور اپنے بھائیوں، بیٹوں کو جو حجرؓ کو اپنے حلقہ میں تحفظ دیئے بیٹھے ہیں اس سے الگ کردو! اس پر وہ لوگ اُٹھے اور گورنر کے کہنے کے مطابق اپنے عزیزوں کو حجرؓ کے حلقہ سے بُلا لیا[1] (اب تک یہ لوگ شاید حکومت اور حجرؓ کے معاملہ کو آنکھ مچولی کا کھیل ہی سمجھتے تھے مگر اب حالات بدل چکے تھے)

علامہ طبری تحریر کرتے ہیں کہ:

زیاد نے اب نرمی کو ترک کر دیا (کہ اس کا وقت گزر چکا تھا) اور سختی کے ساتھ حالات پر قابو حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُس نے پولیس کے افسرِ اعلیٰ کو طلب کر کے حکم دیا کہ جاؤ اور حجرؓ کو بلا لاؤ۔ اور اگر وہ آنے سے انکار کرے تو جس طرح بھی ممکن ہو سکے اُسے لے آؤ۔

یہ حکم پاکر پولیس افسر ایک امدادی دستہ کے ہمراہ حجرؓ کی قیام گاہ پر پہنچا اور اُسے زیاد کا پیغام دیا۔ مگر اصحابِ حجرؓ پھر آڑے آئے اور اُنہوں نے پھر وہی جواب دیا کہ جاؤ زیاد کو کہو جو جی میں آئے کرو ہم تمہاری کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

مگر یہ لوگ آج محض پیغامبر نہیں تھے بلکہ حجرؓ کو لینے کی غرض سے گئے تھے۔ اُنھوں نے بڑھ کر حجرؓ پر ہاتھ ڈالنا چاہا تو اصحابِ حجرؓ نے پولیس کی مزاحمت کی۔

حجرؓ جہاں مقیم تھے وہ مقام مسجد کے بالکل قریب ہی تھا اور حجرؓ کی قیام گاہ کا سارا منظر مسجد سے نظر آتا تھا۔ چنانچہ گورنر زیاد حجرؓ کی گرفتاری کی کیفیت کو منبر پر کھڑے ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

---

[1] طبری جلد ۴

اصحاب حجرؒ نے مزاحمت کی تو پولیس افسر نے لاٹھی چارج کا حکم دیا۔ حجرؒ کے ساتھی ابو عمرطہ نے حجرؒ سے کہا ہم سب میں صرف ایک میرے پاس ہی تلوار ہے اور اس تلوار سے تو پولیس کا مقابلہ ممکن نہیں۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ ہم پولیس کو اپنے میں مصروف رکھتے ہیں اور تم آنکھ بچا کر نکل جاؤ اور اپنی برادری کے لوگوں میں پہنچ کر ان سے تحفظ حاصل کرو۔ اس تجویز کے مطابق حجرؒ تو نکل گئے مگر حجرؒ کے ساتھیوں اور پولیس میں تصادم جاری رہا۔

اس تصادم میں ایک لاٹھی حجرؒ کے ساتھی عمرو بن حمق کے سر پر پڑی اور وہ گر گیا جسے ابو سفیان بن عویمر اور اس کے بعض ساتھیوں نے اٹھا کر کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا۔

ابو عمرطہ پر بھی ایک کاری ضرب پڑی وہ بھی گر گیا اور اسے بھی اس کے دو ساتھی اٹھا کر کہیں لے گئے۔ اس عرصہ میں اصحاب حجرؒ لڑتے بھڑتے ہٹتے ہٹاتے بنی کندہ (حجرؒ کی برادری کے لوگوں) کی طرف بڑھنے لگے۔

پولیس کی طرف سے ان کا تعاقب بڑی سختی کے ساتھ جاری رہا۔ اسی اثناء میں ایک لاٹھی عبداللہ بن خلیفقطائی کو لگی، ایک ضرب عائذ بن حمید تمیمی کے ہاتھ پر پڑی، اس کا ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے جوابی حملہ کر کے ایک پولیس والے سے لاٹھی چھین لی اور لڑنے لگا۔ اس طرح یہ مقابلہ دیر تک جاری رہا۔ آخر یہ لوگ اسی حال میں بنو کندہ کے دروازوں کے راستے باہر نکل گئے۔ وہاں حجرؒ کا خچر کھڑا تھا جسے مضروب ابو عمرطہ اٹھنے کے بعد لے کر آیا تھا۔

اس نے حجرؒ کو خچر پیش کرتے ہوئے کہا، تمہارا برا ہو لو اس خچر پر سوار ہو کر نکل جاؤ۔ تم نے خود کو بھی ہلاک کیا اور ہم کو بھی لے ڈوبے۔

حجرؒ خچر پر سوار ہونے لگے مگر سوار نہ ہو سکے۔ اس پر ابو عمرطہ نے سہارا دے کر انہیں سوار کیا پھر وہ خود بھی اچھل کر اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ مگر ابھی وہ بھاگ نہیں سکا تھا کہ ایک پولیس افسر یزید بن طریف مسلی نے اسے آ لیا اور بڑھ کر ایک لٹھ

رسید کی۔ ابن ظریف نے جوابی حملہ کے طور پر تلوار سونت لی اور پولیس افسر پر بھرپور وار کیا جس سے وہ منہ کے بل گر گیا۔ [1]

خانہ جنگی ابو عمر طہ کی تلوار کا میان سے نکلنا کوفہ میں خانہ جنگی کی طرف پہلا قدم تھا اور فی الواقعہ بھی وہ ایسا ہی ثابت ہوا۔

اس وقت تک حجرؓ اور ابو عمر طہ لڑتے بھڑتے اور گرتے گراتے حجر کے گھر تک پہنچ چکے تھے۔ حجرؓ کی برادری کے لوگوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ فوراً ایک جگہ جمع ہوئے۔

قیس بن فہدان کندی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور جہاں جہاں بھی بنو کندی (حجرؓ کی برادری کے لوگ) موجود تھے وہ سب کے پاس دوڑ دوڑ کر پہنچا اور انہیں جنگ کی تلقین کرتا اور اشتعال دلاتا ہوا نکل گیا۔ وہ ہر طرف ہی یہ اعلان کرتا دوڑتا پھرتا تھا کہ حجرؓ کی قوم کے لوگو! مدافعت بھی کرو اور حملے بھی کرو۔ اٹھو! اور اپنے بھائی حجرؓ کی طرف سے لڑائی میں بھرپور حصہ لو، وہ اعلان کر رہا تھا، جوان مردو! دیکھو تم میں سے کوئی شخص بھی حجرؓ کا ساتھ نہ چھوڑے!

کیا تمہارے اندر کوئی نیزہ باز نہیں ہے؟
کوئی تیر انداز نہیں ہے؟
کوئی تیغ زن نہیں ہے؟
کیا تمہارے اندر کوئی سوار اور کوئی پیادہ نہیں ہے؟
کیا تم میں کوئی شخص ایسا ثابت قدم نہیں کہ وہ میدان سے کبھی نہ ہٹے [2]

علامہ طبری مزید لکھتے ہیں؛

شہر میں حکومت اور حجرؓ کے ساتھیوں کے درمیان جگہ جگہ تصادم جاری تھا۔ مگر بالآخر مقابلہ کی تاب نہ لا کر حجرؓ میدان سے بھاگ نکلے (اور حضرت عثمانؓ کے قاتل اور

---

[1] طبری جلد ۴ باب ۴ [2] ایضاً

باغیوں کے سردار اشتر نخعی کے بھائی عبیداللہ بن حارث کے گھر میں جا چھپے۔

حکومت کو ان کے اس ٹھکانے کی اطلاع ملی تو پولیس ان کے تعاقب میں عبیداللہ کے گھر پہنچی تو عبیداللہ یعنی صاحبِ خانہ اور حجرؓ رات کی تاریکی میں نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور ربیعہ بن ماجد ازری کے مکان میں آ ٹھہرے۔

پولیس ان کے ٹھکانے کا علم پا کر ان کے تعاقب میں پہنچتی تو وہ ہر بار کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے رہے۔ پولیس اور حجرؓ میں یہ آنکھ مچولی کتنے ہی روز تک جاری رہی۔ بالآخر وہ ایک تصادم کے دوران میں گرفتار کر لئے گئے لہ۔

اب دیکھئے مولانا کی مسلّمہ معتبر تاریخی روایات کے مطابق پیشِ نظر واقعات کا ایک ایک مرحلہ، ایک ایک رُخ اور ایک ایک پہلو دعوتِ فکر ہے۔ اس باب میں وارد ہونے والی روایات کی ایک ایک سطر اپنی کہانی آپ کہہ رہی ہے اور اب یہ امر ہمارے قارئین کی صوابدید پر ہی منحصر ہے کہ وہ حضرت حجرؓ کو کہاں تک بے گناہ پاتے ہیں۔ اور حضرتِ معاویہؓ کو کس درجہ کا گنہگار سمجھتے ہیں۔

یا پھر مولانا مودودی صاحب سے بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ اپنے ملک کے صدر بن جائیں تو وہ اپنی مملکت کے ضابطہ نظم وضبط، مملکت کے امن، مملکت کی سلامتی کے خلاف کسی حربی عزم و عمل کے حامل کو کب تک چوم چاٹ کر رکھنے کے حق میں ہوں گے۔

لہ طبری جلد ۴ باب ۴

فصل پنجم

پانچواں حملہ

عدلیہ کی آزادی کا خاتمہ

مولانا مودودی لکھتے ہیں :

قضاء (عدلیہ) کی انتظامیہ سے آزادی کا اصول بھی اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں میں سے تھا۔

خلافتِ راشدہ میں قاضیوں کا تقرر اگرچہ خلفاء ہی کرتے تھے مگر جب کوئی شخص قاضی مقرر ہو جاتا تھا تو اس پر خدا کے خوف اور اس کے اپنے علم وضمیر کے سوا کسی کا دباؤ نہ رہتا تھا۔

کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی عدالت کے کام میں دخل دینے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

حتیٰ کہ قاضی خود خلیفہ کے خلاف فیصلہ دے سکتے تھے اور دیتے تھے۔ مگر جب ملوکیت آئی تو بالآخر یہ اصول بھی ٹوٹنا شروع ہو گیا [۱]

مولانا مودودی صاحب کا عام طریقِ فکر یہی ہے کہ وہ ملوکیت کو حضرت معاویہؓ سے خاص کرتے ہیں اور تاریخ میں آچلنے والی ہر برائی کا تعلق کسی نہ کسی تاویل و تعبیر سے حضرت معاویہؓ کی ذات سے جوڑ دیتے ہیں اور انہیں کوئی نزدیک یا دور کا کوئی بہانہ نہ مل سکے تو ان کا یہ حسنِ ظن حضرت معاویہؓ کے لئے توشۂ آخرت ضرور بن جاتا ہے کہ :

---

[۱] خلافت و ملوکیت صد ۱۶۷ - ۱۶۸

اس تبدیلی کی ابتداء حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہو چکی تھی [۱]

نیز یہ پالیسی حضرت معاویہؓ کے عہد سے ہی شروع ہو گئی تھی [۲]

مولانا اگر کبھی حضرت معاویہؓ کے فرزند جناب یزید کی مذمت بھی کرتے ہیں تو بات کا رُخ حضرت معاویہؓ کی طرف ہی موڑ دیتے ہیں۔ ارشاد ہے:

حضرت معاویہؓ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے اور سیاسی اغراض کے لئے شریعت کی حدیں توڑ ڈالنے کی جو ابتداء ہوئی تھی اُن کے اپنے نامزد کردہ جانشین یزید کے عہد میں وہ بدترین نتائج تک پہنچ گئی [۳]

اس آخری حوالہ میں مولانا نے حضرت معاویہؓ سے اپنی خصوصی محبت کا ثبوت بہم کرتے ہوئے ان کا ذکر جس والہانہ شفقت کے ساتھ شریعت کی حدیں توڑ ڈالنے والا کے الفاظ سے کیا ہے یہ بس مولانا کا ہی حصہ ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں اُن کے دماغ نے جو محنت کی اور اُن کے قلم نے جو چٹخارے بھرے ان کی لذت کچھ مولانا ہی جانتے ہیں۔

یعنی مولانا مودودی حضرت معاویہؓ کو شریعت کی حدیں توڑنے والا نہیں کہتے بلکہ حدیں توڑ ڈالنے والا کہتے ہیں کیونکہ توڑنے اور توڑ ڈالنے میں بہت فرق ہے۔ وہ اگر انہیں صرف حدیں توڑنے والا ہی کہتے تو ان کا دل اطمینان نہ پاتا کیونکہ حدیں توڑنے سے یہ ضروری نہیں کہ حدیں ٹوٹ ہی جائیں، ہو سکتا ہے کہ حدیں نہ بھی ٹوٹیں یا کوئی ٹوٹ جائے اور کوئی بچ جائے۔ کیونکہ توڑنے کا معنیٰ توڑنے کے صرف قصد کو بھی کفایت کرتا ہے۔ مگر توڑ ڈالنے والا کہہ کر انہوں نے اپنے دل کا غبار بھی نکال لیا اور الفاظ میں زہر کی مقدار بھی پوری بھر دی اور خوش ہو گئے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کو شریعت کی حدیں توڑ پھوڑ کر ڈال دینے والا کہا ہے۔

تاہم مولانا نے عدلیہ کی آزادی کے خاتمہ کے عنوان سے ملوکیت کے جس

---

[۱] خلافت و ملوکیت صہ ۱۰۸ [۲] ایضاً صہ ۱۷۲ [۳] ایضاً صہ ۱۷۹

پانچویں زینہ کا ذکر فرمایا ہے تو مولانا کے اسلوبِ فکر کے احترام اور ان کے دل کی آواز کے اجلال میں ان کی خواہش کو پورا کرنے کی خواہش کے باوجود ہم نہیں سمجھ سکے کہ اس عنوان کو حضرت معاویہؓ کے کھاتے میں کیونکر ڈالیں جس سے ہم مولانا کی خوشی کا سامان کر سکیں۔ مولانا کے اس بیان کو صحت سے اگر اتنی بھی نسبت ہوتی جتنی بقول مرزا غالب بُتوں کو کعبہ سے ہے کہ ؎

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بُتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

تو ہم مولانا کو ضرور خوش رکھتے اور یہ بُرائی بھی معاویہؓ کے سر لاد دیتے آخر وہ مولانا کے خانۂ الزام ہی تو ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ عدلیہ کی آزادی کے خاتمہ کا حضرت معاویہؓ سے اتنا بھی تعلق نہیں ہے اور مولانا نے بھی کوئی کہانی ان کے نام نہیں لگائی۔

فصل ششم

چھٹا حملہ

شوُروی حکومت کا خاتمہ

مصنف خلافت وملوکیت رقمطراز ہیں :

اسلامی ریاست کے بنیادی قواعد میں سے ایک اہم قاعدہ یہ تھا کہ حکومت مشورے سے کی جائے اور مشورہ اُن لوگوں سے لیا جائے جن کے علم تقویٰ، دیانت اور اصابت رائے پر اُمت کو اعتماد ہو۔

خلفائے راشدین کے زمانہ میں قوم کے بہترین لوگ اُن کے مشیر تھے جو دین کا علم رکھنے والے اور اپنے علم وضمیر کے مطابق پوری آزادی کے ساتھ بےلاگ رائے دینے والے ہوتے تھے۔

پوری قوم کو ان پر اعتماد تھا کہ وہ حکومت کو کبھی غلط راستے پر نہ جانے دیں گے۔ یہی لوگ اُمت کے اہل الحل والعقد تسلیم کئے جاتے تھے۔ مگر جب ملوکیت کا دَور آیا تو یہ قاعدہ بھی بدل گیا۔ شورٰی کی جگہ شخصی استبداد نے لی، حق شناس اور حق گو اہل علم سے بادشاہ اور بادشاہوں سے یہ لوگ دُور بھاگنے لگے۔

اب بادشاہوں کے مشیر اگر تھے تو اُن کے گورنر قائدین، شاہی خاندان کے اُمراء اور درباری لوگ تھے نہ کہ وہ اہل الرائے اصحاب جن کی قابلیت اور دیانت پر اُمت کو اعتماد تھا لہ

شورٰی کا قاعدہ بلاشبہ اسلامی حکومت کی بنیاد کا رہی ہے اور اس باب میں

لہ خلافت وملوکیت صہ۱۶۸

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کہ پیش آمدہ امور میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کیا کریں اور قرآن کریم نے مسلمانوں کی باہمی مشاورت کو اُن کے ایمان کا نشان بتایا ہے جب ارشاد ہوا کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ کہ ان کے معاملات ہمیشہ باہمی مشورہ سے ہی طے پاتے ہیں۔

اور بلاشبہ یہ بات بھی صحیح ہے کہ جس حکومت کے اندر راعی اور رعایا کے درمیان ربط باہمی کا یہ رشتہ جتنا کمزور ہوگا یا حاکم اور رعایا کے ارباب علم و خبر اور اصحاب فکر و نظر میں جتنا بُعد ہوگا اُسی نسبت سے وہ حکومت اسلامی حکومت کی اصل و بنیاد سے ہٹتی ہوئی سمجھی جائے گی مگر مولانا کو یاد نہیں رہ سکا کہ اگر یہ خرابی اُمت کے اندر کسی ملوکیت کے دخل کا ہی نتیجہ ہے تو بیچارے معاویہؓ کی ملوکیت تو بہت بعد کی بات ہے، اس خرابی کی بنیاد تو مسلمانوں کے ہاں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمام اقتدار سنبھالتے ہی پڑ گئی تھی۔

ہم حضرت علیؓ کے استخفاف کو کسی طرح بھی پسند نہیں کرتے یہ ان کی حکومتی مصلحت اور ان کے حالات کی مجبوری ہو گی مگر مولانا کے استدلال کے مطابق انہوں نے زمام اقتدار کو ہاتھ میں لیتے ہی ان تمام بنیادوں کو مسمار کر دیا تھا جن پر ان کی خلافت سے پہلے خلفائے راشدینؓ کا نظام حکومت استوار تھا۔ اس انتہائی اہم اور انقلابی اقدام کے لئے انہوں نے کسی سے مشورہ طلب نہیں کیا بلکہ ملک کے بہترین اہل الرائے اور اصحاب فکر و نظر کے از خود پیش کردہ مشوروں کو بھی مسترد کر دیا تھا۔

اور جب عین اس مرحلہ پر ہی حضرت علیؓ سے یہ شکایت کی گئی کہ آپ سارے کام خود ہی کر ڈالتے ہیں اور کسی ساتھی سے کوئی مشورہ نہیں کرتے تو خود شیعانِ علیؓ کے بقول بھی حضرت علیؓ کا جواب تھا کہ:

خلافت جب سے مجھے ملی ہے میں نے خدا کی کتاب پر نظر رکھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کی ہے۔ اس لیے مجھے نہ کبھی تم سے رائے
لینے کی ضرورت پڑی اور نہ کوئی ایسا معاملہ ہی پیش آیا جس کا حل مجھے معلوم نہیں
تھا جو میں تم سے مشورہ طلب کرتا[1]

تاہم اگر مولانا کے علم میں ہو تو وہ کسی معتبر تاریخی روایت کا حوالہ دیں جس سے
ظاہر ہو کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فتنہ کے پورے دور میں کبھی کسی سے کوئی
مشورہ طلب کیا ہو یا کسی کے مشورہ پر عمل کیا ہو۔

حضرت علیؓ نے جو اوّل روز سے ہی شورائی نظام سے بے تعلقی پیدا کرلی تھی تو
ہم اس پر انہیں الزام نہیں دیتے کہ مشہور ہے۔ ؎

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

مگر بقول حضرت ابن سیرینؒ اصحابِ رسولؐ اس پہلو سے حضرت علیؓ کی
تصویب نہیں کرتے تھے۔

ایوب سجستانی نے حضرت ابن سیرینؒ سے نقل کیا ہے کہ جب فتنہ کی آگ بھڑکی
تو اس وقت دس ہزار کی تعداد میں اصحابِ رسولؐ موجود تھے۔ مگر حضرت علیؓ کے
اس معمول سے اختلاف کی وجہ سے ان میں سے ایک سو بزرگ بھی حضرت علیؓ کے
ہمراہ اس مرحلہ کے ہنگاموں میں شریک نہیں ہوئے تھے[2]

بات کا یہ رُخ بھی درست ہے کہ حضرت علیؓ کے ہاں بہتر مشیر بھی موجود نہیں تھے
جن کو وہ مشورہ کا اہل سمجھتے بلکہ وہ تو اپنے ساتھیوں کی نافہمی اور بے شعوری سے ہمیشہ نالاں
ہی رہے۔ انھوں نے اگر کبھی کسی کو کسی فکری مہم پر مامور بھی کیا تو وہ ہمیشہ معاملہ کو
بگاڑ کر ہی آیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری ایک بلند پایہ اہل فکر و نظر بزرگ تھے۔
ایک مرحلہ پر حضرت علیؓ نے انہیں اپنا مامور مجاز بھی مقرر کیا مگر حضرت علیؓ کو
ان کی کوتاہ فہمی اور بے تدبیری کی ساتھ ہی ساتھ شکایت موجود رہی۔ جبکہ حضرت
معاویہؓ کے ہاں اہلِ نظر کی بہتات بھی تھی اور وہ معاملات کا تجربہ بھی رکھتے تھے۔

---

[1] نہج البلاغہ حاشیہ نمبر ۲۰۴ [2] المنتقیٰ ص ۵۶۸

شوریٰ نظام کے خاتمہ کا الزام مولانا خواہ جس کسی پر بھی رکھیں اس کے مجاز ہیں، مگر معاویہؓ ضرور اس الزام سے بری ہیں ۔ اُن کے ہاں مضبوط شوریٰ نظام موجود تھا۔ یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حقیقی بھائی حضرت عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حضرت معاویہؓ کے قریبی مشیروں میں شامل تھے۔ اور معاویہؓ ان کی صلاحیتوں کے بہت قائل تھے۔ لیکن اگر مولانا کو اُمت کے اندر شوریٰ نظام کے ختم ہو کر رہ جانے کی شکایت ہے تو اس میں حضرت معاویہؓ کا کوئی دخل نہیں ہے ۔ مولانا کو معاویہؓ کے خلاف ڈگریاں دیتے اپنے توسنِ قلم کو ذرا پچکار لینا چاہیئے تھا کیونکہ معاویہؓ کی ملوکیت تو صرف مولانا کے جادوئے قلم کا ہی کرشمہ ہے ورنہ اُن میں ملوکیت والی کوئی بات موجود نہیں تھی۔

فصل ہفتم

ساتواں حملہ

نسلی اور قومی عصبیتوں کا ظہور

مولانا لکھتے ہیں :

ایک اور عظیم تغیر جو اس دورِ ملوکیت میں رُونما ہوا وہ یہ تھا کہ اس میں قوم، نسل، وطن اور قبیلہ کی وہ تمام جاہلی عصبیتیں پھر سے اُبھر آئیں جنہیں اسلام نے ختم کر کے خدا کا دین قبول کرنے والے تمام انسانوں کو یکساں حقوق کے ساتھ ایک ملت بنایا تھا۔

بنی اُمیہ کی حکومت ابتداء سے ہی ایک عرب حکومت کا رنگ لئے ہوئے تھی جس میں عرب مسلمانوں کے ساتھ غیر عرب نو مسلموں کے مساوی حقوق کا تصور قریب قریب مفقود تھا۔[1]

مولانا نے ملوکیت کے اس مرحلے میں نسلی اور قومی عصبیتوں کے جس فتنہ کا ذکر کیا ہے اس کے بارے میں بڑے اعتماد سے یہ ذکر کیا ہے کہ :

"بنی اُمیہ کی حکومت ابتداء سے ہی ایک عرب حکومت کا رنگ لئے ہوئے تھی"۔

اب یہ بات تو بالکل ظاہر ہی ہے کہ اس حکومت کی ابتداء حضرت معاویہؓ کی حکومت سے ہی ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا نے اس مرحلہ کے جتنے بھی خباثت شمار کئے ہیں اُن سب کے اصل ذمہ دار حضرت معاویہؓ ہی تھے اور آگے چل کر سب لوگ اُنہی کا بویا کاٹ رہے تھے۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۶۹ – ۱۷۰

لیکن مولانا نے معاویہؓ کے سلسلہ میں اس عنوان سے بھی کوئی ثبوت پیش نہیں کیا اگر وہ بنواُمیہ کی نسل میں آنے والے بعد کے خلفاء کی برائیوں کو گن لیتے تو بات غلط نہ تھی مگر اس سے وہ حضرت معاویہؓ کی رُوح کو اذیت نہیں دے سکتے تھے جو اُن کا اصل موضوع تھا اس لئے آنے والے دَور کی ساری بُرائیاں یہ کہہ کر حضرت معاویہؓ کے حساب میں لکھ دیں کہ :

"بنواُمیہ کی حکومت ابتداء ہی سے ایک عرب حکومت کا رنگ لئے ہوئے تھی"۔

قارئین غور فرمائیں کہ حجاج بن یوسف ۷۵ھ ہجری میں عراق کا گورنر مقرر ہوا اپنی تقرری کے آٹھ برس بعد ۸۳ھ ہجری میں اُس نے واسط کے نام سے ایک شہر آباد کیا - پھر مورخین نے اس شہر کے حوالہ سے بہت سی ناکردنی اور ناگفتنی حجاج کے نام نقل کی ہیں - اور مولانا کا کمال ملاحظہ ہو کہ انہوں نے ۸۳ھ کے وہ تمام مبیّنہ خباثت جو واسط میں تخلیق پائے ۶۰ھ میں فوت ہو جانے والے معاویہؓ کے کھاتے میں ڈال دیئے ہیں -

مطلب سعدی یہ ہے کہ گو یہ خباثت کب بھی اُچھلے اور کسی کے عہد میں اُچھلے، کسی کے نام پر اُچھلے مگر یہ انجام تو اس آغاز کا ہی ہے جسے معاویہؓ نے جاری کیا تھا - اللہ اکبر ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

یعنی بھائیوں کا باز جب بھی جھپٹے گا اس کا ہدف دھرم آباد کے مرغ ہی ہونگے ؎

ہر پھر کے دائرہ میں ہی رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

کاش مولانا اس عنوان کے ماتحت حضرت معاویہؓ کا بھی کوئی گناہ درج کر سکتے، یہ بے لذت گناہ تو ان کے لائق نہیں ہے -

ہم کسی بزرگ کو بیکار بحث میں ملوث نہیں کرنا چاہتے لیکن اگر مولانا بھول

نہیں گئے تو ہم ان کی خدمت میں عرض کریں کہ اُنہیں ملوکیت کے اس مرحلہ کی تلاش میں دُور دراز بھاگتے پھرنے کی ضرورت نہیں تھی یہ مال تو ہماری مارکیٹ میں بہت پہلے سے آچکا ہے۔

عبد اللہ بن سبا نے اسی نسلی عصبیت کے نام پر ہی بنو ہاشم کو جمع کیا تھا۔ پھر لشکر میں اس مال کی مانگ بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور بنو اُمیہ کے خلاف بنو ہاشم نے جو ہنگامے کھڑے کئے تھے وہ اُن کے نسبی تفوق کے زعم پر ہی استوار ہوئے تھے۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضؓ کے خاندان کے ایک ایک فرد کو جس اہتمام سے حکومت کے ایوان سے باہر نکال دیا گیا تھا اور اس باب میں جس تشدد کو روا رکھا گیا وہ بھی اس عصبیت کے جادو کا ہی نتیجہ تھا۔ مولانا تو بیکار ہی پچاس برس کا فاصلہ آگے کو طے کر گئے اگر وہ پیچھے دیکھ لیتے تو مرزا غالب کا یہ شعر اُنہیں مجسم صورت میں نظر آجاتا

آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا

اور جہاں تک حضرت معاویہؓ کی ذات کا تعلق ہے اُن کا شام میں رسوخ اور شامیوں کی اُن کی ذات میں بے پناہ کشش ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ معاویہؓ اور اصحابِ معاویہؓ اس فتنہ کی سمیت سے بالکل محفوظ تھے ورنہ معاویہؓ شامیوں کے ہیرو نہ بن جاتے اور شامی اپنے لئے کسی شامی کے بجائے عرب سے آئے ہوئے معاویہؓ کو نہ اختیار کرتے۔ مگر کوئی کیا کہے بقول اقبالؒ سے

سمجھ میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیئے

فصلِ ہشتم

آٹھواں حملہ

خلافت و ملوکیت کے مصنف کی سب سے بڑی مصیبت

قانون کی بالاتری کا خاتمہ

مولانا لکھتے ہیں:

سب سے بڑی مصیبت جو ملوکیت کے دور میں مسلمانوں پر آئی وہ یہ تھی کہ اس دور میں قانون کی بالاتری کا اصول توڑ دیا گیا حالانکہ وہ اسلامی ریاست کے اہم ترین بنیادی اصولوں میں سے تھا۔ اسلام جس بنیاد پر دنیا میں اپنی ریاست قائم کرتا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت سب سے بالا ہے حکومت اور حکمران راعی اور رعیت، بڑے اور چھوٹے، عوام اور خواص سب اُسی کے تابع ہیں کوئی اُس سے آزاد یا مستثنٰے نہیں اور کسی کو اس سے ہٹ کر کام کرنے کا حق نہیں۔

دوست ہو یا دشمن، حربی کافر ہو یا معاہد، مسلم رعیت ہو یا ذمی مسلمان، وفادار ہو یا باغی اور بر سرِ جنگ، غرض جو بھی ہو شریعت میں اُس سے برتاؤ کرنے کا ایک طریقہ مقرر ہے جس سے کسی حال میں تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

خلافتِ راشدہ اپنے پورے دور میں اس قاعدے کی سختی کے ساتھ پابند رہی..... مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو بادشاہوں نے اپنے مفاد اپنی سیاسی اغراض اور خصوصاً اپنی حکومت کے قیام و بقاء کے معاملہ میں

شریعت کی عائد کی ہوئی کسی پابندی کو توڑ ڈالنے اور اس کی باندھی ہوئی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کیا[1]

ملوکیت کے دور میں اس عام اصول شکنی کا ذکر کرنے کے بعد مولانا اپنے تبر کے اصل ہدف حضرت معاویہؓ کی طرف روئے سخن موڑتے ہیں فرمایا۔

یہ پالیسی حضرت معاویہؓ کے عہد میں ہی شروع ہوئی تھی[1]

اس کے بعد مولانا حضرت معاویہؓ کے خلاف فرد قرار دادِ جرم ترتیب دیتے ہیں اور ان کی دھاندلیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

- امام زہری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدینؓ کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے نہ مسلمان کافر کا۔

حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا[2]

- حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ دیت کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا۔ سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی، مگر حضرت معاویہؓ نے اس کو نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی[3]
- ایک مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے۔ حتیٰ کہ مسجد نبویؐ میں منبرِ رسولؐ پر عین روضۂ نبویؐ کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں[4]
- مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب وسنت کی رو سے پورے

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ ۱۷۳-۱۷۲ [2] ایضاً صـ ۱۷۳، اسطر ۱۴
[3] ایضاً صـ ۱۷۳ [4] ایضاً صـ ۱۷۴-۱۷۳

مالِ غنیمت کا پانچواں حصّہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیئے اور باقی چار حصّے اُس فوج میں تقسیم ہونے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو۔

حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا اُن کے لئے الگ نکال لیا جائے پھر باقی مال شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم کیا جائے [۱]

- زیاد بن سمیّہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں اُنہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدہ کی خلاف ورزی کی تھی۔

زیاد طائف کی لونڈی سمیّہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں حضرت معاویہؓ کے والد جناب ابوسفیانؓ نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اس سے وہ حاملہ ہوئی حضرت ابوسفیانؓ نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد اُنہی کے نطفہ سے ہے۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں وہ (یعنی زیاد) آپ کا زبردست حامی تھا ..... حضرت معاویہؓ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد اُنہی کا ولدالحرام ہے۔ پھر اسی بنیاد پر اُسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دیدیا۔

یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا۔ کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں [۲]

- حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کاروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا [۳]

---

[۱] خلافت و ملوکیت صہ۱۷۴ [۲] ایضاً صہ۱۷۵ [۳] ایضاً صہ۱۷۶

- اس سے بڑھ کر ظالمانہ افعال بسر بن ابی ارطاۃ نے کئے جسے حضرت معاویہؓ نے پہلے حجاز و یمن کو حضرت علیؓ کے قبضہ سے نکالنے کے لئے بھیجا اور پھر ہمدان پر قبضہ کرنے کے لئے مامور کیا تھا [۱]
- سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا اسی (یعنی معاویہؓ کے) دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا [۲]
- ایسا ہی وحشیانہ سلوک مصر میں محمد بن ابی بکرؓ کے ساتھ ہوا جو وہاں حضرت علیؓ کے گورنر تھے۔

حضرت معاویہؓ کا مصر پر جب قبضہ ہوا تو انہیں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اور پھر ان کی لاش گدھے کی کھال میں رکھ کر جلا دی گئی [۳]

اس تحریر میں مولانا کے مالِ قلم نے حضرت معاویہؓ کے جسدِ آبرو کو جو ڈنک دیئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک محبوب صحابی کے حق میں جو بیباک انداز نگارش اختیار کیا ہے وہ کسی بھی مسلمان کہلانے والے کے لئے سامانِ ندامت ہے۔

دیکھئے مولانا کس نشیلے انداز میں حضرت معاویہؓ کو معاہد کی نصف دیت کھا جانے والا اور مالِ غنیمت میں سے سونے چاندی کی پوری مقدار الگ کر کے ہضم کر جانے والا، اسلام کے اندر وحشیانہ طرز حیات کا موجد، گندہ ذہن اور زمانہ جاہلیت کے مکروہ کاروبار سے رغبت رکھنے والا شخص کہتے ہیں مگر ہم اپنی جوابی گزارشات میں اس معاملہ کو حضرت معاویہؓ اور مولانا مودودی کے اللہ کے سپرد کرتے ہوئے اپنی بات کو مولانا کے بیان کردہ نکات تک ہی محدود رکھیں گے، انشاء اللہ۔

کافر اور وراثت مولانا نے اپنے بیان میں بڑے اعتماد سے حضرت زہری کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی ہے کہ:

---

[۱] خلافت و ملوکیت صـ۱۷۴ [۲] ایضاً صـ۱۷۵

حضرت معاویہؓ نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا تھا مگر کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا۔

مگر مولانا نے حضرت معاویہؓ کے کسی ایسے حکم یا اُن کے حکم سے تخلیق پانے والے ایسے کسی واقعہ کا پتہ نہیں دیا۔

اس الزام کے غلط ہونے کی یہی ایک دلیل کافی ہے کہ مولانا نے حضرت زہری کا نام لیکر اپنے لئے ذمہ داری سے بچنے کی راہ نکال لی ہے اور اس طرح اپنے بحث کا بوجھ حضرت زہری کی طرف منتقل کر دیا ہے ورنہ اگر کوئی ایسا واقعہ موجود ہوتا تو مولانا اُسے ضرور تحریر کرتے اور زہری کا اُدھارنہ کرتے۔

پھر جب یہ بات ہی یادرہ ہوا ہے تو اس پر کسی بحث کی کیا ضرورت ہے!

معاہد کی دیت

مولانا نے حافظ ابن کثیرؒ کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے مسلمان اور معاہد کی دیت کے بارے میں سنّت کو بدل دیا۔ مسلمان اور معاہد کی دیت برابر برابر تھی مگر معاویہؓ معاہد کی دیت اُسے نصف دیتے تھے اور نصف خود رکھ لیتے تھے۔

مولانا نے یہ بات اگر اپنے علم و تحقیق کے ساتھ لکھی ہے تو ایک بہتان باندھا ہے اور ایک خلافِ واقعہ بات کہی ہے۔

اور اگر بعض راویوں کو بہانہ بنا کر حضرت معاویہؓ پر حملہ کیا ہے تو بیان کی ضرورت ہے جبکہ یہ بات نہایت درجہ غلط بلکہ اغلط ہے۔

کیونکہ نہ تو یہ بات ہی صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے وقت سے ہی مسلمان اور معاہد کی دیت برابر چلی آرہی تھی اور نہ یہ بات ہی صحیح ہے کہ اس سنّت کو معاویہؓ نے بدل دیا۔

اور اگر یہ کوئی سنّت ہی تھی تو مولانا کے راوی کے بقول ہی حضرت معاویہؓ آدھی دیت نہیں وصول کرتے تھے بلکہ قاتل سے تو پوری دیت ہی وصول کرتے تھے مگر مقتول کے وارثوں کو آدھی دیتے تھے اور آدھی اپنی ذات کے لئے رکھ لیتے تھے۔

راوی نے اگر یہ جھوٹ کہتے شرم نہیں کی تھی تو مولانا کو ہی یہ روایت نقل کرتے

وقت اپنے شعور سے مشورہ کر لینا چاہیئے تھا۔ اگر وہ اپنے شعور سے اس روایت کی تصدیق چاہتے تو وہ بھی کان پر ہاتھ رکھتا۔ مگر کوئی کیا کہے کہ ضرورت آدمی سے شعور کی ترازو بھی چھین لیتی ہے۔

مولانا کا یہ دعویٰ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہمارے اہل سیاست نے پچھلے دنوں گجرات کے مشہور جاگیردار، اربوں روپے کے مالک بہت سے کارخانوں ملوں اور اداروں کے مالک چوہدری ظہور الٰہی کے خلاف کسی کی بھینس چرا لینے لینے کا مقدمہ درج کرا دیا تھا۔ بلکہ خود مولانا کے اپنے ہی گھر میں اُن کے حقیقی ہم زلف تحریک استقلال پاکستان کے سربراہ جناب اصغر خاں کے خلاف ساہیوال میں اپنے ہی جلوس کی دھکم پیل سے فائدہ اٹھاتے، کسی کی کلائی سے گھڑی اتار لینے کی رپٹ درج کرا دی تھی۔ آدھی دیت کا اپنی ذات کے لئے رکھ لینا حضرت معاویہؓ پر اتنا بڑا بہتان ہے کہ اس پر یقین لانے کے لئے آدمی کو دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف بننے کی ضرورت ہے۔

معاویہؓ کوئی پولیس ٹاؤٹ نہیں تھے جو رشوت کی دلالی کے بطور آدھی رقم تھانیدار کو دیتے ہیں اور آدھی خود ہضم کر جاتے ہیں۔ وہ ایک ملک کے والی تھے، ایک سلطنت کے سلطان تھے، ایک مملکت کے بادشاہ تھے، ایک قوم کے امیر تھے، ایک اُمت کے خلیفہ تھے ان کی طرف ایسی لغویت منسوب کرتے ہوئے تو قلم بھی شرماتا ہے۔ پھر آدمی ایسی سنگینی کیوں اختیار کرے۔

صدیقہ طاہرہ اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر کچھ ناخلف زبانیں دراز ہوئیں اور پھر چند مومنین کے قدم بھی ڈگمگا گئے۔ پروپیگنڈا بڑی موثر شے ہے اور بعض اوقات تو اس کی کوکھ سے سنگین خطرناکیاں اُچھل آتی ہیں اس مرحلہ پر کچھ لوگ منافقین کے بہکاوے میں آ گئے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے اور پھر فرش کی اس انہونی سے عرش بھی چیخ اٹھا اور اللہ تعالیٰ نے کم نصیبوں کی اس کوتاہ اندیشی پر حیرت بھری سرزنش نازل کی کہ:

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ٥ دلوں کہ حد ہو گئی تم کیسے لوگ ہو جب تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی اور ابو بکرؓ کی بیٹی کے متعلق ایسی بات سُنی تھی تو تم نے فوراً کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ تو صریح بکواس ہے۔ مگر کیا کیا جائے یہ دنیا ہے جب اس دنیا میں وہ ہو گیا تھا تو اب یہ بھی ہو سکتا ہے اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

حیرت ہے حضرت معاویہؓ جو سب کو دیتے ہی تھے کسی سے لیتے نہیں تھے مولانا اُن کو بھی کوتوں کھدردں سے نکال ہوئی کسی مُردہ روایت کے ساتھ خائن ثابت کرنے پر لبضد ہیں۔ ہم پورے اعتماد سے سمجھتے ہیں کہ مولانا اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ دیت کی برابری کے عنوان سے خود محدثین میں بھی اتفاق نہیں ہے۔ اور حد یہ ہے کہ چہار آئمہ بھی اس باب میں کسی ایک فیصلہ پر متفق نہیں رہیں۔ آئمہ میں سے صرف امام ابو حنیفہؒ نے مسلم اور معاہد کی دیت کے برابر رکھنے کا خیال ظاہر کیا ہے اور امام زہری کی رائے کو بہانہ بنا کر مولانا نے اس کو سنّت بنا دیا ہے ورنہ یہ سنّت نہیں تھی۔ دیت کا فیصلہ امام کے اختیار میں ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے خلفائے راشدین تک سب کے ہاں یہی اصول کارفرما تھا اور وہ اس باب میں ہمیشہ اپنی صوابدید سے ہی کوئی فیصلہ کرتے تھے۔

حضرت معاویہؓ بھی ایک امام تھے، ایک مجتہد تھے، اُنہیں بھی اس باب میں پورا اختیار حاصل تھا اور بلا شبہ اُن کے عہد میں بھی بعض اوقات ایسے واقعات گزرے ہیں جب مقتول کے ورثاء کو نصف دیت ادا کی گئی مگر یہ صورت کسی تعزیزی ضرورت یا کسی دوسری مصلحت سے ہوتی تھی اس میں حضرت معاویہؓ کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا بلکہ جیسا کہ ذکر ہوا ہے جب کبھی ایسا واقعہ عمل میں آتا تو فجعل فی بیت المال نصفها و اعطیٰ اهل المقتول نصفها[1]

[1] بدایۃ المجتہد

یعنی حضرت معاویہؓ آدھی رقم بیت المال میں داخل کر دیتے تھے اور آدھی مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیتے تھے۔ یہ حضرت معاویہؓ کی کوئی چوری نہیں ہے جو مولانا نے پکڑ لی ہے۔

حضرت علیؓ پر سب و شتم

مولانا نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں وہ خود اور اُن کے حکم سے اُن کے عمال جمعہ کے خطبوں میں منبرِ رسول سے حضرت علیؓ کو کھلی گالیاں دیتے تھے اور اُن پر لعنت کرتے تھے۔

پھر اس کے بعد تھوڑا سا وعظ فرمایا ہے کہ:

کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو در کنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں بدزبانی کو بہانہ بنا کر مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر جو اپنے دل کا غبار ہلکا کیا ہے اور جس لب بھرے اسلوب میں انہیں شریعت کا مخالف اخلاق کا دشمن خطبہ جیسے پاک عمل کے اندر گندگی اُچھالنے اور اچھلوانے والا اور گھناؤنی حرکات کا مرتکب قرار دیا ہے ہمیں اس سے بحث نہیں کیونکہ ان کی خوشی اسی میں تھی مگر ہم اس بات پر ضرور یقین رکھتے ہیں کہ مولانا کو اس بات کا خوب ہی علم ہے کہ سبِ علیؓ کے سلسلہ کی تمام روایات صرف منتقل کے اُن سبّاب اور شتّام لوگوں کے لئے ہی گھڑی گئی ہیں جن کو معاویہؓ اور معاویہؓ کے خانوادہ کے حق میں گالیاں تصنیف کرنے اور اُن پر دولتیاں جھاڑنے کے لئے کوئی تاریخی سہارا مطلوب تھا اور یہ روایات کذاب وضاع اور مفتری راویوں نے مولانا کے لئے نہیں بلکہ اپنی گستاخ ذریت اور اپنے رفض گزیدہ ناخلف بچوں میں سبّابیت کے ناپاک اور متعفن پیشے کو جاری

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۷۴

رکھنے کے لئے ایک ہتھیار مہیا کیا ہے تاکہ اُنہیں اپنی کینہ توزی، اخلاق سوزی، زبان کی درندگی اور قلم کی سفاکی کے لئے وجہِ جواز مہیا رہے۔ ورنہ حقیقتِ حال یہی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دامن ایسے تمام ہی مکروہات سے پاک ہے اور راویوں کی دھاندلی سے الگ رہ کر جن لوگوں نے بھی حضرت معاویہؓ کی زندگی کو انصاف کی ترازو میں اتارا ہے وہ معاویہؓ کو ان تمام خساستوں سے یکسر پاک ہی بیان کرتے ہیں۔ مولانا نے ان واہی روایات کا سہارا محض اپنے موقف کی ضرورت سے ہی اختیار کیا ہے ورنہ وہ جانتے ہیں کہ ان روایات کے بارے میں اُمت کے مُنصف مزاج اہلِ علم و خبر کا نظریہ بالکل دوسرا ہے۔

لیکن اگر مولانا ان روایات کو اس مفروضہ کی بنا پر صحیح قرار دینے پر بضد ہیں کہ اگر ایسی روایات کو غلط کہا گیا تو تاریخ سے اعتماد ہی اُٹھ جائے گا اور پھر تو ہر روایت کو غلط کہہ کر مسترد کیا جا سکتا ہے تو ہم نہایت درجہ قلق اور دل کی انتہائی گھٹن کے ساتھ حضرت مولانا مودودی صاحب کی خدمت میں عرض کرینگے کہ اگر یہ لغو اور بیہودہ روایات کسی درجہ میں بھی صحت کو پہنچ سکتی ہیں تو پھر ان تاریخی روایات کی روشنی میں اس مکروہ کارروائی کی ابتداء حضرت معاویہؓ سے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کی طرف سے ہوئی تھی اور اگر بعد ازاں حضرت معاویہؓ نے بھی اس صنعت کو اپنا لیا ہو تو اُنہوں نے یہ سبق حضرت علیؓ سے ہی سیکھا ہے۔

مولانا مودودی صاحب کے مسلّمہ محدّث، مفسرّ، فقیہ اور مورّخ حضرت علامہ طبری رقمطراز ہیں:

حضرت علیؓ کا قاعدہ تھا کہ جب وہ صبح کی نماز پڑھتے تو اُس میں قنوت پڑھتے تھے اور یوں کہتے تھے:

اے اللہ! معاویہؓ، عمروؓ بن العاص، ابوالاعور السلمی، حبیبؓ بن مسلمہ، عبدالرحمٰن بن مخلد، ضحاک بن قیس اور ولید بن عتبہ پر لعنت نازل کر۔ اور پھر جب معاویہؓ کو حضرت علیؓ کے اس معمول کی خبر ملی تو اُنہوں نے بھی (صبح کی نماز میں) قنوت شروع

کردی اور وہ بھی حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، اشتر اور حسنؓ اور حسینؓ پر لعنت بھیجنے لگے[1]

مزید ملاحظہ فرمائیے:

حضرت علیؓ کے حامی جب حکمین کا فیصلہ سن کر واپس آئے۔ حضرت علیؓ کے سامنے وہاں کے واقعات بیان کئے تو ان کی باتوں کو سن کر امیرالمومنین علیؓ نماز کے اندر قنوت میں یہ دعا کرنے لگے:

اللھم اللعن معاویۃ وعمرو وحبیبا وعبدالرحمن بن مخلد والضحاک بن قیس والولید والاعور[2]

(اس کا ترجمہ وہی ہے جو طبری کی روایت میں گذرا)

ابن خلدون مزید لکھتے ہیں:

معاویہؓ نے جب یہ خبر سُنی تو انہوں نے بھی علیؓ، ابن عباسؓ، حسنؓ، حسینؓ اور اشتر پر لعنت کرنا شروع کر دیا۔

اب یہ مولانا کا ہی حوصلہ ہے کہ وہ ان بیہودہ، لغو اور واہی روایات کی صحت پر پختہ ایمان رکھیں اور انہیں ان روایات کو مسترد کرنے پر تاریخ کی آبرو ختم ہو جانے کا خطرہ درپیش ہو، اصحاب رسولؐ کی آبرو بیشک چھلنی میں پڑ جائے۔ چھاج سے بندھ جائے مگر تاریخ کے کذّاب اور مفتری راوی پر حرف نہ آنے پائے۔

مولانا تو خیر اپنے مصالح سے بات نہیں سنیں گے مگر حضرت حافظ ابن کثیرؒ جن کے حوالے سے مولانا نے دبیت کے معاملہ میں حضرت معاویہؓ پر حملہ کرنے میں مدد حاصل کی ہے اور جن کے بارے میں مولانا بلند خاص بیان کرتے ہیں کہ:

"وہ صحیح اور ناقص روایات میں تمیز کرتے ہیں"[3]

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ ان ھذا لا یصح کہ یہ روایات صحیح نہیں ہیں۔

حضرت ابن خلدون ان بیہودہ روایات کو اپنے ہاں نقل کر چکنے کے بعد ان پر

---

[1] طبری جلد ۳ حصہ دوم باب ۵ صہ ۳۹۹ [2] ابن خلدون [3] خلافت و ملوکیت صہ ۳۱۵ سطر ۱۱

محاکمہ لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ممکن ہے حضرت علیؓ نے اپنے مخالف گروہ کے حق میں بددعا کی ہو مگر وہ ضرور لعن کے بغیر ہو گی کیونکہ یہ امر امیرالمومنین کی شان کے منافی ہے کہ وہ عورتوں کی طرح اپنے حریف کو کوسنے دینے لگیں۔

ابن خلدون مزید لکھتے ہیں:

جہاں تک میں نے تفحص کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہ امیرالمومنین علیؓ نے ہی معاویہؓ پر لعن کیا ہے اور نہ حضرت معاویہؓ نے ہی علیؓ کے خلاف ایسی لغویت سے اپنی زبان کو آلودہ کیا ہے۔ یہ سب واہیات باتیں ہیں اور کذاب راویوں کے دماغ کی صنعت ہیں۔

ابن خلدون کے اس محاکمہ کے بعد شاید اس عنوان سے مزید کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں رہ گئی ہے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم

مولانا لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے مالِ غنیمت کے سلسلہ میں بھی قانونِ شریعت کی خلاف ورزی کی جبکہ وہ مالِ غنیمت میں سے سونا چاندی اپنے لئے نکال لیتے تھے اور باقی ماندہ مال فوج میں تقسیم کرتے تھے۔

جب کوئی شخص سینہ پر ہاتھ مار کر انصاف کرنے سے انکار کردے تو اس کا کوئی حل نہیں ہے، مگر مولانا کو حضرت معاویہؓ پر اس خیانت کا الزام رکھنے کے لئے بار بار سوچنا چاہیئے تھا۔

افسوس ہے کہ مولانا مودودی جب حضرت معاویہؓ کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں تو انہیں حضرت معاویہؓ کے مطلع پر گھنیرے بادلوں اور تاریک گھٹاؤں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

تعجب ہے کہ معاویہؓ کے ہاں وہ لوگ بھی آتے تھے جو ان کو تلوار اور لاٹھی بھی دکھاتے تھے، حضرت معاویہؓ سے کھاتے تھے اور ان سے تجاوز تک پہنچ جاتے تھے۔

اُن سے وظیفے کھاتے تھے اور پھر ان پر گرفت کرتے تھے، اُن سے دُو بدُو جھگڑتے اور رُد و در رُد بحث کرتے تھے۔ ان میں حضرت علیؓ کے برادرِ حقیقی حضرت عقیلؓ بھی تھے جو حضرت معاویہؓ کے مشیرِ خاص بھی تھے۔ مگر یہ بات مولانا کے راوی کے سوائے کسی کو معلوم نہ ہو سکی کہ معاویہؓ مالِ غنیمت میں سے سونا چاندی پورے کا پورا اُڑا لیتے ہیں پھر مولانا کا راوی اتنا حاضر دماغ واقع ہوا ہے کہ معاویہؓ کی طرف سے نقل کرتا ہے:

حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے سونا چاندی اُن کے لئے الگ نکال لیا جائے پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے [۱]

کوئی پوچھے کہ اتنی بڑی خیانت کے بعد بھی مال کو شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کرنے کی کوئی صورت باقی رہ گئی تھی۔ یہ چاندی سونا کس شرعی قاعدے کے مطابق نکالا گیا تھا جو باقی ماندہ شرعی قاعدہ کی تکمیل باقی تھی۔

اگر مالِ غنیمت صرف سونے چاندی پر ہی مشتمل ہو تو اس وقت حضرت معاویہؓ کیا صورت اختیار کرتے تھے!

اور پھر وہ لوگ جو اپنی جان مار کر سونا چاندی حاصل کر کے لاتے تھے وہ خود صرف کھجوروں کے ٹوکرے اور جَو کے ایک مٹکے پر کیونکر خوش ہو جاتے تھے؟ جبکہ مالِ غنیمت کے باب میں بقول حضرت ابن تیمیہؒ حضرت معاویہؓ کی دیانت کا یہ حال تھا کہ اس کی مثال ان کے بعد شاید کہیں کم ہی ملے۔

حضرت عطیہ بن قیس راوی ہیں، میں نے حضرت معاویہؓ کا ایک خطبہ اپنے کانوں سُنا، فرما رہے تھے لوگو!

تنخواہیں تقسیم کرنے کے بعد جو کچھ بیت المال میں بچ گیا ہے اب میں وہ تقسیم کرنا چاہتا ہوں اور اگر اگلے سال بھی حسبِ دستور کچھ مال بچ سکا اور میں موجود ہوا تو اسے بھی تمہارے درمیان تقسیم کر دوں گا ورنہ مجھے معتوب نہ کرنا، اس لئے کہ یہ مال میرا نہیں ہے بلکہ خدا کا ہے اور اسی نے تمہیں عطا کیا ہے [۲]

---

[۱] خلافت و ملوکیت، ص ۱۷۳ [۲] المنتقی اص ۵٦٧

اور پھر انہوں نے اپنے رب کے حضور حاضری بھرنے سے پہلے اپنا نصف مال بیت المال میں داخل کرنے کی وصیت فرمائی اور پھر کوئی چاندی سونا ان کے ہاں سے برآمد نہ ہو سکا جسے وہ مالِ غنیمت سے چھانٹ نکال کر اپنے ہاں جمع کرتے رہے تھے۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مال کی تقسیم میں تقسیم کے عام قاعدے سے ہٹ کر اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت میں اپنی صوابدید سے تقسیم اور تصرّف کر سکے جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی دستور تھا اور خلفائے راشدینؓ کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ حنین کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا مالِ غنیمت اپنی اسی صوابدید کے ماتحت ہی تقسیم کیا تھا اور اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت اسی میں تھی۔

ایسے ہی بہت سی مثالیں خلفائے راشدین کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جب اُنہوں نے بعض اوقات بعض لوگوں کو اُن کے حصہ سے بڑھ کر دیا۔ بعض اوقات ایسی رقوم جو تقسیم کے عام معمول سے ہٹ کر مجاہدین کو دی جاتیں، ان کی بعض خاص خدمات کا انعام ہوتی تھیں چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مصارف کے مدِّنظر مالِ غنیمت میں سے خمس کے علاوہ کچھ رقم اپنی صوابدید سے خرچ کرنے کے لئے الگ بھی رکھا کرتے تھے [۱]

اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ امام بعض خاص ضرورتوں کے لئے تقسیم کئے جانے والے اموال سے کچھ اموال الگ بھی محفوظ کر سکتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرحلہ پر کسی ایسی ہی مصلحت سے بصرہ کا سارا خزانہ ہی اپنے فوجیوں میں تقسیم کر دیا تھا حالانکہ وہ مالِ غنیمت بھی نہ تھا۔ اور وہ اس امر کو قانون شکنی بھی نہیں سمجھتے تھے کیونکہ اُن کے نزدیک اپنی مملکت کی مصلحت سے مملکت کا امیر تقسیم میں ہر قسم کی کمی بیشی کا مجاز ہے۔ بشرطیکہ اُس کے اس عمل سے حقداروں کا حق متاثر نہ ہو اور کسی کو اس کے حق سے کم نہ ملا ہو۔

ہمیں اس بات کا علم ہے کہ مولانا ان واقعات کو جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ

---

[۱] سیرت النبیؐ شبلی نعمانی حصہ اوّل صہ ۲۴۹

یہ استثنائی صورتیں ہیں جو قانون کا حصہ ہیں، قانون شکنی میں محسوب نہیں ہوتیں، مگر مجبوری یہ ہے کہ یہ افعال اگر کسی اور سے سرزد ہوں تو وہ یقیناً قانون شکنی نہیں ہوتے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی امر حضرت معاویہؓ سے ثابت ہوگا تو اُسے قانون شکنی ہی کہا جائے گا کیونکہ وہ حضرت معاویہؓ سے وقوع میں آیا ہے اور معاویہ کے بارے میں مولانا کا یہی فتویٰ ہے۔

"تاہم اگر مولانا بھول نہیں گئے تو تقسیم میں اس استثنا کی قانونی حیثیت کی تصدیق پوری صراحت سے حضرت ابوحنیفہؒ سے بھی وارد ہو چکی ہے اور دوسرے آئمہ بھی اس کے قائل ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ ہے کہ کسی خاص ضرورت سے مجاہدین میں سے بعض کے ساتھ تقسیم کے وقت ترجیحی سلوک کیا جاسکتا ہے۔

امام صاحب کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار جنگ کے بعد مال غنیمت کی تقسیم کے وقت خمس الگ کر کے باقی مال میں سے ¼ حصہ ناگزیر اور ہنگامی ضرورتوں کے لئے خاص کر لیا تھا اور پھر یہ بعض مجاہدین کو بطور انعام خاص تقسیم کر دیا۔

اس سلسلہ میں بحوالہ مسلم شریف مزید بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجاہد حضرت سلمہ بن اکوع کو جو پیدل تھے ان کے ایک غیر معمولی جنگی کارنامہ پر خوش ہو کر انہیں ایک پیدل اور ایک سوار کا حصہ دیا تھا۔ ایسے ہی حضرت امام شافعیؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ خمس کے ⅕ یعنی کُل مال کے ۱/۲۵ میں سے امام جسے چاہے حسب حالات و ضرورت اپنی صوابدید سے تقسیم کر سکتا ہے[1]

پس حضرت معاویہؓ سے بھی اگر کوئی ایسا واقعہ ثابت ہے تو وہ اس کا حق رکھتے تھے اور جہاں تک ان کے بارے میں یہ کہنے کا تعلق ہے کہ وہ مال غنیمت میں سے چاندی سونا اپنے لئے الگ رکھوا لیتے تھے تو یہ جھوٹ ہے اور محض جھوٹ ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

---

[1] المنتقیٰ صفحہ ۵۲۲

زیاد بن ابی سفیان کا استلحاق

مولانا مودودی صاحب کو حضرت معاویہؓ سے جس درجہ عقیدت اور جو بے تابو محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مولانا کی اُخروی نجات کا وسیلہ بنائے۔ معاویہؓ، اصحابِ معاویہؓ اور معاویہؓ کے خاندان کے کسی بھی فرد کا نام آتے ہی ان کا قلم لہرانے لگتا ہے اور حرف حرف پر بیل بوٹے بناتا چلا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے حضرت کے قلم میں معاویہؓ کے لئے کس طرح بچھو کے ڈنک سے بھی زیادہ تیز ڈنک اور آپ کے قلم کی روشنائی میں سانپ کی لِس سے بھی کہیں بڑھ کر سمیت موجود ہے۔ دیکھئے مولانا اپنے ممدوح کے بارے میں تعریف و تضحیک کی کتنی بڑی مقدار اور توہین و تمسخر بھرے کس انتہائی زہریلے اسلوب میں رقمطراز ہیں:

اُنہوں نے اپنے والد ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں [۱]

ذرا زناکاری اور والد ماجد کی ترکیبوں کے باہمی ربط کو ملاحظہ فرمایئے اور مولانا کے انتخابِ الفاظ کی داد دیجئے کہ کس مزے سے والد ماجد کے ساتھ زناکاری کا ذکر کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں مولانا نے حضرت ابو سفیانؓ کے منہ سے تو صرف یہی الفاظ کہلوائے ہیں کہ "زیاد اُنہی کے نطفہ سے ہے" مگر یہ اُنہی کا نطفہ جب حضرت معاویہؓ کی برادری کا مظہر بننے لگا تو مولانا کا قلم چوکڑیاں بھرنے لگ گیا، فرماتے ہیں کہ معاویہؓ نے یہ ثابت کر دیا کہ زیاد اُنہی (یعنی ابو سفیانؓ) کا ولد الحرام ہے۔ حضرت معاویہؓ کی طرف سے زیاد کے استلحاق (یعنی زیاد کو اپنے نسب میں شریک کرنے) پر مولانا کے غضب آلود تمسخر کے اجلال و احترام میں اپنی گزارشات پیش کرنے سے قبل ہم اپنے قارئین کے سامنے صحیحین (بخاری اور مسلم) کی ایک حدیث پیش کرتے ہیں:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ (حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فاتح ایران کے بھائی) عُتبہ بن ابی وقاص نے اپنے انتقال کے وقت اپنے بھائی

---

[۱] خلافت و ملوکیت صہ ۱۷۵

(حضرت سعدؓ) کو وصیت کی کہ زمعہ (یعنی حضرت اُم المومنین سودہؓ کے والد) کی لونڈی کا بیٹا میرا بیٹا ہے اُس کو حاصل کر لینا۔

فتح مکّہ کے موقع پر سعدؓ نے اُسے دیکھا تو اُسے اپنے قبضہ میں لے لیا اور کہا کہ یہ میرا بھتیجا ہے اور میرا حق ہے کیونکہ میرے بھائی (عُتبہ) نے مجھے مرتے وقت بتایا تھا کہ یہ میرا بیٹا ہے اور مجھے اس کو حاصل کر لینے کی تاکید کی تھی مگر زمعہ کا بیٹا (یعنی حضرت سودہؓ کا بھائی) عبد مزاحم ہوا کہ تم اس کو نہیں لے سکتے کیونکہ یہ میرے باپ کی لونڈی سے ہے اور میرے باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے اور میرا بھائی ہے۔

بات بڑھی تو یہ قضیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش ہوا۔ آپ نے فریقین کے بیانات کو سُن کر فیصلہ کیا کہ اس کو زمعہ کا بیٹا عبد ہی لے گا۔ آپ نے عبد سے کہا یہ تیرا حق ہے کیونکہ یہ تیرے باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے اور زانی کے لئے پتھر ہیں [1]۔

اس حدیث پاک کے مضمون سے ذیل کے چند امور بالکل واضح ہیں:

۱۔ زمانہ کفر کی غیر قانونی مصاحبت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچے زمانۂ اسلام میں بھی حقیقی باپ کے بچوں کے بطور قبول کئے جائیں گے اور زمانۂ کفر کے کسی جُرم کی پاداش میں اُس کے ماں باپ کسی عقوبت کا محل نہیں بنیں گے ہاں اگر ایسا فعل زمانۂ اسلام سے تعلق رکھتا ہوگا تو اس فعل حرام کے مرتکبین کو سنگسار کیا جائے گا۔ تاہم بچہ صاحبِ نطفہ سے ہی منسوب ہوگا۔

۲۔ اگر بچہ اپنے حقیقی باپ یعنی صاحبِ نطفہ کے بستر پر پیدا نہیں ہوا بلکہ کسی غیر باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے تو گو اس کا حقیقی باپ موجود بھی ہو مگر وہ بچہ بستر والے کے ہی سپرد ہوگا۔

۳۔ اگر بستر والا غیر باپ یا اس کا کوئی وارث بچے کا دعویٰ نہ کرے تو وہ بچہ

---

[1] بخاری ومسلم۔ موطا امام مالکؒ کتاب الاقضیہ باب ۲۱

آزاد ہے۔ وہ خواہ اپنے حقیقی باپ سے منسوب ہو کر رہے یا اُس کے حقیقی باپ کا کوئی وارث آ سے اپنے لئے حاصل کرے۔

آیئے اس حدیثِ رسولؐ اور اس سے متخرجہ ان تین نکات کے پیش نظر زیاد بن ابو سفیان کے واقعہ استلحاق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ تاریخی روایات کے بموجب:

جاہلیت کے زمانہ میں حضرت ابو سفیانؓ طائف میں اپنے ایک ملنے والے شخص ابو مریم کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔

اس دوران میں ایک مرتبہ جاہلیت کے دستور کے مطابق ابو مریم نے ابو سفیان کی مہمانداری کے سلسلہ میں اُنہیں سمیّہ نامی ایک لونڈی پیش کی اور اس ملاقات کے نتیجہ میں سمیّہ کے بطن سے زیاد کی پیدائش ہوئی لہ

اس عورت کے بطن سے حارث بن کلاہ ثقفی کے دو بچے ابو بکرہ اور نافع بھی تھے اور حارث نے ان دونوں بچوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اپنے بچے تسلیم کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اُس ہی کے بچے قرار پائے۔ زیاد بھی حارث کے بستر پر ہی پیدا ہوا تھا مگر زیاد کے بارے میں حارث نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ اس کے نطفہ سے ہے۔

اس روایت کے مقابلہ میں مولانا نے اپنی مصلحت سے ایک ایسی روایت کو اختیار کیا جو مولانا کے تو مفید مطلب تھی مگر کسی قرینہ سے صحت کو نہیں پہنچتی بقول ابنِ عساکر:

زیاد نے ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کی مجلس میں ایک سحر طراز تقریر کی حضرت عمروؓ بن العاص نے تقریر سُن کر کہا۔ اگر یہ بچہ قریش میں سے ہوتا تو خدا کی قسم یہ سب کو اپنی لاٹھی سے ہانکتا۔ ابو سفیانؓ بھی موجود تھے کہنے لگے یہ بچہ قریشی ہی ہے اور میرا بیٹا ہے۔ علیؓ بھی موجود تھے اُنہوں نے ابو سفیانؓ کی بات کا انکار تو نہ کیا مگر اُنہیں جھڑک دیا۔

لہ تاریخ دمشق ابن عساکر جلد ۵ صـ ۴۰۹

یہ زیاد پہلے حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور انہی کا عامل بھی تھا۔ مگر جب معاویہؓ نے انہیں اپنا بھائی بنایا تو اپنے پاس بُلا لیا۔

اس کہانی کو اختیار کرنے سے مولانا کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مولانا کو اس سے ابوسفیانؓ کی زبان سے ہی انہیں بدنام کرنے کا بہترین موقع مہیا ہے ورنہ حقیقتِ حال یہ نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر ابن العربیؒ لکھتے ہیں:

ان لوگوں کا یہ کہنا کہ ابوسفیانؓ نے اس بات کا اعتراف کیا تھا اور اس پر انہوں نے چند شعر بھی کہے تھے تو کسی بھی عقلمند آدمی پر یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ اگر ابوسفیانؓ حضرت عمرؓ کی زندگی میں اس بات کا اعتراف کر چکے ہوتے تو بات دو حال سے خالی نہ تھی:

۱۔ یا تو حضرت عمرؓ زیاد کا الحاق حضرت ابوسفیانؓ سے کر دیتے جیسا کہ بہت سے دوسرے لوگوں کے باب میں ایسا ہو چکا تھا اور اس صورت میں یہ استلحاق نافذ ہو جاتا۔

۲۔ یا عمرؓ اس سے انکار کر دیتے اور اس صورت میں بھی ابوسفیانؓ پر کوئی گرفت نہ ہوتی کیونکہ یہ معصیتِ زناءٌ جاہلیت سے تعلق رکھتی تھی اور اسلام پہلے سارے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پس لوگوں کی خود ساختہ اور ذلیل کہانی کا کوئی مطلب نہیں ہے جبکہ یہ کہانی حدودِ دین سے خارج ہے[1]

مسئلہ کو اگر اُلجھا دینے کی نیت سے نہ اُٹھایا جائے تو معاملہ زیرِ بحث میں کوئی اُلجھن موجود نہیں ہے۔ حضرت ابوسفیانؓ نے جاہلیت کے زمانہ میں اگر کوئی غلطی کی تھی تو یہ کوئی منفرد اور انوکھی غلطی نہیں تھی وہاں کتنے لوگ تھے جن کا دامن جاہلیت کی ناکردنیوں سے پاک تھا۔

وہ سارے ہی بزرگ جن کے نام پر رضی اللہ کہنا ایمان کی نشانی ہے، کون جانے ان میں سے کتنے بزرگ اپنی جاہلی زندگی میں حقیقی جاہلیت کا نمونہ رہ چکے ہونگے۔

---

[1] العواصم من القواصم صد ۲۷۹

شراب کی حرمت تک جن بزرگوں کا ذکر شراب نوشی کے ضمن میں آتا ہے ان میں سے بعض بزرگ ایسے بلانوش تھے کہ قرآن نے اُنہیں ایسی حالت میں نماز کے قریب تک آنے سے روک دیا کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى کہ خبردار نشہ کی حالت میں نماز کے قریب بھی مت پھٹکو۔

سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو ایسی حالت میں ایک دفعہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استخفاف بھی کر ڈالا تھا۔ مگر نشہ کی حالت میں مرفوع القلم ہونے کی وجہ سے اُنہیں احتساب کے سپرد نہ کیا جا سکا۔

شراب کی حرمت نازل ہوئی تو اصحابِ رسولؐ نے حضورؐ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہؐ! ہمارے جو بھائی یہ حرام چیز استعمال کرتے رہے ہیں لیکن اس کی حرمت سے پہلے وہ اپنے اللہ کے ہاں حاضر ہو چکے اُن کا کیا بنے گا؟

قرآنِ پاک نے اس سوال کے جواب میں فرمایا: لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ط [1]

تو جب شراب کی حرمت سے پہلے خود مسلمانوں کی شراب نوشی بھی اُنہیں موثر نہ رہ سکی تھی تو کفر و شرک کے زمانہ کی کوئی معصیت کیوں راہ روکے رہے گی!

جب شرک بھی جسے اللہ تعالیٰ نے کبھی نہ معاف کرنے کا اعلان کر رکھا ہے توبہ سے اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے تو اور کونسا گناہ ہے جو اسلام کو قبول کر چکنے کے بعد بھی دامن نہیں چھوڑے گا۔

بڑی عجیب بات ہے کہ پہلے مولانا مودودی حضرت ابوسفیانؓ کے مُنہ سے اپنے ایک گناہ کا اعتراف کراتے ہیں پھر اُنہیں علیؓ کی زبان سے جھڑکی دلاتے ہیں کہ چپ رہو ورنہ عمرؓ کے دُرّوں سے نہیں بچ سکو گے۔

کیا عمرؓ اس حقیقت سے بے خبر تھے یا علیؓ کو خبر نہیں تھی کہ جاہلیت کے

---

[1] مائدہ ع ۱۲

گناہ پہ اسلام میں عتاب نہیں ہے اور اسلام سارے ہی گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بڑا عام تھا کہ اِنَّ الْاِسْلَامَ یَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَہٗ کہ اسلام کفر کے زمانہ کے سارے گناہ ملیامیٹ کر دیتا ہے۔

نیز ارشاد ہے:

مَنْ اَحْسَنَ فِی الْاِسْلَامِ فَلَا یُؤَاخَذُ بِمَا فِی الْجَاھِلِیَّۃِ (مسلم)

کہ جس نے اسلام لانے کے بعد نیک زندگی اختیار کر لی اُسے جاہلیت کے زمانہ کی کسی بات پر مواخذہ نہیں ہوگا۔

کیا عمرؓ ان احادیث سے بے خبر تھے یا علیؓ؟ جو عمرؓ کا دُرّہ جاہلیت کی معصیت پر بیتاب ہو جاتا اور علیؓ نے ابو سفیانؓ کو تحفظ دیا۔

کتنی بُری بات ہے کہ مولانا بات کو پھیلا پھیلا کر اور چسکے لے لے کر بہانے ہی بہانے زیاد کو حرامزادہ کہہ رہے ہیں اور حضرت معاویہؓ کے والد ماجد کی زناکاری کے چٹخارے بھرتے ہیں مگر وہ تاریخ کا وہ صفحہ کیوں نہیں پڑھتے جہاں لکھا ہے کہ:

زیاد کی ماں سمیہ حارث بن کلاہ ثقفی کی لونڈی تھی اور زیاد کے باپ کی نسبت لوگوں کو شبہ تھا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ سمیہ کے ساتھ ابو سفیانؓ نے جاہلیت کے زمانہ میں نکاح کیا تھا اور اس نکاح کے بعد ابو سفیانؓ کے نطفہ سے زیاد کی پیدائش ہوئی تھی۔

زیاد کی شکل و صورت بھی ابو سفیانؓ کے بہت مشابہ تھی۔ مگر (شاید پورا اطمینان نہ ہو سکنے کی وجہ سے) ابو سفیانؓ کے خاندان والے اور امیر معاویہؓ (ایک زمانہ تک) زیاد کو ابو سفیانؓ کا بیٹا تسلیم نہ کرتے تھے [1]

ایسی صورت میں ابو سفیانؓ کا گناہ کیا رہا اور زیاد ولد الحرام کیونکر ہوا؟

تاہم مولانا نے اپنے خاص مصالح سے بات کے اس رُخ پر بہت زور دیا ہے۔ اور الحاقی روایات کی بیساکھیوں سے بہت کام لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی

---

[1] تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں جلد ۲ صہ ۳۱

پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا جائزہ لیں۔

قاضی ابوبکر ابن العربی حضرت علیؓ کے ایک خط کا ذکر کرتے ہیں جو حضرت علیؓ نے زیاد کو تحریر کیا تھا کہ:

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہ (یعنی ابوسفیانؓ کا اپنے آپ کو زیاد کا باپ بتانا) ابوسفیانؓ کی ایک بڑ تھی اور تو اس سے نسب کا مستحق نہیں بن جاتا۔

اس پر قاضی ابوبکر یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ:

اگر (حضرت علیؓ کا)، یہ قول صحیح ہے تو یہ حضرت علیؓ کی (طرف سے زیاد کے ابن ابوسفیانؓ ہونے کی) شہادت ہے اور اس سے امیر معاویہؓ کا یہ فعل (زیاد کا استلحاق) صحیح ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ یہ مسئلہ علماء کے اندر ایک اجتہادی مسئلہ ہی رہا ہے (جس میں مجتہدین مختلف الرائے ہیں) حضرت علیؓ کی اپنی رائے تھی (وہ مجتہد تھے) اور حضرت معاویہؓ کی اپنی رائے تھی[1] (اور وہ بھی مجتہد ہی تھے)

قاضی صاحب کی اس تحریر میں حضرت علیؓ کے جس خط کا ذکر ہوا ہے قاضی صاحب اس خط کی صحت کے بارے میں مطمئن نظر نہیں آتے ورنہ وہ "اگر یہ صحیح ہے" کا جملہ شرطیہ استعمال نہ کرتے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کا یہ خط عام تواریخ میں نقل ہوا ہے بلکہ حضرت علیؓ کے اُن مکتوبات میں بھی موجود ہے جو حضرت علیؓ کی ذات سے غلو کرنے والے لوگوں کے ہاں قرآن کی طرح کی مقدس دستاویز مانے جاتے ہیں۔ نہج البلاغہ میں ہے:

جب آپ (یعنی علیؓ) کو پتہ چلا کہ معاویہؓ نے زیاد کو خط لکھ کر اُسے اپنے خاندان میں ملانے کی بات کی ہے تو آپ نے زیاد کو لکھا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہوا ہے کہ معاویہؓ نے تمہیں خط لکھ کر چاہا ہے کہ تمہاری عقل کے پاؤں اکھاڑ دیئے جائیں۔ لہٰذا اس سے ہوشیار رہو...... یہ عمرؓ بن الخطاب کے زمانہ میں ابوسفیانؓ کے مُنہ سے ایک

---

[1] العواصم من القواصم صہ ۲۸۰

منگھڑت بات اچانک نکل گئی تھی جو شیطانی شرارتوں میں سے ایک شرارت تھی جس سے نہ کسی کا نسب ثابت ہوتا ہے نہ حقِ وراثت بنتا ہے۔ زیاد نے یہ خط پڑھا تو (اُچھل کر) کہنے لگا: شَهِدَ بِهَا وَرَبِّ الْكَعْبَةِ کہ ربِ کعبہ کی قسم علیؓ نے معاویہؓ کی بات کی گواہی دے دی [1]

پھر حضرت علیؓ کے اس خط کے نتیجہ میں زیاد حضرت علیؓ کے زیادہ قریب ہونے کے بجائے اُن کے خط سے حضرت معاویہؓ کے دعویٰ کی تصدیق پڑھ کر حضرت معاویہؓ کی طرف زیادہ جھک گیا حالانکہ وہ اس وقت بھی حضرت علیؓ کے عمالِ حکومت میں سے ایک اہم عامل تھا۔

حضرت علیؓ کے اس خط کے بارے میں حضرت علیؓ اور زیاد کی خط وکتابت کی تفصیل بھی وارد ہوئی ہے مگر حضرت قاضی ابوبکر کا کہنا ہے کہ یہ سب خود ساختہ مضامین ہیں [2]

مولانا مودودی صاحب کے پیدا کردہ ان مباحث کی غرض خواہ کچھ بھی ہو مگر انہیں امرواقعہ سے انکار کرنے کے لئے شریعتِ اسلامیہ کے بہت سے آداب اور تقاضوں کو ترک کرنا ہوگا ورنہ اُن کی بات سیدھی نہیں ہوگی۔ قاضی ابوبکر لکھتے ہیں:

باقی رہا اصل مقصد اور وہ ہے "معاویہؓ کا زیاد کو اپنے ساتھ ملا لینا اور لوگوں کا امیر معاویہؓ پر اعتراض کرنا"

پس اگر امیر معاویہؓ نے اپنے باپ سے یہ سنا ہو کہ زیاد میرا بیٹا ہے اور امیر معاویہؓ اسے اپنے ساتھ ملا لیں تو امیر معاویہؓ پر کیا گرفت ہو سکتی ہے!

اور ابو سفیانؓ پر بھی کیا اعتراض آتا ہے اگر وہ ایسے بیٹے کا اقرار کریں جس کی پیدائش ان کی جاہلیت کے زمانہ کے کسی فعل سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ تو سب کو ہی معلوم ہے کہ سمیہ ابو سفیانؓ کی لونڈی نہیں تھی جیسا کہ زمعہ کی لونڈی (حضرت سعدؓ کے بھائی) عُتبہ کی نہیں تھی لیکن (عتبہ کے دعویٰ کے خلاف)

---

[1] نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۴۴ [2] العواصم من القواصم صفحہ ۳

زمعہ کی طرف سے دعویٰ کرنے والا (زمعہ کا بیٹا عبد) موجود تھا جس کی وجہ سے اس کا فیصلہ کرنا پڑا اور زیاد کے سوال پر کوئی آدمی (حارث یا اس کا کوئی وارث) معاویہؓ سے جھگڑا کرنے والا نہیں تھا (اس لئے یہاں استلحاق کے نافذ کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی)

قاضی صاحب مزید تحریر کرتے ہیں:

یہاں ایک باریک نکتہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ جب بھائی اپنے بھائی کو ملانا چاہے اور کہے کہ یہ میرے باپ کا بیٹا ہے اور اس کے ساتھ جھگڑا کرنے والا دوسرا کوئی نہ ہو اور مقدمہ کا فریق صرف ایک مدعی ہی ہو تو امام مالکؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ وارث ہوگا مگر نسب ثابت نہیں ہوگا۔ مگر امام شافعیؒ کے دو اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ وہ وارث بھی ہوگا اور اس کا نسب بھی ثابت ہوگا[1]

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

حضرت معاویہؓ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ زیاد کو اپنا بھائی بنالیں اور ان کا یہ دعویٰ خلافِ واقعہ نہیں ہوگا کیونکہ "عبد" نے تو "سعد" کے مقابلہ میں جھگڑا پیش کیا تھا مگر حضرت معاویہؓ سے کسی نے کوئی جھگڑا نہیں کیا۔

سمیہ حارث کی لونڈی تھی اور حارث یا اس کے کسی وارث نے زیاد کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ حارث کا بیٹا ہے۔ بنابریں قاضی صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ: (چونکہ) حارث کلاہ نے نہ تو زیاد کا کبھی دعویٰ کیا (جبکہ وہ سمیہ کے بطن سے اپنے دو بیٹوں ابوبکرہ (مسروق) اور نافع کے بارے میں اعلان و اعتراف کرتا تھا کہ یہ دونوں اس کے بیٹے ہیں) پھر خود زیاد بھی اپنے آپ کو حارث سے منسوب نہیں کرتا تھا اگرچہ وہ حارث کی لونڈی سے حارث کے بستر پر ہی پیدا ہوا تھا ایسی حالت میں جو شخص بھی اس کا دعویٰ کرے وہ اسی کا ہے۔ بنابریں امیر معاویہؓ

---

[1] العواصم من القواصم صد ۲۸۱

پر کوئی طعن نہیں اور امام مالک کے مذہب کے مطابق امیر معاویہؓ نے جو کچھ بھی کیا وہ عین صحیح تھا۔[1]

مولانا مودودی صاحب قاضی صاحب کے قلم سے بیان کردہ شرعی پوزیشن کو تسلیم کرنے کے اس لئے بھی مکلف ہیں کہ ان کے نزدیک "قاضی صاحب یہ مقام رکھتے ہیں کہ ان سے شرعی پوزیشن طلب کی جا سکے۔ چنانچہ آپ نے حضرت عثمانؓ کے قاتلین کو طلب کرنے پر حضرت معاویہؓ کو ٹھیٹھ جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنے والا ثابت کرنے کے لئے شرعی پوزیشن انہی قاضی ابوبکر ابن العربی سے ہی دریافت کی تھی[2]

قاضی صاحب اپنے اس موقف پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ صحابہؓ نے اس پر انکار کیوں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جس شخص کی یہ رائے ہو کہ ایک وارث سے نسب ملحق نہیں ہوتا اس کو اس پر اعتراض کرنے کا حق ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا سے حرمت کا حکم لگایا ہے جیسا کہ آپ نے حضرت سودہؓ سے فرمایا تھا کہ اس سے پردہ کیا کرو (اور مولانا مودودی صاحب نے بھی یہی اعتراض وارد کیا ہے (خلافت و ملوکیت صد ۱۷۵)

قاضی صاحب اس کے جواب میں حضرت امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ حضرت سودہؓ کو یہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے شرف و مجد اور حرمت کی وجہ سے تھا[3]

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی قوی وجہ نہیں ہے اور اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تاویل کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ام المومنین سودہؓ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے اس ہبتینہ بھائی سے پردہ کیا کرے تو اس کی وجہ بالکل واضح تھی کہ وہ اسے سودہؓ کے باپ زمعہ کا بیٹا نہیں سمجھتے تھے۔

---

[1] العواصم من القواصم صد ۳۰۸ [2] خلافت و ملوکیت صد ۱۳۶ [3] العواصم من القواصم صد ۳۰۸

اور جیسا کہ بعض روایات سے ظاہر ہے اس بچے کی شکل و صورت عتبہ کے مشابہ تھی اس پر عتبہ کی وصیت اور عتبہ کے بھائی سعد کا دعویٰ بھی موجود تھا تو ان واضح قرائن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ جان چکے تھے کہ وہ زمعہ کا نہیں بلکہ سعدؓ کے بھائی عتبہ کا ہی بیٹا ہے مگر حضورؐ نے جو وہ لڑکا حضرت سودہؓ کے بھائی عبد کے سپرد کرایا تھا تو وہ یہی قانونی مجبوری تھی کہ بیٹا اس کا حق ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا۔ ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا کہ یہ سودہؓ کے لئے محرم نہیں بلکہ نامحرم ہے۔ اس لئے حضورؐ کے اس حکم میں کوئی ابہام یا خلافِ واقعہ بات نہیں ہے۔ حضورؐ کے اس حکم سے قانون کا احترام بھی قائم رہا اور حقیقت بھی واضح رہی یعنی حضورؐ کا فیصلہ عبد کے قانونی حق کی بناء پر تھا اور اُم المومنینؓ کو پردہ کا حکم نسب کی حرمت کے سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔

اسی طرح حضورؐ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی اپنے ایک مبینہ رضاعی بھائی سے ملنے سے پہلے تحقیق کی تاکید فرمائی تھی۔

اس مرحلہ پر ہم پوچھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کو آخر کونسی مجبوری درپیش تھی کہ وہ ایک زیاد کے لئے بیٹھے بٹھائے اپنی عزتِ نفس کو مولانا کے بے رحم قلم کے سپرد کر دیتے اور خواہ مخواہ اپنی ذات پر مخالفین کو زبان طعن دراز کرنے کا موقع مہیا کرتے۔ وہ ایسے کمزور کب تھے کہ انہیں زیاد کی بہت ضرورت تھی انہیں محض علیؓ کی قوت کم کرنے کے لئے اپنے نسب کو بحث کی بھٹی میں جھونکنے کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ مولانا کو اگر خدا کا خوف ہوتا تو اس سلسلہ کی اصل بات خود معاویہؓ نے ہی بڑی وضاحت سے کہہ رکھی ہے اور یہ وضاحت قول فیصل کا حکم ہی رکھتی ہے مولانا کے لئے بھی یہ کافی ہو سکتی تھی۔

ہم حضرت معاویہؓ کی یہ وضاحت مولانا کے اپنے معتبر مورخ جناب طبری کی زبان سے ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ علامہ طبری لکھتے ہیں:

زیاد کے آنے سے میری عزت بڑھ نہیں گئی کیونکہ یہ عزت مجھے زمانۂ جاہلیت میں بھی حاصل تھی۔ پھر جب میں نے اسلام قبول کیا تو اسلام کی وجہ سے میری جو عزت بڑھی وہ میری زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے۔ اور اس سے زیادہ مجھے کسی اور ذریعہ سے کسی عزت کی طلب نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ مجھ پر زیاد کا حق واضح ہو گیا تھا اور میں نے اُسے اُس کا حق دیا ہے[1]

پس کوئی حرج نہیں اگر مولانا ایک بے لذت گناہ کے ساتھ اپنی عقبیٰ کو خطرہ میں ڈالنے کے بجائے یہ سیدھی بات مان لیں کہ:

زیاد کی ماں سمیہ حارث بن کلاہ کی لونڈی تھی۔ زیاد کے باپ کی نسبت لوگوں کو شبہ تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ سمیہ کے ساتھ ابوسفیان نے زمانۂ جاہلیت میں نکاح کیا تھا اور ابوسفیانؓ کے نطفہ سے زیاد کی پیدائش ہوئی تھی، زیاد کی شکل وصورت بھی ابوسفیانؓ کے بہت مشابہ تھی[2]

من آنچہ شرط بلاغ ست با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

گورنر قانون سے بالاتر

مولانا مودودی لکھتے ہیں:
حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

پہلا واقعہ

ان کا گورنر عبداللہ بن عمروؓ بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا کہ ایک شخص نے دورانِ خطبہ میں اُس کو کنکر مار دیا۔ اس پر عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کرایا اور اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رو سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر

---

[1] طبری جلد ۵ صـ۲۱۵ [2] تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں جلد ۲ صـ۳۱

کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے ۔ حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کردوں گا مگر میرے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں [۱]

عبداللہ کی کارروائی یقیناً غلط ہے اور اگر حضرت معاویہؓ نے بھی یہی جواب دیا جس کی خبر مولانا نے دی ہے اور استغاثہ پیش کرنے والوں کو مایوس کیا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے گورنر کو مولانا کے بقول ٹھیک ہی قانون سے بالاتر قرار دیا ۔ انہیں فریادیوں کی فریاد پر کان رکھنا چاہیئے تھا اور گورنر کے خلاف بھی مناسب کارروائی کرنی چاہیئے تھی ۔ اور اگر فی الواقعہ یہی صورتحال بھی ہے جو مولانا نے بیان کی ہے تو ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کی پوزیشن ہرگز صحیح نہیں ہے ۔

مگر قارئین یہ سن کر حیران ہوں گے کہ مولانا کا بیان از اوّل تا آخر غلط ہے ، ان کا راوی جھوٹا ہے اور اس کی بنائی ہوئی کہانی جھوٹ کی پوٹ ہے حضرت معاویہؓ نے فریادیوں کی ٹھیک ٹھیک فریاد رسی فرمائی تھی ، انہیں مطمئن کیا تھا اور گورنر کو اس کی سزا سے بڑھ کر اپنے اطمینان کی حد تک سزا دی اور وہ سب کچھ کیا جو انہیں کرنا چاہیئے تھا ۔

مولانا کی بیان کردہ کہانی سے تعلق رکھنے والا واقعہ مولانا کے معتبر مورخ علامہ طبری نے بھی اپنے ہاں نقل کیا ہے ، ذرا سنیئے :

عبداللہ بن عمرو بن غیلان گورنر بصرہ منبر پر خطبہ میں کھڑا تھا کہ بنوضبہ کے ایک شخص خبیر بن ضحاک نے اسے روڑہ کھینچ مارا اور عبداللہ نے اس کا ہاتھ کٹوا ڈالا ۔

بنوضبہ کے لوگوں نے آکر گورنر سے کہا کہ ہماری برادری کے ایک شخص نے جو کیا آپ نے اسے اس کی حرکت کی قرار واقعی سزا دے دی لیکن ہمیں اندیشہ ہے

---

[۱] خلافت و ملوکیت صد ۱۷۵ - ۱۷۶

کہ اگر یہ خبر امیر المومنین تک پہنچی تو وہ بھی ہمارے خلاف کوئی کارروائی کریں گے۔

اس لئے آپ اگر مناسب سمجھیں تو ہمیں امیر المومنین کے نام ایک خط لکھ دیں تاکہ ہم اُن تک اپنی صفائی پہنچا سکیں، خط کا مضمون یہ ہو کہ "جرم واضح نہیں شبہ میں ہاتھ کاٹا گیا ہے۔" اور گورنر نے یہ خط لکھ کر ان کے حوالے کر دیا۔

اس واقعہ کے چھ ماہ یا ایک برس بعد بنو ضبہ امیر المومنین کے حضور پہنچے اور عرض کیا امیر المومنین! عبداللہ نے ہمارے ایک بھائی کا ہاتھ ناحق کٹوا دیا ہے اور ثبوت میں اُنہوں نے گورنر کا وہی خط پیش کر دیا (جسے اُنہوں نے سفارش کے بطور گورنر سے لکھوایا تھا) امیر المومنین نے خط پڑھ کر فرمایا عمال کی غلطیوں پر قصاص کا تو دستور نہیں اور پھر یہ قصاص (بحالتِ موجودہ) ایک مشکل امر بھی ہے۔ البتہ اگر تم اس بات پر راضی ہو جاؤ تو میں تمہیں دیت دلوا دوں۔ چنانچہ یہ لوگ دیت قبول کرنے پر راضی ہو گئے اور حضرت معاویہؓ نے بیت المال سے اُنہیں دیت دلوادی اور (قانون سے تجاوز کرنے کی وجہ سے) گورنر کو اس کے عہدہ سے معزول کر دیا[1]

اب دیکھئے مولانا کے مسلمہ معتبر مورخ نے کتنی صراحت کے ساتھ بات کی ساری کڑیاں الگ الگ کر کے گن دی ہیں۔

مقطوع الید کے وارث حضرت معاویہؓ سے استغاثہ کرتے ہیں حضرت معاویہؓ توجہ سے بات سنتے ہیں جب یقین ہو جاتا ہے کہ استغاثہ صحیح ہے تو آپ نے قصاص لینے کے سلسلہ کی مجبوریاں پیش کر کے دیت پیش کی جسے مقطوع الید کے وارثوں نے قبول کر لیا اور مقدمہ ختم ہو گیا۔ تاہم معاویہؓ قانون کے مطابق فیصلے کو اپنے نزدیک ناکافی پاتے ہیں اور اپنے اطمینان اور دوسرے عمال کی عبرت کے لئے گورنر کو اُس کے عہدہ سے معزول کر دیتے ہیں۔

لیکن چونکہ یہ تصریحات مولانا کی حسبِ خواہش نہیں تھیں اس لئے اُنہوں نے

---

[1] طبری جلد ۴ صفحہ ۱۴۱ واقعات ۵۵ھ

طری کو ترک کر کے اپنی بات دوسرے ذرائع سے سیدھی کر لی اور یہ ساری کہانی اللہ کے سپرد کر دی۔

اس مقدمہ کے فریق ثانی کی طینت کا یہ خسیس رخ بھی دلچسپ اور توجہ طلب ہے کہ وہ بصرہ کے گورنر کے حضور پیش ہو کر ہی اپنا معاملہ ختم کر چکے تھے اور ایک طرح کی صلح منعقد ہو گئی تھی۔ پھر اُنہوں نے دھوکہ کے ساتھ گورنر سے ایک خط لکھوا لیا جس میں سادہ دل مگر گرم مزاج گورنر کے قلم سے ہی اُس کے جرم کا اعتراف تحریر کروایا۔ خط اپنی صفائی کے لئے لکھوایا تھا مگر اس سے کام گورنر کے خلاف گواہی کا لیا۔ پھر حضرت معاویہؓ سے دیت وصول کی، گورنر کو سزا دلوائی مقدمہ ختم ہو گیا اور جاتے جاتے اپنے کاغذات پھر مولانا کے خاص راوی کی میز کے دراز میں رکھ گئے کہ لو اب تم یہ مُردے قبر سے اکھاڑتے رہنا اور مولانا بھی سب کچھ جانتے بوجھتے اسی بات پر اڑ گئے کہ:

"حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کر دوں گا مگر میرے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں"۔[1]

لاحول ولا قوۃ الا باللہ ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

ایک سوال

یہاں ایک سوال البتہ حل طلب ہے کہ حضرت معاویہؓ نے دیت تو پیش کی مگر قصاص لینے سے کیوں معذرت کر دی۔ اس سوال کا جواب دو طرح ہے:

اوّل: مومن کی غلطی پر قصاص آتا ہی نہیں بلکہ مومن کے لئے صرف دیت ہی مقرر کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا[2]

---

[1] نسائی ع ۱۳

کہ اگر کوئی مومن کسی کو غلطی سے قتل کر دے تو اُسے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ) ایک گردن آزاد کرے اور مقتول کے گھر والوں کو دیت (خون بہا) ادا کرے۔ ہاں اگر وہ لوگ یہ بھی معاف کر دیں تو الگ بات ہے۔

یعنی مومن پر قتلِ خطا میں بھی قصاص نہیں ہے کسی دوسری ایذا کی بات تو رہی اپنی جگہ اور ظاہر ہے کہ عبداللہ سے جو سرزد ہوا وہ بھی ایک خطا ہی ہے اگرچہ اس کا تعلق جذبات سے زیادہ ہو گیا ہے۔ پھر مقطوع الید کے ورثاء نے جو کچھ عبداللہ سے چاہا تھا وہ بھی یہی کچھ تھا کہ قطع ید شبہ کی بنا پر عمل میں آیا ہے۔ پھر عبداللہ نے بھی جب یہی تحریر کیا کہ میں نے محض شبہ میں ہی یہ فعل کیا ہے تو بات کی حیثیت بدل گئی ایسا نہ بھی ہوتا تو عبداللہ کا فیصلہ بہر حال غلط فیصلہ تھا اور اس کے لئے قصاص لازم نہیں آتا تھا۔

ایسے غلط کام ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ یہ کام کبھی نادانستہ بھی تھے اور کبھی دانستہ بھی تھے مگر اُن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت مہد سے خلفاء کے زمانہ تک کبھی قصاص نہیں لیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کی حیات مبارکہ میں جتنے واقعات پیش آئے آپ نے سب میں دیت کا فیصلہ ہی کیا قصاص کبھی نہیں لیا۔ قصاص کا حکم آپ نے صرف ایک بار دیا مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ یہ قصاص بھی نافذ نہ ہو سکا اور بات دیت تک آکر رُکی۔ حضرت انس بن نضر کی بہن ربیع نے عورتوں کے جھگڑے میں کسی دوسری عورت کا دانت توڑ دیا۔ اس کے ورثاء نے قصاص کا دعویٰ کیا حضورؐ نے قصاص کا حکم جاری کر دیا۔ مجلس میں انس بن نضر بھی بیٹھے تھے یہ فیصلہ سُن کر صدمہ کی شدت سے ان کی حالت غیر ہو گئی اور بے دم ہو کر چیخے کہ یا رسول اللہ! اللہ کی قسم میری بہن سے قصاص نہیں لیا جائے گا، اُن کی گلوگیر آواز میں اتنا درد تھا کہ پوری

مجلس پر رقت طاری ہوگئی اور قصاص کے طالب بھی رقت میں ڈوب گئے اور بیتاب ہوکر بولے۔ یا رسول اللہؐ! ہم اپنا دعویٰ واپس لیتے ہیں اور پھر حضور علیہ السلام نے دانت کی دیت دلوا دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ جب وہ اللہ کی قسم کھاکر کوئی بات کر دیں تو اللہ ان کی قسم ضرور پوری کرتے ہیں[1] اللہ اکبر ؎ نہ جاں ان خرقہ پوشوں پر ارادت ہو تو دیکھ ان کو

ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی غلطی سے حضرت حذیفہؓ کے والد گرامی حضرت یمانؓ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفہؓ کو ان کے باپ کی دیت پیش کی مگر حضرت حذیفہؓ نے یہ دیت بھی نہ لی اور مسلمانوں کو معاف کر دیا۔

حضرت خالدؓ بن ولید کو فتح مکّہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو خزیمہ کی جانب تبلیغ کے لئے روانہ کیا مگر اُنھوں نے وہاں لڑائی جاری کر دی جس میں کتنے ہی لوگ قتل ہو گئے اور ان مقتولین میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس نے اپنے اسلام کا اظہار بھی کیا اور مسلمانوں کو السلام علیکم بھی پیش کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ خبر پہنچی تو آپ فرطِ اضطراب سے اٹھ کھڑے ہوئے، آپ پر نہایت درجہ حزن و ملال طاری تھا۔ اسی حال میں آپ نے تین بار ہاتھ اٹھا کر اپنے رب کے حضور حضرت خالدؓ کے اس فعل سے برأت کا اظہار کیا۔

پھر آپ نے مقتولین میں سے ایک ایک کی دیت ادا کی اور اگر اس تصادم میں کوئی کتا بھی ہلاک ہوا تو آپ نے اس کی دیت بھی پیش کر دی اور کچھ مزید رقم بھی دی۔ قرآن کریم میں بھی خالد کے اس فعل پر زجر فرمایا گیا مگر قصاص کا حکم نہیں دیا ارشاد ہوا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ

---

[1] بخاری شریف کتاب الجہاد

عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ [۱]

کہ اے اہلِ ایمان! کبھی اللہ کی راہ میں نکلو تو بغیر تحقیق کے کوئی قدم نہ اٹھاؤ۔ اور اگر تم پر کوئی سلام پیش کرے تو اُسے بے تحقیق ہی مسترد نہ کر دیا کرو کہ تم ہرگز مسلمان نہیں ہو۔ کیا تم محض دنیا کے فائدہ یعنی مالِ غنیمت کے لئے ہی ایسی بے سمجھی کا کام کرتے ہو یاد رکھو مالِ غنیمت اللہ کے ہاں بہت ہے وہ جب چاہے گا تمہیں ضرور دے گا)

صدیقِ اکبرؓ نے جب مرتدین اور زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف مہم جاری کی تو ایک مرحلہ پر صدیقِ اکبرؓ کی ہدایات کے بالکل خلاف حضرت خالدؓ بن ولید کے ہاتھوں مالک بن نویرہ قتل ہو گئے۔ اس پر مالک کے ورثاء نے خالدؓ کے خلاف قصاص کا مطالبہ کیا مگر صدیقِ اکبرؓ نے یہ فرما کر ان کی درخواست مسترد کر دی کہ میں خدا کی تلوار کو محض ایک غلطی کی وجہ سے نیام میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اور پھر آپ نے مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کر دی۔ اس ارشاد میں حضرت صدیقِ اکبرؓ کا اشارہ حضرت خالدؓ بن ولید کے لقب سیف اللہ کی طرف تھا جو انہیں شجاعت کے صلہ میں حضور علیہ السلام کی زبان سے ملا تھا جب آپ نے فرمایا کہ:

خالدؓ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن غیلان کے مقدمہ میں حضرت معاویہؓ کا فیصلہ بھی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ اور سنتِ خلفاء کی انہی روایات کی اتباع میں تھا اور اس میں کسی قسم کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ دستور کے مطابق انہوں نے بھی اپنے ایک عامل کی غلطی پر مقطوع الید کے وارثوں کو دیت ادا کر دی اور وہ اس پر راضی بھی تھے۔ مزید یہ کہ پھر انہوں نے اپنے اطمینان اور دوسروں کی عبرت کے لئے گورنر کو معزول بھی کر دیا تو اب پھر حضرت معاویہؓ کے ذمہ مولانا کا کونسا فرض باقی رہ گیا تھا جس کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں اور جس کے نہ ملنے پر وہ معاویہؓ کو

---

[۱] نساء ع ۱۳

ظلم وستم کا طعن کرتے ہیں۔

دوسری وجہ قصاص نہ لینے کی سیاسی تھی جبکہ حضرت معاویہؓ اگر عامل سے قصاص لیتے تو بھی درست نہ ہوتا اور مملکت کے لئے نقصان کا باعث بنتا حضرت مولانا مودودی صاحب کے بیان کردہ مظلومین نے کوفہ میں جو اودھم مچا رکھا تھا اور جناب حجر بن عدی نے اور اُن کے خاندان نے جس طرح حضرت معاویہؓ کے حکام کے لئے زندگی وبالِ جان بنا رکھی تھی اس کا ذکر قارئین کے سامنے کیا جا چکا ہے۔ اب ایک طرف تو عمالِ حکومت کی عافیت مملکت کے دشمنوں اور حضرت معاویہؓ کے سبّابِ مخالفین کے ہاتھوں مخدوش ہو چکی تھی، کوفہ کا مرکزی شہر فساد کی لپیٹ میں تھا، لوگوں کا حکومت سے اعتماد تیزی کے ساتھ اٹھ رہا تھا کیونکہ جب عمالِ حکومت کی جان و آبرو محفوظ نہیں تھی تو عوام اُن سے اپنی جان و آبرو کے تحفظ کی اُمید کیونکر رکھتے ایسے حالات میں اگر حضرت معاویہؓ بھی محض مولانا اور اُن کے ساتھیوں کو خوش رکھنے کے لئے اپنے عمال کی غلطیوں پر اُن سے حربی معاندین یا مفسدین کا سلوک کرنے لگتے تو جہاں عوام کا اعتماد عمال سے اٹھ گیا تھا عمال کا اعتماد مرکز سے اٹھ جاتا اور پھر ملک کا جو حال ہوتا وہ اللہ ہی جانتے ہیں۔

ہاں اگر حضرت معاویہؓ کا فیصلہ سنّت اور دستور خلفاء راشدین کے خلاف ہوتا تو ضرور قابلِ اعتراض تھا لیکن جب اس فیصلہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفاء کی سنت سے جواز کی سند حاصل ہے تو اُن پر تنقید سراسر بے جواز ہے۔

دوسرا واقعہ

دوسرا واقعہ جس پر مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کی دھاندلی پسندی اور گورنروں کو ظلم وستم کی کھلی چھٹی دے رکھنے کے سلسلہ میں انگلی رکھی ہے وہ مولانا کے اپنے الفاظ میں یوں ہے:

زیاد کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرہ کے ساتھ کوفہ کا بھی حاکم مقرر کیا اور وہ پہلی مرتبہ خطبہ دینے کیلئے کوفہ کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہوا تو کچھ لوگوں نے اس پر

کنکر پھینکے[1] اس نے فوراً مسجد کے دروازے بند کرا دیئے اور کنکر پھینکنے والے تمام افراد کو (جن کی تعداد ۳۰ سے ۸۰ تک بیان کی جاتی ہے) گرفتار کرا کے اُسی وقت اُن تمام کے ہاتھ کٹوا دیئے، کوئی مقدمہ نہ چلایا گیا، کسی عدالت میں وہ پیش نہ کئے گئے، کوئی باقاعدہ قانونی شہادت اُن کے خلاف پیش نہ ہوئی۔

گورنر نے محض اپنے انتظامی حکم سے اتنے لوگوں کو قطع ید کی سزا دے ڈالی جس کے لئے قطعاً کوئی شرعی جواز نہ تھا مگر دربارِ خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا[2]

---

[1] یہ کنکر پھینکے، روڑے چلانے کی تصغیر ہے اور مولانا کی خاص ایجاد ہے۔

[2] خلافت و ملوکیت صد ۱۷۶ - غور فرمایئے مولانا جن شرفا کا مقدمہ لڑ رہے ہیں اور جن کی حمایت میں حضرت معاویہؓ پر زبان طعن دراز کرتے ہیں، ان کا کردار کتنا بلند ہے۔ وہ لوگ ایک سنگین سازش کے تحت مسجد میں آتے ہیں، خطبہ کی بے حرمتی کرتے ہیں، مسجد کا تقدس پامال کرتے ہیں، خطبہ میں خطیب کو قدم قدم پر ٹوکتے ہیں۔ خطبہ دینے والا ملک کا والی ہے، ملک کا گورنر ہے، وہ اسے بات تک نہیں کرنے دیتے، اس کی بات میں بار بار مداخلت کرتے ہیں، اس پر آوازے کستے ہیں، اُس پر روڑے چلاتے ہیں، مسجد کے اندر خطبہ کے دوران میں ہی اُدھم مچاتے ہیں، ہلڑبازی کرتے ہیں، ہنگامہ اُٹھاتے ہیں، لڑائی جھگڑا کرتے ہیں اور یہ کوئی اتفاقی نہیں بلکہ اُن کا ہمیشہ کا یہی معمول ہے۔ یہ لوگ اگر یونہی بدامنی پیدا کرتے رہیں، قانون شکنی کو اپنا پیشہ بنائے رکھیں تو کوئی بات نہیں لیکن گورنر اگر کوئی جوابی کاروائی کرے تو مولانا کی معترضانہ اعتراض اُس کے پَر کاٹنے لگتی ہے۔

گورنر زیاد نے جو کچھ کیا بلاشبہ غلط اور ظلم ہے مگر اُن شرفاء کی روش بھی اپنے لئے کسی احترام کی گنجائش کب رکھتی ہے!

گورنر نے ان کے ہاتھ کاٹ کر یقیناً اُنہیں شرعی سزا نہیں دی، اُسے چاہیئے تھا کہ ان کے ہاتھ کاٹنے کے بجائے انہیں گرفتار کر کے اتنے کوڑے لگاتا کہ ان کی پیٹھ کی کھال اُدھیڑ دیتا

(باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا نے اس روایت کے لئے طبری کا حوالہ خصوصیت سے دیا ہے لیکن اُنہوں نے اس روایت کو اپنے ڈھب کی بنانے کے لئے انصاف کی جس بے دردی سے قربانی دی ہے اُسے ہم مولانا کا حصہ نہیں قرار دے سکتے۔

مولانا نے اس روایت کو نقل کرنے میں کہاں تک انصاف سے کام لیا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہم اپنے قارئین کے سامنے طبری کی اصل روایت پیش کرتے ہیں۔ علامہ طبری لکھتے ہیں:

زیاد جب کوفہ میں آیا، منبر پہ بیٹھا اور حمد وثناء کے بعد خطبہ جاری کیا اور کہنے لگا میں بصرہ میں تھا اور مجھے اس کے ساتھ ہی کوفہ میں بھی خدمت کا موقع دیا گیا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بصرہ سے آتے وقت پولیس کے دو ہزار جوان اپنے ہمراہ لے کر یہاں آؤں۔ مگر مجھے خیال پیدا ہوا کہ تم لوگ اہل حق ہو اور تم نے بہت بار باطل کو دفع کیا ہے اس لئے (مبادا تم لوگ میرے اس طرح آنے سے کوئی خوف یا وحشت قبول کرو) بس میں نے اپنا یہ خیال ترک کر دیا اور) فقط اپنے اہل خانہ کو ہمراہ لے کر ہی تمہارے پاس آ گیا ہوں۔

وہ منبر پہ بیٹھ کر ابھی اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ بہت سے لوگوں نے اس پر روڑے برسانے شروع کر دیئے۔ پھر جب تک لوگوں کی طرف سے پتھراؤ جاری رہا وہ منبر پر ہی بیٹھا (حالات کا جائزہ لیتا) رہا۔ پھر اُس نے اپنے خاص آدمیوں (سرکاری ملازمین) کو حکم دیا کہ سب حاضرین کو روک لو اور کسی کو باہر نہ جانے دو، کوئی شخص بھی تمہارے محاصرہ سے نہ نکل سکے۔ اگر تم نے اس حکم کی تعمیل میں ذرا بھی کوتاہی کی تو تمہارا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) سر پہ کوئی بال باقی نہ چھوڑتا۔ اُسے یقیناً اُن کے ہاتھ نہیں کاٹنے چاہئیں تھے مگر مولانا کو بھی کم از کم اتنی اخلاقی جرأت ضرور دکھانی چاہیئے تھی کہ وہ اُن کے کردار کو بھی شرارت قرار دیتے اور اُن کی ان حرکات کی مذمت کرتے مگر افسوس ہے کہ اُنہیں آخر تک اس بات کی توفیق نہیں ہوئی۔

لوگوں پر قابو حاصل کر کے وہ مسجد کے دروازہ پر کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔ محصورین میں سے چار چار آدمی اس کے سامنے پیش کیئے جاتے تھے اور وہ ہر شخص کو قسم دے کر اس امر کا یقین حاصل کرتا تھا کہ اس نے پتھراؤ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ جو لوگ قسم اٹھا لیتے انہیں چھوڑ دیا جاتا اور جو شخص قسم کھانے سے انکار کرتا اسے روک لیا جاتا تھا۔

وہ لوگ جنہوں نے قسم کھانے سے انکار کیا ان کی تعداد ۳۰ یا ۸۰ یا اسکے لگ بھگ تھی پھر اسی جگہ ان سب کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے لہ

یہ جناب زیاد جن کا ذکر مولانا نے اس واقعہ میں کیا ہے وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق مولانا نے بھی تحریر کیا ہے کہ:

حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں وہ ان کا زبردست حامی تھا لہ

یہ بزرگوار حضرت علیؓ کے عامل بھی تھے، ان کی طرف سے وہ جمل اور صفین میں اُن کے مخالفین کے خلاف جنگ بھی لڑتے رہے ہیں اور یہ بزرگوار جہاں بھی رہے ہیں۔ ان کی ذات سے ایسے واقعات ہمیشہ ہی وابستہ رہے ہیں۔ مگر وہ جب تک مولانا کی مرضی کو اپنے ساتھ ہموار رکھ سکے وہ ایک کامیاب جرنیل تھے، اسلام کے خادم تھے مگر جونہی ان کی وفاداریاں حضرت علیؓ سے حضرت معاویہؓ کی طرف منتقل ہو گئیں تو ان کے بارے میں مولانا کا نظریہ بھی بدل گیا۔

حضرت علیؓ کے ساتھ وابستگی کے ایام میں انہوں نے ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ کے بہت سے حمائتی گرفتار کر کے آگ کے الاؤ میں ڈال دیئے اور پھر از راہِ فخر و ناز انہوں نے یہ واقعہ حضرت علیؓ کو بھی لکھ بھیجا اور اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے آپ کے دشمنوں کو بھسم کر دیا ہے، میں سمجھتا تھا کہ ان کی یہی سزا ہے پھر حضرت علیؓ کے ہاں سے اس واقعہ کا کوئی ردِ عمل سامنے نہ آ سکا مولانا کو بھی اس کی ان دلوں کی درندگی پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض اُس وقت پیدا ہوا جب اُس نے

لہ طبری جلد ۴ ص ۸۷ لہ خلافت و ملوکیت ص ۱۷۵

اپنی درندگی کا حلقہ بدل لیا۔ زیاد کے دخل وعمل سے درندگی اور سفاکی کا ظہور خواہ حضرت علیؓ کے عامل کی حیثیت سے ہوا ہو یا حضرت معاویہؓ کے عامل کی حیثیت سے، بہرحال لائق مذمت ہے اور یہ ظالمانہ کاروائیاں لائق تعریف نہیں۔

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مولانا نے اس سفاکی کو حضرت معاویہؓ کی ذات سے کس منطق کی رُو سے وابستہ کیا ہے؟

کیونکہ یہ تو مولانا بھی نہیں بتا سکے کہ زیاد کی اس کاروائی کی معاویہؓ کو اطلاع مل گئی تھی اور ظاہر ہے کہ اگر یہ دردناکی وقوع پاتی تو معاویہؓ سے پوشیدہ نہ رہتی اور ایسی صورت میں مولانا بھی حضرت معاویہؓ کا یہ بھید ضرور توڑ دیتے اور انہیں ہرگز معاف نہ کرتے۔

جب عبداللہ بن عمرو بن غیلان کے ظلم کی اطلاع مولانا کے ذرائع نے حضرت معاویہؓ تک پہنچا دی تھی اور یہ ذرائع اب بھی موجود تھے پس اس واقعہ میں بھی اگر کوئی صداقت ہوتی تو یہ بہرحال اُس پہلے واقعہ کے مقابلہ میں زیادہ سنگین اور زیادہ ظالمانہ تھا اور مولانا کو بھی معاویہؓ کو شریک ظلم بنانے کے لئے اپنے کسی راوی کے ذریعہ اس واقعہ کی اطلاع حضرت معاویہؓ تک پہنچا دینی چاہیئے تھی۔

افسوس ہے کہ مولانا کے راوی کی فنکاری یہاں مات کھا گئی ہے اُسے معاویہؓ کو اس ظالمانہ کاروائی میں ملوث کرنے کے لئے کوئی جھوٹی سچی روایت اس پہلو سے بھی مولانا کے ہاتھ دے دینی چاہیئے تھی۔

مولانا نے یہ تو کہا ہے کہ زیاد نے ظلم کیا مگر دربارِ خلافت سے اس ظلم کے خلاف کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ مگر وہ روایت کے اس خلا کو نہیں بھر سکے کہ اس ظلم کی اطلاع حضرت معاویہؓ کو بھی تھی۔

تاہم طبری کے حوالے سے مولانا کی پیش کردہ روایت اور خود طبری کے اوراق میں محفوظ اصل روایت جسے ہم نقل کر آئے ہیں اگر دونوں کو سامنے رکھ کر موازنہ کیا جائے تو مولانا کی بات نہیں بنتی۔ زیاد کے ظلم سے قطع نظر روایت کی حد تک واقعات کا تجزیہ مولانا کے حق میں نہیں ہے۔

مولانا کا ارشاد ہے کہ بیس یا اسّی آدمیوں کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے مگر اُن کے جرم کو عدالتی سطح پر ثابت نہیں کیا گیا۔

اُن پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا۔

وہ کسی عدالت میں پیش نہیں کئے گئے۔

کوئی باقاعدہ قانونی شہادت اُن کے خلاف پیش نہیں کی گئی۔

جبکہ مولانا کے اپنے ہی راوی کے مطابق مولانا کی یہ تینوں باتیں غلط ہیں۔

کیونکہ راوی کے بقول ان پر مقدمہ بھی چلایا گیا ہے، اُن کو عدالت کے سپرد بھی کیا گیا ہے، ان کے خلاف قانونی شہادت حاصل کرنے کا اہتمام بھی بخوبی ہوا ہے۔

گورنر خود ایک اعلیٰ عدالت ہے اور اسلامی دستور کے مطابق گورنر کی عدالت ہائیکورٹ کا درجہ رکھتی ہے جبکہ امیرالمومنین کی عدالت کو سپریم کورٹ کی حیثیت حاصل ہے۔

گورنر نے ملزمان کو گرفتار کر کے اُن کے مقدمہ کی سماعت بلاواسطہ خود کی اور انہیں اپنی صفائی کا بھرپور موقع مہیا کیا۔

گورنر نے قانونی شہادت کی سب سے نازک اور سب سے اہم صورت کو اختیار کیا اور مقدمہ کا فیصلہ ملزمین کی قسم پر چھوڑ دیا۔

قسم ایک ایسی شہادت ہے جو ملزم کو اپنی براءت کے لئے سارے ہی ممکنہ وسائل جمع کر کے پیش کر دیتی ہے اور ملزم کا فیصلہ خود ملزم کے ہی سپرد کر دیتی ہے کہ اقرأ کتابك كفى بنفسك اليوم عليك حسيبا۔

کہ اپنی کتاب آپ ہی پڑھ لے اور تُو خود ہی بتا کہ تیرے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے۔

قسم فیصلے کی سب سے قریب تر اور سب سے آسان صورت ہے، گورنر نے ملزمین میں سے ہر کسی کو ہی یہ کھلی چھٹی دے دی کہ جس نے اپنے فعل سے مکرنا ہو وہ مکر جائے اور اس کے مکر جانے پر اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی۔

ایسی صورت میں کوئی بتلائے کہ باہر سے گواہوں کو لانے کی کیا ضرورت باقی

رہ گئی تھی اور تاریخ پر تاریخ دینے کے انگریزی قانون پر عمل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

شریعت کے فیصلے فریقین مقدمہ کو ہر قسم کی سہولت دیتے ہیں اور انہیں مقدمات کے چکر میں ڈال کر ان کے لئے نئی مشکل پیدا نہیں کرتے۔ ایسی سہولتوں میں سب سے بڑی سہولت خود ملزم کو قسم دینا اور اس کی قسم پر ہی مقدمہ کا فیصلہ کرنا ہے۔

یہاں بھی گورنر نے یہی صورت اختیار کی اور ملزمین سے قسم طلب کرکے انہیں گویا یہی کہا کہ اگر کوئی مکر جائے گا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے ہم یہاں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔

پھر جنہوں نے قسم کھانے سے انکار کیا۔ اُنہوں نے صریحًا اس بات کا اقرار اور اعتراف کیا کہ وہ سنگباری کا الزام درست تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد گورنر نے جو فیصلہ کیا وہ غلط تھا۔ تاہم اگر فی الواقعہ بھی ایسا کوئی حادثہ وقوع میں آیا ہوتا تو وہ خود حضرت معاویہؓ کے اپنے ذرائع سے ہی ان کے نوٹس میں آجاتا ورنہ مظلومین کے ورثاء اس ظلم کی اطلاع حضرت معاویہؓ تک ضرور پہنچاتے اور ایسی صورت میں حضرت معاویہؓ ضرور مناسب کارروائی کرتے، اُن مقطوع الید لوگوں اور اُن کے ورثاء کو ضرور مطمئن کرتے اور ان کی دیت ضرور ادا کرتے۔

لیکن ہم مولانا کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کی پیش کردہ یہ روایت ان کی پیش کردہ دوسری بہت سی روایات کی طرح ہی غلط اور خود ساختہ ہے۔ اور ہم نے یہ ساری بحث حضرت مولانا کے اعتراض میں ہی کی ہے ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مولانا کو علم ہے کہ کوفہ میں حجرؓ بن عدی اپنی تمام تر صلاحیتوں اور کارفرمائیوں کے ساتھ حکومت کا مقابلہ کر رہے تھے۔ حجرؓ خود بھی اس خطبہ میں موجود تھے۔ اگر ہاتھ کاٹنے کی روایت صحیح ہوتی تو سب سے پہلے حجرؓ کا

ہاتھ کاٹا جاتا کیونکہ ان کی کلوخ اندازی اور مولانا کے الفاظ میں کنکریاں چلانا ایک عام بات تھی۔ زیاد کا یہ کوفہ میں پہلا خطبہ تھا اور اس خطبہ میں حجرؓ نے بلا شبہ بہت گڑبڑ کی تھی مگر گورنر نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ وہ یہاں اپنی جگہ عمرو بن حریث کو حاکم مقرر کر کے واپس بصرہ چلا گیا تھا جب کہ مولانا کے مظلومین نے نئے حاکم کوفہ کو مار مار کر کوفہ سے بھگا دیا اور زیاد کو دوبارہ آکر انہیں بحال کرنا پڑا جس کا ذکر "ہم حالات میں تبدیلی" کے زیرِ عنوان طبری کے حوالہ سے کر آئے ہیں۔

پس مولانا اپنا غصہ تھوک دیں، وہاں اگر کوئی ہاتھ کاٹے گئے ہوتے تو جناب حجرؓ حکومت کے خلاف اپنی بغاوت میں اس واقعہ کو حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کا خصوصی ذریعہ بناتے جبکہ اس پوری دار و گیر میں ایسی کوئی بھنک بھی سنائی نہیں دی۔

بُسر بن اَبی اَرطاۃ

مولانا کی ترتیبِ بیان میں یہاں بسر بن ابی ارطاۃ کا ذکر ہوا ہے۔ مگر ہم اس کا تذکرہ آگے چل کر "محمد بن ابی بکرؓ" کے ضمن میں کریں گے کہ اس باب کی جوابی گزارشات کا اصل مقام وہیں ہے۔

فصل نہم

وحشیانہ کاروائیاں

سر کاٹنا

مودودی صاحب حضرت معاویہ کی ایک وحشیانہ کاروائی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا (معاویہؓ کے) اسی دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا۔

سب سے پہلا سر جو زمانہ اسلام میں کاٹ کر لے جایا گیا وہ حضرت عمارؓ بن یاسر کا سر تھا..... جنگِ صفین میں حضرت عمارؓ کا سر کاٹ کر حضرت معاویہؓ کے پاس لایا گیا اور دو آدمی اس پر جھگڑ رہے تھے۔ ہر ایک کہتا تھا کہ عمارؓ کو میں نے قتل کیا ہے۔

اس کے بعد دوسرا سر عمرو بن الحمق کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے تھے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں اُنہوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ زیاد کی ولایتِ عراق کے زمانہ میں ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی، وہ بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے۔ وہاں ایک سانپ نے ان کو کاٹ لیا اور وہ مر گئے۔ تعاقب کرنے والے ان کی مُردہ لاش کا سر کاٹ کر زیاد کے پاس لے گئے اُس نے حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق میں بھیج دیا، وہاں اُسے برسرِ عام گشت کرایا گیا اور پھر لے جا کر اُن کی بیوی کی گود میں ڈال دیا گیا[1]

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۷۷

مولانا نے اس سر کاٹنے کی مہم میں بہت سے سروں کا ذکر کیا ہے جو کاٹے گئے اور لوگ اُنہیں لئے پھرتے رہے مگر ہم اپنی گفتگو کو اُن دو ہی سروں تک محدود رکھیں گے جن کا رشتہ مولانا نے حضرت معاویہؓ کی قیادت میں اُن کے دور کی وحشیانہ کاروائی قرار دیا ہے۔

ان میں پہلا سر حضرت عمارؓ بن یاسر کا ہے جسے مولانا کے راوی نے ان کے تن سے جُدا کر کے حضرت معاویہؓ کے سامنے لا رکھا جس پر دو شخص جھگڑا کر رہے تھے ایک کہتا تھا کہ یہ سر میں نے کاٹا ہے اور دوسرا کہتا تھا کہ یہ میری شجاعت کا کارنامہ ہے۔

بہ صریحًا ایک یادرہوا بات ہی تھی یہی وجہ ہے کہ اس کے آگے نہ راوی کچھ بتا سکا اور نہ مولانا ہی کوئی کھوج لگا سکے کہ پھر حضرت معاویہؓ نے اس سر کا کیا کیا۔

مگر حقیقتِ حال کو جاننے کے لیے ہم حضرت عمارؓ کے قتل کا پورا واقعہ ہی اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کئے دیتے ہیں، علامہ طبری لکھتے ہیں:

(صفین کی جنگ میں) عمارؓ آگے بڑھتے ہوئے (اپنے ساتھی ہاشم) سے کہہ رہے تھے **ہاشم**! آگے بڑھ کیونکہ جنت تلواروں کے سائے کے نیچے ہے اور موت تلواروں کی دھاروں میں پوشیدہ ہے، آسمان کے دروازے کھل چکے ہیں اور حوریں بناؤ سنگھار کر چکی ہیں۔ آج میں اپنے دوستوں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت) سے ملاقات کروں گا۔ عمارؓ اور ہاشم پھر واپس نہ لوٹ سکے۔ اور میدانِ جنگ میں قتل ہو کر گر گئے [1]

یہ بات تعجب کی ہی ہے کہ جناب طبری حضرت عمارؓ کے قتل کی خبر تو دیتے ہیں مگر ان کے سر والی بات اُن سے پوشیدہ رہ گئی اور ایک طبری پر ہی کیا موقوف ہے عمار کا سر کاٹنے کی خبر نہ ابن اثیر کو ہو سکی اور نہ ابن کثیر کو، نہ ابن خلدون کو

---

[1] طبری جلد ۳ صہ ۴۸۳

اس کا پتہ چلا نہ ابن حجر کو۔

اب یہ بات بھی ظاہر ہے کہ عمارؓ کے سر کو معاویہؓ کے حضور پیش کرنے کا مقصد صرف حضرت معاویہؓ کو حضرت عمارؓ کے قتل کا یقین دلانا ہی تھا۔

حضرت عمارؓ حضرت علیؓ کے ایک نہایت درجہ قریبی اور معتمد ساتھی تھے حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک تھے اور اب تک قاتلینِ عثمانؓ کے ساتھ تھے۔ اور ان کی حمایت میں سرگرم تھے، ان کا قتل یقیناً معاویہؓ کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک یہ سر حضرت معاویہؓ کے حضور پیش نہ ہو سکا ہوگا۔ حضرت معاویہؓ کو حضرت عمارؓ کے قتل کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہو سکی ہوگی۔ لیکن اب آیئے اگلی بات بھی طبری سے ہی سنیئے وہ لکھتے ہیں:

ابوعبدالرحمٰن السلمی (حضرت علیؓ کا ایک حامی) کہتا ہے کہ جب رات ہوگئی تو میں نے ارادہ کیا کہ میں دشمنوں (یعنی فریق معاویہؓ) میں جاؤں اور معلوم کروں کہ آیا ہماری طرح ہمارے دشمنوں کو بھی عمارؓ کے قتل ہو جانے کا معلوم ہے یا نہیں!

اور چونکہ جنگ جب بند ہو جاتی تھی تو فریقین کے لوگ آپس میں عام طور پر ملتے اور باتیں کیا کرتے تھے۔ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور آہستہ آہستہ پھرتا پھراتا شامیوں کے لشکر کی طرف نکل گیا۔

جب میں شامی لشکر کی حدود میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا چار آدمی میدانِ جنگ میں گھوم پھر رہے ہیں۔ میں نے اُن سب کو ہی پہچان لیا یہ چار آدمی معاویہؓ، ابوالاعور السلمی، عمروؓ بن العاص اور عبداللہؓ بن عمرو بن العاص تھے۔ آخرالذکر (عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص) ان چاروں میں سب سے بہتر شخص تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا تاکہ ان کی باتیں سن سکوں۔ چلتے چلتے عبداللہؓ ایک لاش کے پاس سے گزرا اور مقتول کو پہچان کر وہاں کھڑا ہو گیا۔

اور اپنے باپ (عمروؓ بن العاص) سے کہنے لگا ابا جان! تم نے آج اس شخص (عمارؓ) کو بھی قتل کر دیا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں کچھ فرمایا تھا۔ عمروؓ بن العاص نے دریافت کیا کہ حضورؐ نے کیا فرمایا تھا؟ (اس کے بعد عبداللہؓ نے وہ روایت بیان کی جو عمارؓ کے سلسلہ میں مشہور ہے)۔[1]

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمارؓ کی لاش دوسری لاشوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں پڑی تھی اور عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص نے ان کو پہچان کر اپنے باپ سے اُن کا ذکر کیا۔

حضرت معاویہؓ بھی اس گروہ میں شامل تھے اور انہیں بھی عمارؓ کے قتل کی خبر ہو گئی تھی اور اُنہوں نے بھی ان کی لاش دیکھ لی تھی۔ عبداللہؓ کے منہ سے اُنہوں نے بھی حدیثِ رسولؐ کو سنا اور اُنہوں نے اس کی تاویل بھی کی اور یہ ساری تفصیل طبری کی اس روایت میں درج ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب معاویہؓ بچشم خود حضرت عمارؓ کی لاش کو دیکھ چکے تھے تو اب اُن کا سر اُن کے حضور پیش کرنے کی کیا تک تھی۔ اگر کہا جائے کہ سر کو گشت کرانا مقصود تھا تو یہ بات بھی صحیح نہیں کیونکہ نہ یہ ثابت ہے کہ معاویہؓ نے اس بات کے لئے کوئی حکم دیا اور نہ سر کا گشت کرانا ہی کسی راوی سے منقول ہے۔

یہ مرحلہ اس جنگ کا نازک ترین مرحلہ تھا جبکہ فریقین ہی اس قتلِ عام پر وحشت میں ڈوبے تھے پھر اچانک ہی قرآنِ پاک کے دخل سے فریقین کی تلواریں نیام میں واپس چلی گئیں۔ قرآنِ پاک سے فیصلہ طلب کرنے پر فریقین میں ایک معاہدہ عمل میں آیا اس کے بعد فریقین نے اپنے اپنے مقتولین کو جمع کیا اور ان کی تدفین عمل میں لائی گئی۔ ان لاشوں میں حضرت عمارؓ کی صحیح سالم لاش بھی تھی۔ الاستیعاب مولانا کی مسلمہ معتبر تاریخ ہے۔ صاحب الاستیعاب

---

[1] طبری جلد ۳ صفحہ ۲۴۹

علامہ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں :

دفنہ علی رضی اللہ عنہ فی ثیابہ ولم یغسلہ [1]

کہ حضرت علیؓ نے ان کو (شہداء کے عام دستور کے مطابق) اُنہی کے کپڑوں میں غسل دیئے بغیر دفن کیا۔

لیکن مولانا اگر بضد ہی رہیں کہ نہیں صاحب! حضرت عمارؓ کا سر ضرور کاٹا گیا تھا تو اس ضد کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

دوسرا واقعہ

دوسرا سر جو مولانا نے حضرت معاویہؓ کے ذمہ لگایا ہے وہ عمرو بن الحمق کا سر ہے۔

حضرت عمارؓ کے سر کے بارے میں تو مولانا کو زیبِ داستان کے لئے بھی کچھ معلومات حاصل نہیں ہو سکی تھیں مگر ابن الحمق کے باب میں آپ نے بہت کچھ ڈھونڈھ نکالا ہے مولانا کا کہنا ہے۔

دوسرا سر عمرو بن الحمق کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے تھے مگر حضرت عثمانؓ کے قتل میں انہوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ زیاد کی ولایتِ عراق کے زمانہ میں ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی وہ بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے، وہاں ایک سانپ نے ان کو کاٹ لیا اور وہ مر گئے۔ تعاقب کرنے والے اُن کی مُردہ لاش کا سر کاٹ کر زیاد کے پاس لے گئے، اُس نے حضرت معاویہؓ کے پاس بھیج دیا، وہاں اُسے سرِ عام گشت کرایا گیا اور پھر لے جا کر اس کی بیوی کی گود میں ڈال دیا گیا [2]

افسوس ہے کہ مولانا کی بیان کردہ یہ کہانی از سرتا پا غلط، وضعی، اختراعی اور خلافِ واقعہ ہے اور اس میں سرِ مُو بھی صداقت موجود نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب کے ممدوح یہ حضرت ابن الحمق اُن پاکباز نور نژاد نفوسِ قدسیہ میں سے ایک قدسی نفس بزرگ تھے جنہوں نے خلیفہ سوم اور دامادِ رسولؐ

---

[1] الاستیعاب جلد ۲ صـ ۴۸۱ [2] خلافت و ملوکیت صـ ۱۷۴

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اُن کے گھر جا کر ذبح کیا، اپنے دستِ مبارک سے حضرت عثمانؓ کے دل و جگر پر نیزوں کے زخم دیئے اور ان کی پسلیاں توڑیں اور پھر یہ بزرگوار حضرت عثمانؓ کے قصاص میں اسی وقت سے ہی مطلوب تھے۔

ہم نے ان بزرگوار کا اجلال و احترام اس لئے ملحوظ رکھا ہے کہ مولانا اُن کے اس عظیم کارنامہ کی وجہ سے ان کا ذکر بڑے ادب اور احترام سے کرتے ہیں اور ان کی مرگ پر بہت غمزدہ ہیں۔ ان کے لئے مولانا کی نوازش کا یہ پہلو بالکل مثالی ہے۔ جب لکھا:

"وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے تھے اور حضرت عثمانؓ کے قتل میں اُنہوں نے بھی حصہ لیا تھا۔"

جیسے یہ کوئی بڑے ثواب کا کام تھا جو اُنہوں نے سرانجام دیا اور اسی وجہ سے مولانا کو ان کی موت کا غم بھی زیادہ ہے۔ اور وہ ان کا ذکر بڑے ہی ادب احترام سے کرتے ہیں طبری لکھتے ہیں:

یہ بزرگوار کوفہ میں جناب حجر بن عدی کی جماعت کے سرگرم رکن تھے اور حجر کے ساتھی جن مقامات پر اکثر جمع ہوتے ان میں ایک ان حضرت کا گھر بھی تھا۔ یہ لوگ جمع ہو کر حکومت کے خلاف سوچتے تھے، زیاد گورنر کوفہ کو ان کی سرگرمیوں کی خبر ملی تو اس نے ان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ انہیں پتہ چل گیا اور یہ اپنے ایک ساتھی رفاعہ بن شداد کے ساتھ کوفہ سے بھاگ نکلے۔

یہ لوگ پہلے مدائن پہنچے پھر موصل چلے گئے یہاں اُنہوں نے ایک پہاڑی غار میں پناہ لی (اور اپنی پہلی سازشوں میں مصروف ہو گئے)

اس علاقہ کے حاکم مجاز عبداللہ بن ابی بلتعہ کو کسی نے مخبری کی کہ یہاں پہاڑی غار میں دو آدمی کتنے ہی دنوں سے چھپے بیٹھے ہیں، نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں اور یہاں کیا کرتے ہیں۔

حاکم کو بجا طور پر شبہ گزرا اور اس نے سواروں کے ایک دستہ کے ساتھ پہاڑ کا

رخ کیا۔ یہ لوگ پہاڑ کے قریب پہنچے تو چھپے بیٹھے دونوں شخص (صورت حال کو نازک پاکر) غار سے باہر نکل آئے۔ عمرو بن الحمق کے پیٹ میں پانی پڑ گیا تھا اور وہ کافی کمزور ہو گیا تھا مگر رفاعہ تندرست و توانا اور بڑی قوت کا مالک تھا وہ تلوار لے کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور عمرو بن الحمق سے کہنے لگا کہ میں تمہاری طرف سے لڑائی کروں گا۔ عمرو نے جواب دیا تمہارے جنگ کرنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا تم اپنی جان بچاؤ اور محاصرہ توڑ کر نکل جانے کی کوشش کرو۔ یہ سن کر وہ آگے بڑھا اور محاصرہ کرنے والوں پر حملہ کر دیا اور لڑتا بھڑتا محاصرہ توڑ کر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔

مخالف دستہ نے اس کا تعاقب کیا مگر یہ ایک مشاق قدر انداز تھا، سوار جونہی قریب پہنچتے یہ لوٹ کر انہیں تیروں پر رکھ لیتا اور تعاقب کرنے والوں کے گھوڑے بیکار کر دیتا۔ بالآخر ان لوگوں نے اس کا تعاقب ترک کر دیا۔ اور عمرو بن الحمق کو گرفتار کر لیا انہوں نے بہت کوشش کی کہ گرفتار شدہ کا پتہ چل سکے کہ یہ کون ہے، مگر انتہائی کوشش اور پوچھ گچھ کے باوجود ان کے کچھ پلے نہ پڑا اور وہ اپنا اتہ پتہ دینے پر تیار نہ ہوا تاہم اس نے اتنا کہا کہ اگر تم مجھے چھوڑ دو گے تو تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر قتل کر دو گے تو تمہارے لئے برا ہوگا جب اس کے متعلق کچھ پتہ نہ چل سکا تو حاکم نے اسے موصل کے عامل عبدالرحمٰن الثقفی کے پاس بھیج دیا۔ یہ وہاں پہنچا تو عبدالرحمٰن نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ ذات شریف عمرو ابن الحمق ہیں۔ تاہم موصل کے عامل نے اس کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی اور سارا واقعہ امیر المومنین حضرت معاویہؓ کو لکھ بھیجا اور اس بارے میں ان سے ہدایات طلب کیں۔

حضرت معاویہؓ نے جواب دیا کہ عمرو نے نیزے کے بھالے سے حضرت عثمانؓ پر نو وار کئے تھے تم بھی اسے بالکل ویسی ہی سزا دو اور نیزے کے بھالے سے نو طعن کرو۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق عمل کیا گیا۔[1]

---

[1] طبری جلد ۴ صہ ۱۰۹ - ۱۱۰

یہ ہے جناب عمرو بن الحمق کی وہ کہانی جو حضرت مولانا مودودی صاحب کے مسلمہ معتبر مورخ جناب طبری نے بیان کی یعنی نہ اُسے سانپ نے ڈسا، نہ اس کا کسی نے سر کاٹا نہ وہ سر دمشق پہنچا اور نہ اُسے بازاروں میں گشت کرایا گیا۔ مگر مولانا نے پہلے اس ظالم اور خلیفۂ رسول کے قاتل کو مظلوم ظاہر کیا، پھر ایک ظالم حکومت کے ظلم و ستم سے بچانے کے لئے اُسے ملک ملک دوڑایا پھر کسی غار میں چھپایا پھر اُسے سانپ سے ڈسوایا پھر اس کا سر تن سے جُدا کروایا پھر حضرت معاویہؓ کے ہاں پہنچایا اور پھر اُسے بازاروں میں گشت کروایا اور اس طرح حضرت مولانا نے بکمال صنعت وہ آیا وہ آئے تو آیا تم آئے میں آیا ہم آئے کے ساتھ غائب حاضر اور متکلم کے سارے ہی صیغوں کی گردان مرتب کر ڈالی اور بالآخر یہ جھوٹ حضرت معاویہؓ کی جھولی میں ڈال دیا۔

سبحان اللہ کسی مظلوم کی حمایت ہو تو ایسی ہی ہو۔ بقول مرزا غالب ؎

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

کوئی مولانا سے پوچھے کہ ان ذات شریف کے متعلق تو آپ کو اطلاع پہنچ گئی کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے مگر آپ کو حضرت عثمانؓ کے بارے میں کسی نے نہ بتایا کہ وہ نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اُن کے ارشد خلیفہ تھے بلکہ اُن کے دوہرے داماد بھی تھے۔ اب یہ شخص مظلوم مرا ہے تو کیا وہ ظالم تھے جن کو اس شخص نے قتل کیا تھا؟ جن پر تلواروں کے وار ہوئے جن پر نیزوں کے وار ہوئے، جن پر خنجروں کے وار ہوئے، جن کو ذبح کیا گیا، جن کی ہڈیاں اور پسلیاں توڑی گئیں، جن کا لاشہ بے دفن و کفن تین رات دن تک حرم مدینہ میں پڑا مسلمانوں کی غیرت کے لئے چیلنج بنا رہا۔ عمرو بن الحمق کو وہی سزا ملی ہے جس کے وہ لائق تھا، اس نے عثمانؓ کو قتل کیا تھا اُن کے قصاص میں قتل ہوا۔

اُس نے عثمانؓ پر نیزے کے نو وار کئے جو اُسے واپس لوٹا دیئے گئے۔ اس سے بڑھ کر یہاں اور کیا عمل میں آیا ہے۔

کیا سر کاٹنا ہر حالت میں ہی وحشیانہ کاروائی ہے؟

کسی کا سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا اگرچہ شرع کے نزدیک ضروری نہیں لیکن کسی ملّی ضرورت اور مصلحت سے اگر ایسا کرنا پڑے تو اس میں شرعی رکاوٹ بھی کوئی نہیں ہے بلکہ کبھی ایسا کرنا ناگزیر بھی ہوتا ہے۔ مگر یہ بڑی ہی عجیب بات ہے کہ مولانا نے سر کاٹنے کا جب بھی ذکر کیا ہے اُسے غیر شرعی اور وحشیانہ کاروائی ہی کہا ہے۔ آخر مولانا کو یہ غلط فہمی کیوں ہو گئی ہے کہ تاریخ وہی ہے جسے وہ تاریخ کہہ دیں اور شرعی کام وہ ہے جسے مولانا شرعی قرار دیں اور جسے غیر شرعی کہہ دیں وہ بہر حال غیر شرعی ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ اُسے غیر شرعی سمجھیں۔ آخر یہ پوزیشن مولانا کو کب سے اور کہاں سے حاصل ہوئی ہے۔ حیرت ہے کہ وہ جانتے بوجھتے بھی کس جسارت سے کہتے ہیں۔

سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا اسی (معاویہؓ کے) دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا[1]

مولانا کے الفاظ میں کوئی ابہام نہیں، بڑی صاف بات ہے کہ:

- کسی کا سر کاٹنا ایک وحشیانہ طریقہ ہے اور غیر شرعی فعل ہے۔
- یہ اسلام سے پہلے تو رائج تھا مگر اسلام نے اس کو مٹا دیا۔
- اس وحشیانہ کاروائی کو پھر حضرت معاویہؓ نے مسلمانوں میں رائج کیا۔

تو آیئے مولانا کی تحریر کو تاریخ کی ترازو میں رکھ کر دیکھیں کہ مولانا کی بات حق سے کتنی قریب ہے اور اصلیت سے کتنی ہٹی ہوئی ہے۔ مولانا کو محض

---

[1] خلافت و ملوکیت صد ۱۷۷

حضرت معاویہؓ ہی جینے نہیں دیتے ورنہ اُنہیں معلوم ہے کہ بدر کی لڑائی ختم ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کے انجام کی خبر حاصل کرنے کے لئے حضرت عبداللہ بن مسعود کو بھیجا، اُنہوں نے اسے مقتولین میں پڑا پایا۔ مگر ابھی جان باقی تھی اُنہوں نے اس کا سر کاٹ لیا اور لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا [۱]

مورخ نجیب آبادی تحریر کرتے ہیں کہ :

لشکرِ اسلام فتح حاصل کر چکا تو آنحضرت صلعم نے حکم دیا کہ ابوجہل کی نسبت تحقیق کرو اس کی لاش میدان میں ہے یا نہیں!

یہ حکم پاتے ہی عبداللہ بن مسعود مقتولین کی لاشیں دیکھنے کو چلے۔ ابوجہل کو دیکھا کہ نیم مردہ پڑا ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے اور کہا او دشمنِ خدا! دیکھ تجھ کو خدا نے کیسا ذلیل کیا۔

ابوجہل نے پوچھا کہ لڑائی کا نتیجہ کیا ہوا؟ عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ مسلمانوں کو فتح اور کفار کو ہزیمت ہوئی۔ یہ کہہ کر عبداللہ بن مسعود جب اس کا سر کاٹنے لگے تو اس نے کہا میری گردن مونڈھوں سے ملا کر کاٹنا تاکہ میرا سر دوسرے کٹے ہوئے سروں میں بڑا معلوم ہو اور سمجھا جائے کہ یہ سردار کا سر ہے۔

عبداللہ بن مسعود اس کا سر کاٹ کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں لائے۔ اور آپ کے پاؤں میں ڈال دیا۔ آپ نے ابوجہل کا سر دیکھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا [۲]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں کہ :

مسجد الحرام میں نماز تیار تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی امامت فرما رہے تھے۔ تین آدمی مسجد کے دروازے پر بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ آئے اور اُنہیں کہا کہ اٹھو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھو۔ اس پر

---

[۱] سیرۃ النبیؐ شبلی نعمانی جلد اول صہ ۳۰۳ [۲] تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں جلد اول صہ ۱۵۹

دو آدمی تو اٹھ کر اندر چلے گئے مگر ایک شخص جس کا نام ابوجحش اللیثی تھا بیٹھا رہا اور کہنے لگا کہ میں تو اس وقت اندر جاؤں گا۔ جب کوئی شخص مجھے گرا کر میرا منہ مٹی پر رگڑے، اس پر حضرت عمرؓ نے اسے دبوچ لیا اور گرا کر اس کا منہ مٹی پر رگڑا...... نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ سنا تو فرمایا:

یَا عُمَرُ! وَاللّٰہِ لَوَدِدْتُ اِنَّکَ کُنْتَ جِئْتَنِیْ بِرَأْسِ الْخَبِیْثِ۔

عمر! اللہ کی قسم مجھے بہت خوشی ہوتی اگر تم اس خبیث کا سر قلم کر کے میرے پاس لاتے[1]

اب دیکھئے ابوجہل کے سر کی نمائش جہاں ایک طرف اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کا ایک پُرشکوہ رُخ تھا جس کی وجہ سے مدینہ اور مدینہ کے آس پاس مسلمانوں کی شجاعت کی دھاک بیٹھ گئی وہاں یہ امر کفار اور مسلمان دشمن لوگوں کے لئے عبرت اور ہیبت کے دو پہلو بیک وقت اپنے اندر رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی اقدام سے پہلے ہزار بار سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ یہی مطلب ہے اس آیۂ مبارکہ کا جہاں فرمایا کہ:

فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ (الانفال)

کہ جو سامنے آ گئے ہیں ان کو ایسی عبرت ناک سزا دو کہ جو پیچھے کھڑے حملہ کے لئے سوچ رہے ہیں وفورِ دہشت سے منتشر ہو جائیں۔

سر کاٹنے کے لئے حضور کی اپنی خواہش پر مشتمل یہ دوسرا واقعہ ایک مسلمان کی ذات سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جو شخص مسجد کے دروازہ پر بیٹھا اندر جانے کی شرطیں پیش کر رہا تھا اسلام کا مدعی ہی تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نماز ادا کرنے کی تحریک پر جو گستاخانہ رویہ اختیار کیا سخت قسم کا استہزاء تھا اور اگر اس پر سختی نہ ظاہر کی جاتی تو یہ دینی اعمال کے بارے میں ہر قسم کی گستاخی اور استہزا پر دلیری کی دعوت ہوتی۔

---

[1] ازالۃ الخفا شاہ ولی اللہؒ فصل ہشتم ص۲۶۵

اب یہ بات تو الگ ہے کہ وہ شخص قسمت کی خوبی سے بچ نکلا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گستاخ کا سر کاٹ کر اس کی نمائش کا ارادہ کر لیا تھا۔ تاکہ آئندہ منافقین کو ارکانِ دین کے بارے میں کسی استہزا اور شوخ چشمی کی جرأت نہ ہو۔ ارکانِ دین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی رویہ ورجحان کو دیکھ کر حضرت امام ابو حنیفہؒ نے بے نماز کو قید کر رکھنے اور حضرت احمدؒ بن حنبل نے اُس کے قتل اور اُس کی نماز جنازہ سے انکار اور اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرنے کا فتویٰ دیا تھا۔

اب ہمارے مولانا مودودی ہیں کہ وہ ایسی ہر کاروائی کو غیر شرعی اور وحشیانہ کاروائی ہی کہتے ہیں اور اس فعل کو خواہ وہ جیسے بھی ناگزیر حالات میں اختیار کیا گیا ہو جاہلیت کا رواج ہی کہتے ہیں۔ تو کوئی بتائے کہ ہمارے پاس اس کا کیا علاج ہے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ ان واقعات سے بے خبر ہوں گمان کی آنکھوں پر اُن کے مصالح نے معاویہؓ دشمنی کی جو پٹی باندھ دی ہے وہ انہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رعایت دینے پر بھی آمادہ نہیں ہونے دیتی اللہ اکبر ؎

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

اور یہ بات ہم عرض کر ہی چکے ہیں کہ یہ کاروائی ہمیشہ ضروری نہیں ہے، چنانچہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب اُن کے پاس ایک بطریق (نصرانی رہنما) کا سر کاٹ کر پیش کیا گیا تو آپ نے اسے غیر ضروری کہا اور فرمایا کہ اس کے قتل کی بس اطلاع ہی کافی تھی اور جس کی وجہ یہی تھی کہ وہ کوئی اہم شخصیت نہیں تھا کہ اُس کے سر کی نمائش سے کوئی سیاسی یا دینی نفع مل سکتا۔ ورنہ حضرت ابو بکرؓ نے کسی ناگزیر حالت میں سر کے کاٹنے سے انکار نہیں کیا تھا۔

محمد بن ابی بکر مودودی صاحب نے حضرت امیر المومنین معاویہؓ کی وحشیانہ

کاروائیوں میں سے ایک سخت وحشیانہ کاروائی محمد بن ابی بکر کا قتل اور اس کی لاش کا جلا دینا بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:

ایسا ہی وحشیانہ سلوک مصر میں محمد بن ابی بکر کے ساتھ کیا گیا جو وہاں حضرت علیؓ کے گورنر تھے۔ حضرت معاویہؓ کا جب مصر پر قبضہ ہوا تو انہیں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور پھر ان کی لاش ایک مردہ گدھے کی کھال میں رکھ کر جلا دی گئی۔ لہ

محمد بن ابی بکر کے ساتھ بھی مولانا کا وہی رشتہ محبت مودت ہے جو انہیں اپنی سیاسی اور انتخابی اغراض سے کسی بھی عثمانؓ دشمن شخص کے ساتھ استوار رکھنا ناگزیر ہے اور جس رشتہ کی وجہ سے وہ حجر اور ابن الحمق کے قتل پر احتجاج کر چکے ہیں۔ یہ بزرگوار محمد بن ابی بکر کہنے کو تو حضرت ابوبکرؓ کے ہی بیٹے تھے مگر اُن سے ساری عمر ابوبکرؓ کے بیٹوں کی سطح پر کوئی کام نہ ہو سکا۔ ان کی حالت قرآن کریم کی اس آیہ مبارکہ کے مطابق ہی تھی جہاں ارشاد ہے اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد ان کی والدہ سے حضرت علیؓ نے نکاح کر لیا اور پھر یہ انہی کے گھر میں پلے اور بڑے ہو کر ایک مہم جُو اور طالع آزما قسم کے شخص بنے۔ تاہم وہ اپنی زندگی بھر حضرت علیؓ کے وفادار رہے اور ہمیشہ ان کے لئے ہی سرگرم رہے۔

ان بزرگوار نے کھُلے بندوں حضرت عثمانؓ کے قتل میں حصہ لیا، قتل کی سازش کی، سازشیوں سے رابطہ رکھا، سازش کو پروان چڑھایا۔ سازشی جب مدینہ منورہ میں آتے تو اُن کے پاس ٹھہرتے۔ وہ اُن سے مشورہ طلب کرتے اور یہ انہیں مشورہ دیتے۔ غرض محمد بن ابی بکرؓ کا گھر مدینہ منورہ میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے باغیوں، اُن کے خلاف بلوہ کرنے والوں، اور ان کو قتل کرنے والوں کی پناہ گاہ بھی تھا اور کمین گاہ بھی۔ حضرت عثمانؓ کے قتل کے مرحلہ پہ

لہ خلافت و ملوکیت صد ۱۷۸

یہ پہلا شخص تھا جس نے حضرت عثمانؓ کو ڈاڑھی سے پکڑ کر ہلایا اور کہا کہ او بوڑھے! ہلا اپنے حامیوں کو کہاں چلے گئے ہیں وہ تیری حفاظت کرنے والے اور تیرا دفاع کرنے والے۔

اس شخص نے قاتلوں کی رہنمائی کی، قتل میں مدد دی اور قتل میں شریک ہوا۔ یہ ہے اس بزرگوار کی کوالیفکیشن اور یہ ہے اس کا مقام رفیع اور یہ ہے اس کا شخص جس پر مولانا سوگوار ہیں۔

یہ شخص حضرت عثمانؓ کا قاتل ہونے کی وجہ سے قصاص میں مطلوب تھا جب مل گیا تو اُسے قصاص میں قتل کر دیا گیا اس کی کہانی حضرت عثمانؓ کے قتل سے لے کر ان کے قصاص میں قتل ہو جانے تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اس سلسلہ میں جو چند بحثیں مولانا نے مزید پیدا کی ہیں ہم اس ضمن میں بھی اپنی گزارشات پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر مولانا کی روایت ہی صحیح ہے کہ اُسے جلا ڈالا گیا تو یہ ایک سنگین حرکت ہے اور سخت قابلِ مذمت ہے مگر ہمیں یہ بات ضرور دریافت کر لینی چاہیئے کہ یہ قابلِ مذمت حرکت کیوں عمل میں آئی جبکہ اس کا صرف قتل کرنا ہی کافی تھا۔

محمد بن ابی بکر کو جن حالات میں حضرت علیؓ نے مصر کا گورنر مقرر کیا یہ کوئی مناسب تدبیر نہیں تھی اور نہ خود یہ شخص ہی کچھ ایسا اہم تھا کہ اُسے اتنی بڑی ذمہ داری کا منصب دے دیا جاتا۔ اس کی قابلیت سوائے اس کے کوئی نہیں تھی کہ وہ حضرت علیؓ کا وفادار تھا اس کے سوائے اس میں کوئی خوبی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ بعد میں حضرت علیؓ خود بھی اپنی اس تدبیر پر پشیمان تھے۔ اور وہ اپنی اس تدبیر کی غلطی کو تسلیم کرتے تھے۔ علامہ طبری لکھتے ہیں:

ابو مخنف نے فضل بن خدیج کے ذریعہ مالک بن الحور کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ایک روز حضرت علیؓ نے فرمایا۔ اللہ محمد بن ابی بکر پر رحم کرے وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ خدا کی قسم کاش میں مصر پر ہاشم بن عتبۃ المرقال کو امیر بنا دیتا تو وہ عمرو بن العاص

اور اس کے فاجر مددگاروں کے لئے میدان خالی نہ چھوڑتا۔ وہ اگر قتل بھی ہوتا تو اس حالت میں قتل ہوتا کہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہوتی اور وہ محمد بن ابی بکر کی طرح خون بہائے بغیر قتل نہ ہوتا [1]

اور حضرت علیؓ کے اس اظہارِ پشیمانی کا ہی نتیجہ ہے جو مولانا نے اس باب میں یہ ارشاد کیا ہے کہ محمد بن ابی بکر کو گورنری کا عہدہ دینے کا فعل ایسا تھا جس کو کسی تاویل سے بھی حق بجانب قرار دینے کی کوئی گنجائش مجھے نہیں مل سکی [2] ورنہ حضرت علیؓ اگر اپنی غلطی کا اعتراف خود ہی نہ کر چکے ہوتے تو مولانا حضرت کے اس فعل کی بھی ضرور کوئی تاویل کر لیتے۔ تاہم محمد بن ابی بکر کے مقدمہ میں حضرت علیؓ کی سیاسی فکر یقیناً ایک ابتلا کا شکار رہی تھی جب انہوں نے قیس بن سعد جیسے سمجھدار، سنجیدہ، صحیح الفکر، تجربہ کار، گرم، سرد چشیدہ اور نہایت درجہ زیرک عامل کو معزول کر کے اس کی جگہ محمد بن ابی بکر جیسے کھلنڈرے ناتجربہ کار، اناڑی، فہم و فکر سے تہی دامن، عقل و خرد سے خالی، مغلوب الغضب اور جذباتی شخص کو مصر کا گورنر بنایا۔

بات یہ تھی کہ اہل خربتا حضرت علیؓ سے بیعت نہیں ہو رہے تھے اور وہ کہتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کے خون کے قصاص کا قضیہ طے ہو جائے اور سب لوگ کسی ایک شخص کی خلافت پر جمع ہو جائیں تو ہم بیعت کر لیں گے۔

یہ لوگ انتہائی شریف شہری اور مرنجاں مرنج قسم کے لوگ تھے۔ جناب قیس بن سعد نے ملک کے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر ان کو یہ مہلت دے دی تھی اور فریقین میں ایک معاہدہ طے پا گیا تھا کہ اگر اہلِ خربتا حکومت کے خلاف کسی کاروائی میں حصہ نہ لیں تو مناسب حالات کے انتظار میں حکومت ان کی عدم بیعت پر اعتراض نہیں کرے گی۔

قیس بن سعد کی سوچ یہ تھی کہ بحالاتِ موجودہ اہلِ خربتا کا جن کے جنگجو افراد

---

[1] طبری جلد ۳ باب ۱۸ صہ ۵۹ ۴ [2] خلافت و ملوکیت صہ ۳۴۴

کی تعداد ۱۲ ہزار ہے، غیر جانبدار رہنا بھی بالواسطہ طور پر حضرت علیؓ کی حکومت کی حمایت ہی ہے اور ان کی خاموشی حضرت علیؓ کی فرمانبرداری کا ہی ایک رُخ ہے۔

قیس بن سعد کا خیال تھا کہ اگر یہ ۱۲ ہزار آدمی حضرت علیؓ کے فریق ثانی کا ساتھ دیں تو مصر کے موجودہ حالات میں ۱۲ ہزار جنگجو مردوں کا وجود حکومت کے لئے بہت پیچیدگی اور پریشانی کا موجب بن سکتا ہے اور ایسی حالت میں اگر بیرونی حملہ وقوع پائے تو داخلی انتشار پر قابو پانا ممکن نہیں ہوگا۔ قیس نے اپنی حکومت کی اس پالیسی کی اطلاع حضرت علیؓ کو دی تو انہوں نے قیس کے اس فعل سے بُرا منایا اور اس کی تائید کرنے سے انکار کیا۔ قیس نے بتکرار حضرت علیؓ سے اپنی سوچ کی اصابت کے دلائل پیش کئے اور درخواست کی کہ موجودہ حالات میں یہی بہترین طریق کار ہے مگر حضرت علیؓ اپنے انکار پر مصر رہے اور قیس کو حکم دیا کہ تم بہرحال اہل خربتا کے خلاف جنگ جاری کر دو۔ قیس نے اپنی حکمتِ عملی کے جواز میں مزید دلائل دیئے تو حضرت علیؓ نے قیس کی اس فکر کو فریق ثانی سے کسی سازش کی کڑی قرار دے کر محمد بن جعفر اور محمد بن ابی بکر کے مشورہ سے اُسے گورنری سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ محمد بن ابی بکر کو گورنر بنا کر بھیج دیا[1]

محمد بن ابی بکر نے حسبِ پروگرام قیس بن سعد سے چارج لیتے ہی اہل خربتا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور جیسا کہ توقع کی جاتی تھی اس نے اپنی بے تدبیری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے شکست کھائی اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور شہر کے اندر ایک ویران جگہ کو محفوظ سمجھ کر وہاں چھپ کر بیٹھ گیا۔

فریقِ مخالف کے آدمی اس کی تلاش میں نکلے اور بالآخر اُسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اُسے گرفتار کر کے اپنے سردار ابن خدیج کے سامنے پیش کر دیا۔

---

[1] طبری جلد ۳ صد ۲۵۴

محمد بن ابی بکر نے پانی طلب کیا اور ابن خدیج نے یہ کہہ کر پانی دینے سے انکار کیا کہ تم نے عثمانؓ پر پانی بند کر دیا تھا ہم تمہیں پانی نہیں دے سکتے اب تم دوزخ کے ابلتے ہوئے پانی اور دوزخیوں کے زخموں سے بہنے والی پیپ سے ہی اپنی پیاس بجھانا۔

ابن ابی بکر نے ابن خدیج کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ اے یہودیہ کے بیٹے! وہ پانی اور پیپ تمہارے لئے یا تم جیسے لوگوں کے لئے ہے جو عثمانؓ سے محبت رکھتے ہیں۔ اگر اس وقت میرے ہاتھ میں تلوار ہوتی تو میں یہ بات تم سے ہرگز نہ سن سکتا۔

(اب ظاہر ہے کہ یہ ابن خدیج اگرچہ شریف تو ضرور تھا مگر ضروری نہیں کہ حوصلہ مند بھی ہوتا)

محمد بن ابی بکر کے منہ سے گالی سن کر مشتعل ہو گیا پھر محمد بن ابی بکر کا اپنی تلوار کو یاد کرنا بھی محض اپنی گالی کو مستحکم بنانے کے لئے ہی تھا ورنہ جس تلوار کا وہ ذکر کرتا تھا چند گھنٹہ قبل بحیثیت حاکم بھی یہ تلوار اس کے کام نہ آسکی تھی، اب قیدی بننے کے بعد وہ کیا کام دیتی۔

ابن خدیج اس گالی کو سن کر بے قابو ہو گیا اور چلایا خبردار ہو جا تم میں تجھے عثمانؓ کے قصاص میں قتل کرنے کا حکم دیتا ہوں اور (تمہاری اس گستاخی اور گندہ ذہنی کے عوض) تمہاری لاش گدھے کی کھال میں رکھ کر جلا دوں گا۔

ابن ابی بکر نے جواب دیا کہ تمہاری یہ آگ مجھ پر یوں ٹھنڈی ہو جائے گی جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہو گئی تھی اور اس آگ میں تم گر دگے تمہارے ساتھی گر پڑیں گے، تمہارا عثمانؓ گرے گا، تمہارا معاویہؓ گرے گا، تمہارا عمروؓ بن العاص گرے گا۔ پھر جب یہ آگ مدھم ہو گی تو پھر بھڑکا دی جائے گی۔

ہو سکتا ہے کہ بات اگر ابن خدیج تک ہی رہتی تو اس کا ذاتی اشتعال رفع بھی ہو سکتا مگر جب ابن ابی بکر نے اپنی حد سے تجاوز کیا تو وہ جذبات قہر و غضب سے

مغلوب ہو گیا اور کہا کہ لو اب میں تمہیں عثمانؓ کے قصاص میں قتل کرتا ہوں۔ اس پر وہ پھر بولا تمہارا عثمانؓ قرآن کے خلاف فیصلے کرتا تھا اور قرآن کہتا ہے کہ قرآن کے خلاف فیصلے کرنے والے لوگ فاسق ہیں پس ہم نے اگر عثمانؓ کو قتل کیا تو ایک فاسق کو قتل کیا ہے اور اُسے اس کے فسق کی سزا دی ہے، خدا ہمیں اس کے قتل سے بری کرے گا اور پھر تجھے اور تیرے جیسے لوگوں کو پکڑے گا اور تیرا انجام بھی وہی ہو گا جو عثمانؓ کا ہوا۔ اس پر ابن خدیج نے اُسے قتل کر دیا اور اس کی لاش گدھے کی کھال میں رکھ کر جلا دی [1]

طبری کی یہ روایت اگر صحیح ہے تو اس روایت کے بموجب ابن ابی بکر پر جو کچھ بھی گزرا اس کا سبب وہ خود ہی بنا ہے تاہم ابن خدیج کو بات اس کے قتل تک ہی محدود رکھنی چاہیئے تھی۔ قتل کے بعد اس نے جو کچھ کیا وہ تجاوز ہے اور ہم اس کی حمایت نہیں کرتے اور مولانا کے ساتھ ہی اس کے اس فعل کی مذمت بھی کرتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ روایت خود جناب طبری کی اپنی ہی ایک روایت کے بموجب مشتبہ ہو کر رہ گئی ہے اور یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ یہ روایت محض مخالفینِ علیؓ کو بدنام کرنے کے لئے ہی بنائی گئی ہے ورنہ اس کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ طبری لکھتے ہیں:

محمد بن ابی بکر مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلا اور اس نے مسروق کی پہاڑیوں کے قریب ایک جگہ پناہ لی۔ ابن خدیج کو پتہ چل گیا، اس نے اس کا تعاقب کیا اور اس مقام کا محاصرہ کر لیا جہاں ابن ابی بکر چھپا بیٹھا تھا۔ جب بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہ رہ سکی تو وہ باہر نکل آیا اور مقابلہ کیا۔ بالآخر لڑتا ہوا مارا گیا [2]

اب دیکھئے یہ روایت طبری کے اسی صفحہ پر درج ہے جس پر وہ پہلی روایت ختم ہوتی ہے اور راوی نے بڑی صراحت سے یہ بات بتائی ہے کہ ابن ابی بکر لڑتے لڑتے مارا گیا ہے یعنی نہ وہ گرفتار ہوا نہ ابن خدیج کے حضور پیش کیا گیا۔

---

[1] طبری جلد ۴ باب ۱۸ صہ ۴۵۴ [2] طبری جلد ۴ باب ۱۸ صہ ۴۵۴

نہ کوئی بحث و تکرار ہوئی، نہ اُس نے پانی مانگا نہ جواب میں حمیم اور پیپ کی طرف رہنمائی کی گئی نہ وہاں کوئی تلوار کا ذکر ہوا، نہ کوئی گالی گلوچ ہوئی نہ اُسے گدھے کی کھال میں لپیٹا گیا اور نہ سپردِ آتش کیا گیا یعنی وہ کچھ بھی نہیں ہوا جو مولانا نے لکھا۔ بلکہ وہ مقابلہ پر نکلا، لڑائی کی اور لڑتے لڑتے مارا گیا اور کہانی ختم ہوگئی۔ اور اگر مولانا کی کہانی میں ایک ذرّہ کے برابر بھی سچائی ہوتی تو کم از کم حضرت علیؓ اپنی تقریروں میں اس کا ضرور ذکر کرتے۔ انہوں نے محمد بن ابی بکر کے قتل پر انتقامی کارروائی کے لئے اپنے لوگوں میں سخت اشتعال انگیز تقریریں کیں، انہیں بے غیرت تک کہا گیا [1] مگر اس جلانے پھونکنے کا انہوں نے کہیں ذکر نہیں کیا۔

اب یہ بات تو مولانا سے پوچھنے والی ہے کہ طبری کی یہ دونوں روایات جب بالکل آگے پیچھے ایک ہی صفحہ پر درج ہیں تو انہوں نے اس روایت کو کیوں اختیار کیا جو روایت سے زیادہ افسانہ کی عکاسی کرتی ہے اور اس دوسری کو کیوں ترک کیا جس میں بات سیدھے طور پر کہہ دی گئی ہے۔

ایک اور بات بھی دریافت طلب ہے کہ اگر اس افسانہ کو ایک لمحہ کے لئے صحیح بھی سمجھ لیا جائے تو یہ اچانک ہی تشکیل پایا تھا اور اچانک ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اس میں آخر حضرت معاویہؓ کا دخل کیونکر ہوا جو مولانا نے اس کہانی کا بوجھ بھی انہی کے کندھوں پر رکھ دیا ہے۔

روایت کے بموجب ابن ابی بکر نے ابن خدیج اور اس کے بزرگوں کو گالیاں دیں، اس نے انتہائی اشتعال کی حالت میں ایک فیصلے کا اعلان کیا اور پھر اُس پر فوراً ہی عمل بھی کر دیا اور یہ سارا کچھ اتنی تیزی سے انجام تک پہنچ گیا کہ حضرت عمروؓ بن العاص جو پاس ہی دوسرے لشکر میں موجود تھے اُن تک بھی خبر نہ پہنچ سکی اور حضرت معاویہؓ تو صدہا میل دُور بیٹھے تھے انہیں اس واقعہ میں ملوث کرنے کی

---

[1] نہج البلاغہ جلد اوّل خطبہ ۶۹

آخر کیا تک ہے اور اُن کی طرف سے کسی کھلی چھٹی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے جبکہ اُن کی حوصلہ مندی کی طرف میں تو ایسی بہت سی مزخرفات کے سننے اور سہنے کی ہمیشہ گنجائش موجود رہی تھی اور ہمیں یقین ہے کہ اگر ابن ابی بکر نے اپنی ان خرافات کا اظہار حضرت معاویہؓ کے سامنے کیا ہوتا تو وہ اور کچھ نہیں تو اس کے نام کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ کا نام سن کر بھی ضرور لحاظ کرتے اور اصل سے ذرا بھی تجاوز نہ کرتے۔

حضرت معاویہؓ ابن ابی بکر کے شریر کارناموں اور اس کی خباثتوں سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ یقیناً ہر قسم کی سزا کے ہی سزاوار تھا۔ مگر حضرت معاویہؓ کی خواہش یہی تھی کہ وہ راہِ راست پر آ جائے اور معقول روش اختیار کرے چنانچہ انہوں نے ایک مرحلہ پر اسے اس غرض سے انتباہ بھی دیا اور اسے ایک خط لکھا کہ:

تمہارے خلاف لڑنے والے سارے ہی لوگوں کی خواہش ہے کہ تمہارا مثلہ کیا جائے مگر مجھے یہ بات ہرگز پسند نہیں ہے [۱]

ایسے میں بھلا وہ اُسے جلانے پھونکنے کا حکم کیوں دیتے اور ایسی کسی کاروائی پر خوش کیوں ہوتے!

تصویر کا دوسرا رُخ

تاہم جہاں تک کسی مخالف کو پھونکنے جلانے کا تعلق ہے بلاشبہ یہ باتیں اسلام کی آمد سے پہلے زمانہ سے ہی تعلق رکھتی ہیں اور اسلام نے اس رسم کو فی الفور ہی ختم کر دیا تھا جیسا کہ مولانا نے بھی لکھا ہے مگر ان کا یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ حضرت معاویہؓ نے مسلمانوں کے اندر اس کو پھر رواج دیا۔

حضرت معاویہؓ کی ذات سے جتنے واقعات بھی مولانا نے منسوب کئے ہیں سب کے سب بالواسطہ ہیں اور مولانا نے اپنے علم کی قوت سے انہیں معاویہؓ کے ذمہ سے

---

[۱] طبری جلد ۳ صفحہ ۴۵

باندھنے کا شرف حاصل کیا ہے ورنہ حضرت معاویہؓ ایسے کسی ایک بھی واقعہ میں ملوث نہیں ہیں نہ انہوں نے کسی کے بارے میں کبھی ایسا حکم دیا نہ اس پر خوشی ظاہر کی جبکہ حضرت علیؓ کے بارے میں صحیح حدیث میں یہ بات درج ہے کہ :

زنادقہ کی ایک جماعت حضرت علیؓ کے سامنے پیش کی گئی تو آپ نے ان سب کو نذرِ آتش کر دیا[1]

اس مرحلہ پر مولانا حضرت علیؓ کے اس فعل کے جواز کی ضرور تاویل کر جاتے۔

اسی روایت میں مزید وارد ہوا ہے کہ :

حضرت ابن عباسؓ نے جب یہ خبر سنی تو اس سے سخت اذیت محسوس کی اور فرمایا میں اگر وہاں ہوتا تو علیؓ کو ایسا ہرگز نہ کرنے دیتا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذابوں میں سے کسی عذاب کے سپرد نہ کرو اگر یہ لوگ میرے سامنے پیش کئے جاتے تو میں ان کو صرف قتل ہی کرتا کیونکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے۔ (یعنی مرتد ہو جائے) اُسے قتل کیا جائے[2]

حضرت ابن عباس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جس ارشاد کا حوالہ دیا ہے وہ یوں ہے :

حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ فوج کا ایک دستہ لے کر جاؤ اور فلاں فلاں شخص اگر تمہارے ہاتھ پڑ جائیں تو انہیں جلا ڈالنا۔

روانگی کے وقت جب میں بغرضِ اجازت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ فلاں فلاں آدمیوں کو جلا ڈالنا۔ مگر دیکھو یہ آگ کا عذاب صرف اللہ تعالیٰ کا ہی حق ہے اس لئے تم انہیں آگ میں نہ ڈالنا بلکہ اگر وہ مل جائیں تو انہیں قتل کر دینا[3]

---

[1] بخاری شریف کتاب الجہاد [2] بخاری شریف کتاب الجہاد حدیث نمبر ۳۱۸ [3] ایضاً حدیث نمبر ۲۱

لاشوں کی بے حرمتی

مخالفین کی لاشوں سے بدسلوکی، ان کا مُثلہ کرنا یقیناً کوئی بہادری نہیں ہے۔ مُردہ جسم جوا پنا دفاع تک نہیں کر سکتا، از دیادِ قہر و غضب سے اُسے ضربات دینا، اُسے کھینچے گھسیٹتے پھرنا، اُسے ٹھوکریں لگانا، کچوکے دینا، اُسے کاٹنا پھوڑنا، اُس کے ٹکڑے کرنا، اُسے کچلنا مسلنا، رگیدنا آخر کونسی بہادری ہے اور مولانا نے جو لاشوں کی بے حرمتی پر احتجاج کیا ہے تو یہ ذرا بھی غلط نہیں ہے۔

قرآن کریم نے کافر کی لاش کو بھی تحفظ دیا ہے اور اُسے اُس کے جرم سے بڑھ کر سزا دینے سے منع فرمایا ہے۔

قصاص کا حکم دیا ہے مگر ساتھ ہی تاکید کر دی کہ خبردار اصل سے ذرا بھی تجاوز نہ ہو، مقتول کے ورثاء کے لئے جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطَانًا کا اعلان فرمایا ہے مگر زیادتی کرنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا ہے۔

ایسے میں اگر مولانا نے ابن خدیج کی کاروائی پر احتجاج کیا ہے تو ٹھیک ہے لیکن اس ابن خدیج کی تو حقیقت ہی کیا ہے۔ تاریخ نے غصہ سے مغلوب ہو کر لاشوں کو اپنی قہرمانی کا شکار بنانے والے ایسے ایسے بزرگوں کے نام ذکر کئے ہیں کہ فعل اور فاعل میں کوئی نسبت نظر نہیں آتی اور اُن کے نام سے ایسی کاروائیوں پر مشتمل روایات کے مطالعہ سے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے۔

علامہ طبری لکھتے ہیں:

- صفین کی جنگ میں حضرت علیؓ کا ایک آزاد کردہ غلام کیسان کسی اموی غلام کے ہاتھوں قتل ہو گیا حضرت علیؓ تیزی سے قاتل کی طرف بڑھے اور اُسے دبوچ لیا۔ پھر غصہ کی بہتات سے اُسے سر سے اوپر اٹھایا اور اس زور سے زمین پر پٹخ دیا کہ اُس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت علیؓ کے دونوں صاحبزادے حسنؓ اور حسینؓ اس پر جھپٹ پڑے۔

اور تلواروں کے واروں سے اُسے ختم کر دیا ۔ حضرت علیؓ کھڑے دیکھ رہے تھے اور ان کے صاجزادے (حسینؓ) مقتول کی لاش کو پاؤں کی ٹھوکروں سے مارے جا رہے تھے ۔ حضرت حسنؓ نے جب یہ کام نہ کیا تو اس پر حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ سے کہا تم کھڑے کیوں دیکھ رہے ہو تم اس کام میں حصہ کیوں نہیں لیتے [1]

- حضرت علیؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور حملہ آور گرفتار کر لیا گیا ۔ پھر جب حضرت علیؓ کو اپنی زندگی سے ناامیدی ہو گئی تو آپ نے حضرت حسنؓ اپنے دوسرے سب بیٹوں اور بنو عبدالمطلب کو وصیت کی کہ اگر میں فوت ہو گیا تو میرے عوض صرف میرے قاتل ہی کو قتل کرنا اور امیرالمومنین کے قتل کو ایک مسئلہ بنا کر مسلمانوں کے خون نہ بہاتے پھرنا ۔ پھر آپ نے حضرت حسنؓ کو خصوصی وصیت کی کہ :

تم صرف ایک ہی وار سے قاتل کی گردن اُڑا دینا کیونکہ اُس نے بھی مجھ پر ایک ہی وار کیا تھا اور ایک وار کا بدلہ ایک وار ہی ہے اور خوب غور سے سُن لو کہ قاتل کا مُثلہ (یعنی قاتل کی ناک اور کان کاٹنا اور اس کی لاش کو بگاڑنے کا کام ہرگز) نہ کرنا کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ خبردار جو کسی کا مُثلہ کیا خواہ وہ باؤلا کُتا ہی کیوں نہ ہو ۔

چنانچہ حضرت علیؓ کی وصیت کے مطابق ان کی وفات کے بعد حضرت حسنؓ نے قاتل کو ایک ہی وار سے قتل کر دیا پھر لوگ (حسنؓ کی موجودگی میں ہی) قاتل کی لاش پر ٹوٹ پڑے اور اس کی بوٹیاں کر کے اُسے آگ میں ڈال کر جلا دیا [2]

- مولانا مودودی صاحب نے طبری کے جس صفحہ سے محمد بن ابی بکر کی لاش کے ساتھ وحشیانہ سلوک کی کہانی درج کر کے حضرت معاویہؓ کے سر تھوپ دی ہے اس کے بالکل اگلے ہی صفحہ پر یہ کہانی درج ہے ۔

---

[1] طبری جلد ۳ صہ ۲۱۶ [2] ایضاً جلد ۴ صہ ۵۰۵

زیاد نے جب وہ حضرت علیؓ کا طرفدار تھا، معاویہؓ کے مامور ابن الحضرمی کے خلاف حضرت علیؓ سے امداد طلب کی تو حضرت علیؓ نے اعین بن ضبیعہ المجاشی کو روانہ کرتے ہوئے ہدایت کی کہ ابن الحضرمی کا معاملہ اگر بے قابو نظر آئے تو اپنی قوم کو ساتھ لے کر اس پر ٹوٹ پڑو، اگر تمہارے بھائی ڈھیلے ہوں اور تم اپنے محاذ پر کچھ کمزوری محسوس کرو تو دشمن کے ساتھ مدارات سے پیش آؤ اور اُسے (بظاہر ڈھیل دے کر غلط فہمی میں مبتلا کردو) اس طرح تم (حکمتِ عملی کے ساتھ) اللہ کے لشکروں کے ساتھ اپنے دشمنوں کو بآسانی قتل کر سکو گے۔

مگر یہ شخص (جسے حضرت علیؓ نے اپنی قوم کو ساتھ لے کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑنے کی ہدایت دے کر بھیجا تھا) خود اپنی ہی قوم کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

زیاد نے حضرت علیؓ کو ان واقعات سے آگاہ کیا تو حضرت علیؓ نے جاریہ بن قدامہ کو ایک لشکر دے کر روانہ کیا اور زیاد کو لکھا کہ دیکھو جاریہ کی امداد میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھنا اور اس کی ہر طرح پوری پوری امداد کرنا۔

جاریہ نے حضرت علیؓ کی طرف سے اپنی قوم کے ساتھ بڑے بڑے وعدے کئے اور اس طرح وہ اپنی قوم کو اپنے ہمراہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔

پھر یہ لوگ ایک بڑے ہجوم کی صورت میں ابن الحضرمی کی قیامگاہ کی طرف گئے اور اُسے اپنے محاصرہ میں لے لیا اور اس کی قیامگاہ کو آگ لگادی۔ وہاں ابن الحضرمی کے ساتھ ستر آدمی اور بھی تھے جو سب کے سب ہی جل کر راکھ ہو گئے۔

زیاد نے جاریہ کے اس کارنامہ کی تفصیلی اطلاع حضرت علیؓ کو بھیج دی اور لکھا کہ جاریہ ہمارے پاس آیا، اُس نے ابن الحضرمی کے ساتھ جنگ کی جس کے نتیجہ میں وہ بنو تمیم کے گھروں میں سے ایک گھر میں پناہ گزین ہو گیا۔

اُسے اطاعت قبول کرنے کے لئے کہا گیا مگر اُس نے انکار کیا۔ بالآخر جاریہ نے اس کی پناہ گاہ کو آگ لگادی اور اُسے اُس کے سب ساتھیوں سمیت

جلا کر راکھ بنا دیا۔ پھر اوپر سے اس مکان کو بھی گرا دیا گیا جس میں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ خط کے آخر میں زیادؓ نے دعا کی کہ:

الہٰی! جو شخص بھی ان (جلا دیئے گئے لوگوں کی طرح) سرکشی اور نافرمانی کرے اُس کے لئے ایسی ہی تباہی ہو۔[۲]

دنیا سے انصاف ہی رخصت ہو چکا ہے پھر مولانا کی شکایت کیا ہو۔ وہ ابن تدمیج کی ایک ایسی ہی بینہ کاروائی کو جس کی کوئی اصل نہیں سچ مچ کی کہانی بنا کر حضرت معاویہؓ کے سر تھوپتے نہیں تھکتے۔ حالانکہ حضرت معاویہؓ کو ایسی کسی کاروائی کی اطلاع نہیں ہے۔ مگر جاریہ بن قدامہ کی درندگی، سفاکی اور بھیڑیا پن پر بڑی جرأت سے منقار زیر پر ہیں جس نے ایک ہی جنبش میں ستر سے زائد انسانوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ اور پھر اس درندگی اور سفاکی کی تفصیلی رپورٹ حضرت علیؓ کو پہنچائی اور مولانا پوری تاریخ میں سے حضرت علیؓ کا کوئی ایک کلمہ بھی نکال کر نہیں دکھا سکتے جس کے بموجب حضرت علیؓ نے جاریہ کے خلاف کوئی کاروائی تو کجا اُسے کوئی حرفِ ملامت ہی کہا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو شاید زندیقوں کو اس لئے جلا ڈالا ہوگا کہ اُن تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی نہیں پہنچ سکا ہوگا ورنہ وہ رسول اللہ صلی اللہ

---

[۱] اس زیاد کے بارے میں ہم اپنے قارئین کو بتا آئے ہیں کہ یہ وہی بزرگوار ہیں جن کے حضرت معاویہؓ سے استلحاق کی وجہ سے حضرت معاویہؓ پر مولانا کا قہر و غضب شباب کی سرمستیوں کا عنوان بنا رہا ہے۔ یہ بزرگوار جب تک حضرت علیؓ کے ساتھ تھے ان کی ہر خطا معاف تھی مگر جو نہی یہ حضرت علیؓ سے کٹ کر حضرت معاویہؓ سے آملے تو یہی زیاد پھر طائف کی ایک لونڈی سمیہ نامی کا بیٹا اور حضرت معاویہؓ کے والد ماجد کی زناکاری کے نتیجہ میں اُن کا ولد الحرام تھا۔ سبحان اللہ یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پہ یہ اختیار!

[۲] طبری جلد ۳ باب ۱۹ ص ۴۶۲ ـ ۴۶۳

علیہ وسلم کے ارشاد کے خلاف کوئی اقدام کیونکر کر سکتے تھے۔ مگران گروہی تعلق داروں نے مخالفین کو آگ کے سپرد کرنے کو علیؓ کی سنت قرار دے کر ہی اختیار کر لیا۔

یہ جاریہ بن قدامہ اس باب میں اتنے بے باک تھے کہ آگ کے بغیر بات ہی نہیں کرتے تھے۔ ذرا کسی سے اختلاف ہوا جھٹ اسے آگ کے جہنم میں ڈال دیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ شخص آگ کی ہی مخلوق ہو، مطلق ناری ہو، از اوّل تا آخر ناری ہو۔ معلوم نہیں یہ شخص حضرت علیؓ سے وابستہ کیونکر ہو گیا اور انہوں نے اس کو قبول کیونکر کر لیا۔

اس مرحلہ پر ہم مولانا مودودی صاحب سے خود اُنہی کے الفاظ میں سوال کرتے ہیں کہ:

قطع نظر اس کے کہ جن لوگوں کے مرنے کے بعد یہ سلوک ان کی لاشوں کے ساتھ کیا گیا وہ کس پائے کے لوگ تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام نے کسی کافر کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کرنا جائز رکھا ہے [1]

- اس دور کے واقعات کے بیان میں دوسرے سارے ہی مورخین کے مقابلہ میں مولانا مودودی صاحب کے نزدیک سند کا درجہ رکھنے والے معتبر مورخ جناب طبری رقمطراز ہیں۔

حضرت علیؓ نے انہی جاریہ بن قدامہ کو حضرت معاویہؓ کے ایک مامور بُسر بن ابی ارطاۃ کے مقابلہ میں نجران روانہ کیا تو ان صاحب نے مستی کی فراوانی سے پورے شہر کو ہی آگ لگا دی اور پھر یہ بات صرف اللہ کو ہی معلوم ہے کہ وہاں کس تعداد میں لوگ مرے، کتنے لوگ بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو سکے اور کتنے لوگوں کے بخت کی بازی ہر گئی۔ کتنے بچے بوڑھے اور بیمار آگ کا ایندھن بن گئے اور کس تعداد میں عورتوں نے تڑپ کر جان دی۔

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۷۹ سطر ۳ تا ۵

اس دردناکی کو قلمبند کرتے ہوئے مورخین نے جل کر مرنے والوں کی صحیح تعداد بتا سکنے میں معذوری ظاہر کی ہے۔ البتہ وہ چلتے چلتے یہ بات ضرور بتا سکے ہیں کہ یہاں جاریہ نے حضرت عثمانؓ کے بے شمار حامیوں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔[۱]

- اپنے مخالفین کو نذرِ آتش کرنے کا شغل صرف جاریہ اور زیاد تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس لنکا کا ہر شخص ہی باون گز تھا۔ اس مرحلہ پر حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے ایک مامورِ زکوٰۃ عبداللہ بن سعدہ الفزاری کے خلاف مسیب بن نجبۃ الفزاری کو کارروائی کیلئے بھیجا۔ عبداللہ مقابلہ نہ کر سکا اور قلعہ بند ہو بیٹھا جناب مسیب نے قلعہ کو ہی آگ لگا دی۔ محصورین نے اپنی قوم کے نام اپیلوں کا سہارا لیا تو بالآخر مسیب کے اپنے ہی ہمراہیوں نے اُسے آگ بجھانے پر راضی کر لیا۔[۲]

آتش بازی اور آتش باری کے اس کھلے کھیل پر غور کیجیے۔ ہم اس باب میں اپنی طرف سے کوئی جمع و ترتیب نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی مولانا کو کوئی آئینہ دکھاتے ہیں نہ اُن سے کسی انصاف کے لئے ہی کوئی بے مصرف اپیل کرتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بات بھی موثر نہیں ہوگی۔ البتہ ہم مولانا کی وہ تحریر جس سے بات شروع ہوئی تھی ایک بار پھر پیش کر کے انصاف قارئین پر ہی چھوڑتے ہیں اور وہی فیصلہ کریں کہ مولانا کا یہ کہنا کہاں تک سچ ہے۔

انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا اسی (معاویہؓ کے ہی) دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا۔[۳]

جاریہ اور بسر — مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کی طرف سے گورنروں اور دوسرے عمالِ حکومت کو ظلم و ستم

۱؎ طبری جلد ۳ حصہ اوّل باب ۲۳ ص ۴۹۴ ۲؎ طبری جلد ۳ حصہ ۲ باب ۲۱ ص ۹۰۴
۳؎ خلافت و ملوکیت ص ۱۷۷

کی کھلی چھٹی دے رکھنے کے ضمن میں حضرت معاویہؓ کے ایک مامور بسر بن ابی ارطاۃ کے بہت سے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ اگر یہ کوئی ظالم شخص ہی تھا تو ہم اس کی کوئی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتے۔ اس کی ذات سے وابستہ بہت سے قصے مولانا نے بھی ذکر کئے ہیں۔ ہمیں اس بات کا تو یقین حاصل ہے کہ معاویہؓ جیسے رقیق القلب، صالح الفکر اور خدا سے ڈرنے والے بزرگ کسی شقی القلب، سنگدل اور خدا کے خوف سے عاری شخص سے کوئی میل نہیں رکھ سکتے تھے اور بسر کی سیرت کے بعض پہلوؤں کے مطالعہ سے یہ باور کرنے کے وجوہ بھی موجود ہیں کہ اس کی ذات سے وابستہ قصے محض ابن جواب آں غزل کے بطور جاریہ کے مجرمانہ افعال کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے ہی تخلیق دیئے گئے ہیں۔ لیکن اگر ان میں ایک رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی صداقت ہے تو ہم کسی ظالم کے وکیل نہیں ہیں اور نہ اس کے کسی ظلم کی حمایت پر آمادہ ہیں البتہ جاریہ اور بسر کے کردار کا تقابلی جائزہ ہمیں کچھ ایسے گوشوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو مولانا کو یقیناً پسند نہیں ہوں گے۔ علامہ طبری نے ان دونوں ظالموں کا تقابلی جائزہ اس طرح پیش کیا ہے:

حضرت علیؓ کا مامور جاریہ بن قدامہ جب مدینہ میں داخل ہوا تو اس کی سخت گیری اور سنگینی کے خوف سے مسجد نبویؐ کے امام نماز حضرت ابوہریرہؓ مدینہ سے نکل گئے۔ اسے پتہ چلا تو دانت پیس کر بولا کہ اگر یہ بلی کا باپ مجھے مل جاتا تو میں اس کی گردن اڑا دیتا۔[۱]

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جاریہ مکہ پہنچا اور اہل مکہ کو حکم دیا کہ ہماری بیعت کرو۔ انہوں نے کہا کس کی بیعت کریں، امیرالمومنین کی شہادت عمل میں آچکی ہے اور ان کی جگہ کوئی خلیفہ ابھی مقرر نہیں ہوا کہنے لگا تمہیں خلیفہ کی ذات سے کیا بحث ہے تم اس کے نام پر بیعت کرو جس کی بیعت شیعان علی کریں گے۔

---

[۱] خلافت و ملوکیت ص ۱۷۰ [۲] طبری جلد ۳ حصہ ۲ باب ۲۳

اہلِ مکہ کو یہ حکم بہت گراں گزرا مگر اُن کے لئے اس حکم کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اور انہوں نے کسی ایسے خلیفہ کی بیعت کرلی جو ابھی مقرر نہیں ہوا تھا۔[1]

علامہ طبری رقمطراز ہیں کہ:

حضرت معاویہؓ کا مامور بُسر بن ابی ارطاۃ جب مدینہ میں داخل ہوا تو حضرت علیؓ کا مقرر کردہ عامل ابوایوبؓ مدینہ سے بھاگ گیا۔ بُسر کو اطلاع ہوئی تو اُس نے مسجد نبویؐ کے منبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اے اہل مدینہ! تمہارے لئے خوف کا کوئی مقام نہیں ہے مجھے حضرت معاویہؓ نے تمہیں قتل کرنے یا تم پر کسی قسم کی سختی روا رکھنے سے منع کر رکھا ہے۔[2]

بُسر جب مکہ معظمہ میں داخل ہوا تو اس کے خوف کی وجہ سے حضرت ابوموسیٰ اشعری نے وہاں سے نکل جانے کی کوشش کی۔ بُسر کو اطلاع ہوئی تو اُنہیں پیغام بھیجا آپ کسی قسم کا خوف نہ کریں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی سے کوئی بدسلوکی نہیں کر سکتا۔[3]

اس کے باوجود اگر کسی راوی کو اصرار ہے کہ بُسر بہرحال ظالم اور سفاک تھا تو ہم اس کے دفاع کے مکلف نہیں وہ اپنے کئے کی ضرور سزا پائے گا۔ لیکن راوی کو بھی چاہیئے تھا کہ وہ جس طرح جاریہ بن قدامہ کے کارنامے لکھ کر حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کرتا تھا بُسر کی سفاکیاں بھی حضرت مولانا مودودی صاحب کے لئے محفوظ کر رکھنے کے بجائے ان کی اطلاع حضرت معاویہؓ کو پہنچاتا تاکہ وہ اس کا ٹیٹوا دباتے۔ پھر اگر وہ کوئی کاروائی نہ کرتے تو اُسے یقیناً خلافت و ملوکیت کے لئے مواد بہم پہنچانے کی آزادی تھی۔

---

[1] طبری جلد ۳ حصہ ۲ باب ۲۴ [2] حوالہ مذکور [3] حوالہ مذکور

مولانا مودودی صاحب کا راوی تو اب اپنے رب کے حضور پیش ہو چکا ہے اور مولانا کو بھی آخر وہیں جانا ہے، وہاں اُن سے پوچھا جائے گا۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وحامیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک گناہ کا ارتکاب کیا، مگر سزا سے بچنے کے لئے اُس نے اپنا گناہ بکر کے نام لگا دیا جبکہ گنہگار بکر نہیں تھا بلکہ خود زید ہی تھا۔

تو یقین ہے مولانا کا جواب یہی ہوگا: وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ؕ

اب مولانا کے کذاب راوی سے تو کچھ کہنا ممکن نہیں رہ سکا البتہ مولانا اگر چاہیں تو اُن کے لئے سوچنے کا موقع ابھی باقی ہے [1]

---

[1] آہ! اب مولانا مودودی صاحب کا معاملہ بھی اللہ کے سپرد ہو چکا ہے جو ہے نام اللہ کا

باب پنجم

مغالطات

پہلا مغالطہ ـــــ مآخذ

اپنی تصنیف کی شوکت ظاہر کرنے کے لئے تصنیف کے ساتھ اُن مآخذ کی الگ فہرست شامل کرنے کا بھی اب رواج ہے جن سے مصنف نے استفادہ کیا ہوتا ہے۔ مگر مولانا مودودی صاحب نے اپنی اس تصنیف کے مآخذ کی فہرست کے ساتھ اپنے مآخذ پر اپنی ضرورت اور اپنے مطلب کا تبصرہ و تعارف بھی پیش کیا ہے۔ معروف و مشہور اور پہلے سے متعارف کتب پر نئے سرے سے تبصرہ و تعارف چونکہ مولانا نے اپنی خاص ضرورت سے اور اپنے بیان کے استحکام کی دلیل کے بطور پیش کیا ہے اور اس سے قاری مغالطہ کا شکار ہو سکتا ہے اس لئے اب یہ امر بھی محلِ بحث و نظر ہی ہے۔

مولانا اپنے اس تبصرہ میں ابن سعد کی طبقات ابن عبدالبر کی الاستیعاب ابن اثیر کی کامل اور اسدالغابہ ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ اور ابن جریر کی تاریخ طبری اور اُن کے مصنفین کا بھرپور ذکر کرنے کے بعد جیسے انہوں نے اپنے قارئین کو گھیرے میں لے لیا ہو تعاقب کے انداز میں فرماتے ہیں:

اب غور فرمایئے یہ ہیں وہ مآخذ جن سے میں نے اپنی بحث میں سارا مواد لیا ہے۔

اگر یہ اس دَور کی تاریخ کے معاملہ میں قابلِ اعتماد نہیں ہیں تو پھر اعلان کر دیجئے کہ عہدِ رسالتؐ سے لے کر آٹھویں صدی تک کی کوئی اسلامی

تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے کیونکہ عہدِ رسالتؐ کے بعد سے کئی صدیوں تک کی پوری اسلامی تاریخ شیخین (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) کی تاریخ سمیت انہی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔ اگر یہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں تو ان کی بیان کی ہوئی خلافتِ راشدہ کی تاریخ اور آئمہ اسلام کی سیرتیں اور اُن کے کارنامے سب اکاذیب کے دفتر ہیں [1]

جواباً گزارش ہے کہ ہمیں نہ ان کتابوں کی اہمیت سے انکار ہے نہ اُن کے مصنفین کی عظمت میں ہی کوئی شبہ ہے، یہ لوگ یقیناً امت کا قیمتی سرمایہ ہیں اور ان کی تصنیفات بھی قیمتی لٹریچر ہے مگر آپ نے جو ان کتابوں میں درج ہو چکنے والی روایات کو قرآن کی آیت اور حدیثِ رسول کا حصہ سمجھ لیا ہے ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ ان کتابوں میں بہت کچھ صحیح بھی درج ہوا ہے اور بہت کچھ روایات غیر صحیح بھی ہیں۔

ہمارے قارئین اس بات سے بے خبر نہیں کہ خود مولانا بھی انہی کتب کی بہت سی روایات کی صحت سے انکار کرتے ہیں مگر ہمارا اور مولانا مودودی صاحب کا باہمی فرق یہ ہے کہ مولانا ان کتب کی صرف انہی روایات کو صحیح سمجھتے ہیں جو ان کی سوچ کی ترازو پہ پوری اترتی ہوں اور جو روایت ان کی سوچ سے ہموار نہیں ہوتی وہ اسے مسترد کر دیتے ہیں اور روایات کی صحت کا معیار صرف مولانا کی اپنی ذاتی صوابدید ہے۔ اگر روایت نے ان کا مقصد پورا کر دیا تو وہ صحیح ہے اگر ان کے مقصد کے منافی ہوئی تو غیر صحیح ہے۔ جبکہ ہم سمجھتے ہیں کہ تاریخی روایات کی صحت کے لئے راوی، روایت اور جس کے بارے میں روایت کی گئی ہے تینوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور کسی روایت کی صحت کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ وہ طبری میں آ گئی ہے یا ابن کثیر یا ابن اثیر نے نقل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے خود بھی اپنے ان مآخذ کی بہت سی روایات کو

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۳۱۶

محض اس لئے مسترد کر دیا ہے کہ وہ ان کے اپنے ممدوح کی مجموعی زندگی سے ہموار نہیں ہیں۔

ہم خود مولانا کی اپنی ہی بات کرتے ہیں، ہم مولانا کو جانتے ہیں، ان کی زندگی ہمارے سامنے ہے، ان کے لیل و نہار ہمارے سامنے ہیں مگر انہی کے ایک پروردہ اور عرصہ تک ان کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں ان کے ایک رفیق جناب کوثر نیازی ان کے بارے میں جو بیان کرتے ہیں وہ سب کچھ محض اس لئے نہیں مانا جا سکتا کہ یہ مولانا کے ایک نہایت قریب رہ چکے شخص کا کہا ہوا ہے بلکہ ہم اُن کے کہے کو مولانا کی اس مجموعی زندگی کی ترازو پر تولیں گے جسے ہم جانتے ہیں پھر جو کچھ اس ترازو پر پورا اترے وہ صحیح اور جو کچھ اس ترازو پر نہ اُترے وہ غلط ہے اور یہیں پھر اُس غلط کو غلط کہنے کے لئے کسی مزید دلیل کی حاجت نہیں ہو گی۔

اور اگر ہم مولانا کے بارے میں اتنے نازک احساسات رکھتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اصحابِ رسولؐ کے بارے میں تو ہمارے احساسات اس سے پچاس ہزار گنا زیادہ نازک ہوں گے۔

قرآن پاک نے بڑی صراحت سے کہہ رکھا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (سورۃ حجرات)

کہ اے اہلِ ایمان! جب کسی غیر معتبر آدمی سے کوئی خبر سنو تو بلا تحقیق اس پر یقین نہ کر لیا کرو کیونکہ اس طرح تم کوئی ایسی بری حرکت کر بیٹھو گے کہ آخر میں تمہیں پشیمانی نصیب ہو گی۔

اور جب ہم جانتے ہیں کہ تاریخ اسلام پر ایک دور ایسا بھی گزر چکا ہے جب اسلام اور مسلمانوں کی بدقسمتی سے اصحابِ رسولؐ میں باہمی تصادم رونما ہوا اور اس مرحلہ پر جن شریر لوگوں کی دسیسہ کاریوں سے یہ تصادم وقوع پایا انہوں نے اس

تصادم کو مستقل بنانے کے لئے اور مسلمانوں کو مستقل طور پر ایک دوسرے سے دور رکھنے کے لئے ایک دوسرے کے بارے میں جھوٹی روایات تصنیف کیں، جھوٹ کہانیاں بنائیں اور جھوٹ داستانیں تخلیق کیں۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بہت سے مورخین نے ان کہانیوں کو بلا تحقیق قبول کر لیا اور پھر وہ امتدادِ زمانہ سے تاریخ بن گئیں۔ ایسے میں اگر ہمارے پاس اصحابِ رسولؐ کے بارے میں کوئی روایت آئے گی جو اصحابِ رسولؐ کی مجموعی زندگی سے ہموار نہیں ہوگی تو ہم اُسے محض اس لئے قبول نہیں کر سکتے کہ اس کو طبری نے نقل کیا اور ائسے مولانا مودودی نے معتبر بتایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک ایسا ہی واقعہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آیا۔ منافقین اور مخالفین نے موقع سے ناجائز فائدہ اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی اور مسلمانوں کی ماں صدیقہ طاہرہ حضرت عائشہؓ پر بہتان باندھ دیا اور جب اس باب میں اوپر سے مداخلت ہوئی تو سب سے پہلے خود ان مسلمانوں کو ہی ڈانٹ پلائی گئی جو اس باب میں تذبذب کا شکار تھے۔ فرمایا:

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ [۱]

کہ جب تم نے ایسی واہیات بات سُنی تھی تو اپنے نبی اور ان کی بیوی کے کردار کی روشنی میں تم نے فوراً ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ سبحان اللہ یہ تو نری بکواس ہے۔

اور مولانا مودودی جن مورخین کی عظمت کا دباؤ ڈال کر اپنے قارئین کے سر آرہے ہیں کہ میں ان لوگوں سے جو بھی نقل کرتا ہوں اس کو قبول کرو تو ان مورخین کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ کھلے بندوں اعلان کرتے ہیں کہ ہم اپنی روایات کی صحت کی ضمانت نہیں دیتے۔ ہمارے پاس جو کچھ آیا ہم نے جمع

---

[۱] سورۂ نور

کرکے اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے [۱]

مولانا خود ابن قتیبہ کی کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" کے بارے میں تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں بعض ایسی روایات موجود ہیں جو خود ابن قتیبہ کے علم اور اس کی دوسری تصنیفات کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتیں میں نے خود یہ کتاب پڑھی ہے اور اس کی چند روایات کو میں بھی الحاقی سمجھتا ہوں [۲]

تعجب ہے کہ ابن قتیبہ کی عزتِ نفس کا مولانا کو اتنا خیال ہے کہ وہ اپنے قیاس سے ہی اس کی بعض روایات کو اس کی ذات سے ناہموار قرار دے لیتے ہیں اور اس کے گناہ پر خود معذرت پیش کرتے ہیں۔ مگر اصحاب رسولؐ کے بارے میں ان کے مزاج میں اتنا تشدد ہے کہ وہ صحابی کے مقابلہ میں ابن مخنف اور اسی قماش کے دوسرے کذاب راویوں کی روایات کو نہ صرف خود قبول کر لیتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی ایسا ہی کریں، مولانا کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ ؎

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

قبول کرنے پر آئیں تو ابن سعد کی روایات کو سب دوسروں پر ترجیح دینے لگتے ہیں جنہوں نے اپنے ہاں اتنی واہی روایات قبول کر رکھی ہیں کہ ان پر ایمان لانا صرف مولانا کا ہی حوصلہ ہے۔ یہ بات انہی بزرگوار نے ہمیں بتائی تھی کہ سورۃ نجم کی تلاوت کرتے ہوئے شیطان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے تلک الغرانیق الاولیٰ کا جملہ آیۂ قرآنی بنا کر نکلوا دیا تھا۔

اور اگر ردّ کرنے پر آئیں تو اپنے خلافِ منشا ہونے کی وجہ سے صحیح بخاری کو بھی یہ کہتے ہوئے ردّ کر دیں کہ:

بخاری جس کے بارے میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے کوئی

---

[۱] طبری جلد اول [۲] خلافت و ملوکیت صد ۳۱۰

بڑے سے بڑا غلو کرنے والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں جو چھ سات ہزار احادیث درج ہیں وہ ساری کی ساری ہی صحیح ہیں [1]

صاحب الاستیعاب جناب ابن عبدالبر اکثر دوسروں سے ہی نقل کرتے ہیں یہی حال حافظ ابن کثیر صاحب البدایہ والنہایہ کا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ میں نے اکثر روایات اپنی کتاب میں اس لئے درج کی ہیں کہ طبری نے انہیں اپنے ہاں قبول کیا ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ وہ روایات صحیح احادیث کے خلاف واقع ہوئی ہیں [2] ابن اثیر کی روش بھی اکثر یہی ہے۔

مولانا کے مآخذ میں سے ایک مسعودی شیعہ ہیں اور ان کی شیعیت مولانا کو بھی تسلیم ہے۔ کچھ مورخین کی حیثیت متنازعہ فیہ ہے اور یہ بات قطعی نہیں کہ وہ شیعہ ہیں یا سُنی اور انہی کا رعب دے کر مولانا اپنی منواتے ہیں اور جہاں تک مولانا کے ان معتبر مآخذ کا تعلق ہے وہ اُن سے خود بھی سوتیلی ماں کا ہی سلوک کرتے ہیں وہ ان کی بھی وہی بات مانتے ہیں جسے وہ مولانا کے مناسب مزاج بنا کر پیش کریں ورنہ فوراً آنکھیں بدل لیتے ہیں مثلاً:

طبری جو اُن کے نزدیک سب سے معتبر مورخ ہیں وہ اُن سے یہ روایت تو لیتے ہیں کہ:

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد اکابر مہاجرین و انصار نے جن میں طلحہؓ اور زبیرؓ شامل تھے حضرت علیؓ کے پاس جمع ہو کر اُن سے خلافت قبول کرنے کی درخواست کی اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں یوں بیعت لینے پر تیار نہیں ہوں مسجد نبویؐ میں چل کر سب کے سامنے بیعت لوں گا [3]

مگر وہ طبری کی وہ روایت ترک کر دیتے ہیں جہاں تحریر ہے کہ حضرت علیؓ اپنے لئے بیعت طلب کرنے کے لئے زبیرؓ کے گھر گئے مگر انہوں نے دیکھا کہ ان کی

---

[1] تقریر ۱۵ رمئی بمقام برکت علی محمڈن ہال لاہور مندرجہ ہفت روزہ الاعتصام ۲۶ رمئی ۱۹۵۵ [2] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صـ ۱۴۷ [3] طبری جلد ۳

ران کے نیچے ننگی تلوار پڑی ہے اور ان کے تیور کچھ زیادہ ہی بے ڈھب ہیں اور علیؓ جلدی ہی اُٹھ آئے۔ لوگوں نے پوچھا کیا خبر ہے؟ فرمایا زبیرؓ نے میری بیعت کر لی ہے[1]

یہ ہے مولانا کا وہ سرمایۂ ناز، تاریخی خزانہ جس کی بنا پر وہ یہ دھونس جماتے ہیں کہ:

اگر یہ اُس دور کی تاریخ کے معاملہ میں قابلِ اعتماد نہیں ہیں تو پھر اعلان کر دیجئے کہ عہدِ رسالتؐ سے لے کر آٹھویں صدی تک کوئی اسلامی تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے[2]

دوسرا مغالطہ

علیؓ کی خلافت اور معاویہؓ کی بغاوت

مولانا مودودی صاحب حضرت معاویہؓ کی بغاوت اور حضرت علیؓ کی

[1] طبری جلد ۳ [2] خلافت و ملوکیت ص ۳۱۶

خلافت کے اثبات میں دلائل پیش کرتے ہوئے اپنے قاری کو مغالطہ در مغالطہ اتنی پٹخنیاں دیتے ہیں کہ وہ اپنے ہوش کھو دے آپ بھی دیکھئے فرماتے ہیں:

۱۔ کیا یہ انتخاب غلط تھا (مولانا کا مطلب یہ ہے کہ کیا حضرت علیؓ خلافت کے اہل نہیں تھے؟)

۲۔ کیا اس وقت حضرت علیؓ سے بہتر کوئی آدمی مدینہ میں ہی نہیں پوری دنیائے اسلام میں ایسا موجود تھا جسے خلیفہ منتخب ہونا چاہیئے تھا۔

۳۔ کیا اس وقت کے رائج اور مسلّم اسلامی دستور کی رُو سے حضرت علیؓ جائز طور پر خلیفہ منتخب نہ ہو گئے تھے؟

۴۔ کیا اسلامی دستور میں ایسی کوئی چیز کہیں پائی جاتی ہے کہ نئے خلیفہ کے انتخاب میں اگر سابق خلیفہ کے خلاف سازش برپا کرنے والا گروہ بھی شریک ہو گیا تو اس کا انتخاب غیر قانونی قرار پائے؟

۵۔ کیا یہ درست تھا اور یہی ہونا چاہیئے تھا کہ ایک خلیفہ شہید ہو چکا ہو اور دوسرا خلیفہ اس کی جگہ جلدی سے جلدی منتخب نہ کر لیا جائے بلکہ دنیائے اسلام ایک مدت تک بے خلیفہ ہی پڑی رہے؟

۶۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت علیؓ دانستہ ہی قاتلینِ عثمانؓ کو گرفتار کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے میں کوتاہی کر رہے تھے، یا اُن کے ہاتھ میں بے بس تھے تب بھی کیا اسلامی آئین و دستور کی رُو سے یہ بات اُن کی خلافت کو ناجائز اور اُن کے خلاف تلوار لے کر کھڑے ہو جانے کو جائز کر دینے کے لئے کافی تھی لہ

اور اس کے بعد ان سوالات کے جواب کے لئے صدائے عام دینا بھی مناسب سمجھا ہے۔

لہ خلافت و ملوکیت ص ۳۲۵ تا ۳۲۷

سوال نمبر۱ : مولانا نے یہ سوالات اٹھا کر اپنی ذہانت سے انصاف نہیں کیا ہے۔ انہیں جاننا چاہیئے تھا کہ اس مرحلہ پر حضرت علیؓ کی خلافت کے لیئے ان کی صلاحیت یا عدم صلاحیت کا مسئلہ زیرِ بحث نہیں تھا یہی نہیں بلکہ خود خلافت بھی کوئی متنازعہ فیہ شے نہیں تھی جو مولانا ان سوالات کا تکلف کرتے۔

یہاں نہ کسی کو حضرت علیؓ کی صلاحیت پر اعتراض تھا اور نہ اس کا مرحلہ ہی آیا تھا۔ کیونکہ حضرت علیؓ کی صلاحیت تو اس وقت سے ہی مسلم تھی جب حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اپنی رحلت کے مرحلہ پر انہیں اس جماعت کا رکن نامزد کیا تھا جس میں سے ہر کسی بزرگ کو ہی بطور خلیفہ قبول کیا جا سکتا تھا تو ایسے میں ان کی صلاحیت کیوں زیرِ بحث آتی! پھر حضرت علیؓ کے مقابلہ پر اُس وقت کوئی دوسرا دعویدار بھی نہیں تھا جو صلاحیتوں کے تقابلی جائزہ کا سوال پیدا ہوتا۔

اور پھر یہ بھی واضح ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان ہو چکنے پر بھی کسی نے نہ اُن کی خلافت پر اعتراض کیا تھا نہ صلاحیت پر، پھر یہ بیکار کی بحث اٹھانے کا کیا مطلب ہے!

بات تو بڑی سیدھی تھی کہ آپ خلیفہ منتخب ہو چکے ہیں تو اب آپ کا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اپنے پیشرو مظلوم شہید خلیفہ کے خون کا قصاص لیں یا اگر آپ کو کوئی مجبوری درپیش ہے تو قاتلین کو مقتول کے ورثاء کے حوالہ کر دیجئے۔

اور یہ قاتلین کی مقتول کے ورثاء کو حوالگی کا سوال بھی حضرت علیؓ سے اس لئے کیا جا رہا تھا کہ قاتلین ان کی پناہ میں تھے، ان کی سپاہ میں تھے، اُن کے لشکر میں تھے، ورنہ یہ مطالبہ اُن سے کیوں کیا جاتا!

اور اگر کبھی کسی مرحلہ پر حضرت علیؓ کی خلافت پر بھی کوئی بحث چلی، ہو تو اس بحث کا سبب بھی قاتلوں کا مسئلہ ہی تھا اور یہ بحث اس وقت تک ہی تھی جب تک قاتل حضرت علیؓ کی پناہ میں ہیں یا جب تک حضرت علیؓ انہیں تحفظ دے رہے ہیں ورنہ قاتلوں سے الگ ہو کر حضرت علیؓ کی خلافت کوئی متنازعہ فیہ

مسئلہ نہیں تھی۔

اور حضرت علیؓ کے فریق مخالف کی طرف سے قصاص پر بیعت کی شرط ہی اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ انہیں حضرت علیؓ کی ذات، ان کی خلافت یا ان کی صلاحیت پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اعتراض صرف ان کی پالیسی اور انکے طرزِ عمل پر تھا۔

حضرت علیؓ سے یہ مطالبہ کوئی غیر شرعی نہیں تھا کہ یا تو قاتلوں سے خود قصاص لیجئے یا انہیں عثمانؓ کے ورثا کے حوالے کر دیجئے۔ اور حضرت علیؓ کے باب میں اس مرحلہ پر یہ مطالبہ اس لئے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ملک کے اندر یہ تاثر بہت عام تھا کہ حضرت علیؓ قاتلین عثمانؓ کے خلاف کارروائی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

اب دو ہی صورتیں سامنے ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ قصاص لینا ہی نہیں چاہتے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں حضرت علیؓ کے خلاف سوچنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

۲۔ وہ قصاص لے نہیں سکتے، کیونکہ جیسا کہ وہ خود بھی کہتے تھے وہ قاتلوں کے مقابلہ میں بے بس ہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں قصاص کا امکان بھی خارج از بحث ہے۔

اب اس قضیہ کے حل کی بھی دو ہی صورتیں تھیں:

اوّل، یہ کہ خواہ جیسے بھی ممکن ہو حضرت علیؓ کو قصاص کے لئے مجبور کیا جائے،

دوسری صورت یہ تھی کہ حضرت علیؓ کو مشکل سے بچانے کے لئے ان سے درخواست کی جائے کہ وہ یا تو خود قاتلین عثمانؓ کو عثمانؓ کے وارثوں کے سپرد کر دیں یا ان کا تحفظ واپس لے لیں، ان کا معاملہ عثمانؓ کے ورثاء پر چھوڑ دیں اور خود درمیان سے ہٹ جائیں۔ اور واقعہ یہی ہے کہ قصاص کے سوال پر حضرت علیؓ اور ان کے مخالفین حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ساری کشمکش کا حاصل یہی ہے۔

بات میں اُلجھاؤ کوئی نہیں ہے اُلجھاؤ صرف اس وقت آتا ہے جب اُسے قصداً پیدا کیا جائے۔ قاتلینِ عثمانؓ حضرت علیؓ کے ہاں بیٹھے اُن کے نام سے خلافت

کی گاڑی چلا رہے ہیں۔ علیؓ مانتے ہیں کہ وہ اُن کے مقابلہ میں بے بس ہیں علیؓ اُن کے قابو میں ہیں، وہ علیؓ کے قابو میں نہیں۔ پھر کوئی بھی انصاف پسند شخص یہ بتائے کہ ایسی صورت میں قصاص کے طالب کیا کرتے؟

علیؓ اُن سے قصاص نہیں لیتے یا لے نہیں سکتے۔ اب قصاص کی کیا صورت ہو، کیا قصاص کا مطالبہ ترک کر دیا جائے اور خلیفہ کو بے بس پاکر مقتول کے وارث رو دھو کر چپ ہو جائیں، یا قصاص حاصل کرنے کی متبادل صورت پر غور کیا جائے۔

آخر سٹیٹ کو کیا حق ہے کہ وہ ایک جرم کو جرم بھی سمجھے اور مجرم کو جرم کی نہ صرف سزا نہ دے بلکہ اس غرض سے سوچنے سے بھی انکار کرے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حکومت مجرم کی طرفدار ہے، اگر طرفدار نہیں تو اُسے مجرم کو سزا دینی چاہیئے۔ اگر سزا دینے پر قادر نہیں تو ایسی حکومت کے سربراہ کو سوچنا چاہیئے کہ وہ ایسی حکومت کے سربراہ رہیں یا الگ ہو جائیں۔ مگر یہاں کوئی بھی صورت موجود نہیں تھی۔

حضرت علیؓ سے کہا گیا کہ آپ قصاص لیں، فرمایا میں قصاص لینے پر قادر نہیں۔ عرض کیا گیا کہ پھر راستہ چھوڑ دیں قصاص لے لیا جائے گا مگر علیؓ اس کی بھی اجازت نہیں دیتے۔

مولانا کے نزدیک تو بہر حال معاویہؓ ہی قصوروار ہیں اور وہ اسی بات پر زور دیئے جا رہے ہیں کہ قصاص کے لئے معاویہؓ کو خلیفہ کے حضور حاضر ہونا چاہیئے تھا۔ اب مولانا سے کون کہے کہ جب آپ بھی خلیفہ کو بے بس سمجھتے ہیں اور خلیفہ بھی اپنے آپ کو بے بس کہتے تھے تو معاویہؓ وہاں کیا لینے جاتے؟ جب علیؓ کا حکم نہیں چلتا تھا تو وہ حکم کس سے طلب کرتے۔ جب ان کی عدالت قائم نہیں تھی تو یہ عدل کیونکر طلب کرتے اور کس سے کرتے؟ یہاں علیؓ کی صلاحیت کا سوال ہی نہیں تھا صرف قصاص کا سوال تھا اور وہ مل نہیں رہا تھا اس لئے مولانا کا یہ سوال ہی غلط اور بے محل ہے کہ کیا یہ انتخاب غلط تھا؟

سوال نمبر ۲: مولانا پوچھتے ہیں کہ "کیا اس وقت حضرت علیؓ سے بہتر کوئی آدمی مدینہ میں ہی نہیں پوری دنیائے اسلام میں ایسا موجود تھا جسے خلیفہ منتخب ہونا چاہیئے تھا؟"

گذارش ہے کہ مولانا کا یہ سوال کار بے خیر بھی ہے اور بعد از وقت بھی ہے۔ ہم اپنے آپ کو اس بحث کا حریف نہیں سمجھتے لیکن اگر کسی کو اس باب میں تجسس کا ہی شوق ہو تو وہ پھر حضرت عثمانؓ کے اُن قاتلوں سے اس سوال کا جواب دریافت کرے جو حضرت علیؓ کی موجودگی میں ان کو چھوڑ کر طلحہؓ اور زبیرؓ کے دروازوں پر بھٹکتے پھرتے رہے اور پھر جب وہ خلافت قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے تو انہوں نے اپنی غرض حضرت علیؓ کے ذریعہ پوری کر لی۔

یا پھر اس بات کا پتہ اس صورت میں چل سکتا تھا کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ پر کوئی دوسرا شخص خلافت کا مدعی بن کر آتا اور پتہ چل سکتا کہ مسلمانوں کے اندر زیادہ رسوخ کس کا ہے اور لوگ کس شخص کو خلافت کا زیادہ اہل سمجھتے ہیں۔

اور حق تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے باب میں مولانا مودودی صاحب کا بار بار اس سوال کو اُٹھانا حضرت علیؓ کے حق میں مولانا کی نادان دوستی میں ہی شمار ہو گا کیونکہ مولانا خود بھی جانتے ہیں کہ تاریخ اس سوال کا جواب بار بار دے چکی ہے۔ اور مولانا کو اس بات کا بھی علم ہے کہ یہ جواب حضرت علیؓ کے حق میں نہیں ہے مگر مولانا مودودی ہیں کہ جانتے بوجھتے بھی اپنی غرض سے علیؓ علیؓ کے نعرے لگائے چلے جا رہے ہیں تاکہ اپنے ناراض ووٹروں کو خوش کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیں خواہ اس مہم میں انہیں حضرت علیؓ کے استخفاف کا گناہ بھی برداشت کرنا پڑے۔

ہم گزشتہ اوراق میں زیرِ عنوان "یہ غلط فہمی نہیں غلط اندیشی ہے" حضرت علیؓ کے ایک بے لاگ محب، بہی خواہ اور ہمدرد مصری مؤرخ عمر ابو النصر

کے حوالہ سے یہ بات مولانا کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں کہ۔

اگر اشتر اور اس کے ساتھی لوگوں کو حضرت علیؓ کی بیعت کے لئے مجبور نہ کر دیتے تو طلحہؓ و زبیرؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ یہ منصب حاصل نہ کر سکتے۔ (علیؓ و عائشہؓ ص۶۲)

اور ہم جانتے ہیں کہ مولانا کو یہ بھی علم ہے کہ اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم حضرت علیؓ کے بارے میں ایک واضح موقف رکھتے تھے جس کی وجہ سے حضرت علیؓ خلافت کی ہر تبدیلی کے مرحلہ پر ہمیشہ مؤخر رکھے گئے۔

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد بھی اصحابِ رسولؐ کا خیال حضرت علیؓ کے حق میں نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کی زندگی کے دورِ آخر میں یہ مسئلہ ایک بار پھر مجلسوں اور محفلوں میں آگیا تھا۔

ذیل میں ہم ان تینوں ادوار (یعنی ادوارِ شیخین، دورِ عثمانی اور حضرت عثمانؓ کے بعد) کے بارے میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ سے تین فیصلہ کن احادیث یہاں درج کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے ہر کوئی ہی صورتِ حال کے بارے میں صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے اگرچہ مولانا کا معاملہ سب سے الگ ہے۔

۱۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔

كُنَّا فِي زَمَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نَعْدِلُ بِأَبِي بَكْرٍ أَحَدًا ثُمَّ عُمَرَ ثُمَّ عُثْمَانَ ثُمَّ نَتْرُكُ أَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نُفَاضِلُ بَيْنَهُمْ۔ (بخاری شریف کتاب المناقب حدیث نمبر ۱۹) کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ابو بکرؓ کے برابر دوسرے کسی صحابی کو نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے بعد عمرؓ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے اور اُن کے بعد عثمانؓ کو سب سے افضل جانتے تھے۔ عثمانؓ کے بعد پھر کسی کو کسی دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے تھے (بلکہ سب کو ہی ایک دوسرے کے برابر سمجھتے تھے)

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے صاحبزادے حضرت محمد بن علی (ابن حنفیہ) اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ۔

میں نے ایک روز اپنے والد (حضرت علیؓ) سے دریافت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ فضیلت کس کو حاصل ہے؟ فرمایا ابوبکرؓ کو قُلْتُ ثُمَّ مَنْ ؟ کہ ابوبکرؓ کے بعد کون افضل ہے؟ فرمانے لگے ثُمَّ عُمَرُ کہ ابوبکرؓ کے بعد عمرؓ سب سے افضل ہیں۔ حضرت محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ خَشِيْتُ اَنْ يَقُوْلَ عُثْمَانَ کہ مجھے خوف ہوا کہ اگر میں نے اب پوچھا کہ ثُمَّ مَنْ ؟ کہ عمرؓ کے بعد کون افضل ہے تو آپ عثمانؓ کا نام نہ لے دیں۔ پس میں نے (خود ہی سبقت کی اور) کہا ثُمَّ اَنْتَ (یَا اَبَتِ)؟ پھر آپ ابا جان؟ (اور مجھے مایوسی ہوئی جب) آپ نے فرمایا مَا اَنَا اِلَّا رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ کہ نہیں میں تو عام مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہوں۔ (بخاری شریف کتاب المناقب حدیث نمبر ۸۶۸)

۳۔ مدینہ منورہ میں ایک بار نکسیر کا مرض بہت زیادہ پھیل گیا اور اتفاق سے حضرت عثمانؓ بھی اس مرض کا شکار ہو گئے۔ خون بکثرت بہہ جانے سے آپ اتنے زیادہ کمزور ہو گئے کہ حج کے لئے بھی نہ جا سکے اور موت واقع ہو جانے کے خطرہ کے پیشِ نظر آپ نے وصیت بھی لکھوا دی۔ اس حال میں اُن سے درخواست کی گئی کہ اِسْتَخْلِفْ! کہ امیر المومنین اپنے جانشین کے بارے میں بھی وصیت فرما دیجئے۔ فرمایا وَقِيْلَ ذَاكَ کہ سب لوگ کیا یہی چاہتے ہیں؟ اور وہ میرے بعد کس کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتے ہیں؟ قَالَ نَعَمْ اَلزُّبَيْرُ کہنے والے نے کہا کہ ہاں سب لوگ یہی کہتے ہیں اور لوگ آپ کے بعد زبیرؓ کی بات کرتے ہیں۔ فرمایا اَمَا وَاللّٰهِ

اِنَّكُمْ لَتَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ خَيْرُكُمْ ثَلٰثًا کہ اللہ کی قسم تم جانتے ہی ہو کہ زبیرؓ اس وقت تم سب میں سب سے بہتر ہیں اور آپ نے یہ کلمہ تین بار دہرایا۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں اَمَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّهٗ خَيْرُهُمْ مَا عَلِمْتُهٗ وَاِنْ كَانَ لَهٗ اَحَبَّهُمْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (بخاری شریف پ۱۴ کتاب المناقب حدیث نمبر۹۱۱) کہ سن لو مجھے اپنے اس رب کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس وقت جتنے لوگوں کو میں جانتا ہوں زبیرؓ ان سب میں سے بہتر شخص ہیں اور وہ سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے تھے۔

سوال نمبر۳: مولانا کا سوال ہے "کیا اس وقت کے رائج اور مسلّم اسلامی دستور کی رُو سے حضرت علیؓ جائز طور پر خلیفہ منتخب نہ ہو گئے تھے؟"

کوئی جان بوجھ کر نادان بنے تو اس کا کوئی علاج نہیں ورنہ مولانا خوب جانتے ہیں کہ حضرت علیؓ کا انتخاب جن حالات میں ہوا ہے وہ اُن اسلامی دستوری حالات کے مطابق ہرگز نہیں تھے جو اسلام اور مسلمانوں کی روایات تھیں کیونکہ جب حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کیا گیا تو انتخاب کے ناگزیر عوامل میں سے سوائے حضرت علیؓ کی اپنی ذاتِ گرامی کے کوئی دوسری بات ہرگز موجود نہیں تھی۔

دارالخلافہ میں ہنگامہ قتل و خون جاری تھا، ہر طرف بدامنی کا دَور دَورہ تھا، جارحیت اور زور و جبر کی حکومت تھی، شہید خلیفہ کے قاتل شہر میں ہر طرف دندناتے پھرتے تھے، نہ کسی کو جان کا تحفظ حاصل تھا نہ آبرو کا۔

خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لینے والے عام اہل مدینہ تو رہے ایک طرف خود منتخب

ہونے والے خلیفہ کی اپنی رائے بھی اُن کی اپنی مرضی کے تابع نہیں تھی اور سارے ہی اہلِ مدینہ حضرت علیؓ سمیت قاتلوں، مفسدوں، باغیوں اور بلوائیوں کی رائے کے پابند تھے اور منتخب ہونے والے خلیفہ اس طرح باغیوں اور بلوائیوں کے نرغہ میں تھے کہ اگر وہ بھی خلافت قبول کرنے سے انکار کرتے تو انہیں اس کی ہرگز اجازت نہ دی جاتی کیونکہ وہ لوگ جو مورخین کے بقول حضرت علیؓ کی بیعت کرکے بھی انہیں دھمکاتے تھے کہ اگر تم نے ہماری مرضی کے خلاف سانس بھی لی تو تمہارا انجام بھی عثمانؓ کی طرح ہی ہوگا۔ وہ اس وقت جب اُنہیں بہرحال ایک خلیفہ کی ضرورت تھی اُنہیں کیونکر معاف کرتے۔

دوسری طرف اکابر صحابہؓ نے حضرت علیؓ کی بیعت سے انکار کر رکھا تھا اور وہ مدینہ کے ان غیر یقینی اور مخدوش حالات میں جہاں کسی کی رائے آزاد نہیں تھی بیعت پر آمادہ نہیں تھے۔ لوگوں کو بیعت کے لئے گھروں سے گھسیٹ گھسیٹ کر لایا جا رہا تھا اور بلوائیوں کا اُن لوگوں کے ساتھ بھی یہی سلوک تھا جن کی خدمت میں وہ چند گھنٹے پہلے خلافت کا تاج لے کر حاضر ہوئے تھے۔ شرفاءِ شہر اپنے اپنے گھروں میں بند ہو بیٹھے تھے اور وہ باہر نکلنے سے انکار کرتے تھے اور بہت سے لوگ دہشت کے سبب شہر چھوڑ کر نکل گئے تھے۔

ان حالات میں حضرت علیؓ کی خلافت کا انعقاد کیا جا رہا تھا اور کچھ لوگ جیسے کیسے بھی بیعت کر رہے تھے۔

پھر جب بلوائیوں نے حضرت علیؓ کی زبان سے ان کی پالیسی کا اظہار کروایا تو بہت سے مبایعین بھی دل شکستہ ہوگئے اور بہت سے لوگ بیعت فسخ کرکے نکل گئے اور باقی لوگ محاصرہ میں پڑے مجبوری کا کلمہ پڑھتے رہے۔

ان حالات میں مولانا کا یہ سوال کرنا کہ کیا اسلام کے رائج اور مسلّم دستور کے مطابق علیؓ خلیفہ نہیں منتخب ہوگئے تھے؟ اگر فریب دہی نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔ اس صورتِ حال میں تو خود مولانا سے پوچھا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ کی

خلافت کے انعقاد میں جن عوامل کا دخل تھا یعنی یہ زور یہ جبر یہ ظلم یہ تشدد یہ جَور یہ تعدّی یہ جارحیت اور یہ زیادتی تو کیا اسلام کے مسلّم دستور کے مطابق خلیفہ کے انتخاب کی یہی روایات چلی آ رہی تھیں۔ خلافتِ راشدہ کے انتخابی قواعد کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے ہی بتایا تھا کہ۔

خلافتِ راشدہ میں قاعدہ یہ تھا کہ کوئی شخص خود خلافت حاصل کرنے کے لئے نہ اُٹھے اور اپنی سعی و تدبیر سے برسرِ اقتدار نہ آئے بلکہ لوگ جس کو اُمت کی سربراہی کے لئے موزوں سمجھیں اپنے مشورے سے اقتدار اس کے سپرد کر دیں۔ بیعت اقتدار کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا سبب ہو بیعت حاصل کرنے میں آدمی کی اپنی کوشش یا سازش کا قطعاً کوئی دخل نہ ہو بلکہ لوگ بیعت کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں پوری طرح آزاد ہوں اور جب تک کسی کو لوگوں کی آزادانہ رضامندی سے بیعت حاصل نہ ہو جائے وہ برسرِ اقتدار نہ آئے۔ خلفاء الراشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدہ کے مطابق برسرِ اقتدار آیا تھا۔[1]

تو کیا مولانا بتا سکتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے انتخاب پر صرف ایک امر حضرت علیؓ کی صلاحیت سے قطع نظر باقی امور میں سے کوئی ایک امر بھی وہاں موجود تھا۔ اور آپ کی بیان کردہ شرائط انتخاب میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری ہو سکی تھی؟

سوال نمبر ۴ : مولانا مودودی پوچھتے ہیں کہ۔

کیا اسلامی دستور میں ایسی کوئی چیز پائی جاتی ہے کہ نئے خلیفہ کے انتخاب میں اگر سابق خلیفہ کے خلاف شورش برپا کرنے والا گروہ بھی شریک ہو گیا تو اس کا انتخاب غیر قانونی قرار پائے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ خواہ جن حالات میں بھی خلیفہ بنائے گئے ہوں وہ صحابیت

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۵۷ - ۱۵۸

کے شرف سے مشرف ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ارشد ہیں۔ اور اس میں بحث والی کوئی بات نہیں ہے مگر مولانا نے جو سوال اُٹھایا ہے اس میں بحث کی پوری گنجائش بلکہ دعوتِ بحث بھی موجود ہے۔ اور یہ ایک نہایت نازک بحث ہے اور ہم اس پر کسی طرح بھی آمادہ نہیں مگر مولانا کی مغالطہ آفرینی کی سمیّت کے ازالہ کی غرض سے ہمیں اس نازک عنوان پر بھی مولانا کی خدمت میں کچھ باتیں عرض کرنے کی مجبوری ہے۔

مولانا سے گزارش ہے کہ یا تو وہ خلافتِ راشدہ کا دستور اور اسکے قاعدے سامنے نہ رکھیں یا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب کو حالات کے عذر سے ان قواعد سے مستثنیٰ قرار دیں۔ اگر وہ حضرت علی رضؓ کو خلفائے راشدین میں شامل کرنا چاہیں گے تو انہیں حضرت علیؓ کو بھی انہی قواعد کی ترازو پر تولنا ہوگا جو قاعدے دوسرے خلفاء الراشدین کے لئے مقرر ہیں۔ اور اگر مولانا حضرت علیؓ کو فتنہ اور اختلاف کے حالات کا فائدہ دے کر بہلو بچا کر نکل جانا چاہیں تو پھر وہ اسی حدیثِ پاک کے مضمون پر قناعت کریں جہاں ارشاد ہے۔

"خلافتِ راشدہ حضرت عثمانؓ تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد بادشاہت ہے جسے اللہ چاہے عطا کر دے"

اب جہاں تک کسی خلیفہ کے انتخاب میں رائے دہندگان کی شرکت کا تعلق ہے تو قرآن فاسقوں کی گواہی قبول کرنے سے انکار کرتا۔ یہ رائے بھی ایک گواہی ہے۔ حضرت عثمانؓ کے قاتل صریحاً فاسق تھے اور وہ نئے خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لینے کا حق نہیں رکھتے تھے، اُنہوں نے اپنے فسق سے توبہ نہیں کی تھی اور مولانا مانتے ہیں کہ "فاسق کی گواہی مردود ہے" [1]

پھر یہ لوگ حضرت علیؓ کے انتخاب میں شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ انتخاب کے نام سے وہاں جو کچھ ہوا تھا وہ اُنہی کا تھا، اُنہی کی مصلحت سے

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۵۳

تھا، اُنہی کی ضرورت سے تھا، اُنہی کے اہتمام میں تھا اور اُنہی کے حکم سے تھا۔ اُن کے بارے میں کوئی مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت کہاں تھی اور کس کو تھی! بلوائیوں کو اس مرحلہ پر جلد از جلد ایک خلیفہ مطلوب تھا خواہ وہ کوئی ہو، اور وہ اسی غرض سے سرگرم تھے۔ مولانا اپنے قارئین کو کن بھول بھلیوں میں ڈال رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کی خلافت کے جائز یا ناجائز ہونے کا جب سوال ہی کوئی نہیں اُٹھا رہا اور سب ہی اس بات پر متفق ہیں کہ جو کچھ ہو چکا وہ ٹھیک ہی ٹھیک ہے۔ تو اب آپ کس سے جواب طلبی کے لئے نکلے ہیں!

سوال نمبر ۵ : بلوائیوں کو تو خیر اپنی بھیانک مجرمانہ کاروائی کے بھیانک انجام سے بچنے اور اپنے جرم کی کہانی کو سمیٹ لینے کے لئے جلد از جلد ہی ایک خلیفہ چاہیئے تھا مگر مولانا کو بھی (شاید مقصد کی یکسانیت کے سبب) یہی خطرہ دامنگیر ہے، فرماتے ہیں:

"ایک خلیفہ شہید ہو چکا ہے تو کیا اس کی جگہ دوسرا خلیفہ جلدی سے منتخب نہ کر لیا جائے اور دنیائے اسلام ایک مدت تک بے خلیفہ ہی پڑی رہے"[1]

مولانا کا یہ نکتہ درست ہے کہ اُمت کو زیادہ دیر تک بے امام رکھنا مناسب نہیں تھا۔ مگر کیا اس مناسب کام کے لیئے وہی کچھ کرنا چاہیئے تھا جو کیا گیا!

ملک کو خلفشار سے محفوظ رکھنے کے لئے عجلت میں کسی ایک شخص پر لوگوں کو بزور جمع کرنے کے بجائے کیا یہ بہترین صورت نہ تھی کہ بلوائی اور شورشی فاروقِ اعظمؓ کی سنّت کی روشنی میں اکابر صحابہ کی ایک انتخابی جماعت تشکیل دیتے۔ اور اس جماعت کو پابند کیا جا سکتا تھا کہ وہ دو، چار یا چھ روز کے اندر اندر کسی شخص کی خلافت کا اعلان کرے۔

اگر ایسا کیا جاتا تو کیا پھر بھی اُمت بے امام ہی پڑی رہتی! اس طریقہ

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۲۵۳

بیں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ اصحابِ رسولؐ کے درمیان باہمی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکتا۔ وہ لوگ ایک دوسرے سے اختلاف کے بجائے ایک دوسرے سے مشاورت کرتے اور باہمی جنگ اور جھگڑے کی جگہ
اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کا ایمان افروز منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ لوگ شہر سے بھاگنے کے بجائے نئے خلیفہ کے اعلان کا انتظار کرتے، میدان کے فیصلے میز پر طے ہوتے اور وہ ہزاروں مسلمان جو اصحاب کی باہمی منافقت اور بالآخر تصادم سے خاک و خون میں لوٹ گئے اُن کا خون نہ بہتا۔ کافر کا مقابلہ کرنے والے آپس میں نہ کٹ مرتے، اور جن تلواروں کو کافروں کی گردنوں کی پیمائش کے لئے ڈھالا گیا تھا وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی گردنیں کاٹنے کے کام نہ آتیں۔ مگر وہاں اُمت کے بے امام رہ جانے کی فکر کس کو تھی جو یہ بھلی صورت اختیار کی جاتی وہاں تو قاتلینِ عثمانؓ کے پیشِ نظر صرف یہ ایک ہی بات تھی کہ جیسے بھی ہو جلد از جلد کسی آدمی کی خلافت کا اعلان کر دیا جائے تاکہ حضرت عثمانؓ کے مظلومانہ قتل کی وجہ سے جو مسلمانوں کی ناراضگی کا سیلاب ہر لمحہ بڑھتا ہی جارہا ہے خلیفہ کا انتخاب کر کے اُس کا رُخ قاتلوں کی طرف سے دوسری جانب موڑ دیا جائے اور بس۔

بہتر ہوتا اگر انتخابی کمیٹی کی تجویز خود حضرت علیؓ ہی پیش کرتے اس طرح ان کی ذات کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیل رہی تھیں وہ بھی دُور ہو جاتیں۔ مگر افسوس کہ انہوں نے بھی اس مرحلہ پر خاموش رہنا ہی پسند کیا اور ظاہر ہے کہ مولانا مودودی بھی اس مرحلہ پر ایسا کوئی مشورہ پیش کرنے کے حق میں نہیں ہوں گے اگرچہ وہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے یزید کی جانشینی پر تنقید کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کو یہی مشورہ پیش کرتے رہے ہیں کہ:

میں پوچھتا ہوں اگر فی الواقع حضرت معاویہؓ کا یہ خیال تھا کہ اُن کے بعد کہیں جانشینی کے لئے اُمت میں خانہ جنگی برپا نہ ہو اور اس بنا پر وہ یہ

ضرورت محسوس فرماتے تھے کہ اپنی زندگی میں ہی اس کا فیصلہ کر کے اپنے ولیعہد کے لئے بیعت لے لیں تو کیا وہ اس نہایت مبارک خیال کو عمل میں لانے کی یہ صورت اختیار نہ فرما سکتے تھے کہ بقایا صحابہ اور اکابر تابعین کو جمع کرتے اور اُن سے کہتے کہ میری جانشینی کے لئے ایک موزوں آدمی کو میری زندگی میں ہی منتخب کر لو۔ اور جس کو وہ لوگ منتخب کرتے اُس کے حق میں سب سے بیعت لے لیتے۔

اس طریق کار میں آخر کیا مانع تھا؟ اگر حضرت معاویہؓ یہ راہ اختیار کرتے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خانہ جنگی پھر بھی برپا ہوتی، اور قیصر روم پھر بھی چڑھ آتا اور اسلامی ریاست کا خاتمہ کر ڈالتا [1]

مگر افسوس ہے کہ یہ مشورہ مولانا صرف معاویہؓ کے لئے ہی پسند کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کو وہ ایسا مشورہ پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکے کیونکہ مولانا کا انصاف کانا انصاف ہے اور وہ صرف ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہے۔

سوال نمبر ۶: ہمارے مولانا بڑے جری واقع ہوئے ہیں۔ دیکھئے کس حوصلہ سے لکھتے ہیں:

اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت علیؓ دانستہ ہی قاتلینِ عثمانؓ کو گرفتار کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے میں کوتاہی کر رہے تھے... تب بھی کیا... یہ بات ان کی خلافت کو ناجائز اور ان کے خلاف تلوار لے کر کھڑے ہو جانے کو جائز کر دینے کے لئے کافی تھی؟ سبحان اللہ ؎

اس نازنیں کو دیکھنا جو دستِ نہ چھیڑنا
گر روٹھ بھی گیا تو منایا نہ جائے گا

حضرت مولانا! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حضرت علیؓ کے خلاف کسی نے بھی تلوار نہیں اٹھائی، اُن سے لڑنے والوں کا جرم صرف یہ ہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے عُذر کو غیر صحیح سمجھ کر اُن سے اختلاف ناگزیر قرار دیا ہے اور پھر حضرت علیؓ سے جس کسی کا بھی قصاصِ عثمانؓ کے سلسلہ میں

[1] خلافت و ملوکیت۔ صـ ۳۴۶

تصادم و توقع پایا یا وہ محض اپنے دفاع کے طور پر تھا اُن کے خلاف جارحیت کسی نے نہیں کی اور مولانا خود مانتے ہیں کہ:

حضرت علیؓ نے اس کے بعد شام پر (یعنی معاویہؓ کے خلاف) چڑھائی کی تیاری شروع کردی .... لیکن عین وقت پر .... حضرت علیؓ کو شام کی طرف بڑھنے کے بجائے ربیع الثانی ۳۶ھ ہجری میں بصرے کا رُخ کرنا پڑا۔ جنگِ جمل (جمادی الاخریٰ ۳۶ھ) سے فارغ ہو کر حضرت علیؓ نے پھر شام کے معاملے کی طرف توجہ کی[1]

اب اگر حضرت علیؓ اپنے خلاف کسی دعوے دار کو مطمئن کرنے کے بجائے اس پر حملہ ہی کر دیتے ہیں تو شریعت میں ایسا کوئی قاعدہ موجود نہیں تھا کہ اُن کے حملہ کردینے پر اپنا دفاع بھی نہ کیا جائے۔ تاہم جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے حاکم کی زیادتی کے خلاف احتجاج کرنے اور اس کی غلطی پر اُسے ٹوکنے کا حق شریعت نے اسلامی مملکت کے ہر شہری کو دے رکھا ہے اور اس کی مثالوں سے اسلام کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اگر حاکم جسے قرآن نے اولی الامر کہا اپنی غلطی پر اصرار کرے اور اُسے ترک کرنے پر آمادہ نہ ہو تو قرآن نے اس کے خلاف لڑنے کی بھی اجازت دی ہے، جب فرمایا:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ[2]

کہ اگر (اولی الامر) کے ساتھ تمہارا جھگڑا ہو جائے تو فیصلہ کے لئے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف لوٹ آؤ۔

قرآنِ پاک نے تین مطاع قرار دیئے ہیں: اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ کہ اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو۔ لیکن جب جھگڑے کی بات چلی تو رجوع کے لئے اللہ اور اُس کے رسولؐ کا ذکر فرمایا، اولی الامر کو مرجع قرار نہیں دیا بلکہ اُسے ساقط کر کے اطاعت اللہ اور اُس کے رسولؐ سے خاص کردی۔ اور ظاہر ہے

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ ۱۳۴ [2] سورۂ نساء

یہ جھگڑا اولی الامر سے ہی ہے ورنہ وہ بھی ایک مطاع تھا اُسے ساقط کیوں کیا جاتا۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی باہمی جنگ میں تحکیم کا واقعہ اسی حقیقت کا مظہر ہے جہاں حضرت علیؓ نے بھی اپنے اور معاویہؓ کے جھگڑے میں تحکیم کو اسی اصول کی بنا پر اختیار کیا تھا۔

حدیث میں ہے لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت واجب نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ اس حکم میں خروج بھی داخل ہے۔ پھر مولانا کس شریعت کی بات کرتے ہیں جو طاقت ہوتے بھی اپنے حاکم کو سیدھی راہ پر لانے میں مانع ہے۔ اس حدیث رسولؐ کا کیا مطلب ہے جہاں فرمایا۔

مَن رَای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہٖ۔ کہ تم میں سے کوئی اگر کسی کو بے راہ پائے تو (اگر ہمت رکھتا ہے) تو اُسے اپنی قوتِ بازو سے سیدھا کرے۔

مولانا کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علیؓ اسی حکم پر عمل کرتے ہوئے حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ کے خلاف نکلے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس حکم پر عمل کرنے کا حق حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ سے بھی ساقط نہیں ہو چکا تھا۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں:

بیعتِ خلافت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے سب سے پہلا خطبہ جو دیا اس میں وہ فرماتے ہیں اطیعونی ما اطعت اللہ و رسولہ فاذا عصیت اللہ و رسولہ فلا طاعۃ لی علیکم۔ میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں۔ لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے [1]

خلیفۃ المسلمین منصور کے خلاف جب نفس ذکیہ اور اُس کے بھائی ابراہیم نے خروج کیا تو منصور کے خلاف لڑنے کے لئے امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ ایک بہت بڑا سبب تھا۔ مولانا مودودی نے اس بغاوت میں نفس زکیہ کی بغاوت کو حق بجانب

---

[1] خلافت و ملوکیت۔ ص ۷۶

قرار دیا ہے اور اس باب میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے فتویٰ کو ایک اہم موثر بیان کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

(حضرت امام ابو حنیفہؒ) نے اس زمانہ میں جبکہ منصور کوفے ہی میں موجود تھا اور شہر میں ہر رات کرفیو لگا رہتا تھا، بڑے زور شور سے اس (یعنی نفس زکیہ اور اس کے بھائی ابراہیم) کی تحریک کی حمایت کی۔ یہاں تک کہ اُن کے شاگردوں کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ ہم سب باندھ لئے جائیں گے۔ وہ لوگوں کو ابراہیم کا ساتھ دینے اور اُن سے بیعت کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

وہ اُن کے خلاف خروج کو نفلی حج سے ۵۰ یا ۷۰ گنا زیادہ ثواب کا کام قرار دیتے تھے۔ ایک شخص ابواسحاق الفزاری سے اُنہوں نے یہاں تک کہا کہ تیرا بھائی جو ابراہیم کا ساتھ دے رہا ہے اس کا یہ فعل تیرے اس فعل سے کہ تو کفار کے خلاف جہاد کرتا ہے زیادہ افضل ہے.... ان اقوال کے صاف معنی یہ ہیں کہ امام (ابو حنیفہؒ) کے نزدیک مسلم معاشرے کے اندرونی نظام کو بگڑی ہوئی قیادت کے تسلط سے نکالنے کی کوشش باہر کے کفار سے لڑنے کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ فضیلت رکھتی تھی [1]

اس اقتباس سے ہمارا مقصد حضرت علیؓ اور منصور کے مقدمہ کو ایک سطح پر قیاس کرنا ہرگز نہیں ہے کہ ع "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" بلکہ ہمارا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مولانا صرف حضرت معاویہؓ کی ضد میں ہی اُن کو کوئی شرعی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں ورنہ عقیدہ اُن کا بھی یہی ہے کہ کسی جائز عذر سے مسلمان حکومت کے خلاف خود مسلمانوں کا خروج غیر شرعی امر نہیں ہے بلکہ ابو حنیفہ تو اس کو نفلی حج سے بھی ۵۰ یا ۷۰ گنا زیادہ موجب ثواب گردانتے ہیں اور مسلم حکومت کی اصلاح کو کفار کے خلاف جہاد سے بھی بڑھ کر جانتے ہیں۔

بنا بریں جب مولانا پوچھتے ہیں کہ کیا حضرت عثمانؓ کا دانستہ قصاص نہ لینا بھی کوئی ایسا جرم ہے کہ اس پر حضرت علیؓ کے خلاف خروج جائز ہو تو مولانا کو لگے ہاتھ یہ مسئلہ بھی حضرت امام ابو حنیفہ سے ہی دریافت کر لینا چاہیئے تھا۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۷

تیسرا مغالطہ

ملوکیت اور خلافت

"خلافت و ملوکیت" کے مصنف گرامی نے حضرت معاویہؓ کی خلافت کو اسلام کے مزاج اور اس کی روایات سے ہٹی ہوئی ثابت کرنے کی غرض سے ان کی خلافت کو ملوکیت کے اصطلاح سے نوازا ہے اور پھر ملوکیت کے اندر ایسے معنی داخل کر دیئے ہیں جو دراصل ملوکیت کے معنی نہیں ہیں۔

مولانا مودودی نے خلافت کو تو خداوند تعالیٰ کا انعام قرار دیا ہے مگر ملوکیت کے بارے میں اُن کا خیال ہے کہ یہ بندوں پر خدا تعالیٰ کے عذاب کے مترادف ہے اور پھر انہوں نے بڑی ہی محنت سے حضرت معاویہؓ کو مَلِک ثابت کر کے اُن کی حکومت کو ملوکیت کا نام دیا ہے۔

اور چونکہ ملوکیت کے معنی وہ زور و جبر، ظلم و تعدی، بے انصافی و بے اعتدالی، خود غرضی و خود پسندی بیان کرتے ہیں۔ اس لئے وہ جب حضرت معاویہؓ کو مُلک اور اُن کی حکومت کو ملوکیت کہتے ہیں تو وہ گویا حضرت معاویہؓ کو ان سارے ہی مفاسد و معائب کا حامل قرار دیتے ہیں جو اُنہوں نے ملوکیت کے اندر داخل کر دیئے ہیں اور وہ جی ہی جی میں حضرت معاویہؓ کو وہ ساری ہی گالیاں دے لیتے ہیں جن کا مستحق اُن کے نزدیک ایک مَلِک ہو سکتا ہے۔ ہمیں مولانا مودودی صاحب کی صلاحیتوں کا پورا اعتراف ہے اور ہمیں خوب ہی علم ہے کہ وہ چاہیں تو انسان کو بھینس اور بھینس کو انسان ثابت کر سکتے ہیں۔ ان کی منطق بڑی زوردار منطق ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ان صلاحیتوں سے بہرہ وافر

عطا کیا ہے کہ وہ حق کو ناحق اور ناحق کو حق بنا ڈالیں۔ سانپ کو رسّی اور رسّی کو سانپ ثابت کر دیں۔ وہ آسمان کے زمین ہونے اور زمین کے آسمان ہونے پر دلیل قائم کر سکتے ہیں۔ وہ دن کو رات بنا دینے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں اور رات کی تاریکیوں میں سورج کا وجود تلاش کر سکتے ہیں۔

تاہم الفاظ اپنے معنوں کے پابند ہوتے ہیں اور کسی کے فکر و عمل کی ساحری انکی راہیں تبدیل نہیں کر سکتی۔ اب جہاں تک خلافت اور ملوکیت کے لغوی تجزیہ کا تعلق ہے یہ بحث آگے آرہی ہے۔ لیکن جہاں تک ان دونوں اصطلاحوں کے محل استعمال کا تعلق ہے قرآن کریم میں یہ دونوں ایک ہی معنوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

داؤد علیہ السلام سے خطاب ہے اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ کہ ہم نے تجھے زمین میں خلافت بخشی ہے۔ یہاں لفظ خلیفہ ٹھیک بادشاہ کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے کیونکہ ساتھ ہی فرمایا فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص ۲۶) کہ اپنی خلافت کی قوت سے لوگوں میں حق کے مطابق فیصلے کرو۔ دوسری جگہ حضرت داؤدؑ کے ہی ذکر میں ارشاد ہوا ہے۔ وَاٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ (البقرہ ۲۵۱) کہ اللہ نے داؤدؑ کو بادشاہی عطا فرمائی اور ظاہر ہے کہ یہ وہی بادشاہی ہے جسے سورہ صٓ میں خلافت کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

جیسا کہ ہم عرض کر آئے ہیں مولانا نے حکومت کی دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ

۲۔ ملوکیت

خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے خصائص مولانا کے نزدیک یہ ہیں:

۱۔ قانون خداوندی کی بالاتری ۲۔ عدل بین الناس ۳۔ مساوات بین المسلمین ۴۔ حکومت کی ذمہ داری و جوابدہی کا احساس ۵۔ شوریٰ ۶۔ اطاعت فی المعروف ۷۔ اقتدار کی طلب و حرص کا ممنوع ہونا ۸۔ ریاست کا مقصد وجود (یعنی اسلامی نظام زندگی کو کسی رد و بدل کے بغیر جوں کا توں قائم رکھنا۔

۹۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حق اور فرض لہ

جس حکومت میں یہ خصائص موجود ہوں مولانا کے نزدیک وہ اسلامی ریاست کی صحیح شکل ہے یہی خلافتِ راشدہ ہے اور یہی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے، مولانا کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یکے بعد دیگرے چار خلفاء انہی اصولِ حکمرانی کی بنا پر حاکم تھے ؎

اور مولانا کے نزدیک ملوکیت وہ ہے جو ان تمام اصولوں کے خلاف واقع ہوئی ہو یعنی اس میں نہ تو قانونِ خداوندی کی بالاتری کو ہی تسلیم کیا گیا ہو نہ عدل بین الناس ہی قائم ہو، نہ مساوات بین المسلمین کا ہی کوئی اہتمام ہو، نہ حاکم حکومت کو خدا کی امانت سمجھتا ہو، نہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی مرحلہ پر خدا یا اس کی مخلوق کے سامنے جوابدہی کا ہی مکلّف جانتا ہو، نہ وہاں شورائی نظام موجود ہو، نہ سربراہ کو شوریٰ کے اصول پر ہی منتخب کیا گیا ہو، نہ اطاعت فی المعروف ہی اس کے پیشِ نظر ہو، نہ اسے نہی عن المنکر سے کوئی دلچسپی ہو سربراہِ حکومت اقتدار کی حرص سے اندھا ہو رہا ہو اور اسے نہ عدل کا خیال ہو نہ ظلم سے اعراض ہو۔ ریاست اپنی اصلیت اور مقصدیت کو کھو چکی ہو اور نظامِ اسلام کو علیٰ حالہ قائم رکھنے کا کوئی سوال سامنے نہ ہو۔

مولانا جب اپنے زورِ قلم سے ملوکیت کے اندر یہ معنی داخل کر چکے تو فرمایا:

حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں اختیارات کا آنا خلافت سے ملوکیت کی طرف اسلامی ریاست کے انتقال کا عبوری مرحلہ تھا۔ بصیرت رکھنے والے لوگ اسی مرحلے پر ہی سمجھ گئے تھے کہ اب ہمیں بادشاہی (یعنی ملوکیت) کے ساتھ سابقہ درپیش ہے ؎

مزید ارشاد ہوا:

ملوکیت کا دور آیا تو بادشاہوں نے اپنے مفاد، اپنی سیاسی اغراض اور خصوصاً اپنی حکومت کے قیام و بقا کے معاملہ میں شریعت کی عاید کی ہوئی کسی پابندی

لہ خلافت و ملوکیت صلا تا ۸۰ ؎ ایضاً صد ۸۳ ؎ ایضاً صد ۱۴۷

کو توڑ ڈالنے اور اس کی باندھی ہوئی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کیا[1]

اور اس مرحلہ پر مولانا بطورِ خاص لکھتے ہیں کہ:

یہ پالیسی حضرت معاویہؓ کے عہد سے ہی شروع ہو گئی تھی[2]

یہاں مولانا حضرت معاویہؓ کی خلافت کو اپنے بیان کردہ ملوکیت کے معنوں کی مصداق منوانے کے لئے گفتگو کے واجبی آداب سے بہت ہٹ کر بڑے اعتماد سے رقمطراز ہیں کہ:

حضرت معاویہؓ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہ تھی کہ مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے۔ وہ بہرحال خلیفہ ہونا چاہتے تھے، انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہیں تھا۔ لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے[3]

اور پھر مولانا کے ارشاد کے مطابق یہیں سے وہ ساری خرابیاں شروع ہوئیں جن سے ملوکیت عبارت ہے اور جو خلافتِ راشدہ کے ٹھیک ٹھیک منافی تھیں یعنی پھر خلفاء کے طرزِ زندگی میں تبدیلی آئی اور وہ قیصر و کسریٰ کی سی زندگی بسر کرنے لگ گئے۔ بیت المال کی حیثیت تبدیل ہو گئی، امانت کا تصور جاتا رہا اور بیت المال خلیفہ کی ملکیت بن گیا، اظہارِ رائے کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا، ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے، کوئی بڑا ہی حق گو ہوا تو کوڑے کھانے پڑتے، عدلیہ کی آزادی ختم ہو گئی، شوروی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، نسلی اور قومی عصبیتوں کا ظہور ہونے لگا، قانون کی بالاتری ختم کر دی گئی[4]

اللہ اکبر! مولانا کو حضرت معاویہؓ کے لئے کہاں سے کہاں تک سفر کرنا پڑا ہے، کتنی مشقت اٹھانا پڑی ہے، کتنی کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑا ہے اور انہیں ایک حقیقت کو جھٹلانے کے لئے کتنی سچائیوں کا انکار کرنا پڑا ہے۔ ادب مانع

۱؎ خلافت و ملوکیت ص۱۳۳ ، ۲؎ ایضاً ص۱۷۳ ، ۳؎ ایضاً ص۱۵۸ ، ۴؎ ایضاً ص۱۶۱ تا ۱۶۲

ہے اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہم صورتِ حال کی تعبیر کے بطور یہ شعر اس کی خدمت میں پیش کرتے ؎

اُس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل چلا

حکومت کی بھلی اور بری دو قسمیں تو بہرحال ٹھیک ہیں مگر یہ بات صریحاً غلط ہے کہ ان میں سے ایک خلافت اور دوسری ملوکیت کیونکہ عربی لغت کے مطابق خلافت اور ملوکیت تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ چنانچہ المنجد میں ہے :

مَلِک اور مَالِک قوت و اقتدار کے مالک بادشاہ کو کہتے ہیں اور مملکۃ کے معنی ہیں بادشاہی اور شان و شوکت۔

"مفرداتِ راغب" میں ہے : اَلْمَلِکُ بادشاہ اور پھر اس پر قرآن کی اس آیۂ مبارکہ سے استشہاد کیا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ کہ آج کس کی بادشاہی ہے؟ جواب میں فرمایا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ کہ آج اللہ تعالیٰ کی بادشاہی ہے جو ایک ہی ہے اور غلبہ رکھنے والا ہے۔ تقریباً یہی معنی خلافت کے ہیں۔ المنجد میں ہے :

خلافۃ بادشاہی اور جانشینی دونوں معنی دیتی ہے۔ خلیفہ کے معنی ہیں جانشین، قائمقام اور بادشاہ۔

مفرداتِ راغب میں ہے : الخلائف اس کا واحد خلیفہ ہے بادشاہ کو کہتے ہیں اور پھر اس پر آیۂ قرآنی لائے ہیں کہ يٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ کہ اے داؤدؑ! ہم نے تم کو زمین کا بادشاہ بنایا ہے وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ اور ہم نے اُن کو (زمین میں) خلافت بخشی اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ جب ہم نے تم کو نوحؑ کے بعد بادشاہ بنایا۔ خليفة الارض زمین کا بادشاہ۔ بنابریں مولانا نے جو حکومت کی تقسیم خلافت اور ملوکیت میں خلافت کے مقابلہ میں ملوکیت کا ذکر کیا یکسر باطل ہے اور صریحاً ایجاد بندہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہے خلافت اور ملوکیت بالکل ایک ہی معنی رکھنے والے دو لُغت ہیں اور خود ان دونوں میں بُرائی یا بھلائی کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ خلیفہ ارشد بھی ہو سکتا ہے اور ضال و مضل بھی، اسی طرح مُلک صالح بھی ہو سکتا ہے اور مفسد بھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ مولانا نے حکومت کی جو دو قسمیں بیان کی ہیں اُنہیں اپنی اس تقسیم کے مقابلہ میں کوئی تقسیم منظور نہیں ہوگی کیونکہ اُن کی ضرورت یہ ہے کہ حکومت خواہ کیسی بھی ہو اگر وہ حضرت معاویہؓ سے منسوب ہوگی تو وہ بہر حال بُری ہے اور بُرے معنوں میں ہی جانی جائے گی مگر مشکل یہ ہے کہ الفاظ کے معنی مولانا کی مرضی کے تابع نہیں ہیں کہ وہ جس لفظ میں جو معنی داخل کرنا چاہیں اُنہیں اس کی اجازت ہے اور جس لفظ سے جو معنی خارج کرنا چاہیں اُنہیں اختیار ہے۔ الفاظ کے معنی الفاظ کے ہی تابع ہیں اور وہ مولانا کی ضرورت سے نہیں بلکہ لفظ کی ضرورت سے کئے جائیں گے۔

پس اگر مولانا بضد ہوں کہ خلافت بہر حال ملوکیت سے الگ کوئی چیز ہے اور ان میں ضرور فرق موجود ہے تو اس کی تقسیم خلافت اور ملوکیت کی صورت میں نہیں ہوگی بلکہ اس کو ہم خلافت راشدہ اور خلافت ضالہ کی صورت میں تقسیم کریں گے ایسے ہی ملوکیت کی تقسیم بھی ملوکیتِ حسنہ اور ملوکیتِ سیئہ کی صورت میں ہوگی کیونکہ خلافت فی نفسہا بادشاہی یا جانشینی کے معنی ہی دیتی ہے اس میں خلافت کے بھلی یا بُری ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ یہی حال ملوکیت کا ہے۔ پس اگر خلیفہ بھلا ہے اور اس کی حکومت قرآن و سنت کے مطابق کام کرتی ہے تو وہ خلافت راشدہ یا خلافتِ راشدہ کا حصہ ہے۔ اور اگر خلیفہ بُرا ہے اور اس کی حکومت خدا اور اس کے رسولؐ کے خلافِ منشا کام کرتی ہے تو وہ حکومتِ ضالہ اور شیطانی حکومت ہے۔

یہی حال مَلِک کا ہے۔ چنانچہ ایک مَلِک وہ ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے فَتَعٰلَی اللّٰہُ الْمَلِكُ الْحَقُّ [۱] کہ اللہ بلند ہے اور سچا بادشاہ ہے نیز فرمایا هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ [۲] کہ اللہ وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے، وہ بادشاہ ہے اور اس کی ذات پاک ہے۔

یہی مَلِکِ النَّاس ہے اور خود مولانا مودودی صاحب نے اس کے معنیٰ لکھے ہیں، لوگوں کا بادشاہ [۳] یہ اللہ کی ملوکیت ہے جو رحیم و کریم خدا ہے۔ اور دوسری ملوکیت وہ ہے جسے چنگیز اور ہلاکو نے اپنی ملکیت بنا رکھا تھا۔ قرآن کریم نے ایک ایسے ہی مَلِک کا ذکر کیا ہے جب فرمایا: وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا [۴] کہ وہ ایک بادشاہ تھا جو لوگوں کی کشتیاں بزور و جبر چھین رہا تھا۔

یہی حال خلافت کا ہے، ایک خلافت وہ ہے جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قائم کیا تھا اور دوسری خلافت وہ ہے جسے حضرت علیؓ کے ہی حقیقی چچا حضرت عباسؓ کی اولاد میں سے سفاح نے قائم کیا۔ جس کا حال ہم خود مولانا مودودی صاحب کی زبانِ قلم سے ہی پیشِ نظر کتاب میں ذکر کر آئے ہیں۔

قرآن کریم نے ایسے ہی بادشاہوں کی مثال دیتے ہوئے ملکۂ سباء کی زبان سے بتایا ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا [۵] کہ یہ ظالم جب کسی بستی پر قبضہ کرتے ہیں تو اسے الٹ پلٹ کر پھینک دیتے ہیں۔

یہ عجیب ہی بات ہے کہ مولانا نے پہلے خود ہی ملوکیت کو ہوّا بنایا اور خود ہی اس سے تحت الرجک بھی رہنے لگے ہیں۔ ملوکیت کے وہ معنی ہرگز نہیں تھے جو مولانا نے اس کا پیٹ چاک کر کے بجبر اس کے اندر بھر دیئے اور ان بت پرستوں کی طرح جو قرآن کریم کے بقول خود ہی پتھر کو تراش کر اسے اپنا معبو

---

[۱] سورہ مومنون [۲] سورہ حشر [۳] تفہیم القرآن مودودی سورۃ الناس [۴] سورہ کہف [۵] سورہ نمل

بنا لیتے ہیں اور پھر اُس سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کبھی خدا سے بھی نہ ڈرے ہوں۔ ایسے ہی مودودی صاحب نے بھی پہلے تو ملوکیت کا ایک بُت تراشا پھر اس میں اپنی مرضی کے معنوں کی مینا کاری کی اور اس کی شکل اس درجہ خوفناک اور ڈراونی بنادی کہ خود بھی اس سے بدکنے بھاگنے اور ڈرنے لگ گئے

یہ بات مولانا کے علم میں ضرور ہوگی کہ ملوکیت خلافت سے زیادہ عام اور زیادہ وسیع المعنیٰ ہے۔ خلیفہ اور مَلِک یا مَالک کا معنیٰ اگرچہ ایک جیسے ہی ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے مَلِک اور مَالک کا کلمہ اختیار کیا ہے کیونکہ مَلِک یا مَالک ہمیشہ بااختیار ہوتا ہے جبکہ خلیفہ کے لئے ہمیشہ بااختیار ہونا ضروری نہیں۔ وہ کبھی بااختیار بھی ہوتا ہے اور کبھی بلا اختیار بھی خلیفہ کہلاتا ہے۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

اَلْخَلَافَۃُ کے معنی (اگرچہ بادشاہت کے بھی ہیں مگر اکثر اس کے معنی) دوسرے کا نائب بننے کے ہیں خواہ وہ نیابت اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کے سبب ہو یا اس کے عجز کے سبب ہو اور یا محض نائب کو شرف بخشنے کے لئے ہو اور اس آخری معنیٰ کے لحاظ سے ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین میں خلافت بخشی ہے جیسے فرمایا وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلَائِفَ الْاَرْضِ کہ وہی تو ہے جس نے تمہیں زمین میں نائب بنایا۔ جبکہ مُلک ہمیشہ بااختیار ہوتا ہے اور کبھی بے اختیار نہیں ہوتا،

حاکمیت تو دراصل اللہ تعالیٰ کا ہی خاصہ ہے اور وہی دراصل بھی مَلِک اور مالک ہے۔ اس کی بادشاہی زمین اور آسمانوں کو محیط ہے مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اسی کے لئے ہے پھر وہ محض اپنی ذات تک ہی بادشاہ نہیں، وہ دوسروں کو بطور انعام بادشاہی عطا بھی کرتا ہے اور چاہے تو عطا کر کے چھین بھی سکتا ہے۔ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ

مِمَّنْ تَشَاءُ [1] وہ مالک الملک بھی ہے اور مالک یوم الدین بھی ہے۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے جیسا کہ حدیثِ قدسی میں وارد ہوا ہے اَنَا مَالِكُ الْمُلْكِ وَمَلِكُ الْمُلُوْكِ [2] میں بادشاہی کا مالک اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں۔

یعنی مولانا جس ملوکیت سے اس درجہ سخت الرجک ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی شوکت کا رُخ ہے اور اگر یہ کوئی بُری اور قابلِ نفرت شے ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کبھی نہ فرماتے کہ اَلْخِلَافَةُ بِالْمَدِیْنَةِ وَالْمُلْكُ بِالشَّامِ [3] کہ (میری) خلافت مدینہ میں ہے اور (میری) بادشاہی شام میں ہے۔

"اور مولانا کو یہ بات جان لینی چاہیئے کہ جس طرح خلافت حقہ وہ ہے جو علی منہاج النبوۃ تشکیل پائے ٹھیک ایسے ہی جس شاہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شاہی بیان کریں، جسے پسند فرمادیں اور جس پہ فخر کریں وہ شاہی بھی علی منہاج النبوۃ ہی ہے اور یہ امر اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ایک عظیم احسان ہے جو اس نے اپنی مخلوق کا مقدر بنایا چنانچہ بنی اسرائیل سے خطاب ہے":

اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا [4]
کہ اللہ کی وہ نعمتیں یاد کرو جو اُس نے تم میں سے کچھ لوگوں کو نبوت بخشی اور کچھ لوگوں کو بادشاہ بنایا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے بادشاہی کو نبوت کے پہلو بہ پہلو اپنا انعام بیان فرمایا ہے اور مولانا کے نزدیک اس شاہی سے بڑھ کر بُری شے ہی کوئی نہیں۔ یاللعجب اللہ تعالیٰ ان انعامات کو اٰلَآءَ اللّٰهِ یعنی اللہ کی نعمتیں قرار دیتے ہیں اور مولانا اگر ان کا ذکر سُن پائیں تو اُن کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی ہے۔ مولانا مفسّرِ قرآن ہیں انہیں پتہ ہونا چاہیئے کہ اپنے تمکن فی الارض کی غرض سے

---

[1] آلِ عمران [2] مشکوٰۃ شریف [3] بیہقی [4] المائدہ

بنی اسرائیل نے اپنے نبی کی معرفت بادشاہی ہی طلب کی تھی۔

اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا [1]

کہ ہمیں ایک بادشاہ میسّر فرمادیجئے نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ تاکہ ہم اس کے ماتحت اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ملک ہی بخشا جب فرمایا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ نامزد کردیا ہے۔

اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے رب سے یہی بادشاہی مانگی تھی جب عرض کیا هَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ الٰہی! مجھے ایسی بادشاہی عطا کر جو میرے بعد بھی کسی کو نہ دی جائے۔

حضرت اُم حرام رضی اللہ عنہا کی روایت کے بموجب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دوپہر اُن کے ہاں آرام فرمارہے تھے کہ مسکراتے ہوئے نیند سے اُٹھے اور خبر دی کہ انہیں اُن کی اُمت کے کچھ لوگ دکھائے گئے ہیں جو سمندر کی موجوں پر سوار کافروں کے خلاف جہاد کے لئے نکلے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفورِ مسرت سے اپنے اُن اُمتیوں کی اُٹھان کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس طرح ہے:

یَرْكَبُوْنَ ثَبَجَ هٰذَا الْبَحْرِ مِثْلَ الْمُلُوْكِ عَلَى الْاَسِرَّةِ [2]

کہ وہ لوگ کشتیوں میں یوں بیٹھے ہیں جیسے بادشاہ تختوں پر بیٹھے ہوں۔

یعنی حضورؐ نے اپنے ان جاں نثاروں کے لئے مُلک کا لفظ ہی اختیار فرمایا ہے اور اپنے ان جاں نثاروں مجاہدین فی سبیل اللہ منعم علیہم اور مغفور لہم خدام کو خلفاء کے بجائے بادشاہ کہنا پسند کیا ہے،

---

[1] البقرہ ع ۳۲ [2] بخاری شریف کتاب الجہاد

مولانا تو لفظ مُلک سے اس لئے الرجک ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ شرف حضرت معاویہؓ کو بخش دیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز معاویہؓ کے بخت کا حصہ ہے وہ اچھی کیونکر ہو سکتی ہے۔ حضرت معاویہؓ کا یہ شرف اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیش گوئی کے بموجب ہی ہے مگر اس شرف کے بے وقر ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ شرف معاویہؓ کو ملا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں خلفائے راشدینؓ کی خلافت کو یہ فرما کر اپنی پسندیدگی کی سند عطا فرمائی کہ الخلافۃ فی المدینۃ کہ (میری) خلافت مدینہ میں ہے وہاں حضورؐ نے حضرت معاویہؓ کی شاہی کو بھی اپنے اس ارشاد کے ساتھ سند پسندیدگی سے نوازا تھا کہ وَالْمُلْکُ بِالشَّامِ کہ (میری) بادشاہی شام میں ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ خلافت اور شاہی اگر اسلام اور اس کے نظام کی تعبیر ہیں تو یہ دونوں ہی اسلام ہیں، اسلام سے ہیں اور اسلام کا حصہ ہیں اور یہ دونوں اسلام کے ہی حسین مظاہر ہیں۔

خلافت اسلام کے نظام حکومت کی رتی کا پہلا سرا ہے اور شاہی دوسرا اور خلافت تو خلافت ہی ہے اور اس کا درجہ بالکل ظاہر ہے لیکن بادشاہ اگر اسلام کا متبع ہے تو اس کی شاہی اسلام کی جلالت کا ایک پُر شکوہ رُخ اور اسلامی حاکمیت کا ایک تابناک پہلو ہے۔

چوتھا مغالطہ

اصحابِؓ رسولؐ کی عدالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عادل ہونے میں اہل سنّت کے اندر کوئی اختلاف موجود نہیں ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ

اس مسئلہ میں کسی اختلاف کی گنجائش بھی نہیں کیونکہ اصحابِ رسول کی عدالت تو خود قرآنِ پاک نے ہی قائم کر رکھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضورؐ کی زندگی کے کسی بھی مرحلہ پر متعلق ہونے والے کسی بھی صحابی کو اس انعامِ خداوندی سے محروم نہیں کیا گیا جب فرمایا وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى [1] کہ اللہ تعالیٰ کا سارے ہی اصحابِ رسولؐ سے نیک وعدہ ہے خواہ کوئی جس وقت بھی ایمان لایا اور جب بھی لایا یہ سب لوگ عادل ہیں۔

مسلمانوں کے سارے ہی گروہ اور مسالکِ فکر اس بات پر متفق ہیں کہ

اِنَّ الصَّحَابَةَ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ قَبْلَ فِتْنَةِ عُثْمَانَ وَعَلِيٍّ كَذَا بَعْدَهَا [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سب کے سب عادل ہیں، راستباز اور ہدایت یافتہ ہیں خواہ وہ عثمانؓ اور علیؓ کے زمانوں میں اُچھلنے والے فتنوں سے پہلے گزر چکے یا بعد تک موجود رہے۔

حمید بن زیاد کہتے ہیں کہ اُنہوں نے ایک روز محمد بن کعب قرظیؓ سے سوال کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے باہمی تنازعہ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ تو اُنہوں نے جواب دیا۔ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لِجَمِيْعِهِمْ وَاَوْجَبَ لَهُمُ الْجَنَّةَ فِيْ كِتَابِهٖ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کے لئے ہی (خواہ وہ نیکوکار ہوں یا خطاکار) جنت واجب کردی ہے اور قرآنِ پاک میں اس کا ذکر بھی فرمایا ہے۔

حمید بن زیاد کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یہ ذکر قرآن کے کس مقام پر ہے؟ فرمایا سبحان اللہ! تو نے اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ نہیں پڑھا! پھر آپ نے یہ پوری آیت تلاوت کی۔ راوی کہتا ہے کہ جب آپ نے یہ آیت پڑھی تو میں نے یوں محسوس کیا کہ جیسے میں اس آیۂ مبارکہ سے آج ہی واقف ہوا ہوں [3]

یہ سب کے سب وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ

---

[1] سورۃ الحدید [2] شرح فقہ اکبر [3] تفسیر خازن جلد ۳ زیرِ آیت السابقون الاولون

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو گیا اور وہ سب اُس سے راضی ہو گئے۔

اصحابِ رسول کی عدالت کے بارے میں پورے عالمِ اسلام کا یہی عقیدہ ہے اور اہلِ سنت کا اس پر اتفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا محبوب سہارا قرار دیا ہے جب فرمایا:

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

کہ اے ہمارے نبی! آپ کے لئے اللہ اور آپ کے پیروکار مومنین بہت کافی ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ از سرتا پا عادل ہیں اور ان کی عدالت میں شبہ کرنا بجائے خود بدنصیبی ہے۔ یہ لوگ اپنی زندگی کے ہر پہلو اور ہر رُخ سے ہی عادل تھے اور ان کی عدالت اُن کی زندگی کے کسی ایک پہلو سے خاص نہیں کی گئی تھی، پس ان لوگوں کے بارے میں مولانا مودودی کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ میں اس کا مطلب یہ لیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں یا اُن کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں کسی صحابی نے کبھی راستی سے ہرگز تجاوز نہیں کیا ہے[1]

مگر بات یہ نہیں کہ آپ اس کا مطلب کیا سمجھتے ہیں یا کیا سمجھنا مناسب خیال کرتے ہیں یا آپ کی ضرورت آپ کی کیا رہنمائی کرتی ہے بلکہ بات امرِ واقعہ کی ہے کہ حقیقتِ حال کیا ہے یہ امر یقیناً اصحابِ رسول کے استخفاف کے ہی مترادف ہے کہ ان کا صرف یہ ایک پہلو ہی ایسا ہے جسے زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا۔ اور وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کو اتنا اعتماد تھا کہ اُس نے اُن کے ایک گروہ کو یہاں تک کہہ دیا کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ کہ تم خواہ اب کچھ بھی کرو میں نے تم کو بخش ہی دیا ہے۔ مگر مولانا کے نزدیک ان کی زندگی کا صرف یہ ایک ہی پہلو لائقِ اعتماد ہے باقی سارے پہلوؤں میں اُن پر اعتماد نہ کرنے کی پوری گنجائش

[1] خلافت و ملوکیت صد ۳۰۳

ہے اور ظاہر ہے کہ بے یقینی کی یہ صورت عدالت کے صریحاً منافی ہے۔ مولانا اگر اس ایک پہلو سے بھی ان کے بارے میں اپنے نامۂ عمل کا بوجھ ہلکا کرلیں تو انہیں کیا مانع آ سکتا ہے کہ ؎

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

عدل کی اصل اصحابِ رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عدالت کی اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جاننے اور پہچاننے کا حقیقی ذریعہ صرف اصحابِ رسول ہی ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ دنیا کے درمیان سب سے بڑا مستند ذریعہ ہیں جسے اختیار کئے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جانا ہی جا سکتا ہے اور نہ اُن کی پہچان ہی ممکن ہے۔

آنے والے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت کو صرف انہی لوگوں کے ذریعہ پایا ہے۔ ان کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کا اس دنیا میں کوئی ذریعہ موجود نہیں اور اگر مولانا اپنی کسی ضرورت سے اس ذریعہ کو بھی مشتبہ کر دیتے ہیں تو ظاہر ہے یہ اصحابِ رسولؐ کے خلاف کھُلا عدمِ اعتماد ہے۔

اور اس بات کی صحت کی نہ کوئی دلیل ہے نہ قرینہ کہ ایک شخص زندگی کے سارے پہلوؤں سے تو محلِ نظر ہو مگر اس کا ایک پہلو محلِ نظر نہ ہو، اسکو کی یہ بھی اپنی بدنصیبی کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی سب سے پہلے انہی لوگوں نے دی ہے اور پھر اپنی اس گواہی کو حق کی گواہی ثابت کرنے کے لئے انہوں نے جو عزیمت دکھائی اور جس استقامت کا ثبوت دیا وہ اسلام کی پوری تاریخ میں صرف اُنہی کا حصہ ہے اور اُنہی سے خاص ہے اور اس باب میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔

انہوں نے شمع نبوت سے بلا واسطہ اکتسابِ نور کیا ہے وہ دوسرے سب لوگوں کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب تھے اور اپنے عادات واطوار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات واطوار کی ٹھیک ٹھیک چھاپ تھے ان کا دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دن کے مشابہ تھا اور ان کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کا نمونہ تھی اور حقیقت بلاشبہ یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مکمل تصویر اصحابِ رسول سے باہر اور کہیں موجود نہیں ہے۔

ایسے میں الصحابۃ کلھم عدول کا صحیح مطلب اگر وہی ہے جو مولانا نے لیا تو یہی کہنا چاہیئے کہ عہ واۓ گر در پسِ امروز بود فردائے

بلاشبہ مولانا نے اپنے دل کی بات کہتے ہوئے دوسروں کے اضطراب اور استعجاب کو بھی ملحوظ رکھنے کا تکلف کر لیا ہے۔ اس باب میں ان کی گروہی ضرورت بھی ایک سبب ہو سکتی ہے کہ جہاں وہ اصحابِ رسولؐ کی عدالت کو اپنی صوابدید کی سند کا محتاج سمجھتے ہیں، وہاں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ان کی عدالت میں ذرہ برابر بھی شبہ پیدا ہو جائے تو دین ہی مشتبہ ہو جاتا ہے [1]

اور وہ اپنی ضرورت سے بعض اصحابِ رسولؐ کو یہاں تک رعایت بھی دیتے ہیں کہ کسی شخص کے ایک دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کر گزرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عدالت کی کلی نفی ہو جائے اور وہ عادل کے بجائے فاسق قرار پائے [2]

مگر پھر وہ شاید اس واہمہ کے ماتحت کہ اس سے حضرت معاویہ کی عدالت پر بھی استدلال ممکن ہے جلد ہی اپنی اس رعایت کو یہ کہہ کر واپس بھی لے لیتے ہیں کہ (سب صحابہؓ کے راستباز ہونے) کا مطلب یہ نہیں کہ تمام صحابہ بے خطا تھے اور ان میں کا ہر ایک ہر قسم کی بشری کمزوریوں سے بالاتر تھا [3]

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۳۰۳ سطر ۳ [2] ایضاً صہ ۳۰۴ سطر ۱۴-۱۵
[3] ایضاً صہ ۳۰۳ سطر ۴-۵

اور پھر یہاں مولانا نے اپنے ارشاد کے ثبوت میں چند اصحابِ رسولؐ کی گنہگاریوں کی فہرست پیش کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔

معلوم نہیں کہ مولانا کو یہ سعادت حاصل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی جبکہ پورے عالمِ اسلام میں اہل السنّتہ کے کسی گروہ میں سے کوئی ایک شخص بھی اصحابِ رسولؐ کی معصومیت کا قائل نہیں ہے اور نہ ہی کسی نے اصحابِ رسولؐ کو بشری کمزوریوں سے پاک کہا ہے۔

یہ بشریت جب خود انبیاء و رسل تک کو موثر ہو جاتی ہے تو انبیاء و رُسل کے اصحاب اس بشریت کے دخل وعمل سے کیونکر محفوظ ہو سکتے ہیں۔ پس اس غرض سے مولانا کو بعض اصحابِ رسولؐ کی بشری کوتاہیوں اور معصیتوں کی فہرست مرتب کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔

مولانا کو اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ جو لوگ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اُن کے سامنے واقعات کا یہ نقشہ آتا ہے کہ ۳۴-۳۳ھ تک خلافتِ راشدہ اسلامی حکومت کی بہترین خصوصیات کے ساتھ چل رہی ہے۔ پھر اس پر زوال آنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ ۶۰ھ تک پہنچتے پہنچتے وہ ساری خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں۔

اور ان کی جگہ دنیوی حکومت کی امتیازی خصوصیات نمایاں ہو جاتی ہیں۔ جبری بیعت، موروثی بادشاہت، قیصر و کسریٰ کا سا طرزِ زندگی، راعیوں کا رعایا سے احتجاب، بیت المال کے معاملہ میں احساسِ ذمہ داری کا فقدان، سیاست کا شریعت کی پابندی سے آزاد ہو جانا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی سے مسلمانوں کی محرومی، شوریٰ کے طریقے کا خاتمہ۔ غرض وہ تمام چیزیں جو ایک دنیوی حکومت کو ایک دینی حکومت سے ممیز کرتی ہیں وہ ۶۰ھ کے بعد ایک مستقل بیماری کی طرح مسلمانوں کی حکومت کو لگی نظر آتی ہیں۔ اب اس عظیم تغیر اور نہایت نمایاں تغیر کے متعلق ہم کیا کہیں؟ [1]

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۳۰۱ - ۳۰۲

یعنی وہ سب کچھ جو حضرت مولانا نے حضرت معاویہؓ کے نام پر اپنی پوری کتاب میں درج فرمایا ہے اس کا جامع خلاصہ بیان کرنے کے بعد مولانا پھر بے دریغ وہ کچھ کہنا شروع کر دیتے ہیں جس کو کہنے کا فیصلہ کر کے انہوں نے قلم اٹھایا تھا۔

مولانا مودودی صاحب کو تاریخ کے کوئی طالب علم صاحب جا بجا کہ بہت ستاتے تھے کہ مسلمانوں نے جب رسول علیہ السلام اور خلفاءِ راشدین کے نظامِ حکومت کو بھی مانا اور پھر (حضرت معاویہؓ کی تخلیق) بادشاہی نظام پر بھی ایمان رکھا (تو بقول مولانا بھی) سیاست کے ہر طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصل اسلامی نظریۂ سیاست کیا ہے؟ لـه

یہ بات تو مولانا کو ہی معلوم ہو گی کہ سیاست کے وہ کونسے بے دماغ طالب علم تھے جو مولانا کے حضور پہنچے اور اُن سے درخواست کی کہ وہ ان کی مشکل کشائی فرما دیں اور اُس عُقدہ کو کھولیں جو اُس طالب علم کی آنکھ میں روڑہ بن رہی تھی ورنہ اسلام کی تو پوری تاریخ میں ایسی کوئی گرہ موجود نہیں ہے سوائے اس صنعت کاری کے جسے مولانا نے خود ہی تخلیق بخشی ہے۔

اسلام کی تاریخ بڑی سیدھی ہے، بڑی صاف ہے کہ حضرت عثمانؓ جن حالات میں قتل ہوئے، بعض لوگوں کو شبہ تھا کہ اس قتل میں حضرت علیؓ کا اشارہ شامل ہے۔ یہ بات کھل کر سامنے آئی تو حضرت علیؓ نے اس الزام کی صحت سے انکار کیا جبکہ الزام دینے والے اپنے الزام کی صحت پر اصرار کرتے رہے اور اتفاق سے پھر کچھ ایسے واقعات بھی ظہور میں آئے کہ یہ شبہ کرنے والوں کا موقف مزید مضبوط ہو گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بغیر کسی وجۂ اشتعال اور بغیر کسی عذر کے حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ عمالِ حکومت کو برطرف کر دیا یہی نہیں بلکہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف بلوہ کرنے والوں اور اُن کے قاتلوں کو اپنی فوج میں

لـه خلافت و ملوکیت صد ۱۰۳ سطر ۱۲

بھرتی کرکے اُنہیں باقاعدہ پناہ دی اور حضرت عثمانؓ کے قتل پر اُن کے قاتلوں سے قصاص لینے کا مطالبہ مسترد کر دیا۔

حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے عمال کو برطرف کیا تو وہ اپنے خیرخواہ اور ہمدرد رفقاء کے اس مشورہ کے باوجود کہ حالات پر قابو حاصل کرنے کے بعد ہی یہ سختی مناسب ہے اس مشورہ کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ حضرت معاویہؓ شام کے حاکم تھے اور حضرت عثمانؓ کے ورثاء میں داخل تھے۔ ان کے خطرہ کو دور کرنے کے لئے بھی اگرچہ حضرت علیؓ نے کوتاہی نہیں کی تھی اور ان کی برطرفی کے احکام صادر کر دیئے تھے مگر اُنہوں نے یہ احکام ماننے کے لئے قصاص عثمانؓ کی شرط لگا دی جو حضرت علیؓ نے منظور کرنے سے انکار کر دیا اور بات تصادم تک پہنچ گئی۔

تاریخ کا یہ باب بڑا واضح ہے اور معلوم نہیں مولانا کے پاس پہنچنے والے تاریخ کے طالب علم کی عقل کو کوئی بھینس چر گئی تھی جو اس کا پائے نگاہ خشک زمین پر ہی پھسل گیا اور اس نے مولانا کے دروازہ پر جا دستک دی۔ اُدھر حضرت کو بھی شاید بہانہ ہی درکار تھا، طبیعت لہرا اُٹھی اور پھر بقول اقبال ؎

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے

یا بقول غالب ؎

پُرہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

حضرت کو اپنی ضرورت سے ایک بات چلانا تھی بس تاریخ کے طالب علم کو بہانہ بنایا اور اپنی منزل کی طرف چل نکلے

بات حضرت عثمانؓ کی آبرو کے تار ناپنے سے چلی پھر مولانا نے ان کی سیرت میں جو کیڑے ڈالے وہ مولانا کے سوا کوئی دوسرا نہ ڈال سکتا تھا۔ اب جب

ان کے سازِ نفس کے لئے ان کا اندرونی طالب علم مضراب بن کر اچھلا تو تاریخ کے ایک نئے باب نے تخلیق پائی جس کے بموجب عثمانؓ خلافتِ راشدہ کی راہ سے ہٹتے ہٹتے بالکل ہٹ گئے اور اسی کی پاداش میں بالآخر قتل ہوئے۔

اب اگرچہ ترتیب کے لحاظ سے بات کا دروازہ حضرت علیؓ کی جانب کھلتا تھا مگر مولانا نے جھٹ سے انہیں خلافتِ راشدہ کی نظامی حکومت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا اور حضرت معاویہؓ پر چڑھ دوڑے۔ پھر ۶۰ھ میں حضرت معاویہؓ کی وفات تک مولانا اپنی ضرورت سے اس دنیا کی جس بُرائی کو بھی تخلیق فرما سکے انہوں نے سب اکٹھی کر کے حضرت معاویہؓ کے دامن سے باندھ دیں یعنی حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد صرف ۲۲ برس تک ہی مولانا کا حوصلہ ان کا ساتھ دے سکا پھر یہ جام چھلک گیا اور اب اُن کے قلم کی یلغاروں سے نہ حضرت عثمانؓ کو پناہ تھی، نہ حضرت معاویہؓ کو، نہ حضرت عمروؓ بن العاص کی آبرو اُن سے محفوظ تھی، نہ حضرت مغیرہؓ کی۔ غرض جس نے بھی مولانا کی ضرورت سے انکار کیا مولانا نے اُسے معاف نہیں کیا۔

مولانا کو اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے بہت محنت کرنا پڑی ہے، بہت جدوجہد کام میں لانا پڑی ہے۔ انہوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے بڑی مشقت جھیلی ہے، بڑے جتن کئے ہیں مگر ہمت نہیں ہاری، انہیں اگر اپنی کاربرآری سے کسی بالا کو پست کہنا پڑا تو بے جھجک کہہ دیا اور کسی پست کو بالا کہنے کی ضرورت ہوئی تو یہ مرحلہ بھی طے کر گئے۔ ظالم کو عادل کہا اور عادل کو ظالم بنا دیا، بدی کا نام نیکی رکھ دیا اور نیکی کو برائی کا لباس پہنا دیا۔ محض معاویہؓ دشمنی میں بادشاہی کو لعنت اور خدا کا عذاب قرار دیا جبکہ یہ بھی مانتے ہیں کہ خدا خود بادشاہ ہے اور ملک الناس کا معنیٰ خود بھی لوگوں کا بادشاہ ہی کرتے ہیں۔ غرض ان سے جو کچھ بن سکا اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے انہوں نے کوتاہی نہیں کی۔

حدیثہ کہ الصحابۃ کلہم عدول کی ایسی نادر تاویل کی کہ یہ تاویل پھر مولانا کی ہی ملکیت بن گئی۔

عادل کون ہے

واقعہ یہ ہے کہ یہاں آپ کو ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جن کے اندر کتنے ہی اخلاق فاضلہ جمع ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شرافت، اپنے حسنِ اخلاق، اپنی نیک دلی، نیک نفسی اور طینت کی پاکیزگی کے اعتبار سے نہایت درجہ لائقِ اعتماد اور قابلِ تعریف لوگ ہوتے ہیں۔ وہ نیک شہرت کے حامل، گناہوں سے بچنے والے اور خدا کے خوف سے مالامال ہوتے ہیں۔ مگر وہ عادل نہیں سمجھے جاتے کیونکہ شرفِ عدالت کو حاصل کرنے کے لئے یہ عام انسانی محاسن اور اخلاقی اچھائیاں کافی نہیں ہوتی ہیں۔ اس مرتبۂ بلند کو حاصل کرنے کے لئے آدمی کو وہ خصوصی صلاحیتیں، وہ مکارمِ اخلاق، وہ کردار کی پختگی، وہ روحانی پاکیزگی، وہ خدا دوستی، وہ ایثار پیشگی، وہ جذبۂ صادق یہ تمام و کمال ہی درکار ہے۔ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت نے اپنے اصحاب کے اندر جمع کر دیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ لوگ شرفِ عدالت سے مشرف تھے۔ بنابریں اگر مولانا کے نزدیک صحابہؓ کی عدالت کے یہی معنی ہیں کہ۔

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں یا ان کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں کسی نے راستی سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔

تو ایسا عقیدہ اصحابِ رسولؐ سے سخت ترین زیادتی بھی ہے اور ان کی توہین کے مترادف بھی ہے کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر کوئی صحابی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں ہی احتیاط کر لے تو اس نے عدالت کا شرف حاصل کر لیا اور پھر خواہ وہ جو کچھ بھی کرتا پھرے یہ عدالت اس سے ساقط نہیں ہو سکے گی۔ اور اسے اپنی اس عدالت کو قائم رکھنے کے لئے کسی دوسرے تکلف کی حاجت نہیں ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت درجہ مضحکہ خیز پوزیشن ہے۔ اس پوزیشن کو صحیح سمجھنے کا ایک خطرناک نتیجہ یہ ہو گا کہ اصحابِ رسولؐ کی پوری

دینی و دنیوی زندگی کا تقدس اور تحفظ دونوں ختم ہو جائینگے جس کا جی چاہے ان کی زندگی کے خواہ کسی بھی رُخ کو بحث کا عنوان بنا لے۔ ان کی پاکیزہ زندگی میں اپنی ضرورت سے خواہ کتنے بھی کیڑے ڈالے، اُن کے اخلاق پر حملے کرے، اُن کے کردار پر اُنگلی رکھے، اُن کی نیت میں کھوٹ تلاش کرنے لگے، انہیں روایت میں دیانت کے علاوہ ہر نیکی کے اعتبار سے تلاش ثابت کرے وہ عادل ہی رہیں گے۔

ظاہر ہے کہ مولانا کی دریافت کے اس ترازو میں حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاص اور اُن کے تمام رفقاء تک جن کی صحابیت ثابت ہے، عادل ٹھہرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے ایک طرف تو دنیا بھر کی خود غرضیاں اور خیانتیں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دی ہیں اور عدالت کی تعریف کے اس معیار کی روشنی میں اُنہیں بار بار رضی اللہ عنہم کی دعا عنایت فرما کر ان کے لئے عدالت کا تکلف بھی قائم رکھتے ہیں۔ یہ فلسفہ ایک بالکل اچھوتا فلسفہ ہی ہے کہ ایک شخص کی عام زندگی میں خیانت بھی واضح ہے مگر وہ حضورؐ سے روایت میں خیانت نہیں کرتا اس لئے وہ عادل ہے، اُس کے ہاتھ خونِ بے گناہی سے رنگین ہیں مگر وہ حضورؐ سے روایت میں تجاوز نہیں کرتا اس لئے وہ بدستور ہی عادل ہے۔

اُس نے دوسروں کے حقوق غصب کر رکھے ہیں مگر چونکہ وہ حضورؐ سے روایت میں راستی سے نہیں ہٹتا اس لئے وہ بہر حال عدالت کا ہی حامل ہے۔

اُس نے بیت المال کو اپنا مال بنا رکھا ہے مگر اس کی عدالت کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا کیونکہ وہ ایک دیانتدار راوی ہے، لاحول ولا قوۃ ؎

شب کو میخوار بنے صبح کو کر لی توبہ
رند کے اندر رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

یا پھر ؎
رات پی زمزم پہ مئے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

اور پھر اس فلسفہ کی بنیاد پر مولانا کو ایک اصول بھی تخلیق کرنا پڑا ہے، آپ بھی سنیئے اور سر دھنیئے فرماتے ہیں:

کسی شخص کے ایک، دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کر گزرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عدالت کی کُلّی نفی ہو جائے اور وہ فاسق قرار پائے[1]

پھر مولانا نے چند اصحابِ رسولؐ کی تمام بنام گنہگاریوں کا ذکر کر کے اپنے اصول کو زندگی کا پانی مہیا کیا ہے۔ حالانکہ آدمی کا ذاتی گناہ صرف اسی کو موثر ہے، وہ متعدی نہیں ہوتا اور ایسی شاذ مثالوں کو بنیاد بنا کر کوئی اصول تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اور بلاشبہ اصحابِ رسولؐ ان ساری بشری کوتاہیوں کے صدور کے باوجود الصحابۃ کلھم عدول کے حکم میں ہی رہتے ہیں، کیونکہ جہاں تک اصحابِ رسولؐ کا تعلق ہے ان کی بیرگناہگاریاں یا تو بخش دی جا چکی ہیں یا ان کا قصاص وقوع پا چکا ہے اور ان پر حدود جاری ہو چکی ہیں۔ اس طرح اُنہیں صادر شدہ گناہوں سے پاک ہو جانے کی سند مل چکی ہے اور ان کی عدالت اپنی جگہ بدستور قائم ہے۔

مگر اتنے ہیر پھیر کے باوجود بھی جب مولانا اصحابِ رسول کی عدالت کا انکار نہیں کر سکے تو آخر یہ بات ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی کہ اگر کوئی شخص اصحابِ رسولؐ کو خائن بھی کہتا ہے، حق سے تجاوز کا الزام بھی ان پر رکھتا ہے اُنہیں بدنیت اور خود غرض بھی کہتا ہے، اُنہیں ناجائز خویش پروری اور اقربا نوازی کا الزام بھی دیتا ہے۔ ان کو خود غرض اور دھوکہ باز بھی کہتا ہے اور اس کے باوجود ان کی عدالت کا بھی قائل ہے تو اُسے دوسروں کو کچھ سمجھانے کے بجائے اپنی سمجھ کا علاج کروانے کی ضرورت ہے۔

مولانا کے لئے صحیح راستہ اس جزوقتی مضحکہ خیز اور ناپائیدار عدالت پر اصرار کرنے کے بجائے مولانا کے لئے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ وہ پوری جرأت سے اُن تمام اصحابِ رسولؐ کی عدالت سے

---

[1] خلافت و ملوکیت صفحہ ۳۰۴ سطر ۱۴-۱۵

کھلے بندوں انکار کر دیں جن سے انہیں کسی بھی گروہی قبائل، نسلی نسبی یا کسی اور وجہ سے اختلاف اور عناد ہے۔ یا جن سے وہ اپنی سیاسی اور انتخابی ضرورتوں سے ناراض رہنا چاہتے ہیں۔ یا جن کے اندر انہوں نے پورے اخلاص اور پوری دیانتداری سے عدالت کے خلاف مواد موجود پایا ہے۔

کیونکہ مسلمانوں کے ہاں اصحاب کے لئے ایسی اپاہج، لنگڑی اور مفلوج عدالت قابل تسلیم نہیں ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک الصحابۃ کلھم عدول کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی اپنی ہر حالت اور ہر حیثیت میں ہی عادل ہے۔ وہ نہ تو خائن ہے نہ کاذب، وہ نہ منافق ہے نہ بدنیت، وہ نہ روایت میں خیانت کرتا ہے نہ کسی دوسرے معاملہ میں۔ اس کے نزدیک مثبت صرف حق ہے اور وہ حق کے سوا کسی بات کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے یا کہتا ہے پوری دیانتداری سے اُسے حق سمجھ کر ہی کرتا اور کہتا ہے اس سے غلطی کا امکان بلا شبہ ہر لمحہ ہے وہ ہر وقت خطا کا شکار ہو سکتا ہے لیکن اُسے اگر اپنی خطا اور اپنی غلطی کا علم ہو جائے تو وہ اس پر کبھی قائم نہیں رہتا کیونکہ وہ کبھی عمداً غلطی نہیں کرتا، جان بوجھ کر کوئی غلط کام نہیں کرتا، اس کا کوئی کام بھی نیت کی خرابی سے نہیں ہوتا اور وہ اپنے منصب سے کبھی خیانت نہیں کرتا۔ بلا شبہ بشریت کے تقاضا سے کبھی اس سے گناہ کا صدور بھی ممکن ہے مگر وہ کبھی گنہگار نہیں مرتا بلکہ مرنے سے پہلے اپنے گناہ کا ازالہ پوری جرأت سے حسب ضابطہ کر دیتا ہے اور مرتا ہے تو اپنے آپ کو گناہ سے پاک کر کے ہی مرتا ہے اور اس طرح وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنی عدالت کا تحفظ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان سارے کے سارے ہی اس بات پر متفق ہیں کہ اصحاب رسولؐ اپنے باہمی اختلافات بلکہ باہمی قتل و قتال کے باوجود غیر عادل نہیں تھے کیونکہ اس اختلاف، اس جدال اس مشاجرت اور قتل و خون سے اُن میں سے کسی ایک کو بھی اپنا ذاتی فائدہ

مطلوب و مقصود نہیں تھا، وہ جو کچھ کرتے تھے حق سمجھ کر اور حق قرار دے کر ہی کرتے تھے اور جس نے جو کچھ بھی سوچا پوری دیانتداری سے سوچا تھا اور جو اقدام کیا پوری دیانتداری سے حق سمجھ کر ہی کیا تھا۔

اُن کے ہر کام میں حسنِ نیت کارفرما تھی اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک بھی اپنے باہمی قتل و قتال میں کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوتے تھے۔

مولانا مودودی کی بات نہیں کرتے کہ ان کا قلم کسی خاص پس منظر کا پابند ہے۔ ہم فریقینِ قتال میں سے ہی ایک فریق کے سربراہ بلکہ اس جدال و قتال میں مسلمانوں کے ایک گروہ کے کمانڈر اعلیٰ خلیفۂ رسول حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہی یہ مسئلہ دریافت کئے لیتے ہیں۔

علامہ طبریؒ نے مشاجراتِ صحابہ کے ایک مرحلہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلِ کوفہ کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے۔ یہ مکالمہ اس بحث میں آخری فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم یہ مکالمہ اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

اہلِ کوفہ: طلحہؓ، زبیرؓ اور اُن کے ساتھیوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

علیؓ: لوگوں کی اصلاح مناسب ہے اور جلتی آگ کا بجھانا ہی بہتر ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ اس ذریعہ سے اُمت کو متحد کر دے، مجھے امید ہے یہ لوگ میری بات مان لیں گے۔

اعور: اگر اُنھوں نے ہماری بات قبول نہ کی تو پھر؟

علیؓ: پھر بھی اُن سے اس وقت تک جنگ نہیں کریں گے جب تک وہ ہم سے جنگ نہ کریں۔

اعور: اگر اُن لوگوں نے ہم سے جنگ چھیڑ دی تو؟

علیؓ: اس صورت میں ہم اپنی جانوں کا دفاع کریں گے۔

اعور: کیا انہیں بھی اسی طرح اجر ملے گا جس طرح ہمیں ملے گا؟

علیؓ: یقیناً وہ بھی اجر کے مستحق ہوں گے۔

ابو سلامہ: کیا ان لوگوں کے لئے شرعاً یہ دلیل کافی ہے کہ وہ خون عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کر رہے ہیں اور ان کی نیت میں بھی اللہ عزوجل کی رضامندی کا حصول ہی ہے؟

علیؓ: ہاں، بے شک

ابو سلامہ: آپ نے جو قصاص عثمانؓ میں تاخیر کی ہے کیا یہ آپ کے لئے جواز کی دلیل بن سکتی ہے؟

علیؓ: ہاں جب کسی شے کی حقیقت کا علم نہ ہو تو حکم یہ ہے کہ وہ راہ اختیار کرے جس میں احتیاط پائی جائے اور جس کا نفع عام ہو۔

ابو سلامہ: اگر کل کو ہماری اور ان کی جنگ ہو گئی تو اس کا انجام آخرت میں کیا ہوگا؟

علیؓ: مجھے امید ہے کہ ہمارا یا ان کا جو شخص بھی مارا جائے گا اگر اس کی نیت خدا کی رضا کا حصول ہی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریگے۔

مالک: اگر جنگ ہو گئی تو ہمارے مقتولوں کا کیا حشر ہوگا؟

علیؓ: جس کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی رضا ہے تو اسے اس کا ضرور فائدہ پہنچے گا اور اس کی نجات کا سبب بنے گا[۱]

حضرت علیؓ کے یہ ارشادات الصحابۃ کلھم عدول کی بہترین تفسیر ہیں اور اگر اس کے باوجود بھی مولانا کو اپنے لنگڑے فلسفہ کی صحت پر اصرار ہو تو پھر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ذیل کا سامنا کرنے کا سامان کر لینا چاہیئے۔

میرے اصحاب آسمان کے تاروں کی طرح ہیں تم ان میں سے جس کی بھی

---

[۱] طبری جلد ۳ حصہ سوم صد ۱۶۴ - ۱۶۵

پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

حضرت سعیدؒ بن مسیب حضرت فاروق اعظمؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے اصحاب کے اندر اختلاف (رونما نہ ہونے) کے لئے اپنے رب سے درخواست کی تھی جس پر مجھے بتایا گیا کہ آپ کے سارے ہی اصحاب میرے ہاں آسمانی تاروں کی طرح (روشن قندیلیں) ہیں۔ پھر ان تاروں میں سے بعض تارے اپنے بعض دوسرے ساتھی تاروں سے زیادہ روشن ہیں۔ پس آپ کی اُمت کے لوگوں میں سے جس کسی نے آپ کے جس صحابی کی بھی پیروی کی وہ میرے نزدیک صراطِ مستقیم پر اور راہِ ہدایت پر ہی شمار ہوگا۔ بخاری شریف میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرو اور ان کو اپنی نکتہ چینیوں کا نشانہ نہ بناؤ۔ یاد رکھو جس نے میرے اصحاب سے محبت کی اُس نے میری محبت کی وجہ سے اُن سے محبت کی اور جس نے اُن سے بُغض رکھا تو (سمجھا جائے گا کہ) اُس نے مجھ سے بُغض رکھنے کی وجہ سے اُن سے بُغض روا رکھا۔ جس نے مجھے اذیت دی، اُس نے میرے رب کو اذیت دی اور پھر عنقریب ہی اللہ تعالیٰ اُسے اپنی گرفت میں لے لیں گے۔

ایک سخت انتباہ

ابنِ حجر لکھتے ہیں:

جب تم دیکھو کہ کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی صحابی کی تنقیص کرتا ہے اور اُس کی کمزوریاں بیان کرتا ہے تو جان لو کہ وہ زندیق ہے اور یہ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق ہیں، قرآن حق ہے اور جو کچھ ان دونوں (رسولؐ اور قرآن) کے ذریعہ ہم تک آیا ہے وہ حق ہے اور چونکہ اس حق کو ہم تک پہنچانے والے اصحابِ رسولؐ ہی ہیں تو جو شخص ان کی تنقیص کرتا ہے وہ حق کی شہادت دینے والے گواہوں کی ثقاہت کو مجروح کرتا ہے تاکہ

سنت کو باطل کیا جائے [1]

ایک سوال

یہاں ایک سوال کا جواب بھی مطلوب ہے کہ اصحابِ رسولؐ میں سے جن لوگوں کے بارے میں مولانا نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے کہ انہوں نے دین کو دنیا پر قربان کر دیا، جن کے ظلم و جور کی کہانیاں مولانا کے قلم نے بڑے اہتمام سے تحریر کی ہیں، جن کی سیرت کا ہر ہر صفحہ کتاب و سنت کی منشأ سے گریز کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

جو شرفِ صحابیت سے مشرف ہونے کے باوجود اپنی ضرورت سے جھوٹ بولتے ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، جو فریب دیتے ہیں اور اس میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے، جو حسبِ ضرورت رشوت دیتے بھی ہیں اور رشوتیں قبول بھی کرتے ہیں۔

نفاق جن کی سیاست ہے اور سازش جن کی سیادت کا عنوان ہے۔ جو حرام اور حلال میں تمیز نہیں کرتے۔ ان لوگوں کے بارے میں اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں خیانت نہیں کریں گے۔ اگر دوسروں پر جھوٹ لگاتے انہیں خدا کا خوف نہیں آتا، دوسروں سے خیانت روا رکھتے وہ خدا سے نہیں ڈرتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ لگاتے انہیں کون سا پہاڑ راہ میں مزاحم ہوگا اور نبی علیہ السلام سے خیانت کرتے انہیں کونسا بحرِ ظلمات عبور کرنا ہوگا؟ پس مولانا کو چاہیئے کہ اپنے معتوب ان چند خاص اصحاب کے بارے میں اپنا یہ تکلف بھی ختم ہی کر چھوڑیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں راستی سے تجاوز نہیں کرتے۔

---

[1] الاصابہ جلد ۲

پانچواں مغالطہ

مولانا کا ایک مبیّنہ قاعدہ کُلیہ

مولانا مودودی صاحب نے بعض حضرات کے نام سے اپنے مفید مطلب ضروری اضافہ کے ساتھ ایک قاعدہ کُلیہ کا ذکر کیا ہے کہ :

بعض حضرات اس معاملہ (یعنی اصحابِ رسولؐ کے متعلق تاریخی روایات کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کے ضمن) میں یہ نرالا قاعدہ کُلیہ پیش کرتے ہیں کہ ہم صحابہ کرامؓ کے بارے میں صرف وہی روایات قبول کریں گے جو اُن کی شان کے مطابق ہوں اور ہر اُس بات کو رَدّ کر دیں گے جس سے اُن پر حرف آتا ہو، خواہ وہ کسی صحیح حدیث میں ہی وارد ہوئی ہو [1]

مولانا محترم نے اپنی اس مختصر سی تحریر میں بڑی جسارت کے ساتھ "خواہ وہ کسی صحیح حدیث میں ہی وارد ہوئی ہو" کے جملہ کا اضافہ کر کے اپنی ذات سے بھی اور اپنے قاری سے بھی بڑی ہی دردناک زیادتی کی ہے۔ کیونکہ نہ تو کسی نے کبھی یہ کہا ہے کہ صحابی کی بشریت کو تحفظ حاصل ہے اور اس سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا اور نہ ہی کسی نے یہ کہا ہے کہ صحابی کی شان کے خلاف خواہ کوئی بات صحیح حدیث سے ہی ثابت ہو مانی نہیں جا سکتی۔ کسی کج دماغ، کج فہم اور کج اندیش کی بات الگ ہے مگر کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان صحیح حدیث سے ثابت شدہ کسی بات کو کبھی رَدّ نہیں کر سکتا کیونکہ جو بات صحیح حدیث میں آ چکی ہے وہ تو بہرحال ہی صحیح ہے پھر کوئی مومن اس کو مسترد کرنے کی جسارت کیوں کرے گا۔

مگر ایک یہ بات ہر کوئی سُن لے کہ کسی غیر صادق راوی کی غیر صحیح روایت

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ ۳۰۵

کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کی آبرو کے تار بکھیرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ایسی کسی بھی روایت کی صحت کا فیصلہ کرنے سے قبل درائت سے ضرور مشورہ طلب کیا جائے گا۔ اور جہاں تک مشاجراتِ صحابہؓ کے دَور کا تعلق ہے اِس باب میں وارد ہونے والی ساری ہی تاریخی روایات کو درایت کی تکڑی میں تولنا قطعی ناگزیر ہے۔ بلکہ اگر اس بات پر کچھ اضافہ کیا جائے تو یہ کہنا درست ہے کہ مشاجراتِ صحابہؓ کے دَور کی ہر روایت پر درایت کو ترجیح حاصل ہے کیونکہ اس دَور میں کام کرنے والے گروہی راویوں نے تاریخ کے بجائے صرف اپنے فریق کو ہی لکھا ہے اور اسی کو آگے بڑھایا ہے اس دَور کی تاریخ صرف کسی ضرورت مند سیاست کار یا کسی گروہی متعصب مورخ کے لئے ہی تاریخ ہے اس کو کوئی منصف مزاج آدمی صحیح تاریخ نہیں کہہ سکتا۔

پس اس تاریخ کو تاریخ بنانے کے لئے اسے بہرحال درایت کی چھلنی میں سے گزارنا پڑے گا اور اس دور کی روایت کو صحابی کے لئے محک بنانے کے بجائے صحابی کو اس روایت کی محک قرار دیا جائے گا۔

یقیناً ہم تاریخ کی روایت کو صحیح حدیث کے برابر قرار نہیں دے سکتے۔ بلاشبہ مولانا مودودی صاحب کا یہ کہنا عام حالات میں صحیح ہو سکتا ہے کہ تاریخ کی روایت کو حدیث کے اصولوں پر پرکھنا ممکن نہیں مگر اس کو اصول نہیں بنایا جاسکتا۔ تاریخ کے بھی کچھ اصول مقرر ہیں اور جب کسی بات پر تنازعہ وقوع پا جائے تو تاریخ کے راویوں کو بھی تاریخ کے مسلّمہ اصولوں پر ضرور پرکھا جائیگا۔ یہ اصول بہت عام ہیں اور ان کو ابن خلدون کے مقدمہ اور علامہ شبلیؒ کی مصنّفات سے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا نے اگرچہ دوسروں کو یہی نصیحت فرمائی ہے کہ صحابی کے لئے صحیح حدیث کو متردکرنا غلط بات ہے مگر خود انہیں جب کبھی ایسی کوئی ضرورت پیش آجائے تو انہیں اپنی نصیحت یاد نہیں رہتی یا وہ اُس وقت اپنی نصیحت پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے اور پھر وہ صحابی کو اس کی

صحابیت کے گز سے ہی ناپتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی انہیں یہ کہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کی خواہش دہتی تھی تو اس وقت مولانا کو حضرت علیؓ کے لئے بخاری شریف کی روایات بھی کمزور نظر آنے لگتی ہیں۔ اور جب دل ساتھ نہ دے تو اُم المومنین عائشہؓ کو بھی طبری اور مسعودی کے گز سے ناپنے لگ جاتے ہیں۔ مگر یہ بات اپنی جگہ حق ہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی کو کسی ابن مخنف کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ پس اگر کسی تاریخی روایت میں کسی صحابی کے بارے میں ایسی روائتیں وارد ہوئی ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوشِ نبوت میں پلے کسی بندۂ مومن کی مجموعی زندگی سے ہموار نہ ہوں اور اس کی عام زندگی جو دوسرے ذرائع سے ہم تک پہنچ چکی ہو روایت کے مندرجات اس سے توافق نہ رکھتے ہوں، تو یقیناً ایسے راوی اور اس کی روایت دونوں کو رد کر دیا جائے گا اور ایسی کوئی روایت محض اس لئے نہیں مان لی جائے گی کہ اُسے کسی پُرانے مصنف نے اپنے ہاں درج کیا ہے یا وہ کسی قدیم تاریخی کتاب میں پائی جاتی ہے یا اُسے کسی عالم دین نے اپنی کتاب میں نقل کر رکھا ہے۔

اگر تاریخی روایت اپنی صحت کے لئے حدیث کی صحت کو دریافت کرنے کے آداب کو اختیار کرنے کی متحمل نہیں تو اس کا کسی بڑے آدمی کی تصنیف میں درج ہو جانا بھی اس کو صحت کی سند عطا نہیں کر دیتا۔ بالخصوص جبکہ ان تاریخی کتب کے مصنفین خود بھی اپنی بیان کردہ کسی روایت کی صحت کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر رہے ہوں۔ ایسے میں مولانا کا یہ کہنا محلِ ماتم ہی ہے کہ۔

(اگر صحتِ روایت کا معیار صحابہ کی صحابیت کو ہی ٹھہرایا گیا تو کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ) جنگِ جمل اور جنگِ صفین سرے سے پیش ہی نہیں آئیں کیونکہ صحابہ کرامؓ کی شان اس سے بعید ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں تلواریں لے کر کھڑے ہو جائیں اور اُن کے ہاتھوں سے اہلِ ایمان کی خونریزی ہو[1]

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ ۳۰۶

اب کوئی مولانا سے کیونکر عرض کرے کہ آپ کی یہ منطق آپ سے عقیدت کے رشتے سے ہی صحیح کہی جا سکتی ہے ورنہ اصحابِ رسولؐ کی بشری کوتاہیوں اور کمزوریوں سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے۔ اور پھر جب بعض بزرگوں کی غلطیاں حدیث چھوڑ، قرآن میں بھی ذکر ہوئی ہیں تو آپ یہ نئی بات کونسی منوانا چاہتے ہیں۔

بات بڑی صاف تھی مگر مولانا نے اس کو خواہ مخواہ اُلجھا دیا ہے یہاں بحث اصحابِ رسولؐ سے غلطی کے امکان یا عدمِ امکان کی نہیں بلکہ بات صرف اصحابِ رسولؐ کے بارے میں تاریخی روایات کو پرکھنے کے اصول کی ہے۔ کیونکہ اگر حدیثِ رسولؐ جیسے محتاط ذرائع سے آنے والی حقیقت میں بھی ملاوٹ ثابت ہے تو مشاجراتِ صحابہؓ کے بارے میں وارد شدہ تاریخی روایات جو اکثر ہی جانبداری کی تخلیق ہیں اور جن کی پرورش گروہی تعصب کے دُودھ سے ہوئی ہے اُن میں کیا کچھ کھوٹ نہیں مل سکتا۔ اگر حدیث کے سلسلہ کو سیدھا رکھنے کے لئے جرح و تعدیل کی ضرورت ناگزیر ہوئی تو پھر جرح و تعدیل تاریخی روایات کے لئے شجرِ ممنوعہ کیوں ہو گی!

مولانا یقیناً کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہیں، انہیں خوب ہی معلوم ہے کہ ہمیں جس تاریخ سے بحث ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ نہیں ابوبکرؓ اور عمرؓ کی تاریخ نہیں، حضرت عثمانؓ کے دَور کے نصف اوّل کی تاریخ نہیں بلکہ بحث اُس تاریخ سے ہے جو حضرت عثمانؓ کی خلافت کے نصف آخر سے چلتی ہے کیونکہ اس تاریخ میں واقعات سے کم بحث ہوئی ہے اور صنعت کاری زیادہ ہے۔

یہ تاریخ جس دَور میں مرتب ہوئی ہے وہ ایک سخت بُحرانی دَور تھا جب تاریخ واقعات کے تابع نہیں تھی بلکہ مرتب کرنے والوں کی اپنی سیاسی اور گروہی ضرورتوں کے تابع تھی اور تاریخ لکھی نہیں جاتی تھی بلکہ بنائی اور لکھوائی جاتی تھی۔ ہماری اس تاریخ کی تدوین کا زمانہ ایک خاص قبیلہ (بنو عباس) کے اقتدار کا زمانہ ہے جو اپنے

پیشرو صاحبِ اقتدار قبیلہ (بنو اُمیہ) کو شکست دے کر حکومت پر قابض ہوا تھا اور اس کی سیاست بنو اُمیہ دشمنی پر قائم تھی۔

جو لوگ راوی کی حیثیت سے سامنے لائے گئے اُن میں سے کوئی ایک بھی واقعات کا چشم دید گواہ نہیں تھا اور کسی نے اُس زمانہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔

وہ راوی جن واقعات کو بیان کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اس واقعہ کے وقت موجود نہیں تھا یہ سب کے سب ہی ضرورت کے پیداوار تھے۔ اور اہلِ غرض نے اُنہیں خود راوی بنایا تھا اور ان کی زبان سے اپنی مرضی تاریخ کے نام سے اوراق پر منتقل کر دی تھی۔

ان راویوں میں اکثر ہی شیعہ تھے، رفض ان کے خمیر مایہ میں شامل تھا جو حکومت کی مرضی کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات اور خیالات بھی تاریخ کے نام سے ترتیب دیتے تھے اور یہ سب کچھ حکومت کے اہتمام میں تاریخ بن جاتا تھا۔ راویوں کی یہ افترا پردازیاں، کذب تراشیاں چونکہ بنو اُمیہ کے خلاف بنو عباس کی سیاست کے لئے مفید مطلب تھیں اس لئے عباسی حکومت کو ان کی ان افسانہ سازیوں پر نہ صرف کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ عباسی حکومت ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتی تھی اور ان کی سرپرستی کا فریضہ بھی انجام دیتی تھی۔

بنو عباس اور روافض کے اس مشترکہ مفاد سے کذاب اور مفتری راویوں نے بنو اُمیہ اور ان کے سربراہوں حضرت ابوسفیانؓ، حضرت معاویہؓ اور اُن کے دوسرے رفقاء کے نام سے جو جمع و ترتیب کی اُسے عباسیہ حکومت نے مسلمانوں کی تاریخ کے نام سے اپنی ساری مملکت میں پھیلایا اور اُسے اپنے ڈنڈے کے زور سے تاریخ بنایا اور پھر امتدادِ زمانہ سے یہ جھوٹ سچ مچ کی تاریخ کے بطور ہی جانا جانے لگا۔ ورنہ اس تاریخ کی حیثیت انگریزوں کے بیان کردہ بلیک ہول سے زیادہ کچھ نہیں ہے، یہ لوگ اس درجہ شقی القلب، سفاک اور درندہ صفت

تھے کہ وہ بقول مولانا مودودی صاحب بھی اپنے زندہ دشمن پر رحم تو رہا ایک طرف وہ ان کے مُردہ جسموں سے بھی ایسا وحشیانہ سلوک کرتے تھے کہ کتے اور بھیڑیئے تک اس صورتِ حال کے نظارہ سے کانپ جائیں۔

وہ بنو اُمیہ کے جان بلب اور سسکتے اتڑپتے اور جان توڑتے معصوم بچوں کی نعشوں کو اپنے پاؤں تلے کچل کر لذت پاتے تھے اور ان کی لاشوں پر فرش بچھا کر دادِ عیش دیتے تھے، ان کی بیویوں اور بچیوں کی بے دریغ آبروریزی کرتے تھے اور پھر اس پر شرمانے کے بجائے فخر کرتے تھے [1]

اور پھر ہم بتا چکے ہیں کہ بنو اُمیہ کی تاریخ کو ترتیب دینے والا قلم انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھا اور یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ یہ ظالم سفاک اور وحشی اہل سیاست اور اُن کے آلۂ کار کذاب گروہی راوی بنو اُمیہ سے انصاف نہیں کر سکتے تھے۔

وہ لوگ جنہوں نے بنو اُمیہ کے مُردہ لوگوں کو قبروں سے نکال نکال کر پیٹا، ان پر ڈنڈے برسائے اور انہیں دہکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں ڈال کر بھسم کر دیا تھا وہ ان کی تاریخ لکھتے ہوئے کیا کچھ صنعت کاری نہیں کریں گے اور انہی لوگوں کے قلم سے بنو اُمیہ کی لکھی جانے والی تاریخ ہے جس کی روایات پر اگر کوئی شخص قرآنِ پاک کی طرح ایمان نہ لائے تو اُسے مولانا کے نشتر اثر قلم کی چبھن کا سامنا کئے بغیر چارہ نہیں ہے اور اگر کوئی یہ سچی بات زبان قلم پر لے آئے تو مولانا اُسے یہ کہہ کر رگیدتے ہیں کہ اس طرح تو کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین پیش ہی نہیں آئیں [2]

حضرت مولانا کا یہ خدشہ صحیح ہو سکتا ہے۔ یقیناً ایسے لوگ ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں جو حقائق کا انکار کرنے کچھ بھی بوجھ محسوس نہیں کرتے۔ اس کی مثال خود مولانا کے اپنے وجود میں ہی موجود ہے جنہوں نے تاریخ کی ایک

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۹۳ [2] ایضاً صہ ۳۰۶

زندہ حقیقت ابن سبا کو حذف کرکے اُس کی ساری شرارتوں، خرابیوں، سازشوں اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو برباد کرنے کی خوفناک مساعی کو حضرت عثمان ذوالنورین رضہ کی نقاہتوں اور کمزوریوں کے نام سے اُن کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ دیکھئے کس اعتماد سے فرماتے ہیں:

حضرت عثمانؓ کے خلاف جو شورش برپا ہوئی اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی سبب کے بغیر محض سبائیوں کی سازش کی وجہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ یا وہ محض اہلِ عراق کی شورش پسندی کا نتیجہ تھی تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں۔ ان لوگوں کو اپنی سازش میں کامیابی صرف اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ اپنے اقربا کے معاملے میں حضرت عثمانؓ نے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا تھا اس پر عام لوگوں ہی میں نہیں بلکہ اکابر صحابہ تک میں ناراضی پائی جاتی تھی [1]

اب رہا مولانا کا یہ تعجب کہ "میں نہیں جانتا کہ محدثین ومفسرین اور فقہاء میں سے کس نے یہ قاعدہ کلیہ پیش کیا ہے اور کونسا محدث ومفسر یا فقیہ ہے جس نے کبھی اس کی پیروی کی ہے [2]

تو گزارش ہے کہ آپ کو محدثین، مفسرین اور فقہاء کی تلاش میں نکلنے کے بجائے اپنے سفر کا رُخ قرآنِ پاک کی وادی کی طرف موڑ دینا چاہیئے تھا۔ وہاں آپ کو وہ سب کچھ مل جاتا جو آپ کو مطلوب تھا۔

اللہ اکبر! مولانا خود مفسر ہیں، قرآنِ پاک کی تفسیر انہوں نے ایک بار قرآن کی ضرورت سے اور دوسری بار اپنی ضرورت سے تحریر فرمائی ہے۔ اگر وہ ایک بار اصحابِ رسولؐ کی صحابیت کے تقدس کی تلاش میں بھی ادھر نگاہ اُٹھا لیتے تو یقیناً مایوس نہ ہوتے۔

صدیقہ طاہرہ اُم المومنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پاکدامنی پر جب مخالفین نے تہمت کی انگلی رکھی تو اللہ تعالیٰ نے اسی درایت کے اصول پر مسلمانوں

---

[1] خلافت وملوکیت صد ۳۲۳ - ۳۲۹ [2] ایضاً صد ۳۰۵ سطر ۱۴-۱۵

کو ڈانٹ پلائی تھی کہ :

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا
وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ [1]

مسلمانو! یہ بات جونہی تمہارے کانوں تک پہنچی تھی تو سب مسلمان مردوں اور عورتوں نے یہ سنتے ہی فوراً کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ تو صریحاً جھوٹ ہے۔

اور ظاہر ہے کہ اس ارشاد میں درایت کی دلیل سے ہی صدیقہ طاہرہؓ کی پاکیزگی پر استدلال ہوا ہے اور اس استدلال و انتباہ سے مقصود باری یہی ہے کہ لوگو! انہیں ابوبکرؓ کی بیٹی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی کے بارے میں ایسا بُرا سوچتے کچھ بھی حجاب محسوس نہ ہوا!

تم نے آخر یہ کیونکر باور کر لیا کہ عائشہؓ سے بھی ایسا کوئی گناہ صادر ہو سکتا ہے۔

تم نے یہ بیہودہ بات سنتے ہی کہنے والے کے منہ پر یہ کہتے کیوں نہ دے ماری کہ تیرا بُرا ہو یہ تو نری بکواس ہے۔

دوسری طرف مخالفین و معاندین کے لئے بھی اس ارشاد میں انتباہ کا ایک پہلو موجود ہے کہ ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر شِیر

یہ بات تو مولانا کو معلوم ہی ہے کہ یہاں روایت موجود تھی اور اس روایت کو روایت کرنے والوں اور آگے چلانے والوں میں بعض اکابر صحابہؓ شامل تھے اور اس روایت کے متاثرین میں بھی بعض اکابر داخل تھے بلکہ حضور علیہ السلام کے بعض اخص رفقاء اور اعزہ تک نے نہ صرف اس روایت کی تردید نہ کی بلکہ اس روایت کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُم المومنین عائشہؓ سے منحرف ہو جانے کا مشورہ بھی پیش کیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے عائشہؓ کو روایت

---

[1] پارہ ۱۸ سورہ نور ع ۲

راویوں اور متاثرین کی ترازو میں تولنے کے بجائے ان سب کو خود عائشہؓ کے معیار پر ہی جانچنے کا حکم دیا۔ مگر ٹھہرئیے ہم مولانا کو یہ تکلیف بھی نہیں دیتے کہ وہ روایت کا یہ اصول قرآن سے سیکھتے پھریں۔ ہم اُن کے سامنے خود اُنہی کا عمل پیش کرتے ہیں کیونکہ ان کا اپنا عمل بھی اپنی ضرورت سے اسی اصول کا پابند ہے۔

بات ذرا پرانی ہو چکی ہے اور مولانا کو خود اپنا ہی یہ ارشاد یاد نہیں رہ سکا کہ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی صحیح روح اس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔

پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اوّل نظر میں ہی سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں۔[1]

مزید ارشاد ہے:

قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعہ سے (آدمی کے اندر) ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے ..... اس کا یہ ذوق اُسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اُس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی چیز نہیں رکھتی۔ پھر جب وہ روایات پر نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی ردّ و قبول کا معیار ہو جاتی ہے۔[2]

یعنی ہمارے مولانا مودودی صاحب اپنی ضرورت سے حدیثِ رسولؐ پر مشتمل کسی روایت کے راویوں کا فیصلہ بھی کبھی محدثین کے وضع کردہ اصولوں سے رہنمائی حاصل کئے بغیر خود اپنے اُس ملکہ اور ذوق کی مدد سے ہی کر لیتے ہیں جو اُنہوں نے کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے حاصل کر رکھا ہے کیونکہ اُنہوں نے سخت محنت کے بعد اپنے ذوق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج سے ہموار کر لیا ہے۔

---

[1] تفہیمات صـ ۲۷۶ [2] ایضاً صـ ۲۹۵

اور اب انہیں بغیر کسی مقررہ یا مجوزہ قاعدہ کی پیروی کے از خود ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی بات کہی ہو گی اور کون سی نہیں کہی ہو گی۔ انہیں اپنے کثرتِ مطالعہ اور مہارت کے نتیجہ میں اب یہ حاجت نہیں رہ سکی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی صحت دریافت کرنے کے لئے محدثین کی رہنمائی حاصل کریں۔

جرح و تعدیل کا کوئی ضابطہ اسماء الرجال کا کوئی قانون، راوی یا روایت کی پرکھ کا کوئی متداول پیمانہ اُن کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ حضرت کی اپنی صوابدید ان سب کو کفایت کرتی ہے سبحان اللہ ؎

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

اب یہ ایک المناکی ہی ہے کہ اپنی ضرورت سے کبھی وہ حدیث کی صحت کی پرکھ میں محدثین تک کی احتیاج قبول نہیں کرتے اور کبھی اپنی ضرورت سے ایرے غیرے اور مجہول راویوں کو بھی آنکھوں پر بٹھا لیتے ہیں۔

جن اصحابِ رسول ؐ سے وہ اپنی غرض سے ناراضگی قائم رکھنا پسند کرتے ہیں ان کی تحسین اگر بخاری میں بھی ذکر ہو تو اسے مسترد کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کا استخفاف اگر روافض کی راہ سے بھی میسر آ جائے تو اسے سندِ قبول عطا کر دیتے ہیں۔

نہ مانیں تو ابن تیمیہؒ اور قاضی ابوبکرؒ کی بھی نہ مانیں اور ایمان لائیں نو واقدی کی مزخرفات کو قرآن کی آیت بنا دیں کوئی بات ٹکے تو واقدی کا بھی دفاع کرنے لگ جاتے ہیں۔ اب انہیں کوئی کیا کہے ؎

لطف یہ لطف ہے املا بھی مرے یار کی یار
حامئ حطّی سے گدھا لکھتا ہے ہوز سے ہمار

چھٹا مغالطہ

اصحابِ رسول پر گفتگو کے بارے میں مولانا کا مسلک

فرماتے ہیں:

میں صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدینؓ کے معاملہ میں اپنا یہ مستقل مسلک پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ اُن کا کوئی قول اور فعل اگر بظاہر غلط محسوس ہوتا ہے تو اُن کے اپنے کسی بیان یا اُس وقت کے ماحول یا اُن کے مجموعی طرزِ عمل میں اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی پوری کوشش کی جائے اور اس کے حق میں ہر وہ معقول تاویل کی جائے جو بے جا اور بھونڈی وکالت کی حد تک نہ پہنچتی ہو۔[1]

بات بڑی خوبصورت ہے مگر مولانا کا اپنا طرزِ عمل اس کے مطابق نہیں ہے۔ مولانا کے ہاں ان کے اس اصول کی کارفرمائی حضرت علیؓ کی حد تک تو صحیح ہے مگر کسی دوسرے صحابی کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ خود مولانا کا ہی ارشاد ہے کہ۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں رسائل و مسائل حصہ اوّل کے مضمون "حضرت علیؓ کی امیدواری خلافت" اور موجودہ زیرِ بحث مضمون میں جو رویہ میں نے اختیار کیا ہے وہ دراصل اسی قاعدے پر مبنی ہے۔[2]

مولانا نے اس باب میں مزید وضاحت بھی کر رکھی ہے جب فرمایا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت سے لے کر خود اُن (یعنی حضرت علیؓ) کی اپنی شہادت تک ایک ایک مرحلے پر ان کا جو رویہ رہا ہے اس کے ہر جز کا ایک صحیح محمل میں نے تلاش کیا اور ان کے اپنے بیانات میں یا اُس وقت کے حالات و واقعات

---

[1] خلافت و ملوکیت صـ۳۰۷ [2] ایضاً صـ۳۰۸

ہیں وہ مجھے مل گیا [۱]

اب دیکھئے حضرت علیؓ کے سلسلہ میں راویوں کی دھاندلی کے ازالہ کے لئے مولانا جس درجہ فکرمند ہیں، بڑی ہی ایمان افروز بات ہے۔ حضرت علیؓ یقیناً اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ انہیں غلط سلط تاریخی روایات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیا جائے اور ان کی طرف سے دفاع کی بھرپور سعی کی جائے۔ مگر ستم یہ ہے کہ مولانا حضرت علیؓ کے علاوہ کسی عام صحابی کے لئے تو کیا حضرت علیؓ کے کسی ہم رتبہ بلکہ بعض پہلوؤں سے ان سے کسی فائق تر شخص کے لئے بھی یہ رعایت پسند نہیں کرتے اس لئے مولانا کا یہ بیان خلاف واقعہ اور ایک سخت مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

انہوں نے جب حضرت علیؓ کے بارے میں سُنا کہ بہت سی روایات کے مطابق وہ خلافت کی ہر تبدیلی پر جھگڑا ڈال بیٹھتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے خلافت میرا حق ہے تو مولانا بغیر کسی تحقیق اور بغیر کسی منقولی دلیل کے صرف حضرت علیؓ کے ذاتی شرف کی دلیل سے ہی ان روایات کو مسترد کر دیتے ہیں کیونکہ ایسا گھٹیا فعل حضرت علیؓ جیسے عظیم شخص سے متوقع نہیں ہے [۲]

لیکن حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر کوئی مسلمہ شیعہ راوی بھی کوئی تہمت رکھ دے تو مولانا اس کی طرف سے خود مدعی بن جاتے ہیں۔ راوی نے کہا کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں [۳]

تو بجائے اس کے کہ مولانا کذاب راوی کی پٹائی کرتے انہوں نے عثمانؓ دشمن راوی کا ساتھ دیا اور اس کے الزام کے ثبوت میں روایات کی تلاش میں اپنی لائبریری کا ایک ایک کونہ کھنگال مارا۔ مولانا کے راوی نے حضرت عثمانؓ

---

[۱] خلافت و ملوکیت ص۳۴۸ [۲] ایضاً ص ۳۴۷ [۳] ایضاً ص ۱۰۶

پر تہمت تراشی کی کہ۔

اُنہوں نے افریقہ کے مالِ غنیمت کا پورا خمس (۵ لاکھ دینار) مروان (اپنے ایک قریبی عزیز) کو بخش دیا۔

عبداللہ بن سعد بن ابی سَرح افریقہ کا خمس مدینہ لائے اور مروان بن الحکم نے اُسے پانچ لاکھ دینار میں خرید لیا پھر حضرت عثمانؓ نے یہ قیمت اُسے معاف کر دی . . . .

مولانا کے نزدیک افریقہ کے خمس کے معاملہ میں جتنی روایات بیان کی جاتی ہیں یہ روایت اُن میں سب سے زیادہ درست ہے۔ مولانا لکھتے ہیں :

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے افریقہ کا خمس عبداللہ بن سعد کو دیا تھا اور بعض دوسرے لوگ بیان کرتے ہیں کہ مروان بن الحکم کو عطا کیا تھا۔

اب بجائے اس کے کہ مولانا روایت کے اختلاف کو حضرت عثمانؓ کے حق میں بطور دلیل پیش کر کے اپنے اصول کا احترام کرتے اور حضرت عثمانؓ کو ایک غلط الزام سے بری کرنے کی سعی کرتے ، انہوں نے اپنے خاص راوی کے تعاون سے بعض مجہول الاسم لوگوں کے نام پر اس اختلافی روایت کے لئے اپنی پسند کے معنی تلاش کئے اور فرمایا کہ اس اختلاف کا صحیح حل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے یہ خمس ہی دو بار اپنے عزیزوں کو عطا کیا تھا۔ ایک بار عبداللہ بن سعد کو اور دوسری بار مروان کو عطا کر دیا۔ یعنی آپ نے تہمت کو دُور کرنے کے بجائے اس کا بوجھ دوگنا کر دیا۔

دیکھئے مولانا کس جرأت سے اپنے راوی کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس روایت سے حقیقت یہ ظاہر ہوئی کہ حضرت عثمانؓ نے افریقہ کی پہلی جنگ کا خمس عبداللہ بن سعد کو عطا کیا تھا اور دوسری جنگ جس میں افریقہ کا پورا علاقہ فتح ہوا اس کا خمس مروان کو عطا کیا[1]

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۰۶-۱۰۷ حاشیہ

یہاں پورے افریقہ کی فتح یابی سے حاصل آمدہ خمس کی لے اندازہ مقدار کا تاثر دے کر آپ نے مروان والے خمس کا بوجھ مزید بڑھا دیا ہے۔ اب حضرت علیؓ کو تو اُن کے ذاتی شرف کی دلیل سے ہی مولانا نے بری کر دیا۔ حالانکہ اس عنوان سے بخاری شریف تک کی روایات موجود ہیں مگر مولانا حضرت عثمانؓ کا اعتبار نہیں کرتے جب انہوں نے اپنی زبان سے ارشاد کیا کہ۔

لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے خاندان سے محبت کرتا ہوں اور ان کو عطیات دیتا ہوں لیکن میری محبت نے مجھے ظلم و جور پر آمادہ نہیں کیا (یعنی میں نے بیت المال کی تقسیم میں کسی مسلمان کی حق تلفی نہیں کی)

پس واضح رہے کہ میں نے اپنے اقربا کو جو کچھ بھی دیا ہے (بیت المال سے نہیں بلکہ) اپنے ذاتی مال سے دیا ہے۔ مسلمانوں کا مال نہ میں اپنے لئے حلال سمجھتا ہوں نہ مسلمانوں میں سے کسی دوسرے (غیر مستحق) کے لئے۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اپنے مال سے اپنے اقربا کو بیش قیمت اور گراں بہا عطیئے دیا کرتا تھا۔ حالانکہ زندگی کا وہ زمانہ اور عمر کا وہ حصہ کمانے اور جمع کرنے کا دور سمجھا جا سکتا ہے مگر میں نے اس زمانے میں بھی کبھی مال سے محبت نہیں کی تھی اور اب جبکہ میں طبعی عمر کو پہنچ چکا ہوں اور تھوڑے ہی عرصہ بعد میری دولت میرے عزیزوں کی طرف ہی منتقل ہونے والی ہے اور یہ اُنہی کا مال ہے۔ اگر میں اپنے ہاتھوں اُن کو دوں تو میرے خلاف الزامات تخلیق کرنے والے اور بیت المال میں تصرف کی تہمت رکھنے والے لوگ بلاشبہ بدنیت لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔

خدا کی قسم میں نے کسی سے اصل سے زیادہ خراج کبھی وصول نہیں کیا۔ پھر وہاں سے بھی جو وصول ہوا وہ بھی مسلمانوں ہی کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا ہے میرے پاس جو خمس آتا ہے اس میں سے بھی میں اپنے لئے کوئی چیز جائز نہیں سمجھتا، مسلمان ہی اس کے مالک ہیں اور وہ ہی اس مال کو مستحقین میں تقسیم کرتے رہے ہیں۔

اللہ کے مال سے ایک پائی بھی خرد برد نہیں کی گئی ہے اور نہ خود اپنے گزارے کے لئے ہی اس میں سے کچھ لیتا ہوں اور میں تو کھانا بھی اپنے ذاتی مال سے ہی کھاتا ہوں ؎

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ بیان حلفیہ بیان ہے جسے کفر کی عدالتوں تک میں زیر بحث قضایا میں آخری بیان سمجھا جاتا ہے۔ مگر مولانا مودودی کی عدالت میں حضرت عثمانؓ کے اس حلفیہ بیان کی بھی کوئی قیمت نہیں اور وہ اس بیان کو جانتے بوجھتے بھی اُنہیں بدنام کرنے کے لئے غلط اور جھوٹ روایات کو بدستور ہی اُچھالتے چلے جارہے ہیں اور اس پر بھی اُن کا دعویٰ ہے کہ:

اصحاب رسولؐ خصوصاً خلفائے راشدین کا اگر کوئی قول یا فعل بظاہر غلط محسوس ہو تو میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ متعلقہ صحابی کے اپنے بیان یا اس کے گرد و پیش کے حالات یا اُس کے مجموعی طرز عمل کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل تلاش کروں اور ہر اُس تاویل سے جو معقول ہو صحابی کے مقام کا تحفظ کروں۔ سبحان اللہ ؎

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

ساتواں مغالطہ

قاتلین عثمانؓ کا معاملہ

مولانا مودودی صاحب نے اپنی کتاب کے آخر میں ایک آخری سوال کے ذریعہ اُن لوگوں سے خطاب کیا ہے جو اس بات پر بضد ہیں کہ حضرت علیؓ

لہ طبری جلد ۴

کو بہر حال قاتلینِ عثمانؓ کو گرفتار کر لینا چاہیئے تھا۔ مولانا سوال کرتے ہیں کہ ایسے لوگ مجھے بتائیں کہ:

حضرت علیؓ قاتلینِ عثمانؓ کے اس مضبوط جتھے کو کس وقت پکڑتے؟

- کیا خلافت سنبھالتے ہی فوراً؟
- یا جنگِ جمل کے زمانہ میں؟ یا جنگِ صفین کے زمانے میں؟
- یا جنگِ صفین کے بعد اُس زمانہ میں جب کہ ایک طرف حضرت معاویہؓ اُن کے مقابلے میں مملکت کے ایک ایک صوبے کو توڑ لینے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف خوارج اُن کے خلاف صف آرا تھے؟[۱]

اور اب یہ ایک لطیفہ ہی ہے کہ مولانا نے دوسروں سے جو سوال پوچھا ہے تو اس کا مقصد دوسروں کا جواب سننا نہیں تھا کیونکہ سوال انہوں نے بعد میں کیا ہے مگر اس کا وہ جواب جو انہیں مفید مطلب تھا اُسے وہ خود اپنے ہی قلم سے ایک صفحہ پہلے رقم کر چکے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے مولانا نے لکھا ہے:

میں نے شرعی احکام پر جتنا بھی غور کیا ہے اس کی بناء پر میرے نزدیک خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی شرعاً ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ خلیفۂ وقت کی خلافت کو مان کر انہی سے مطالبہ کیا جاتا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین کو گرفتار کر کے اُن پر مقدمہ چلائیں اور جس جس کا جو بھی حصہ اس جرمِ عظیم میں تھا اس کو شہادتوں کے ذریعہ متعین کر کے قانون کے مطابق اس کو سزا دیں۔

دوسری طرف اُس وقت کے حالات کا میں نے جس قدر بھی مطالعہ کیا ہے اس کی بناء پر میں سمجھتا ہوں کہ عملاً یہ طریق کار اس کے بغیر اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ حضرت علیؓ کے ساتھ سب لوگ تعاون کرتے اور اُن کو

---

[۱] خلافت و ملوکیت صد۳۴۱

پُرامن حالات میں کام کرنے کا موقع دیا جاتا لہ

اب کوئی پوچھے کہ اگر فیصلہ آپ نے ہی سنانا تھا تو دوسروں سے دریافت کرنے کا تکلف کیوں کیا اور پھر جب آپ اپنا فیصلہ پہلے ہی لکھ چکے تھے تو سوالات اٹھانے کا کیا مطلب ہے؟

قابلِ احترام مولانا! آپ کی کمزوری یہ ہے کہ آپ نے واقعات کو نہیں بلکہ اپنی ضرورت کو پیش نظر رکھا ہے اور اپنی ضرورت کے مصالح سے ہی آپ نے اپنی اس مہم میں حضرت علیؓ کو حق پر اور حضرت معاویہؓ کو باطل پر پہلے قرار دے لیا ہے۔ اور اس مسئلہ پر بحث بعد میں جاری کی ہے اور آپ کی اسی غلط راہِ فکر نے آپ کے لئے مشکل پیدا کر رکھی ہے۔ اگر آپ بحث پہلے کرتے اور بحث کے بعد دلائل کی روشنی میں کسی کے حق بجانب یا غیر حق بجانب ہونے کا فیصلہ کرتے تو آپ کو کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ آپ نے جو سوالات اٹھائے ان کا خمیر مایہ ہی کسی طفلی اثر سوچ یا خود فریبی سے اٹھا ہے۔ یہ سوالات تاریخ سے ناواقفی کی بنا پر نہیں بلکہ تاریخ کے طالب علم کی ناواقفی سے فائدہ اٹھانے کی ایک تدبیر کے بطور جانتے بوجھتے اٹھائے گئے ہیں۔ ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ یہ سوالات پیدا ہی نہیں ہوتے اور اگر کوئی ایسے سوالات پیدا کرتا ہے تو اسے اپنے خدا سے اپنی نیت کی صحت مندی کی دعا کرنی چاہیئے۔

مولانا المحترم! علیؓ قاتلینِ عثمانؓ کو کب پکڑتے، کس جگہ پکڑتے، کیونکر پکڑتے، کس مرحلہ پر پکڑتے۔ بالکل پرائمری کے بچوں کا پہاڑہ ہے جو سکول کے بچے سکولوں میں الاپتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی سلطنت کے بعض مصالح سے انہیں گرفتار ہی نہیں کرنا چاہتے تھے ورنہ ان کی گرفتاری کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اگر ان کو گرفتار کر لیا جاتا تو جنگِ جمل اور صفین کے برپا ہو سکنے کے

لہ خلافت و ملوکیت صہ ۱۴۲

۸۰ فیصد اسباب ختم ہو جاتے اور بہت ممکن تھا کہ پھر صلح کے دخل و عمل سے باقی ۲۰ فیصد اسباب بھی ختم ہو جاتے۔ حضرت علیؓ صرف اپنے انتخاب یا اپنی خلافت کے چند ابتدائی ایام میں ہی انہیں گرفتار نہ کر سکنے کا عذر کر سکتے تھے ورنہ جن بزرگوار کی کمان میں ایک لاکھ کے قریب شمشیر بکف اور جانثار قسم کے مجاہد موجود ہوں اُن کے لئے صرف چند سو بلوائیوں پر قابو پانا ہرگز کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ قاتلوں کے بارے میں حضرت علی جو سوچ رکھتے تھے اس کا کھلا اظہار انہوں نے اس صفائی سے کر دیا تھا کہ خود مولانا مودودی نے بھی اپنے آپ کو مبہوت بنا لینا مناسب سمجھا جب مولانا نے لکھا کہ:

"ایک چیز ایسی ہے جس کی مدافعت میں مشکل سے ہی کوئی بات کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ جنگِ جمل کے بعد انہوں نے قاتلین عثمانؓ کے بارے میں اپنا رویّہ بدل دیا۔

جنگِ جمل تک وہ ان لوگوں سے بیزار تھے اور بادلِ ناخواستہ ان کو برداشت کر رہے تھے اور اُن پر گرفت کرنے کے لئے موقع کے منتظر تھے ... لیکن اس کے بعد تدریج وہ لوگ ان کے ہاں تقرب حاصل کرتے چلے گئے ...... حتیٰ کہ انہوں نے مالک بن حارث الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کے عہدے تک دے دیئے" [۱]

اور یہ جو حضرت مولانا کے لئے حضرت علیؓ کی مدافعت مشکل ہو رہی ہے اور وہ حضرت علیؓ کے اس اقدام پر تعجب سے دم بخود ہیں، یہ حضرت کا محض تکلف ہی ہے ورنہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ قاتلینِ عثمانؓ کے بارے حضرت علیؓ کا یہ طریق یگانگت صرف وقت کے انتخاب کا ہی مسئلہ تھا ورنہ قاتلین عثمانؓ سے وہ اپنا دل کسی مرحلہ پر بھی میلا نہیں رکھتے تھے۔ اور ان کے خلاف کوئی کاروائی ان کی مملکت، ان کی حکومت اور ان کی خلافت

---

[۱] خلافت و ملوکیت صد ۱۴۶

رکے مصالح کے منافی تھی، مولانا ان مصالح سے بے خبری کے اظہار میں غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔

حضرت مولانا کی خدمت میں عرض ہے کہ حضرت علیؓ اگر عثمانؓ کے خون کا قصاص چاہتے تو انہیں قاتلوں کو پکڑنے کی حاجت ہی نہیں تھی وہ اگر قاتلوں سے قطع تعلق ہی کر لیتے، ان سے علیحدہ ہو جاتے یا انہیں اپنے سے علیحدہ کر دیتے تو حضرت علیؓ پر سے بہت سا بوجھ اُتر جاتا۔ مولانا مودودی صاحب کا بار بار یہ آموختہ دُہرانا اُن کی شبکی کا موجب اور اُن کے فکر و نظر اور علم و خبر کی توہین ہے کہ حضرت معاویہؓ یا دوسرے طالبانِ قصاص حضرت علیؓ کی خدمت میں پہنچ کر استغاثہ کرتے اور قتل کے عینی گواہ تلاش کر کے حضرت علیؓ کے حضور پیش کرتے اور پھر اگر حضرت علیؓ توجہ نہ کرتے تو اُن پر اعتراض آتا تھا ورنہ نہیں۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے قتلِ ناحق پر حضرت علیؓ کی اپنی کوئی ذمہ داری نہیں تھی؟ کیا اُنہیں اس سے کوئی بحث نہیں تھی کہ ان کے پیشرو قتل ہوئے ہیں؟

وہ جن بزرگوار کے جانشین بنے کیا جانشین کی حیثیت سے ان پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے پیشرو کے قتلِ ناحق پر قاتلوں کے خلاف کاروائی کریں؟

کیا اسلامی حکومت یا بقول مولانا اسلام کی نظامی حکومت کی اپنی کوئی ذمہ داری نہیں کہ وہ ملک کے اندر برپا ہونے والے فتن کا از خود نوٹس لے؟

کیا اسلام کی نظامی حکومت کو اس بات کی آزادی ہے کہ وہ ظلم کو کھلی آنکھوں دیکھے مگر چپ رہے اور اس امر کی منتظر رہے کہ مظلوم کی دادرسی صرف اس وقت ہی کی جائے گی جب مظلوم دادخواہی کی درخواست لے کر آئے ورنہ ظالم کو سرِ ظلم کی کھلی چھٹی ہے۔ اُسے صرف اسی وقت پکڑا جائے گا جب کوئی

اسے پکڑنے کی درخواست کرے - اور کیا مولانا بتا سکتے ہیں کہ مدینہ میں عثمانؓ کے ورثاء میں سے کون تھا جسے بلوائیوں اور قاتلوں سے پناہ حاصل تھی اور وہ باہر نکل کر اپنی داد خواہی کی جسارت پر قادر ہوتا۔

پھر چند روز بعد مدینہ میں عثمانؓ کے ورثاء میں سے کوئی شخص موجود بھی رہ گیا تھا جو حضرت علیؓ کے حضور حاضر ہو کر مولانا کو خوش کر سکتا۔ کیا سیدھی راہ اب یہی رہ گئی تھی کہ حکومت قاتلوں کے خلاف صرف اس وقت ہی حرکت کرے گی جب حضرت نائلہ خود حاضر ہو کر اپنے شوہر کا قصاص طلب کریں۔

کیا قصاص طلبی ورثا کے علاوہ کسی دوسرے کی ذمہ داری نہیں؟ کیا اگر کوئی دادخواد موجود نہ ہو تو نظامِ حکومت کے اندر ہر ظلم پر خاموشی اور ہر ستم پر قناعت درست ہوگی؟

مولانا مودودی بخبر ضروری طور پر ہی عقل کا مظاہرہ فرما رہے ہیں اور جانتے بوجھتے دوسروں کو بے وقوف بنا رہے ہیں اور غور نہیں کرتے کہ خود ان کے بارے میں لوگ کیا خیال کریں گے۔

انہیں خوب معلوم ہے کہ جن درخواست گزاروں کی تلاش میں وہ افسانے تصنیف کر رہے ہیں یہ مرحلہ وہاں آ بھی چکا تھا اور گزر بھی چکا تھا۔ لوگوں نے خلیفۂ اسلام سے ایسی درخواستیں کی تھیں اور بعض لوگوں نے اس شرط پر ہی بیعت کی تھی کہ وہ پہلا کام خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کا ہی کریں گے۔ مولانا جانتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے ایسی درخواستیں سن کر عذر خواہی کی تھی، لوگ ان کے عذر کو صحیح نہیں جانتے تھے مگر وہ اپنے عذر کی صحت پر اصرار کرتے تھے۔ اگرچہ لوگ ان کے اس اصرار کو خلاف انصاف قرار دیتے تھے اور مدینہ میں کتنے ہی دنوں تک یہ کشمکش رہی، بالآخر قصاص کے طالب مایوس ہو کر مدینہ سے نکل آئے اور دوسرے ذرائع سے قصاص لینے کی

سعی کرنے لگے اور ان کی یہی سعی تھی جس کی خبر پاکر حضرت علیؓ نے ان کے خلاف چڑھائی کی اور جنگِ جمل تخلیق پائی۔ ان میں سے کوئی بات نہیں جس سے مولانا واقف نہ ہوں۔ مگر ان کی ضرورت کی انتہا یہ ہے کہ کھلی آنکھوں حقائق کا انکار کرتے ہیں اور انتہائی جسارت سے اپنے معتقدین کو بزاخفش سمجھ رہے ہیں۔

اب مولانا سے کوئی پوچھے کہ قتلِ عثمانؓ کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کو کس مرحلہ پر واقعات سے بے خبری تھی قاتلوں کی حضرت عثمانؓ کے ساتھ حضرت علیؓ کے ذریعہ ہی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ قاتل حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت علیؓ کے ربیب محمد بن ابی بکر اور ابن حذیفہ کے ذریعہ گہری راہ و رسم رکھتے تھے، اُنہیں ایک ایک مفسد، ایک ایک بلوائی اور ایک ایک قاتل کا علم تھا۔ مولانا ایک بے لذت گناہ کے ذریعہ حضرت علیؓ کے حضور درخواستیں گزارنے والوں کو تلاش کرتے پھرتے ہیں جبکہ حضرت علیؓ کو ان درخواستوں کا کسی مرحلہ پر بھی انتظار نہیں تھا۔ وہ بار بار یہی فرماتے تھے کہ بحالاتِ موجودہ قصاص ممکن ہی نہیں ورنہ وہ قاتلوں کی شناخت سے انکار نہیں کرتے تھے۔ یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودی کی قسمت کا حصہ بنائی۔ جن کو گواہ مطلوب ہیں یا مترجم نہج البلاغہ رئیس احمد جعفری کے بخت کا کوڑھ ہے جن کو عینی گواہ نظر نہیں آتے۔

مولانا نے بڑا مشکل سوال اٹھایا ہے کہ علیؓ قاتلوں کو کب پکڑتے۔ یہ سوال اس لئے غلط ہے کہ قصاص کا مطالبہ کرنے والوں نے ان سے یہ پکڑنے، نہ پکڑنے یا کب پکڑنے کا بوجھ سرے سے ہی اُتار رکھا تھا، کیونکہ جب علیؓ نے فرمایا کہ قاتل تو میرے مالک بنے ہوئے ہیں میں ان کو کیسے پکڑوں تو فریق ثانی کا کہنا تھا کہ آپ اُنہیں نہ پکڑیئے مگر ان کو اپنے سے الگ کر دیجئے ہم خود اُن کو پکڑ لیں گے۔ مولانا کو معلوم رہے کہ حضرت

علیؓ سے جو قاتلوں کی حوالگی کا مطالبہ کیا گیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ قاتل حضرت علیؓ کے پاس تھے، اُن کی پناہ میں تھے، اُن کی فوج میں بھرتی تھے۔ اگر حضرت علیؓ قاتلوں سے اپنا تعلق توڑ لیتے تو کسی کی عقل گم گئی تھی جو علیؓ سے قاتلوں کی حوالگی یا قصاص چاہتے۔

مولانا کو محض دوسروں کو غلط کار اور گمراہ ثابت کرنے کے لئے حضرت علیؓ کو بے بس حاکم اور مجبور خلیفہ ظاہر کرنے کی مجبوری قبول کرنا پڑی ہے جبکہ یہ کوئی فخر کی بات نہیں کہ مولانا حضرت علیؓ کے بارے میں یہ صفائی پیش کریں کہ ان کی تو سانس پر پہرے بیٹھے تھے وہ کیسے قاتلوں کو پکڑتے؟

اللہ کے بندے! یہ علیؓ کی تعریف ہے یا توہین و تحقیر! کتنے نادان دوست ہیں آپ حضرت علیؓ کے۔

مولانا کے معتبر راویوں اور مصدقہ مورخین ابن کثیر، ابن اثیر، طبری اور ابن سعد کا کہنا ہے کہ علیؓ قاتلوں کو نہ پکڑنا ہی چاہتے تھے نہ انہیں چھوڑنے پر ہی آمادہ تھے کیونکہ پکڑتا تو کوئی اس کو ہے جو کہیں مفرور یا غیر حاضر ہو اور یہ قاتلینِ عثمانؓ تو حضرت علیؓ کے گھر میں موجود تھے، ان کے کارکن تھے ان کے وزیر تھے، ان کے مشیر تھے، انہیں چھوڑنے پکڑنے کا کیا سوال ہے۔

حضرت علیؓ نے اپنے مخالفین سے جتنی جنگیں لڑی ہیں یہ قاتل ان کی سپاہ میں موجود تھے۔ نزاع تو یہی تھی کہ حضرت علیؓ قاتلوں کو اپنا ساتھی بنائے ہوئے ہیں۔ قاتلینِ عثمانؓ حضرت علیؓ کی کمان میں لڑتے تھے، حضرت علیؓ کی جگہ لڑتے تھے، حضرت علیؓ کے لئے لڑتے تھے، قاتلینِ عثمانؓ حضرت علیؓ سے خوش تھے، علیؓ قاتلینِ عثمانؓ سے خوش تھے وہ اُن کو کیوں پکڑتے اور پھر یہ بات مولانا مودودی بھی جانتے ہیں کہ آگے چل کر حضرت علیؓ نے اُن کو جی بھر کر نوازا۔ حضرت علیؓ نے عثمانؓ کے قاتل، اپنے ربیب اور گود پلے بیٹے محمد بن ابی بکر کو مصر جیسے اہم صوبے کی گورنری سے شاد کام فرمایا۔ اشتر جو قاتلوں اور بلوائیوں کا

مشہور سردار تھا اُسے گورنری سے نوازا۔ یہ لوگ حضرت علیؓ کے محض ساتھی ہی نہیں تھے آپ کے معتمد بھی تھے۔ بصرہ کا بیت المال سب کا سب آپ نے ان لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جمل میں لڑنے والی فوج میں حضرت علیؓ کی زیرِ کمان کم و بیش ۳۰-۳۵ ہزار آدمی تھے۔ بصرہ کو فتح کیا تو حضرت نے سارا خزانہ اُن کو تقسیم کر دیا۔ بقول مورخ اکبر شاہ حضرت علیؓ کے ہر فوجی کو پانچ پانچ سو درہم حصہ ملا۔ اور حضرت علیؓ نے انہیں آفرین کہتے فرمایا کہ اگر تم شام کو فتح کر لو تو ہم تمہیں اس سے بھی کہیں بڑھ کر دولت دیں گے[1]

قاتلین عثمانؓ کے سردار اشتر سے حضرت علیؓ اتنے خوش تھے کہ نہ صرف اُسے گورنری سے نوازا بلکہ جب وہ مرا تو اس کے لئے آپ نے حصولِ جنت کی دعائیں کیں اور اس کی بخشش کے لئے اس کے حق میں اپنی رضامندی کو بطور سفارش پیش کیا[2]

آٹھواں مغالطہ

تاریخ نویسی اور تاریخ سازی

مولانا لکھتے ہیں:

آج کل یہ خیال بھی بڑے زور شور سے پیش کیا جا رہا ہے کہ ہمارے ہاں چونکہ تاریخ نویسی عباسیوں کے دور میں شروع ہوئی تھی، اور عباسیوں کو بنی اُمیہ سے جو دشمنی تھی وہ کسی سے چھپی نہیں ہے اس لئے جو تاریخیں اس زمانہ میں لکھی گئیں وہ سب اس جھوٹے پروپیگنڈے سے بھر گئیں، جو بنی عباس نے اپنے دشمنوں کے خلاف برپا کر رکھا تھا۔

لیکن اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو آخر اس بات کی کیا توجیہ کی جا سکتی

---

[1] تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں حصہ اوّل ص۳۰۰ [2] نہج البلاغہ

ہے کہ انہی تاریخوں میں بنی امیہ کے وہ شاندار کارنامے بھی بیان ہوئے ہیں جنہیں یہ حضرات فخر کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔

انہی میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی بہترین سیرت کا بھی مفصل ذکر ملتا ہے جو بنی امیہ ہی میں سے تھے [۱]

جواباً گزارش ہے کہ بات جو کہی تھی وہ بڑی سیدھی ہے کہ یہ تواریخ جس دور میں لکھی گئی ہیں وہ عباسیوں کا دور تھا اور عباسیوں اور امویوں کی دشمنی کی سطح کا اندازہ کرنے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ عباسیہ نے اپنی حکومت کا ایوان بنو امیہ کی لاشوں پر استوار کیا تھا۔ بنو عباس نے بنو امیہ کی سلطنت کی صف لپیٹ کر اپنا تختِ حکومت بچھایا تھا اور ظاہر ہے کہ اگر بنو امیہ کی تاریخ نویسی کا کام ان لوگوں کے سپرد ہوگا تو بنو امیہ کے ساتھ انصاف کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی اور کوئی وجہ نہیں کہ اس دور کے تاریخ نویس حکومت کے فکر و ذہن اور اس کی مرضی اور منشاء سے متاثر نہ ہوں اور بنو عباس بنو امیہ کے خلاف جن سفاکیوں کے مرتکب ہوئے اس کا ذکر ہم خود مولانا مودودی صاحب کے قلم سے ہی کر چکے ہیں۔ عباسی حکمران اموی حکمرانوں کے نہایت درجہ کمینہ دشمن تھے جس کا ثبوت ان کی ایک ایک سانس سے مہیا ہے۔ تو جب کوئی کمینہ دشمن اپنے دشمن کی تاریخ مرتب کرے گا تو ظاہر ہے وہ ہر نا کردنی کرے گا اور ناگفتنی کہے گا اور عباسیہ کی تحریر کردہ تاریخ کا ہر صفحہ اُن کی طینت کی شیطنت پر گواہ ہے۔

تاہم اس زمانہ میں تحریر کردہ تاریخ کے متعلق یہ کسی نے نہیں کہا کہ وہ از سرتاپا ہی غلط اور جھوٹ ہے۔ یہ درست ہے کہ اس میں حکومت کی ضرورت سے بہت سے جھوٹ درج ہوئے ہیں مگر یہ نہیں کہ وہ سب کچھ ہی جھوٹ ہے۔ نرا جھوٹ تو شیطان سے بھی نہیں نبھ سکتا کوئی دوسرا کیونکر نبھا سکتا ہے۔

---

[۱] خلافت و ملوکیت صد ۳۱۶

اگر وہ لوگ بنو امیہ کے نام سے کوئی بھی بھلی بات تاریخ میں درج نہ کرتے تو وہ اپنی جمع و ترتیب کو تاریخ کیونکر کہتے۔ اپنے فریب کو قائم رکھنے اور اپنی سازش کے استحکام کے لئے اُنہیں بنو اُمیہ کی بعض خوبیوں کا ذکر کرنا ناگزیر ہی تھا یہ اُن کی نہ کوئی خوبی تھی نہ احسان۔ اُنہوں نے اپنی بُرائی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کچھ نیکی بنو اُمیہ کا حصہ بنا دی تھی۔ بقول مرزا غالبؔ ؎

دیا ہے اَوروں کو بھی تا اِسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیشِ تجمل حسین خاں کے لئے

مودودی صاحب اس بات سے ہرگز بے خبر نہیں ہو سکتے کہ یہ تاریخ صرف عباسیہ کے قلم تک ہی محدود نہیں تھی کچھ دوسرے لوگ بھی عباسیہ کے علی الرغم تاریخ کی جمع و ترتیب میں مصروف تھے۔ اور اگر عباسیہ دھاندلی بھی کرتے تو وہ اسلام کے اندر بحری بیڑے کی تشکیل، قسطنطنیہ پر حملہ، قبرص اور دوسرے جزائر کی فتح، قسطنطنیہ کی تسخیر وغیرہ ایمان افروز کارناموں کی سرانجام دہی حضرت معاویہؓ کے نام سے کیونکر الگ کر سکتے تھے۔ یہ کارنامے نہ حضرت معاویہؓ کے کسی ہمعصر کے نام لگ سکتے تھے نہ اُن کے کسی مخالف کے نام ان کا اندراج ممکن تھا۔ پھر وہ اپنے سینے پر سل رکھ کر یہ باتیں معاویہؓ کے نام نہ لکھ دیتے تو کیا کرتے۔

بنو اُمیہ تقریباً ایک سو برس تک حاکم رہے۔ اور اس عرصہ کا بہت سا حصّہ اُنہوں نے کفر و شیطنت کے خلاف جہاد میں صَرف کیا۔ اب اس سو برس کو عباسی مورخین کہاں چھپا لیتے۔ قسطنطنیہ پر حملہ حضرت معاویہؓ کے فرزند جناب یزید کی کمان میں کیا گیا۔ حضرت معاویہؓ کے حکم سے یہ مہم بحری راستے قیصر کے شہر پہنچی۔ اس مہم کی تفصیل محدثین نے بڑے اہتمام سے اپنے ہاں درج کر رکھی تھی۔ اب عباسیہ دور کے مورخین یزید کی جگہ دولت

عباسیہ کے کسی شہزادے کا نام کیونکر لکھ سکتے تھے اور حضرت معاویہؓ کی جگہ اپنے کسی بزرگ کا تذکرہ کیونکر کرتے - حضرت معاویہؓ کی مہمات اور ان کے کارناموں کو وہ لوگ غیر اہم تو بنا سکتے تھے اور یہ کام اُنہوں نے بڑی خوبی سے کیا ہے مگر وہ اُنہیں تاریخ سے نہیں نکال سکتے تھے۔

اُن سے یہ تو ممکن تھا کہ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والی فوج سے حضرت حسینؓ کا نام حذف کر دیں مگر وہ اس فوج پر یزید کی سالاری کا انکار کیونکر کر سکتے تھے۔

باقی رہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تعریف و توصیف جسے مولانا مودودی صاحب نے اپنے حق میں ایک عظیم دلیل کے بطور ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے بنی عباس کے وہ آنسو پونچھے تھے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے لے کر اس وقت تک باغِ فدک کے فراق میں بہاتے چلے آ رہے تھے اور جس کے لئے اُنہوں نے ہر خلیفۂ اسلام سے مجادلہ جاری رکھا تھا - حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ جاگیر اُن کے سپرد کر دی تھی تا کہ بنو عباس کی یہ دنیا طلبی ہمیشہ ہی مسلمانوں کی سلامتی کے لئے چیلنج نہ بنی رہے - اگر وہ بھی اس جاگیر کی حیثیت وہی رہنے دیتے جو خلفائے راشدین کے دَور سے چلی آ رہی تھی تو عمر بن عبدالعزیز بھی بنو اُمیہ کے انہی لوگوں میں شمار ہوتے جن کے مقدر کی تصویر کشی تاریخ کے ابن مخنفوں ابن کلبیوں اور واقدیوں کے موئے قلم کے سپرد رہی ہے اور جن کی بنو اُمیہ دشمن روایات ہمارے حضرت مولانا مودودی صاحب کے مزاج سے ہمیشہ ہموار رہی ہیں -

---

نواں مغالطہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ایک قول

مولانا نے حضرت معاویہؓ کو اپنی خود ساختہ ملوکیت کا مصداق ثابت کرتے اور انہیں خلافتِ راشدہ کے نظام سے خارج کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے بھی اپنے قارئین کو دھوکہ میں ڈالنے کی سعی فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ میرے بعد خلافت ۳۰ سال تک جاری رہے گی، پھر بادشاہی ہوگی اور یہ مدت ربیع الاول ۴۱ھ میں ختم ہوگئی جبکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوئے [۱]

مولانا کے تحریفی ذرائع کا کمال یہ ہے کہ وہ ان کی مدد سے پلاسٹک کے اس کھلونے کی طرح ہمیشہ پاؤں کے بل ہی آتے ہیں جس کی پیندی میں بوجھل کیل لگا ہوتا ہے اور آپ خواہ اُسے جتنی بار بھی لٹائیں وہ کیل کے وزن کا حریف نہ ہونے کی وجہ سے ہر بار ہی اُچھل کر سیدھا بیٹھ جاتا ہے۔

مولانا نے صحیح حدیث کی راہ ترک کر کے ایک روایت بالکل مجہول طریقہ سے تاریخ کی کتاب البدایہ سے نقل کی ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں خلافت کے بجائے اسلام کے الفاظ وارد ہوئے ہیں اور نہ تو وہاں "میرے بعد" کے الفاظ ہی موجود ہیں اور نہ اصل مدت ہی ۳۰ برس بیان ہوئی ہے ۔۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ان رحی الاسلام ستزول بعد خمس وثلثین او ست وثلثین او سبع وثلثین سنۃ

---

[۱] خلافت و ملوکیت صہ ۱۴۸

کہ اسلام کی چکی ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ برس کے بعد چلتے چلتے اپنے مقام سے ہٹ جائے گی۔

(یہ راوی کا شک ہے کہ حضورؐ نے شاید ان میں سے کونسا ہندسہ بیان فرمایا" تاہم جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ ۳۵ برس صحیح ہے)

مولانا کی یہ عبارت نہایت درجہ المناک ہے کہ انہوں نے محض اپنی غرض کی تکمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کو اس مدت سے حذف کر دیا جبکہ صحیح روایت کے بموجب اسلام کی چکی کی گردش کے سالوں میں حضورؐ علیہ السلام کا اپنا مبارک دور بھی شامل ہے۔

یہاں ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے یہ پوری بحث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے قلم سے اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

الحاکم نے منصور سے کتنی ہی سندوں کے ساتھ منصور نے ربعی بن حراش سے انہوں نے براء بن ناجیہ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں حضرت عبداللہؓ بن مسعود بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان رحی الاسلام ستزول لبعد خمس وثلثین او ستٍ وثلثین او سبع وثلاثین سنۃ۔

(بے شک اسلام کی چکی ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ برس کے بعد (اپنی جگہ سے) ہٹ جائے گی[1]

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں حضرت عثمان ذوالنورینؓ ۳۵ھ میں شہید ہوئے اور ان کی خلافت ۱۲ برس تک رہی۔

یعنی حضرت شاہ صاحب کے بموجب حضرت عثمانؓ کی شہادت تک ہی اسلام کی چکی کی اصلی گردش موجود تھی اس کے بعد کی سیاست کا معاملہ الگ ہے۔

---

[1] ازالۃ الخفاء جلد اوّل مقصد اول فصل چہارم ص ۲۸۶

شاہ صاحب کے اس ارشاد کے مطابق اس ۳۵ سالہ مدت کی تقسیم اس طرح ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دور ہجرت سے وفات تک گیارہ برس، حضرت صدیق اکبر کی خلافت سے حضرت فاروقِ اعظمؓ کی شہادت تک بارہ برس، حضرت عثمانؓ کی شہادت تک بارہ برس۔

شاہ صاحب نے حضرت ابن مسعود سے ہی دوسری روایت نقل فرمائی ہے جس سے خلافتِ راشدہ پر دلیل لائی گئی ہے۔ حضرت ابن مسعود کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم کہ بہترین قرن میرا ہے، پھر میرے ساتھ والوں کا، پھر اُن کے ساتھ والوں کا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں اس کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ پہلا قرن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے آپ کی وفات تک لیا جائے، دوسرا قرن صدیقِ اکبرؓ کی ابتدائے خلافت سے حضرت فاروق اعظمؓ کی شہادت تک، تیسرا قرن حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے اس تجزیہ پر مولانا عبدالشکور صاحب مترجم کتاب حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں:

یہ مقام اس کتاب عالی نصاب کے ان مقامات سے ہے جہاں حضرت مصنف نے اپنی خداداد ذہانت اور اپنے وہبی علم کی بہار دکھائی ہے۔ اس حدیث کو جمہور نے تبع تابعین کے زمانہ تک منطبق کیا ہے۔ مگر مصنف (حضرت شاہ صاحب) نے اس کو حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک ختم کر دیا ہے اور حق یہی ہے جو مصنف نے لکھا ہے [۱]

---

[۱] ازالۃ الخفا حوالہ مذکور

یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہاں کچھ

کیا مولانا یہ منظر دیکھ سکیں گے

ایسی حیرتناکیاں بھی کارفرما ہیں جن کو پاکر یقیناً مولانا خوش نہیں ہوں گے مگر وہ جو کہا گیا ہے کہ ؎

بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد جس کا اوپر ذکر ہوا کہ اسلام کی چکّی ۳۵ برس تک گردش کرے گی وہ حضورؐ کے ارشاد کا نصف اوّل ہے اور اس حدیثِ پاک کا نصف آخر یوں ہے :

فان یھلکوا فسبیل من تد ھلك وان یقم لھم دینھم یقم سبعین سنۃ :

کہ ۳۵ برس کے بعد اگر لوگ ہلاکت کی راہ پر چل نکلیں گے تو اُن کا مقدر پھر وہی ہے جو ہلاک ہونے والوں کے لئے مقرر ہے۔

لیکن اگر اُن کا دین اُن کے لئے قائم رہ گیا تو پھر اسلام کی چکّی کا سفر ستّر برس تک جاری رہے گا [۱]

اس پر حضرت عمرؓ نے سوال کیا کہ آقا! یہ ستّر برس کی مدت پہلے ۳۵ برس شامل کر کے ہے یا ان سے الگ؟ آپ نے فرمایا: نہیں یہ مدت ان برسوں کے علاوہ ہو گی۔

اس پر حضرت شاہ ولی اللہ تحریر کرتے ہیں :

۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ شہید ہوئے اور جہاد کا نظام بگڑ گیا (اب اس درمیانی مدت کو آپ مولانا کے الفاظ میں بادشاہی کا زمانہ کہہ لیجئے یا حدیث کے الفاظ میں ہلاکت کا دور (اس دور کے بارے میں حدیث کے الفاظ بہت سنگین ہیں) پھر بقول شاہ صاحب جہاد کا نظام حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے زمانہ میں

---

[۱] ازالۃ الخفا مقصد اوّل فصل پنجم صہ ۴۸۱ - ۴۸۲

قائم ہوا (اور اسلام کی چکی پھر چلنے لگی) یہاں تک کہ اس تاریخ سے ستر برس بعد بنو امیہ کی سلطنت زائل ہوگئی (اور اسلام کی چکی پھر اپنی جگہ سے ہٹ گئی)

اب یہ ایک لطیفہ ہی ہے کہ مولانا کے کو ملبس علم نے ایک روایت دریافت کی جس کے ذریعہ آپ نے حضرت معاویہؓ کو اسلام کے نظام خلافت سے نکالنے کے لئے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت مہد کو بھی اپنی ضد پر قربان کر دیا مگر اس لطیفہ یا طربیہ کا انجام اس المیہ پر ہوا کہ حضرت حسنؓ تو کیا خود حضرت علیؓ بھی نظام خلافتِ راشدہ کا حصہ نہ بن سکے اور بات پھر وہیں آ کر رُکی کہ ؎

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو
